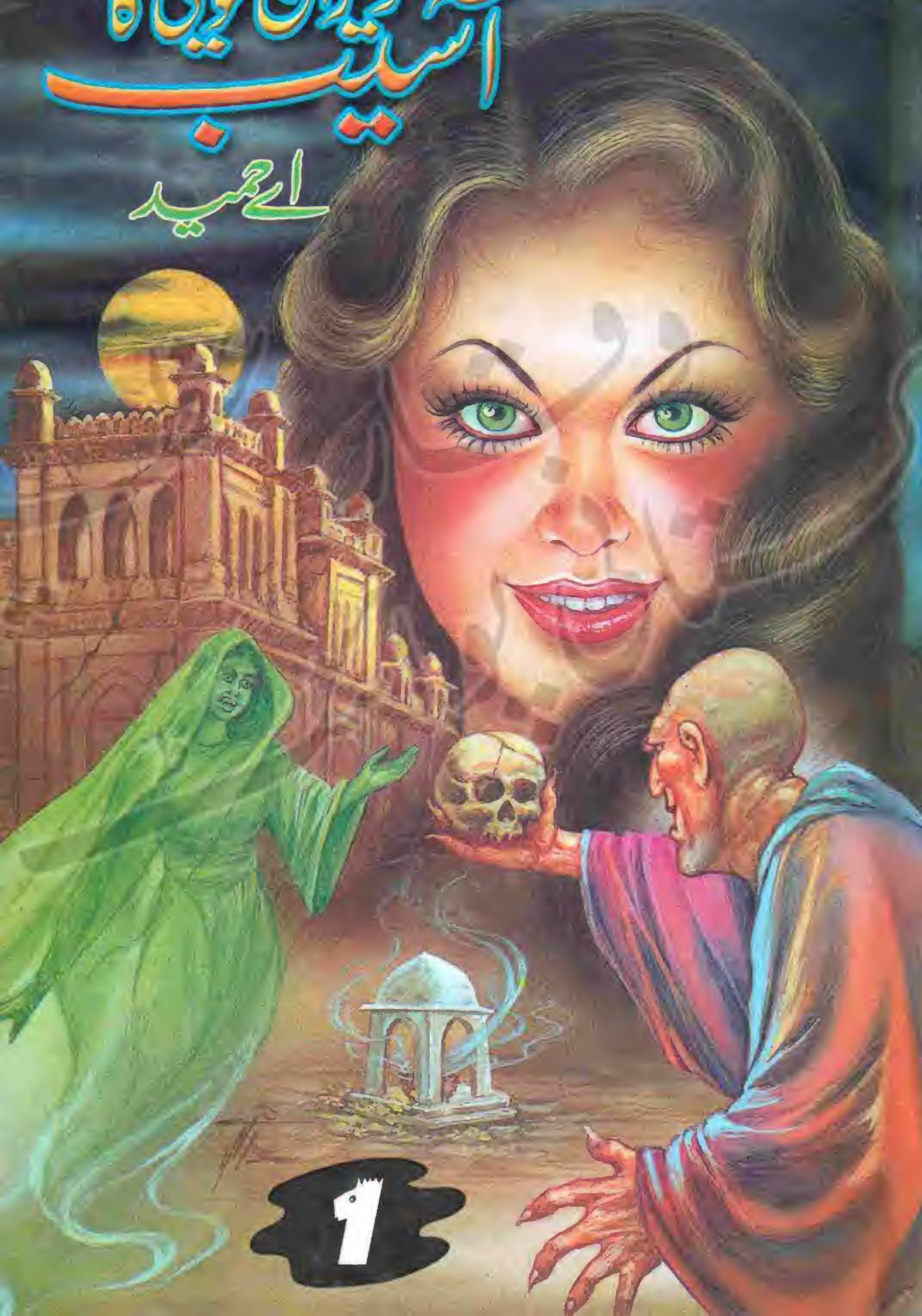


ایک دہشت ناک آسیب کی لرزہ خیز داستان

اسدِ ویران حویلی کا

الحمد



”بمبئی بروڈ ریلوے لائن پر جھانسی سے بھوپال جاتے ہوئے جھانسی سے کوئی ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر روہت گڑھ کا چھوٹا سائٹیشن آتا ہے۔ روہت گڑھ سے تین چار کوس جنوب مشرق کی جانب گھنے جنگلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان جنگلوں میں شیر، چیتے، ہاتھی، ریچھ غرض کہ ہر قسم کے درندے، جانور اور حشرات الارض پائے جاتے ہیں۔ یہ جنگل آگے جا کر ہوشنگ آباد ناگ پور کے وسطی جنگلاتی سلسلے سے جا کر مل جاتے ہیں۔ ان جنگلوں کا روہت گڑھ سے ہوشنگ آباد تک کا علاقہ سب سے خطرناک اور خوفناک سمجھا جاتا ہے۔ ان جنگلوں کے بارے میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ یہاں رات کی تاریکی میں ان لوگوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں جو جنگلی درندوں کا شکار ہو چکے ہیں۔

اس جنگل میں روہت گڑھ سے تھوڑے فاصلے پر ایک پرانے قلعے کا کھنڈر ہے جسے رانی بائی کا قلعہ کہتے ہیں۔ یہ قلعہ مغلوں کے زمانے کا ہے۔ کہتے ہیں اسے کسی مغل صوبیدار نے اپنی کنیز رانی بائی کے لئے بنوایا تھا۔ قلعے کے اندر رانی بائی کا ایک عالی شان محل تھا۔ اس محل کے نیچے ایک خفیہ سرنگ بنائی گئی تھی جو زمین کے اندر ہی اندر روہت گڑھ تک جاتی تھی۔ ساون کے دنوں میں جب خوب بارشیں ہوتی تھیں تو رانی بائی اس قلعے میں آ جاتی تھی اور محل کے باغ میں اپنی کنیزوں کے ساتھ جھولا جھولتی تھی اور موسم برسات کا لطف اٹھاتی تھی۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ رانی بائی کی خون آلود لاش محل کے پائیں باغ میں پائی گئی۔ رانی بائی کے مسلمان صوبیدار خاوند

معیاری اور خوبصورت کتابیں

با اہتمام محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ایڈیشن.....	2009ء
مطبع.....	نیر اسد پریس لاہور
ڈیزائن.....	ذاکر
کمپوزنگ.....	کلائمکس گرافکس
قیمت.....	225/- روپے
مکمل سیٹ.....	450/- روپے

نے رانی بائی کی لاش کو ہندو رسم کے مطابق نذر آتش کرنے کے بعد اس کی ہڈیاں جس کو ہندو لوگ پھول کہتے ہیں محل کے باغ میں جہاں رانی بائی کی لاش ملی تھی وہیں دفن کر کے اوپر مڑھی یعنی سنگ مرمر کا ایک چبوترہ بنادیا تھا جس کے اوپر ایک سنگ مرمر کی چھوٹی سی بارہ دری تھی۔

رانی بائی کے اس قلعے کے بارے میں یہ روایت بمبئی تک مشہور تھی کہ کبھی کبھی تاریک راتوں میں اس قلعے میں سے کسی عورت کے سسکیاں بھرنے اور کبھی درد بھرے گیت گانے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

ان پر اسرار آسب کی آوازیں کی وجہ سے کوئی شخص اس قلعے کے نزدیک نہیں جاتا تھا۔ لوگوں کو تو اس قسم کی کوئی بات ہاتھ آجانی چاہئے۔ لوگوں نے یہ بھی مشہور کر رکھا تھا کہ رانی بائی کے قلعے میں ایک ہندو طوائف کی بدروح رہتی ہے جو چڑیل کا جنم لے چکی ہے اور قلعے کے قریب سے گزرنے والے مسافروں یا شکاریوں کو محبت بھری آوازیں دے کر بلاتی ہے اور جب وہ قلعے کے اندر چلے جاتے ہیں تو اس کے بعد ان کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ اس بدروح چڑیل کی آوازیں اب تک کئی انسانوں کو ہڑپ کر چکی ہے۔ جس شخص نے مجھے یہ خوفناک داستان سنائی ہے اس کا کہنا ہے کہ میں نے بمبئی میں رانی بائی کے قلعے کے بارے میں یہ مبالغہ آمیز اور دہشت ناک روایتیں سنیں تو میں نے دل میں اس معے کو حل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔“ وہ شخص خاموش ہو گیا۔ میں اس شخص کا یہاں نام اس لئے نہیں لکھوں گا کہ اس نے خود بھی اپنا نام نہیں بتایا اور مجھ سے وعدہ بھی لے لیا تھا کہ اگر کسی ذریعے سے مجھے اس کا اصلی نام معلوم بھی ہو گیا تو میں اپنے قارئین کو وہ نام نہیں بتاؤں گا۔ مجھے ابھی تک اس پر اسرار قسم کے شخص کا اصلی نام معلوم نہیں ہوا لیکن یقین کریں اگر معلوم ہو بھی گیا تو میں اپنے وعدے کو نبھاؤں گا اور اس کا نام زبان پر نہیں لاؤں گا۔ لیکن چونکہ یہ اس شخص کی آپ بیتی ہے اور یہ سارے دہشت ناک واقعات سچے ہیں اور اس

کے ساتھ گزر چکے ہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ایک فرضی نام رکھنا ضروری ہے۔ میں اس کا نام فیروز فرض کر لیتا ہوں۔ فیروز سے میری ملاقات محض ایک اتفاق سے ہو گئی تھی۔ جولائی، اگست کے موسم میں، میں پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے ایک صحت افزا پہاڑی مقام پر گیا ہوا تھا۔ کچھ روز وہاں قیام کے بعد وہاں سے واپسی کا سفر شروع کیا تو راستے میں بارش آگئی۔

خیال تھا کہ پہاڑی بارش ہے گھنٹے آدھ گھنٹے بعد رک جائے گی۔ لیکن بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ آسمان کو سیاہ گھنگھور گھٹاؤں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی۔ یہ تو کوئی بارش کا طوفان تھا۔ ہماری بس ایک مقام پر جا کر رک گئی۔ معلوم ہوا کہ آگے ایک پہاڑی پل ٹوٹ کر بارش میں بہہ گیا ہے۔ پہاڑی علاقوں میں اگر کوئی سڑک یا کوئی پل بارش میں بہہ جائے تو اتنی جلدی ٹریفک کے واسطے دوسرا راستہ نہیں بنایا جاسکتا خاص طور پر جبکہ بارش بھی موسلا دھار ہو رہی ہو۔ ہم پندرہ بیس مسافر ایک لگژری کوچ میں سفر کر رہے تھے۔ کوچ کے ڈرائیور نے جہاں گاڑی کھڑی کی تھی وہ ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں تھا۔ ذرا بلندی پر ایک ریست ہاؤس بھی تھا۔ ڈرائیور نے مسافروں سے کہا۔

”آپ لوگوں کو پریشانی ضرور ہوئی ہوگی۔ لیکن یہ مجبوری ہے۔ آگے پل بارش میں بہہ گیا ہے شاید آپ لوگوں کو رات یہیں گزارنی پڑے۔“

مسافروں میں شدید مایوسی پھیل گئی۔ سب کے چہرے لٹک گئے۔ مگر بارش کے آگے کسی کا زور نہیں چل سکتا تھا۔ صرف ایک ادھیڑ عمر کا چوڑے شانوں والا ایک مسافر ایسا تھا جس پر اس صورت حال کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ اپنے اوپر کوٹ کے کار اوپر کئے سر پر سواتی ٹوپی پہنے چائے کی دکان کے سامان کے نیچے لوہے کی کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ آدمی تو بالکل ہی بے حس اور ڈل قسم کا ہے اور یا پھر وہ اس قسم کی تکلیفوں اور ناگہانی آفتوں کا عادی

معلوم ہوتا ہے۔ اس کی سوائی ٹوپی کے کناروں پر اس کے بالوں کی سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس کی عمر پچاس سال کے قریب ہو گئی مگر جسم صحت مند اور متناسب تھا۔

ایک مسافر نے ڈرائیور سے کہا۔ ”ہم لوگ رات کہاں بسر کریں گے بہتر یہی ہے کہ تم ہمیں واپس لے چلو۔“

ڈرائیور بولا۔ ”صاحب فکر نہ کریں۔ اوپر محکمہ جنگلات کا ایک پراناریسٹ ہاؤس ہے وہاں آپ لوگوں کے سونے کا بندوبست ہو جائے گا۔ باقی دو چار آدمی کوچ کے اندر بھی سو سکتے ہیں۔“

سورج بادلوں کے پیچھے ڈھلنا شروع ہو گیا تھا اور دن کی روشنی ماند پڑنے لگی تھی۔ ڈرائیور یہ کہہ کر اوپر ریسٹ ہاؤس کی طرف چلا گیا کہ ”آپ لوگ تب تک چائے کی دکان میں چائے وغیرہ پیئیں میں اوپر آپ لوگوں کے سونے کا کچھ انتظام کرتا ہوں۔“

چائے کی دکان پہاڑی سڑک کے کنارے پر ہی تھی۔ پتھریلی سلیٹوں والی ڈھلوان چھت کے نیچے ایک بڑا سا برآمدہ تھا۔ ایک طرف دکان کا مالک چائے وغیرہ پکاتا تھا۔ برآمدے میں لکڑی کی بوسیدہ دو چار میزوں کے گرد لوہے کی کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک جانب لکڑی کے دو تین بیچ بھی رکھے ہوئے تھے۔ کچھ مسافر کرسیوں پر اور کچھ بچوں پر بیٹھ گئے اور چائے وغیرہ پینے میں مصروف ہو گئے۔ میں سب سے الگ ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگے لکڑی کے بیچ پر بیٹھا چائے پی رہا تھا اور برآمدے کے باہر سڑک پر بارش کا نظارہ بھی کر رہا تھا۔ چائے کے ہوٹل کے مالک نے بادلوں کی وجہ سے شام کا اندھیرا جلدی گہرا ہوتے دیکھ کر برآمدے کی چھت پر لگا ہوا بلب روشن کر دیا تھا۔ میں نے لمبا کوٹ پہن رکھا تھا اور سردی سے بچنے کے لئے گلے میں مفلر بھی لپیٹا ہوا تھا۔

چھت کے لکڑی کے شہتیر سے لٹکتے ہوئے بلب کی روشنی میرے چہرے پر پڑ رہی

تھی۔ اتفاق سے وہ ادھیڑ عمر کا آدمی جس کا میں ذکر کر چکا ہوں اس پر اس پریشان صورت حال کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا، مجھ سے چند گز کے فاصلے پر ایک میز کے پاس کرسی پر اکیلا بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ شخص میری طرف بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا اور خاموشی سے بیٹھا چائے پیتا رہا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ شخص کرسی سے اٹھا اور میرے قریب آکر بڑی شائستگی سے بولا۔ ”کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟“

میں اس کے مہذبانہ انداز گفتگو سے متاثر ہوا تھا۔ میں نے بیچ پر ذرا سا پیچھے سرکتے ہوئے کہا۔ ”ضرور! تشریف رکھئے۔“

اور وہ شخص اپنے گرم اودر کوٹ کو سمیٹتے ہوئے میرے پاس بیچ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جیب سے پائپ نکال کر اس میں پہلے سے بھرے ہوئے تمباکو کو اگلوٹھے سے دبا کر اسے سلگایا اور دو ایک ہلکے سے کش لگانے کے بعد مجھ سے میرا نام لے کر یوں مخاطب ہوا۔

”آپ وہی ہیں نا جو آج کل اخباروں، رسالوں میں پراسرار اور کسی حد تک دہشت ناک ایڈ ونچر کی کہانیاں لکھ رہے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”جی ہاں! میں وہی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”میں نے آپ کی ایک کتاب میں آپ کا فوٹو دیکھا تھا وہیں سے میں نے آپ کو پہچانا ہے۔۔۔۔۔“

پھر وہ مجھ سے شمالی علاقہ جات کے موسموں اور بارش کی باتیں کرنے لگا۔ میں ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ اس آدمی کے چہرے کے نقوش دیکھے تھے۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ چہرے کا رنگ جو کبھی سرخ و سفید ہو گا اب گندمی رنگت اختیار کر چکا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس شخص نے زندگی اور وقت کے بڑے گرم سرد موسم دیکھے ہیں۔ اس کی سواری آنکھوں میں بھی ذہانت کی بڑی چمک تھی۔

وہ پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے جنگلوں کے بارے میں بڑے ماہرانہ انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ”لگتا ہے آپ کو ان جنگلوں کا کافی تجربہ ہے۔“
وہ پائپ کو اپنے ہونٹوں سے الگ کرتے ہوئے بولا۔ ”ان جنگلوں کا تو مجھے اتنا تجربہ نہیں ہے لیکن بھارت کے جنگلوں میں، میں نے کافی وقت گزارا ہے۔“
بھارت کے جنگلوں میں پاکستان بننے سے پہلے میں بھی تھوڑی بہت آوارہ گردی کر چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا اس نے مجھے ہوئے پائپ کو انگوٹھے سے دبانے کے بعد دوبارہ سلگایا اور کہنے لگا۔ ”بھارت کے جنگلوں کے بارے میں تم نے بھی بہت کچھ لکھا ہے اور کافی حد تک درست لکھا ہے۔ لیکن ان پراسرار جنگلوں میں مجھے جو تجربے ہوئے ہیں وہ تم سے بہت مختلف ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ شکاری رہ چکے ہیں؟“
وہ بولا۔ ”جم کاریٹ کی طرح کوئی پیشہ ور شکاری تو نہیں تھا لیکن تھوڑا بہت شکار کھیل لیتا تھا محض کھیل کی خاطر..... زیادہ تر مجھے ان جنگلوں کی پراسرار روایتیں ان کی طرف کھینچ کر لے گئی تھیں۔ میں پراسرار اور ماورائی چیزوں کو پسند کرتا ہوں اور مجھے پراسرار رازوں کا سراغ لگانے اور انہیں بے نقاب کرنے اور اصل حقیقت معلوم کرنے کا شروع ہی بڑا شوق رہا ہے۔“

پھر اس نے اچانک چہرہ میری طرف گھما کر آہستہ سے کہا۔ ”تم جو پراسرار کہانیاں لکھتے ہو وہ مجھے فرضی کہانیاں لگتی ہیں لیکن میرے پاس ایک ایسی پراسرار کہانی ہے جو تم سنو گے تو تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ آج کے ماڈرن اور کمپیوٹر سائنس کے زمانے میں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسا ہوتا ہے ایسا ہوا ہے اور ایسا میرے ساتھ ہوا ہے۔ یہ کہانی نہیں بلکہ میری آپ بیتی ہے.....“

وہ چپ ہو گیا۔ اور خاموشی سے پائپ پیتے ہوئے جیسے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔
بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ شام کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں اس پراسرار شخص کی کہانی ضرور سننا چاہتا تھا۔ جب میں نے اس کے آگے اپنے اشتیاق کا اظہار کیا تو وہ بولا۔
”میں تمہیں یہ حیرت انگیز کہانی ضرور سناؤں گا شاید اسی لئے میں وہاں سے اٹھ کر تمہارے پاس آ کر بیٹھا ہوں۔ پہلے یہ معلوم ہو جائے کہ ہمیں رات کہاں بسر کرنی ہے۔ کوچ میں یا اوپر والے ریٹ ہاؤس میں.... میں تو اسی جگہ بچ پر بیٹھے بیٹھے رات گزار سکتا ہوں میرا جسم اس قسم کی تکلیفوں کا عادی ہے۔ میں نے کئی راتیں جنگلوں کے درختوں پر بیٹھ کر گزاری ہیں۔“

اس دوران کوچ کا ڈرائیور اوپر سے آگیا۔ اس نے بتایا۔ ”اوپر والے ریٹ ہاؤس میں سب کے رات بسر کرنے کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ برائے مہربانی سب مسافر اوپر آجائیں وہاں آپ کو کھانا بھی مل جائے گا۔“ بارش ذرا رک گئی تھی۔ مسافروں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ ان میں کوئی عورت اور بچہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ سارے مسافر ہلکی بارش میں بھگتے پہاڑ کی چڑھائی چڑھ کر اوپر ریٹ ہاؤس میں آ گئے۔ ان کا سامان کوچ یعنی دیگن کے اندر رکھوا دیا گیا تھا اور کوچ کے کلیئر نے سامان کی حفاظت کی خاطر رات کوچ میں ہی گزارنی تھی۔ ریٹ ہاؤس میں انتظام یہ ہوا تھا کہ ایک بڑے سے کمرے کے آئینہ میں آگ جلا کر زمین پر دریاں بچھا دی گئی تھیں۔ کچھ لحاف اور کچھ کمبل مہیا کر دیئے گئے تھے۔ وہیں دریوں پر لیٹ کر رات بسر کرنی تھی۔

میرے پراسرار ساتھی نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور ایک کمبل گھٹنوں پر رکھ کر آتش دان کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ ”یہ لوگ فیشن پرست لوگ ہیں۔ محض فیشن کی خاطر ان پہاڑی علاقوں کی سیر کرنے آتے ہیں اور یہاں بھی گھر کا سا آرام ڈھونڈتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ پہاڑی علاقوں میں رہنے والے غریب

لوگ کس قدر سخت زندگی بسر کرتے ہیں اور جنگل کیا ہوتے ہیں۔“

کھانا وغیرہ کھانے کے بعد سب لوگ وہیں دریوں پر لحاف اور کمبل وغیرہ اوڑھ کر سو گئے۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی جس کی وجہ سے ریٹ ہاؤس کے بڑے کمرے کی سردی تھوڑی کم ہو گئی تھی۔ میں اور وہ پراسرار شخص آتش دان کے قریب ہی کمبل لے کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے تھے۔ اسی رات اس پراسرار شخص نے مجھے وہ حیرت انگیز کہانی سنائی جو بقول اس کے اس کی آپ بیتی تھی اور جو میں آپ کو سنانے والا ہوں۔ اس شخص نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا تھا اور مجھ سے وعدہ بھی لے لیا تھا کہ اگر کسی ذریعے سے مجھے اس کا نام معلوم بھی ہو جائے گا تو میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ میں اس عہد پر قائم ہوں اور میں نے کہانی بیان کرنے کی سہولت کی خاطر اس پراسرار شخص کا فرضی نام فیروز رکھ لیا ہے۔ فیروز نے اپنے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا کہ وہ کس شہر میں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے اور اس کی کوئی گھریلو زندگی بھی ہے یا نہیں۔ اس نے اپنے ساتھ گزرے ہوئے ناقابل یقین، ناقابل فراموش پراسرار اور دہشت ناک جو واقعات سنائے ہیں وہ میں ویسے کے ویسے بالکل اسی طرح سنارہا ہوں جس طرح اس پراسرار شخص نے مجھے سنائے تھے۔

اب میں آپ کو واپس بمبئی بروڑہ ریلوے لائن پر جھانسی سے تریٹھ، چونٹھ کلو میٹر دور روہت گڑھ ہو شنگ آباد ریلوے کے ان جنگلوں میں لئے چلتا ہوں جہاں ایک گھنے جنگل میں کسی مغل صوبیدار نے اپنی جیتی کینز رانی بائی کے لئے ایک قلعہ نما محل تعمیر کرایا تھا جو رانی بائی کے قلعے کے نام سے مشہور تھا اور بقول فیروز کے جس کے متعلق طرح طرح کی ڈراؤنی کہانیاں مشہور تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس قلعے کے محل کے پائیں باغ میں رانی بائی کا قتل ہو گیا تھا اور باغ میں جس جگہ رانی بائی کی لاش ملی تھی مغل صوبیدار نے اسی جگہ اس کی مڑھی بنادی تھی۔ رانی بائی کو کس نے قتل کیا تھا؟ اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہ تین سو سال سے ایک سر بستہ

راز تھا۔

ان جنگلوں کے بارے میں یہ کہانیاں بھی مشہور تھیں کہ یہاں رات کی تاریکی میں اکثر ان لوگوں کی چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں جنہیں جنگلی درندے ہڑپ کر گئے تھے۔ قلعہ رانی بائی کے بارے میں بھی یہ بات مشہور تھی کہ تاریک اندھیری راتوں میں کبھی کبھی اس قلعے میں سے کسی عورت کی سسکیوں کی اور کبھی درد بھرے گیت گانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ قلعہ رانی بائی میں ایک ہندو طوائف کی بدروح رہتی ہے جو جنگل میں سے گزرنے والوں کو محبت بھری آوازیں دے کر اور کبھی خوبصورت عورت کے روپ میں سامنے آکر انہیں قلعے میں لے جاتی ہے اور اس کے بعد ان کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں چلے گئے۔ انہیں زمین کھاگئی یا آسمان نے اوپر اٹھالیا۔ یہ ہے رانی بائی کے قلعہ کا پس منظر جس نے مجھے اس قلعے کی بدروح کا معہ حل کرنے پر اکسایا.....

میں نے دہشت خیز کہانی جو فیروز نے اپنی آپ بیتی کہہ کر مجھے سنائی تھی اس پراسرار مہم جو شخص سے ایک نشست میں سنی یا چھ نشستوں میں..... شمالی علاقہ جات کے پہاڑی ریٹ ہاؤس میں سنی یا کسی دوسرے شہر میں کسی دوسری جگہ بیٹھ کر سنی اس سے آپ کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے اور میں اس کی تفصیل میں جانا بھی نہیں چاہتا۔ میں اس شخص کی زبانی سنی ہوئی کہانی پوری تفصیل اور پورے واقعات کے ساتھ آپ کو سنائوں گا۔ پوری کہانی سننے کے بعد یہ فیصلہ آپ خود کریں کہ کیا آج کے خلائی دور میں کسی انسان کے ساتھ ایسے ناقابل یقین واقعات بھی پیش آسکتے ہیں۔

پراسرار شخص فیروز کہہ رہا تھا.....

”یہ پاکستان بننے سے دو سال پہلے کی بات ہے جب میں نے بمبئی میں قلعہ رانی بائی کے بارے میں اس قسم کی عقل کو حیران کر دینے والی پراسرار اور آسیبی کہانیاں

سین۔ میں پنجاب سے عام طور پر سردیوں کے موسم میں بمبئی کا ایک چکر ضرور لگایا کرتا تھا۔ وہاں میرا ایک بچپن کا دوست آٹو سپئر پارٹس کا چھوٹا سا بزنس کرتا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی اور بمبئی کے ایک علاقے میں اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں اکیلا رہتا تھا۔ اسے شکار کا شوق تھا۔ شکار کا شوق مجھے بھی تھا۔ چنانچہ جب میں اس کے پاس بمبئی آتا تو ہم شکار کا پروگرام بنا کر ہفتہ دس دن کے لئے بمبئی کے قریبی جنگلوں میں شکار کھیلنے نکل جاتے تھے۔ ہم عام طور پر سانہر، چٹیل اور ہرن کا شکار کھیلنے تھے۔

اگر کسی جگہ ہمیں دیہاتیوں کی زبانی پتہ چلتا کہ وہاں کوئی شیران کے مویشی اٹھا کر لے جاتا ہے تو ہم اس شیر کو بھی ہلاک کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اگر ہمیں یہ معلوم ہو جاتا کہ شیر آدم خور بن چکا ہے تو ہم نے اس کے مقابلے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی اس لئے کہ آدمی خور شیر کو صرف ایک زیرک، چالاک اور تجربہ کار شکاری ہی ہلاک کر سکتا ہے۔ آدم خور بن جانے کے بعد شیر بڑا خطرناک بن جاتا ہے۔ اس کی چالاکی اور مکاری میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ روہت گڑھ ہو شک آباد کے جنگلوں میں اس وقت تک کئی اناڑی شکاری آدم خور شیروں کا نوالہ بن چکے تھے۔ ویسے بھی مجھے شیر کے شکار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے تو چٹیل، سانہر اور ہرنوں کے شکار سے بھی کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو بس اپنی مہم جوئی کے شوق کی تسکین کے لئے اپنے دوست کے ساتھ جنگلوں میں نکل جاتا تھا۔ جنگل بذات خود ایک بہت بڑا سر بستہ راز ہوتا ہے۔ جن جنگلوں کا میں ذکر کرتا ہوں ان کے حسن میں بھی ایک ہلاکت آمیز ہیبت ہوتی ہے۔ ان جنگلوں کو دیکھ کر میرے جیسے آدمی پر بھی ایک بار دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ جنگل کے بڑے بے ہید ہوتے ہیں۔ بہت راز ہوتے ہیں۔ ان رازوں کو پانے کے لئے انسان کو اپنی جان پر کھیلنا پڑتا ہے۔

جب میں نے قلعہ رانی بائی کے بارے میں پراسرار قسم کی عجیب و غریب کہانیاں سنیں تو میں نے اس قلعے کے رازوں کو بے نقاب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے اس فیصلے

کو میں نے اپنے بمبئی کے دوست جس کا نام جمشید تھا سے بھی پوشیدہ رکھا۔ چنانچہ بمبئی پہنچنے کے تین چار روز کے بعد میں نے جمشید سے کہا۔

”یار! اس دفعہ میرا جی چاہتا ہے کہ اکیلے ہی شکار کھیلنے جاؤں۔“

جمشید جانتا تھا کہ میں کوئی اناڑی شکاری نہیں ہوں اور جنگل کی زندگی اور درندوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس وجہ سے اس نے میرے اکیلے جانے پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ کہنے لگا۔

”اس دفعہ میں بھی کاروبار کے سلسلے میں بہت مصروف ہوں۔ ٹھیک ہے تم اکیلے ہی شکار پر چلے جانا لیکن زیادہ دور جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بمبئی کے قریبی جنگلوں میں ہی رہنا۔ نوکر عبدل کو بے شک ساتھ لے جانا۔“

میں نے کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ میں بمبئی کے قریب جو جنگل ہیں وہیں تک جاؤں گا۔ مگر نوکر عبدل کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ اس دفعہ مجھے جیپ کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“

جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”تو کیا پیدل جاؤ گے؟“

میں نے کہا۔ ”پیدل کیوں جاؤں گا۔ چپا مندر کے ریلوے اسٹیشن تک ٹرین میں جاؤں گا۔ وہاں سے آگے جنگل دو ایک میل ہی تو رہ جاتا ہے.....“

”بھائی جیسے تمہاری مرضی ہے کرو.....“ یہ کہہ کر جمشید خاموش ہو گیا۔ میں نے اس پر بالکل ظاہر نہ کیا کہ میں روہت گڑھ کے قلعہ میں رانی بائی کے آسپی رازوں کا کھوج لگانے جا رہا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے اس خطرناک اور جان لیوا مہم پر کبھی نہیں جانے دے گا۔

مجھے کوئی شکار اگرچہ نہیں کھیلنا تھا مگر اپنے دوست پر یہی ظاہر کرنا تھا کہ میں شکار کھیلنے جا رہا ہوں۔ چنانچہ مجھے مجبوراً ایک ڈبل بیرل بندوق اور میگنیزین کا تھیلا ساتھ لے جانا پڑا۔ ان دنوں بھی میں سگریٹ کی بجائے پائپ پیا کرتا تھا۔ ایرن مور تمباکو کی

تھیل، پاپ اور سگریٹ لائٹر بھی ساتھ رکھ لیا۔ ایک شکاری چاقو تو شکار پر جاتے ہوئے ہر حالت میں ساتھ رکھنا پڑتا تھا چنانچہ اسے بھی میگزین والے تھیلے میں رکھ لیا۔ تھوڑا سا خشک راشن یعنی بھنے ہوئے چنے بھی ایک تھیلے میں ڈال کر رکھ لئے۔ اتنا راشن ہم ویسے بھی شکار پر جاتے ہوئے ساتھ رکھ لیا کرتے تھے۔ جب یہ ختم ہو جاتا تو جنگل میں مرغیاں اور خرگوش وغیرہ شکار کر کے گزارہ کر لیا کرتے تھے۔ ضرورت کے مطابق کرنی نوٹ میں نے اپنی شکاری جیکٹ کی خفیہ جیب میں چھپا کر اور کچھ کھلے نوٹ اور ریزگاری جیکٹ کی عام جیبوں میں رکھ لی تھی۔ اپنے دوست جمشید سے میں نے یہی کہا کہ میں بمبئی سینٹرل سے ٹرین میں سوار ہوں گا اور چمپا مندر کے سٹیشن پر اتر کر قریبی جنگل میں نکل جاؤں گا اور دو ایک روز جنگل میں شکار کھیلنے کے بعد واپس بمبئی آ جاؤں گا۔

میں بمبئی سینٹرل کی بجائے بمبئی کے بوری بندر سٹیشن سے وایا بھوپال جھانسی جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ڈبل بیرل ہندوق اور شکار کا لائسنس میں ہمیشہ اپنے پاس بٹوے میں رکھتا تھا۔ ابھی برصغیر پر انگریز کی حکومت تھی اور اس قسم کے لائسنس کسی بھی سٹیشن پر چیک کئے جاسکتے تھے۔ میں جھانسی سے ایک سٹیشن پہلے روہت گڑھ کے سٹیشن پر اتر گیا۔ یہاں سے جنوب مشرق کی جانب تین چار کوس کے فاصلے پر ہوشنگ آباد ریج کے گھنے اور خطرناک جنگلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس جنگل میں ایک جگہ قلعہ رانی بائی کا وہ کھنڈر تھا جس کے بارے میں روئٹے کھڑے کر دینے والی کہانیاں مشہور تھیں۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ قلعہ رانی بائی کے قرب وجوار کے جنگل میں کبھی کبھی رات کے سنائے میں ان بد نصیبوں کی چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں جو جنگلی درندوں کا نوالہ بن چکے تھے۔ خود قلعہ رانی بائی کے بارے میں مشہور تھا کہ اس قلعے کے اندر سے راتوں کو کسی عورت کے سسکیاں بھرنے اور کبھی درد بھرے گیت گانے کی آوازیں آتی ہیں۔

میں مسلمان ہوں اور مسلمان کا اس قسم کے توہمات پر یقین نہیں ہوتا۔ میں بھی اسے محض ضعیف العقیدہ لوگوں کی من گھڑت کہانیاں ہی سمجھتا تھا۔ پھر بھی میں خود اس قلعے میں جا کر ان توہمات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ بس یہ میرا شوق تھا اور کوئی بات نہیں تھی۔ یہ میں نے وسطی بھارت کے جنگلوں میں گھومتے پھرتے سادھوؤں سے سن رکھا تھا کہ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق جس ہندو مرد یا عورت نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہوتا ہے اس کی روح مرنے کے بعد چڑیل یا کسی آسیب کا روپ دھار لیتی ہے اور زمین پر بھٹکتی پھرتی ہے۔ میرے دل میں یہ شوق بھی تھا کہ قلعہ رانی بائی میں اگر کوئی ایسی بدروح ہے تو چلو اس سے ملاقات ہی ہو جائے گی اور قلعے کے بارے میں جو پر اسرار کہانیاں مشہور ہیں ان کی حقیقت بھی کھل جائے گی۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں عام طور پر سردیوں کے موسم کے آخری دنوں میں بمبئی اپنے دوست جمشید کے ہاں جایا کرتا تھا۔ پنجاب اور شمالی یوپی میں ان دنوں موسم سرد ہوتا ہے مگر وسطی ہند اور خاص طور پر بمبئی کے آپ پاس کے جنگلوں میں موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ یہ بارشوں کا موسم نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھی ان جنگلوں میں اس موسم میں بھی بارشیں شروع ہو جایا کرتی ہیں۔

روہت گڑھ کے سٹیشن سے اترنے کے بعد میں ایک یکے میں بیٹھ کر اس جگہ سڑک پر اتر گیا جہاں سے ہوشنگ آباد ریج کے جنگل شروع ہو جاتے تھے۔ محکمہ جنگلات کی طرف سے یہاں جنگل میں بعض جگہوں پر چھوٹے چھوٹے پگ ڈنڈی نما راستے بنائے ہوئے تھے۔ یہ کچے راستے جنگل کے ایک حصے کو دوسرے سے الگ کرتے تھے۔ یہ راستے اس لئے بنائے جاتے تھے کہ اگر جنگل کے ایک حصے میں آگ لگ جائے تو دوسرا حصہ آگ سے محفوظ رہے۔ ان چار پانچ فٹ چوڑے راستوں کو جو ادھر ادھر سے گھومتے ہوئے جنگل کے وسط میں سے گزرتے چاروں طرف نکل جاتے تھے انہیں محکمہ جنگلات کی اصطلاح میں سانپ لائن کہتے ہیں لیکن یہ سانپ سائن جہاں

جنگل زیادہ گھنے اور دلدلی ہو جاتے تھے وہاں تک نہیں گئی ہوئی تھیں۔ میں ان جنگلوں میں اپنے دوست جمشید کے ساتھ یا اکیلا کبھی شکار کھیلنے نہیں آیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ جنگل میرے لئے اجنبی تھے اور میں ان جنگلوں کے لئے اجنبی تھا۔ لیکن چونکہ یہ برصغیر کے وسطی علاقوں کے جنگل تھے اور تقریباً یہ ایک جیسے ہی ہوتے ہیں اس لئے مجھے کوئی خاص اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ کوئی جنگل کم خطرناک ہوتا ہے اور کوئی جنگل زیادہ خطرناک اور دشوار گزار ہوتا ہے۔ دیے ان ہوشنگ آباد ریج کے جنگلوں کے بارے میں، میں نے سن رکھا تھا کہ یہاں شیر، چیتے، ریچھ اور بھیڑیے عام ہوتے ہیں اور شکاری بھی ان جنگلوں میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔

میں نے شکار تو کھیلا نہیں تھا۔ میرا مارگٹ رانی بائی کا قلعہ تھا جس کے رازوں کو میں بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ اور اگر واقعی وہاں کسی عورت کی بدروح راتوں کو سسکیاں بھرتی تھی اور درد بھرے گیت گاتی تھی تو میں اس سے ملنا چاہتا تھا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے کیا گناہ کیا تھا جس کی پاداش میں اسے یہ سزا ملی ہے۔ میں جنگل میں داخل ہو گیا تھا اور ایک سانپ لائن پر یعنی جنگل کے دو بلاکوں کے درمیان محکمہ جنگلات کی طرف سے بنائی گئی پگ ڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ بندوق میرے کندھے سے لٹک رہی تھی۔ کار تو سوں کا تھیلا میرے دوسرے کندھے پر لٹک رہا تھا۔

دن کے دس بجے کا وقت تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ دھوپ درختوں کے اوپر نکلی ہوئی تھی۔ درخت اتنے گنجان اور ساتھ ساتھ آگے ہوئے تھے کہ ان کے نیچے ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ میں گنجان جنگلوں کا عادی تھا۔ خطرہ اگر تھا تو صرف یہ تھا کہ کسی طرف سے اچانک کوئی آدم خور شیر نہ نکل آئے۔ آدم خور شیر انسان کی بوپاتے ہی اس کے پیچھے لگ جاتا ہے اور ایسی مکاری سے پیچھا کرتا ہے کہ بڑے سے بڑے شکاری کو بھی پتہ نہیں چلتا۔ پھر موقع پاتے ہی آدم خور شیر آدمی کو دبوچ کر لے جاتا ہے۔ جو شیر

آدم خور نہیں ہوتا وہ آدمی پر بھوکا بھی ہو تو حملہ کرنے سے گریز کرتا ہے۔ دوسرا خطرہ ریچھ کا ہوتا ہے۔ ریچھ بڑا بے وقوف اور بے ڈھب درندہ ہے۔ چالاک، عیاری بالکل نہیں جانتا۔ آدمی کو دیکھ کر سامنے آن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور حملہ کر کے آدمی کو سینے کے ساتھ بھینچ کر اس کی پسلیاں توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ آدمی اگر بھاگ جائے تو اس کا پیچھا شروع کر دیتا ہے اور بڑی مشکل سے جان چھوڑتا ہے۔

چلتے چلتے میں ایک ڈھلان اترنے لگا۔ ڈھلان جہاں جا کر ختم ہوتی تھی وہاں جھاڑیاں تھیں اور چھوٹا سا نالہ بہہ رہا تھا۔ میں نالہ عبور کرنے لگا تو اچانک جھاڑیوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں وہیں رک گیا۔ مجھے شیر کی مخصوص بو آگئی تھی۔

میں آہستہ آہستہ ایک ایک قدم کر کے پیچھے ہٹا گیا۔ اتنے میں ایک شیرنی نے جھاڑیوں میں سے نکل کر اپنا بھاری سراٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں بالکل ساکت کھڑا رہا۔ شیر کے مقابلے میں شیرنی بہت متلون مزاج ہوتی ہے، اس کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب آدمی پر حملہ کر دے۔ خاص طور پر جب وہ پورے دنوں سے ہوتی ہے تو سخت چڑچڑی ہو جاتی ہے اور ذرا سی مداخلت پر غضبناک ہو جاتی ہے۔ لیکن میں نے دیکھ ہی لیا تھا کہ یہ شیرنی پورے دنوں سے نہیں تھی۔ چند سیکنڈ تک وہ میری طرف اپنی چمکیلی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ میں بھی اسے خاموشی سے ساکت کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر اس نے منہ کھول کر جھانکی اور نالے میں سے گزر کر جنگل کے درختوں کی طرف چلی گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اگر وہ مجھ پر حملہ کر دیتی تو میری دونوں بندوق کا فائر اس کو ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔

میں بھی نالہ پار کر کے دوسری طرف نکل گیا۔ میری معلومات کے مطابق رانی بائی کا قلعہ نالے کی دوسری جانب جنگل کے تیسرے بلاک میں ایک تالاب کے عقب میں وہاں سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ شہر کی سڑک پر تو آدمی دو فرلانگ کا فاصلہ پیدل چل کر بھی بڑی جلدی طے کر لیتا ہے مگر جنگل میں اور خاص

طور پر گھنے جنگل میں کوئی سڑک تو ہوتی نہیں۔ آدمی کو بڑی عقل مند سے کام لیتے ہوئے سمت کو درست رکھتے ہوئے خود راستہ بنانا پڑتا ہے اور دو فرلانگ کافی وقت لے جاتے ہیں۔

اگر مجھے جنگلوں میں گھومنے پھرنے کا تجربہ نہ ہوتا تو میرے لئے رانی بانی کے قلعے تک پہنچنا ممکن تھا۔ بھری ہوئی ڈبل پیرل گن میں نے اپنے سیدھے ہاتھ میں اٹھا رکھی تھی تاکہ کسی بھی خطرے کا ہر وقت مقابلہ کر سکوں۔ میں جھاڑیوں اور درختوں کی لٹکتی ہوئی شاخوں میں راستہ بناتا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ کئی درختوں کی جڑیں زمین سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ کہیں کوئی درخت جڑ سے اکھڑ کر گر پڑا تھا۔ آخر گھنے درختوں کا دشوار گزار راستہ ختم ہو گیا اور سامنے تھوڑی سی کھلی جگہ آگئی۔ اس کھلی جگہ پر بھی اونچی اونچی قد آدم گھاس اگی ہوئی تھی۔ اس گھاس کو ہاتھی چھپواں گھاس کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اس میں سے گزرتے ہوئے ہاتھی بھی چھپ جاتا ہے۔ جنگلی جانوروں نے اس گھاس میں چھوٹا سا راستہ بنا دیا ہوا تھا۔ میں اس راستے پر پھونک پھونک کر قدم بڑھاتا اس گھاس کے قطعے سے بھی باہر نکل آیا۔

آگے پھر جنگل تھا۔ مگر درخت الگ الگ کھڑے تھے۔ ایک کھائی آگئی۔ میں اس میں سے اتر گیا۔ کھائی کی دوسری جانب باہر نکلا تو سامنے ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا جس کی ڈھلان جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھی تھی۔ میں ٹیلے کے پہلو سے ہوتا ہوا دوسری جانب آیا تو سامنے بانس کے درختوں کے جھنڈ کے درمیان ایک چھوٹا سا تالاب اور اس کے پیچھے ایک دیو ہیکل قلعے کی سیاہی مائل بھوری دیوار دکھائی دی۔ یہی رانی بانی کا وہ پر اسرار قلعہ تھا جس کی مجھے تلاش تھی اور جس کے بارے میں روگئے کھڑے کر دینے والی کہانیاں مشہور تھیں۔ میں تالاب کے پاس آگیا۔ تالاب زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کے تین طرف بانس کے درختوں کے جھنڈ تھے ایک جانب یعنی جس جانب میں کھڑا تھا دیوار کے درختوں کے نیچے سے ہوتی ہوئی ایک پگڈنڈی آگے کو نکل گئی تھی۔

اس پگڈنڈی پر سے ایک راستہ جھاڑیوں کے درمیان سے ہوتا رانی بانی کے قلعے کی طرف جاتا تھا۔

میں اس راستے پر چلتے ہوئے قلعے کی دیوار کے سامنے آکر رک گیا۔ قلعے کی دیوار کے پتھر کئی جگہوں سے اکھڑ چکے تھے اور وہاں جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ یہ بوسیدہ کھنڈر نما دیوار کافی بلند تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا قلعے کے دروازے کے سامنے آگیا۔ اس محرابی دروازے کے دونوں پٹ غائب تھے۔ دروازہ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ اس کی دونوں جانب گول چبوترے تھے۔ ان چبوتروں کی شکستہ دیواریں بھی آدھی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ اندر ایک ڈیوڑھی تھی جہاں دھندلا دھندلا سا اندھیرا تھا۔ میں ڈیوڑھی میں آگیا۔ ڈیوڑھی کے فرش کی بڑی بڑی سلیں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔

میں نے دیکھا کہ ڈیوڑھی کے کونے میں ایک زینہ تھا جو اوپر کو جاتا تھا۔ میں زینے کی چار پانچ سیڑھیاں چڑھا تو آگے دیوار آگئی۔ خدا جانے یہ دیوار وہاں کس لئے بنائی گئی تھی۔ میں نیچے اتر آیا اور ڈیوڑھی پار کر کے قلعے کے صحن میں آگیا۔ صحن چھوٹا سا تھا۔ اس کے وسط میں گول دائرے میں پتھر کا نوارہ تھا۔ نوارہ تو ٹوٹ پھوٹ گیا تھا صرف اس کی گول دیوار ہی باقی رہ گئی تھی۔ نوارے کے اندر گھاس اگ رہی تھی۔ نوارے کی دوسری جانب پھر ایک چھتی ہوئی سرنگ نما ڈیوڑھی تھی۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس سرنگ نما ڈیوڑھی سے بھی گزر گیا۔ اب میں رانی بانی کے قلعے کے درمیانی حصے میں تھا۔ یہاں تین جانب راہ داریاں تھیں۔ ان کے سنگ مرمر کے پتلے پتلے ستون تھے۔ راہ داریوں کے اوپر محل کے جھروکے تھے جن کی بارہ دریوں کے ساتھ جنگلی بلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ یہ یقینی طور پر رانی بانی کا وہ محل تھا جو اس کے عاشق یا خاندان مغل صوبیدار نے اس کے لئے خاص طور پر بنوایا تھا۔ میں خاموش کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

جس چیز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا وہ صحن میں ایک طرف گول چبوترے پر بنی ہوئی چھوٹی سی بارہ دری تھی۔ میں بارہ دری کے پاس آگیا۔ بارہ دری کے اندر ایک مخروطی برجی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ رانی بانی کی وہ مڑھی ہے جہاں رانی بانی کے قتل ہونے کے بعد اس کی لاش کو جلا کر اس کی ہڈیاں یعنی پھول دفن کئے گئے تھے۔ چبوترے کا فرش بھی ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور کہیں کہیں گھاس اگی ہوئی تھی۔ مڑھی کی برجی کارنگ بھی بارشوں اور دھوپ کی وجہ سے سیاہ پڑ چکا تھا۔

میں مڑھی کے چبوترے سے اتر کر راہداری میں پھرنے لگا۔ ایک جگہ سے زینہ اوپر محل کے چوبارے کو جاتا تھا۔ میں زینہ طے کر کے اوپر آگیا۔ ایک نیم تاریک چھوٹا سا خالی کمرہ تھا جس کی سیاہ دیواریں گویا آگے کو جھکی ہوئی تھیں۔ ایک عجیب قسم کی ٹھنڈی آبی خاموشی طاری تھی۔ میں چھوٹے سے دروازے میں سے گزر کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ یہ مستطیل کمرہ تھا اور اس کے جنگل کی جانب تین جھروکے تھے۔ ایک جھروکے میں سے چھوٹی سے گیلری باہر کو نکلی ہوئی تھی مگر گیلری کا فرش غائب تھا اور نیچے گہرائی میں زمین نظر آرہی تھی۔ میں اس لمبے کمرے میں سے بھی گزر گیا۔ کمرے کے آخر میں پتھر کی تین سیڑھیاں چڑھ کر میں ایک اور گیلری میں آگیا۔

یہ گیلری ایک بڑے سے ہال کے پکڑے کی دیوار کے ساتھ نصف دائرے کی شکل میں بنی ہوئی تھی۔ گیلری کا جھکا جانی دار پتھروں کا تھا اور فرش سے دو ڈھائی فٹ اونچا تھا۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا نیچے گول ہال کمرہ تھا جس کے وسط میں ایک گول چبوترہ تھا۔ اس چبوترے پر سنگ سرخ کا ایک تخت بنا ہوا تھا۔ تخت خالی تھا۔ ہال کمرے کی ایک جانب دیوار میں ایک چھوٹا محراب دار دروازہ تھا جس کے اندر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں ایک مسلمان سیاح کی حیثیت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میرے ذہن پر خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ مجھے اس تین سو سال پرانے قلعے میں ابھی تک

عقل کو حیران کر دینے والی یادوں کے کھڑے کر دینے والی کوئی شے نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے ان لوگوں پر ہنسی آرہی تھی جنہوں نے اس قلعے کے بارے میں عجیب و غریب ایسی کہانیاں گھڑ رکھی تھیں۔

ہندوؤں کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہے وہ ایک دیو مالا ہے۔ ان کے ہاں کوئی آسمانی کتاب نہیں ہے۔ وید ہیں جو رشیوں مینوں نے لکھے ہیں۔ یہ رشی منی بڑے جتنی ستی اور دانالوگ تھے مگر ویدوں میں انہوں نے بھی ہر قسم کے توہمات کو بھر دیا ہے۔ دیوتاؤں کا ذکر ہے جو زمین پر آکر غیر عورتوں سے رومانس لڑاتے ہیں اور پھر انہیں اغوا کر کے آکاش میں لے جاتے ہیں جہاں ان دیوتاؤں کے مسکن ہیں۔ رامائن میں رام چندر کے بن باس اور راون کے ہاتھوں سیتا جی کے اغوا کی داستان ہے۔ سب سے پہلے رامائن دالمیک جی نے سنسکرت میں لکھی تھی بعد میں درویش شاعر تلسی داس نے اسے اس زمانے کی برج بھاشا یعنی عام فہم ہندی زبان میں دوبارہ لکھا۔ یہ دوسری رامائن ہندوؤں میں آج بھی بڑی مقبول ہے۔ تیسری کتاب گیتا ہے۔ گیتا میں پچیس صفحوں کے حجم کی ایک چھوٹی سی تقریر ہے جو ہندوؤں کے اوتار کرشن جی نے مہابھارت کے میدان جنگ میں اپنے ساتھ ارجن کے آگے اس وقت کی تھی جب اس نے یہ کہہ کر دشمن پر تیر چلانے سے انکار کر دیا تھا کہ دشمنوں کی صفوں میں اس کے سارے رشتے دار موجود ہیں اور وہ اپنے عزیزوں پر تیر نہیں چلا سکتا۔ اس کے جواب میں ہری کرشن نے ارجن کے آگے جو تقریر کر کے اسے لڑائی پر آمادہ کیا تھا وہ تقریر گیتا ہے۔ اس کے علاوہ پران ہیں، اپنشد ہیں جو دیدوں کی شرحیں یا تشریحیں ہیں۔ سینکڑوں دیوی دیوتا ہیں۔ یہ دیوی دیوتا انسانوں کی طرح ایک دوسرے سے حسد بھی کرتے ہیں، نفرت بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو گزند پہنچانے اور ہلاک کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ہر دیوی دیوتا کی اپنی دیو مالا ہے اور اپنا الگ فرقہ ہے ایسے ہزاروں، سینکڑوں فرقے ہیں۔ غرض ہندی دیو مالا ایک

عجیب گورکھ دھندا ہے جو خود بڑے بڑے پڑھے لکھے ہندوؤں کی بھی سمجھ میں نہیں آتا۔

پھر آواگون ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ہر ہندو مرد اور عورت اپنے اعمال کے مطابق مرنے کے بعد دوبارہ جنم لیتا ہے۔ وہ کسی درندے، کسی جانور، کسی کیڑے مکوڑے، پھل، سبزی، گھاس کی پتی اور پتھر کی شکل میں بھی دوسرا جنم لے سکتا ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ہر ہندو کو ایک لاکھ چوراسی ہزار بار اس دنیا میں جنم لینا پڑتا ہے۔
ہے ناگورکھ دھندا!.....!

O

مجھے چونکہ اس قلعے میں کم از کم ایک رات ضرور گزارنی تھی۔ اس لئے میں کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا کہ جہاں بیٹھ کر رات گزار سکوں۔ میں گیلری والے ہال کمرے سے نکل کر اس کے ساتھ والے چھوٹے کمرے میں آگیا۔ یہاں جنگل والے تالاب کے رخ پر ایک چھوٹا سا جھروکا بنا ہوا تھا جس میں سے تازہ ہوا بھی اندر آرہی تھی۔ میں وہیں جھروکے کے پاس بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھے رہنے کے سوائے میرا اور کوئی کام نہیں تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ جو لوگوں نے مشہور کر دیا ہے کہ رانی بائی کا قلعہ آسیب زدہ ہے اور آدھی آدھی راتوں کو اس قلعے میں سے کسی عورت کے دردناک گیت اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں آتی ہیں اس کی کیا حقیقت ہے۔ میں کسی اخبار یا کسی رسالے کی طرف سے یہ تحقیقات کرنے نہیں گیا تھا۔ یہ محض میرا زوق تجسس تھا۔

مجھے بچپن ہی سے جن بھوتوں اور چڑیلوں وغیرہ کو دیکھنے کا شوق تھا۔ میں اپنے شہر کے قبرستانوں میں اکثر جایا کرتا تھا کہ شاید وہاں کسی روح سے ملاقات ہو جائے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ میری کبھی کسی روح، کسی چڑیل یا جن بھوت سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

کچھ دیر میں رانی بائی کے قلعے سے باہر آکر تالاب کے کنارے ادھر ادھر پھرتا رہا۔ میں نے دوہرن دیکھے جو تالاب پر آکر پانی پی رہے تھے۔ جیسے ہی انہیں میری موجودگی کا احساس ہوا وہ ڈر کر جنگل میں بھاگ گئے۔ جب سورج مغرب کی جانب

ڈھلنے لگا اور جنگل میں شام کا دھند لکھ چھانا پیش روغ ہو گیا تو میں قلعے میں آکر جھروکے کے پاس بیٹھ گیا۔ بھری ہوئی بندوق میں نے اپنے پاس ہی رکھی ہوئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو وہیں تھیلے کا سرہانہ بنا کر لیٹ گیا۔ مجھے نیند آگئی۔

معلوم نہیں کتنی دیر سویا رہا ہوں گا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں نے کوئی آواز سنی تھی لیکن یہ نیند کی حالت میں سنی ہوئی کوئی آواز بھی ہو سکتی تھی۔ میرے چاروں جانب اندھیرا تھا۔ جھروکے میں سے رات کی پھیکی پھیکی روشنی اندر آرہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور کان لگا کر سننے لگا کہ وہ آواز کیا تھی مگر وہاں سوائے جنگل کے سناٹے اور تالاب کے کنارے بولتے ایک دو جھینگروں کی آوازوں کے اور کوئی آواز نہیں تھی۔ میں نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی اور آنکھیں بند کر کے دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے آنکھیں بند کئے بمشکل ایک ڈیڑھ منٹ ہی گزرا ہو گا کہ مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کسی نے آہ بھرنے کے انداز میں گہرا سانس لیا ہو۔ میں نے دیوار کے ساتھ بیٹھے بیٹھے آنکھیں کھول دیں اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ میں نے جیب سے لائٹر نکال کر جلایا۔ لائٹر کی روشنی نے اس چھوٹے سے پرانے کمرے کی تاریکی کو تھوڑی دیر کے لئے روشن کر دیا۔

کمرہ بالکل خالی تھا۔ میں نے لائٹر بجھا کر جیب میں ڈالا تو مجھے ایک بڑی پر اسرار سی خوشبو کا احساس ہوا۔ اس قسم کی خوشبو میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ شاید وہ خواب میں دیکھے ہوئے باغ کی خوشبو تھی اس کے ساتھ ہی کسی کے لباس کی سرسراہٹ سنائی دی۔ ایسے لگا جیسے کوئی ریشمی لباس والی عورت میرے قریب سے گزر گئی ہو۔ میں نے جلدی سے دوبارہ لائٹر جلایا۔ کمرہ خالی تھا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ لیکن میں نے اپنے ہوش و حواس کے ساتھ کسی عورت کے آہ بھرنے اور اس کے ریشمی ملبوس کی خوشبو محسوس کی تھی۔

اس کے بعد ایک بار پھر وہی پر اسرار سناٹا چھا گیا۔ اب میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ اچانک جنگل میں سے انسانی چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ یقین کریں میں جو اپنی طرف سے بڑا حقیقت پرست اور بہادر بننا تھا ایک بار میں بھی خوف سے لرز گیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی درندے نے اچانک کسی انسان کو دبوچ لیا ہو اور اسے پھاڑ رہا ہو۔ دوسرے لمبے چیخوں کی آواز بند ہو گئی اور جنگل کی خاموشی اور زیادہ گہری اور دہشت ناک ہو گئی۔ مجھے یاد آ گیا۔ اس قلعے کے بارے میں یہ بات بھی مشہور تھی کہ قلعے کے آس پاس جنگل میں سے رات کے وقت ان بدنصیب انسانوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں جنہیں جنگلی درندوں نے ہڑپ کیا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ کم از کم یہ روایت ضرور سچی تھی۔

میری نیند غائب ہو چکی تھی۔ میں قلعے کے چھوٹے سے ویران کمرے کے جھروکے کے پاس کان لگائے اس انتظار میں بیٹھا تھا کہ دیکھیں اب کون سی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں نے لائٹر جلا کر اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے پونے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے گردن اونچی کر کے پتھر کے جھروکے میں سے باہر دیکھا جنگل ایسے ساکت اور خاموش تھا جیسے کسی نے اس پر جادو پھونک دیا ہو۔ میں نے جنگل کی کئی راتیں دیکھی تھیں۔ جنگل کتنا ہی خاموش کیوں نہ ہو اس کی خاموشی میں بھی کوئی نہ کوئی آواز ضرور سنائی دے جاتی ہے۔ کسی درخت کی سوکھی شاخ کے اپنے آپ اچانک گرنے کی آواز، کسی بھٹکے ہوئے پرندے کی آواز جو راستہ بھول کر ادھر آ نکلا ہو یا پھر دور کسی بھیڑیے یا لکڑ بگڑ کے بولنے کی آواز..... اور کچھ نہیں تو کہیں نہ کہیں کوئی جھینگر ضرور بول رہا ہوتا ہے۔

لیکن اس جنگل میں تو موت کی خاموشی چھا گئی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے جنگل کی ہر چیز بے جان ہو گئی ہے یا پھر کسی نے جنگل کی ہر شے پر خاموشی کا طلسم پھونک دیا ہے۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس بے جان خاموشی کا اثر مجھ پر بھی ہونے لگا تھا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میرے دل نے بھی دھڑکنا بند کر دیا ہے اور میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ سینے پر رکھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا مگر اس کی دھڑکن بڑی مشکل سے محسوس ہو رہی تھی۔

اتنے میں مجھے کسی عورت کے سسکیاں بھرنے کی آواز سنائی دی۔

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ پراسرار آہنی آواز سن کر کچھ دیر کے لئے میرے جسم کے رونگٹے بھی کھڑے ہو گئے تھے لیکن اپنے حقیقت پسند مزاج کی وجہ سے میں نے بڑی جلدی اپنے حواس پر قابو پایا اور سسکیوں کی آواز کو بڑے غور سے سننے لگا۔ سسکیوں کی آواز کسی غم زدہ عورت کی تھی جو کبھی تو مجھے اپنے بالکل قریب محسوس ہوتی اور کبھی دور چلی جاتی۔ چند لمحوں کے بعد سسکیوں کی آواز بند ہو گئی اور ایک بار پھر خاموشی چھا گئی.....

مگر یہ خاموشی زیادہ دیر تک نہ رہی۔ پھر ایسی آواز آنے لگی جیسے کوئی غم نصیب عورت روتے ہوئے کوئی دردناک گیت گارہی ہو۔ یہ روایت بھی میں نے سن رکھی تھی کہ اس قلعے میں سے آدھی رات کو پہلے کسی عورت کے سسکیاں بھرنے اور پھر روتے ہوئے درد بھرے گیت گانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں کان لگا کر غور سے سننے لگا۔ عورت کی آواز ایسی تھی جیسے بین کرتے ہوئے ساتھ ساتھ گیت کے بول دہرا رہی ہو۔ گیت کے بول میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہے تھے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح سے معلوم کر سکوں کہ وہ کس زبان کا گیت گارہی ہے مگر کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ عورت کے بین ایسے تھے کہ ان میں خوف بھی تھا اور دہشت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ پھر ایک دم یہ آواز بھی غائب ہو گئی۔

رانی بائی کے قلعے کے بارے میں، میں نے جو روایتیں سنی تھیں وہ سچی ثابت ہو چکی تھیں۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کی حقیقت کیا ہے اور یہ عورت کون

ہے جو پہلے سسکیاں بھرتی رہی تھی اور پھر درد بھرنے گیت گاتے ہوئے رو رہی تھی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اندازہ لگالیا تھا کہ یہ آوازیں قلعے کی اس جانب سے آرہی ہیں جس طرف قلعے کا بڑا کمرہ تھا جس کی دیوار کے ساتھ نصف دائرے میں سنگ سرخ کی پرانی گیلری بنی ہوئی تھی۔

میں نے بندوق سنبھالی اور اٹھ کر دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل کر گیلری والے کمرے کی طرف بڑھا۔ اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے جیب سے لائٹر نکال کر جلا لیا۔ لائٹر کی روشنی میں، میں نے پتھر کے زینے کی تین سیڑھیاں چڑھیں اور اوپر گیلری میں آ گیا۔ وہاں آتے ہی میں نے لائٹر بجھا دیا اور وہیں بیٹھ گیا اور گیلری کے جنگلے کی جالیوں میں سے نیچے ہال کمرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہال کمرے کے وسط میں چبوترہ اسی طرح خالی خالی تھا۔ چبوترے کے اوپر بنا ہوا پتھر کا تخت بھی خالی اور دیران پڑا تھا۔ فضا میں ایک سنناہٹ سی لرز رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے یہاں کچھ ہونے والا ہے۔ میں پتھر کی جالی کے ساتھ لگ کر چپ چاپ اور دم بخود سا ہو کر بیٹھا نیچے دیکھ رہا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہال کمرے کی دیواروں پر اندھیرا تھا مگر کمرے کے درمیان میں خدا جانے کہاں سے دھندلی دھندلی روشنی آ رہی تھی۔ یہ روشنی دھند کی طرح صرف چبوترے اور اس کے اوپر والے خالی تخت تک ہی محدود تھی۔

جنگل کی طرف تو پہلے ہی سناٹا طاری تھا۔ سنناہٹ کی لرزتی ہوئی آواز ایسی تھی جیسے یہ کسی آواز کی صدائے بازگشت ہو اور آہستہ آہستہ مدھم پڑ رہی ہو۔ پھر یہ آواز بھی گم ہو گئی۔ میں نے اپنی شکاری اور جہاں گردی کی زندگی میں کئی راتیں جنگلوں، صحراؤں اور بیابانوں میں کاٹی ہیں مگر ایسی خاموشی میں نے کسی جگہ محسوس نہیں کی تھی۔ یہ خاموشی کی خاموشی تھی۔ موت کا سکوت بھی اس خاموشی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ مجھے اپنا وجود اس خاموشی میں پتھر کے بجسے میں تبدیل ہوتا

محسوس ہونے لگا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ میں پتھر کا مجسمہ نہیں بنا تھا۔ میں اس ازلی اور ابدی اور بہت حد تک آسیب زدہ سکوت کا حصہ بھی تھا اور اس کا تماشا بھی تھا۔

یہ دہشت ناک سکوت زیادہ دیر تک قائم نہ رہا اور اچانک مجھے کسی عورت کے بین کرنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ آواز ایسے لگ رہا تھا جیسے قلعے کے کسی دوسرے حصے سے آرہی تھی لیکن اس آواز سے موت کی خاموشی کا ظلم ٹوٹ گیا تھا۔ عورت کے آہستہ آہستہ بین کرنے اور رونے کی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اس آواز کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی آواز تھی جسے میں جبر و کے والے کمرے میں بیٹھا پہلے بھی سن چکا تھا۔ یہ اسی بد نصیب عورت کی آواز تھی۔

مجھے یہ سوال پریشان کر رہا تھا کہ یہ کس عورت کی آواز ہے۔ یہ کون بد نصیب عورت ہے جو آدھی رات کے وقت اس ویران قلعے میں آکر رو رہی ہے۔ میں اس عورت کو اپنی زندگی کی کوئی زندہ ہستی سمجھ رہا تھا۔

لیکن بہت جلد یہ معمہ حل ہو گیا۔ لیکن معمہ اس طرح حل ہوا کہ حل ہونے کے بعد اس نے ایک ایسے معمے کی شکل اختیار کر لی جس کا حل شاید کسی کو معلوم نہیں تھا۔

عورت کے رونے اور بین کرنے کی آواز جیسے جیسے قریب ہوتی جا رہی تھی میرے اشتیاق میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور مجھ پر ایک بیجانی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی کہ یہ عورت کون ہے اور کس طرف سے اس کمرے میں آرہی ہے۔ دیواروں پر جیسے اندھیرے کے سیاہ گہرے سائے پڑے ہوئے تھے۔ پھر ایک ایسی بات ہوئی جس نے میرے بدن میں خوف کی سرد لہر دوڑادی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے والی دیوار کا اندھیرا ایک جگہ سے غائب ہو گیا اور دیوار میں ایک غار نظر آنے لگا۔ پھر اس غار میں سے ایک سیاہ غلام آدمی نمودار ہوا جس نے دونوں ہاتھوں سے تلوار تھام رکھی تھی اور

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا غار میں سے نکل رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو اور حبشی غلام نمودار ہوئے جنہوں نے ایک جوان عورت کو زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا اور اسے آہستہ آہستہ کھینچتے ہوئے لارہے تھے۔

عورت نے گلابی رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ بال گھنے تھے۔ سر پر سفید ہیروں سے جڑا ہوا چھوٹا سا تاج تھا۔ عورت بڑی خوبصورت تھی۔ اس کے نقشہ تنکھے تھے اور گلے میں بھی موتیوں کا ہار تھا۔ عورت سر کو دائیں بائیں کرب کے ساتھ ہلاتی دھیمی آواز میں بین کرتے ہوئے رو رہی تھی۔ اس کے پیچھے دو اور سیاہ غلام حبشی غلام نمودار ہوئے جنہوں نے ایک زرنگار کرسی کو اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ کرسی پر ایک منڈھے ہوئے سردالا آدمی گردن اٹھائے بیٹھا تھا۔ اس آدمی کا رنگ گندمی تھا، آنکھوں میں طلسمی چمک تھی۔ جسم کو ایک زرد چادر میں لپیٹ رکھا تھا اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کی چھڑی تھی۔ وہ اس شان سے کرسی پر بیٹھا تھا جیسے اس قلعے کا مالک ہو۔

یہ جلوس کمرے کے وسط میں چبوترے کے پاس آکر رک گیا۔ منڈھے ہوئے سردالے آدمی کی کرسی حبشی غلاموں نے چبوترے کے سامنے آہستہ سے رکھ دی۔ دونوں غلام بڑے ادب سے کرسی کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ جن دو حبشی غلاموں نے عورت کو پکڑ رکھا تھا وہ عورت کو کھینچتے ہوئے چبوترے پر لے گئے اور اسے تخت پر لٹا دیا۔ عورت نے کوئی مزاحمت نہ کی وہ ایسے لیٹ گئی جیسے پہلے سے تیار ہو۔ دونوں غلام پیچھے ہٹ گئے۔ اب وہ غلام آگے بڑھا جس نے ہاتھوں میں تلوار اٹھا رکھی تھی۔ وہ عورت کے پہلو کی جانب تخت کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ عورت اب بین نہیں کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے بار بار یہی الفاظ نکل رہے تھے۔

”مجھے جانے دو۔۔۔۔۔ مجھے جانے دو۔“

تلوار بردار حبشی غلام نے گردن آہستہ سے موڑ کر کرسی پر بیٹھے آدمی کی طرف

دیکھا۔ کرسی پر بیٹھے زرد پوش آدمی نے آہستہ سے اپنی چھری اوپر اٹھادی۔ اس کے ساتھ ہی حبشی غلام نے تلوار کے دسے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اوپر اٹھایا اور پھر تلوار پوری قوت سے تخت پر لیٹی ہوئی عورت کے سینے میں گھونپ دی۔

عورت کے حلق سے ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی اور ساتھ ہی اس کے سینے سے خون کا فوارہ اچھل پڑا۔ خون کے چھینٹے حبشی غلام کے جسم پر پڑنے لگے۔ حبشی غلام نے تلوار عورت کے سینے سے نکالی اور تلوار کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر دو قدم پیچھے ہٹ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ پھر کرسی پر بیٹھا ہوا زرد پوش آدمی اٹھا اور بڑے وقار سے قدم اٹھاتا چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ کر تخت کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ تخت پر عورت کی لاش خون میں لت پت بے حس و حرکت پڑی تھی۔ زرد پوش آدمی نے ہاتھ اٹھا کر ایسے اشارہ کیا جیسے کوئی چیز طلب کر رہا ہو۔ اس کے ہاتھ کا اشارہ پا کر کرسی کی دونوں جانب کھڑے حبشی غلام دوڑ کر چبوترے کے پاس آئے پھر انہوں نے چبوترے کی دیوار میں سے پتھر کی سل کو پیچھے ہٹایا اندر سے ایک سیاہ مرتبان نکالا جس کا منہ ڈھکن سے بند تھا۔ غلاموں نے سیاہ مرتبان زرد پوش کے سامنے تخت پر عورت کی لاش کے پاس رکھ دیا اور خاموشی سے پچھلے پاؤں چبوترے سے اتر گئے۔

میں یہ منظر خوف زدہ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ میں خواب میں دیکھ رہا ہوں یا یہ عالم بیداری ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں دہشت زدہ ضرور تھا اور پتھر کی جالی سے لگا پتھر بن کر یہ خونی کھیل دیکھ رہا تھا۔

زرد پوش آدمی نے سیاہ مرتبان کا ڈھکن الگ کر دیا اور عجیب سے منتر پڑھنے شروع کر دیئے۔ منتر پڑھتے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ عورت کی لاش پر مرتبان میں سے کوئی راکھ سی نکال کر چھڑک دیتا تھا۔ آہستہ آہستہ عورت کی لاش میں سے دھوئیں کی سیاہ لہریں اٹھنا شروع ہو گئیں۔ یہ دھواں عورت کی لاش سے الگ ہو کر لہروں کی شکل میں اس کے اوپر گول دائرے میں چکر لگانے لگا تھا۔ جیسے جیسے

دھوئیں کی لہریں گہری سیاہ ہو رہی تھیں عورت کی لاش غائب ہونے لگی تھی۔ پھر عورت کی لاش غائب ہو گئی اور اس کی جگہ تخت کے اوپر سیاہ دھوئیں کا ایک گولہ سا چکر لگا رہا تھا۔

زرد پوش آدمی نے منتر پڑھتے پڑھتے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا، دھوئیں کا گولہ گھومتے گھومتے چھوٹا ہوتا چلا گیا۔ پھر اس دھوئیں نے ایک عورت کے جسم کی شکل اختیار کر لی۔ جیسے ہی دھواں عورت کے جسم میں تبدیل ہوا زرد پوش آدمی نے دھوئیں کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا۔ دھواں عورت کے چھوٹے سے جسم کی شکل میں زرد پوش آدمی کی مٹھی میں بند تھا۔ وہ منتر اسی طرح پڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی آواز پہلے سے بلند ہو گئی تھی۔ پھر زرد پوش آدمی نے منتروں کا جاپ کرتے ہوئے اپنی وہ مٹھی مرتبان کے اندر ڈال دی جس میں عورت کی لاش کا دھواں مجسم روپ میں تھا۔ کچھ دیر اپنی مٹھی مرتبان کے اندر ڈالے رکھنے کے بعد زرد پوش آدمی نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ مرتبان سے باہر نکال کر مرتبان کا منہ ڈھکن سے بند کر کے ڈھکن کو اچھی طرح سے کس دیا اور دونوں بازو پھیلا کر چھت کی طرف دیکھ کر حلق سے ایک چیخ کی آواز نکالی اور مرتبان کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر آہستہ آہستہ چبوترے کی سیڑھیاں اتر کر اس جگہ آ گیا جہاں چبوترے کی دیوار میں سے سل کو ہٹا کر مرتبان باہر نکالا گیا تھا۔

زرد پوش آدمی کے اشارے سے دو حبشی غلام آگے بڑھے۔ انہوں نے زرد پوش کے ہاتھوں سے سیاہ مرتبان اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور پھر مرتبان کو چبوترے کے شکاف کے اندر رکھ کر پتھر کی سل سے چبوترے کی دیوار کے شکاف کو بند کر دیا۔ زرد پوش آدمی واپس مڑا اور قدم قدم چل کر اپنی زرنگار کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں غلاموں نے کرسی کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ جس حبشی غلام نے عورت کے سینے میں تلوار گھونپی تھی وہ خون آلود تلوار دونوں ہاتھوں میں تھام کر اسے اوپر

اٹھائے کرسی کے آگے آگے چلنے لگا۔ باقی دونوں غلام پیچھے ہو گئے اور سر جھکائے کرسی کے پیچھے پیچھے ادب سے چلنے لگے۔

یہ عجیب و غریب جلوس اس دیوار کی طرف بڑھ رہا تھا جس کے شکاف میں سے یہ نکلا تھا۔ دیوار ساری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صرف جہاں غار نما شکاف تھا وہاں ہلکی ہلکی پراسرار سی روشنی تھی۔ زرد پوش آدمی اپنے غلاموں کے ساتھ دیوار کے غار نما شکاف میں داخل ہوتے ہی میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہال کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ چوترے اور تخت پر پہلے جو دھندلی دھندلی روشنی دکھائی دے رہی تھی وہ بھی اب غائب ہو چکی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک خونی ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔ میں حیران بلکہ حیرت زدہ وہیں کا وہیں بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے کیا وہ حقیقت تھی یا محض میرا وہم تھا۔ کیا یہ سب کچھ حقیقی دنیا میں ہوا تھا یا سب کچھ عالم ماورائے قیام میں ہوا تھا۔ اگرچہ یہ ساری باتیں، سارے خونی منظر جو میں نے دیکھے تھے میری آنکھوں کے سامنے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تخت پر پڑی عورت کی لاش کیسے غائب ہو کر دھواں بن گئی تھی۔

میرے ذوق تجسس نے کہا کہ چوترے کی دیوار کی سل ہٹا کر سیاہ مرتبان نکال کر اسے کھول کر دیکھوں کہ اس کے اندر سچ جچ دھواں ابھی تک عورت کے جسم کی شکل میں ہی ہے کہ نہیں؟ حالانکہ مجھے اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا بلکہ الٹا نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا لیکن میرے ارادوں پر میرا شوق اور ذوق تجسس غالب تھا۔ میں یہ راز معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مرتبان کے اندر اور کیا کیا ہے؟

اگر اس وقت مجھے معلوم ہو جاتا کہ اس مرتبان کے کھولنے سے مجھ پر کیسی کیسی بھیاںک مصیبتیں نازل ہو جائیں گی تو میں اس کا لے مرتبان کو ہاتھ بھی نہ لگاتا۔

لیکن کہتے ہیں کہ تقدیر میں جو لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ چنانچہ میرے

ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جب میں نے تسلی کر لی کہ پراسرار ہال کمرے میں اب کوئی بدروح نہیں رہی تو میں گیلری کا تاریک زینہ اتر کر چوترے کے پاس گیا۔ اندھیرے میں مجھے تھوڑا تھوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے تخت کو غور سے دیکھا وہاں کسی جگہ پر خون کے نشان نہیں تھے۔ میں چوترے کی دیوار کے پاس اس جگہ بیٹھ گیا جہاں سیاہ فام حبشی غلاموں نے سیاہ مرتبان چھپایا تھا۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا کہ ایک جگہ سے پتھر کی سل ذرا سی اکھڑی ہوئی تھی۔

میں نے سل کو دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر پیچھے کھسکا لیا۔ پھر شکاف میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں سیاہ مرتبان موجود تھا۔ جیسے ہی میں نے مرتبان کو ہاتھ لگایا مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے بجلی کا خفیف سا جھٹکا لگا ہو۔ میں نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ دوسری بار ہاتھ لگایا تو کسی قسم کا جھٹکا نہ لگا۔ میں نے مرتبان کو باہر نکال لیا۔ اس کے ڈھکن کو کھولنے لگا کہ کچھ سوچ کر رک گیا۔ پتھر کی سل کو چوترے کی دیوار کے ساتھ لگا کر شکاف کو بند کر دیا۔ مرتبان کو بغل میں دبایا اور زینہ چڑھ کر گیلری میں آیا۔ گیلری کا زینہ اتر کر راہ داری میں سے ہوتا ہوا واپس جھروکے والی چھوٹی سی کوٹھڑی میں آ گیا۔ یہ کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ میں نے لائٹر جلا کر اس کی روشنی میں مرتبان کا جائزہ لیا۔ یہ کسی مضبوط دھات کا بنا ہوا مرتبان تھا۔ اس کا رنگ کچھ اور ہو گا لیکن اتنی مدت سے دیوار کے اندر پڑے پڑے اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔ میں نے ڈھکن کو دیکھا۔ ڈھکن پیچ دار تھا۔ میں اسے گھما کر کھولنے لگا تو جیسے اندر سے آواز سی آئی کہ اسے مت کھولو۔ میں رک گیا۔ مرتبان کو دیوار کے ساتھ اپنے قریب ہی رکھ لیا اور سوچنے لگا کہ اسے کھولوں یا نہ کھولوں؟

میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ جب آدمی کے کسی گناہ کی پاداش میں اس پر سزا کے طور پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو سب سے پہلے اس آدمی کی عقل ماری جاتی ہے۔ عقل ان معنوں میں ماری جاتی ہے کہ قدرت اس سے اس کی قوت فیصلہ چھین لیتی ہے۔ وہ یہ کروں یا نہ کروں کے چکر میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مرتبان کھولوں یا نہ کھولوں..... آدمی خطا کار ہے۔ اس سے زندگی میں خطائیں سرزد ہو جاتی ہیں۔ اس کی بعض خطائیں، بعض گناہ اللہ غفور الرحیم معاف فرمادیتا ہے لیکن بعض خطائیں ایسی ہوتی ہیں جن کی سزا انسان کو ضرور بھگتنی پڑتی ہے۔ مجھے بھی قدرت کی طرف سے میرے کسی ایسے ہی گناہ کی سزا ملنے والی تھی۔ میں آئینی قلعے کی جھرد کے والی کو ٹھڑی میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مرتبان کو کھولوں کہ نہ کھولوں؟

جب میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا تو میں نے کو ٹھڑی کی دیوار کے ساتھ سر لگا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ سر بستہ رازدوں کو بے نقاب کرنے کا شوق کہتا تھا کہ ابھی مرتبان کو کھول کر دیکھو کہ اس کے اندر کیا ہے۔ دل کے اندر سے بڑی دھیمی سی آواز آتی کہ اسے مت کھولنا، اسے وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے اٹھا کر لائے ہو۔

اسی تذبذب میں مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ پھر میں عالم خواب میں پہنچ گیا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ میں ایک تاریک غار میں سے گزر رہا ہوں۔ میں زمین پر چل

نہیں رہا میرے پاؤں زمین سے اوپر اٹھے ہوئے ہیں اور میں ہوا میں پرواز کرتا جا رہا ہوں۔ غار میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ پھر اچانک مجھے کسی عورت کے سسکیاں بھر کر رونے کی آواز آتی ہے۔ میں اپنے آپ اس آواز کی طرف مڑ جاتا ہوں۔ یہ آواز غار کے اندر بنی ہوئی کو ٹھڑی میں سے آرہی ہے۔ کو ٹھڑی کا دروازہ کھول کر دیکھتا ہوں کہ اندر فرش کے درمیان ایک گول کنواں ہے۔ کنوئیں کے اندر روشنی ہو رہی ہے۔ عورت کے رونے کی آواز کنوئیں کے اندر سے آرہی ہے۔ میں کنوئیں کی منڈیر پر سے کنوئیں میں جھانکتا ہوں۔ کنوئیں کی تہہ میں آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ عورت کے رونے اور سسکیاں بھرنے کی آواز ان شعلوں میں سے آرہی ہے۔ وہ کہہ رہی ہے۔ ”مجھے باہر نکالو..... مجھے باہر نکالو..... میں جل رہی ہوں..... میں جل رہی ہوں۔“

میں عالم خواب میں ہی عورت کو کہتا ہوں کہ ”میں تمہیں کیسے باہر نکالوں۔“ عورت روتے روتے کہتی ہے۔ ”کنوئیں کا ڈھکن کھول دو۔ کنوئیں کا ڈھکن کھول دو۔ مجھے عذاب سے نجات مل جائے گی۔“ میں عورت کو کہتا ہوں۔ ”کنوئیں کا تو کوئی ڈھکن نہیں ہے۔ کنواں تو کھلا ہے۔“ عورت سسکی بھر کر کہتی ہے۔ ”کنوئیں کا ڈھکن کھول دو۔ مجھے باہر نکالو۔ مجھے باہر نکالو۔“

اس کے ساتھ ہی اچانک میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں چونک کر ادھر ادھر دیکھتا ہوں۔ یقین نہیں آتا کہ میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں وہ مرتبان میں قید عورت کی روح تو نہیں تھی جو بار بار کہہ رہی تھی کہ ”مجھے کنوئیں سے باہر نکالو۔ مجھے عذاب سے نجات دلاؤ۔“

میرا حقیقت پسند ذہن اس خواب کو سچ ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ اچانک اسی عورت کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ وہ سسکیاں بھر کر کہہ رہی تھی۔ ”مجھے باہر

نکالو..... مجھے آگ سے باہر نکالو۔“

میں نے محسوس کیا کہ آواز مرتبان میں سے آرہی تھی۔ چونکہ میں بدروحوں کا قائل نہیں تھا اس لئے میں نے اس عورت کی آواز پر کوئی توجہ نہ دی اور آنکھیں بند کر کے سوپنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ مرتبان کے اندر سے عورت کی درد بھری آواز تھوڑی تھوڑی دیر بعد آرہی تھی۔ آخر میرا شوق تجسس میری عقل پر غالب آ گیا۔ اور میں نے مرتبان کے پیچ دار ڈھکن کو آہستہ آہستہ کھولنا شروع کر دیا۔ ڈھکن کو کھلتے دیکھ کر عورت کی آواز اب نہیں آرہی تھی۔ میں نے مرتبان کا ڈھکن کھول دیا۔ ڈھکن کے کھلتے ہی ایک ایسی بھیاںک چیخ کی آواز بلند ہوئی کہ جس سے جنگل کی فضا دیر تک گونجتی رہی۔ میں نے ڈر کر مرتبان کو ہاتھوں سے چھوڑ دیا تھا۔ مرتبان اندھیرے میں مجھ سے تین چار فٹ کے فاصلے پر فرش پر بیڑھا ہو کر پڑا تھا اور اس میں سے سفید دھوئیں کی لیکر سی نکل رہی تھی۔ میں بندوق تھام کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہی بھیاںک چیخ ایک بار پھر بلند ہوئی۔ میں باہر کو بھاگنے لگا تو اچانک مرتبان میں سے نکلتے ہوئے دھوئیں نے ایک زندہ عورت کی شکل اختیار کر لی۔ یہ عورت وہی تھی جسے میری آنکھوں کے سامنے تخت پر لٹا کر قتل کیا گیا تھا۔ اس کے سر پر سفید ہیروں کا تاج تھا، گلے میں سفید موتیوں کی مالا تھی، بال کھلے تھے۔ وہ گلابی رنگ کی ریشمی ساڑھی میں ملبوس تھی۔

عورت کا جسم اختیار کرتے ہی اس نے مجھے روک کر کہا۔ ”باہر مت جانا.....“ میرے دل پر ایک خوف سا طاری ہو گیا تھا۔ انسانی چیخ کی بھیاںک آواز نے میرے اعصاب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اوپر سے ایک مردہ عورت زندہ ہو کر مرتبان سے نکل کر میرے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے بولنا چاہا لیکن خوف کے مارے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اب بیک وقت کئی انسانوں کی چیخوں کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ یہ آوازیں ایسے لگ رہا تھا جیسے ہماری کوٹھڑی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

پھر اچانک کوٹھڑی کے جھروکے میں سے آگ کا ایک شعلہ سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا اندر کی جانب لپکا۔ عورت نے میری کلائی پکڑی اور مجھے کھینچتی ہوئی کوٹھڑی کے دروازے میں سے باہر نکل گئی۔ قلعے کے دالان میں اندھیرا تھا۔ عورت مجھے کھینچتی ہوئی قلعے کے بڑے دروازے کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔

چیخوں کی آوازیں زیادہ خوفناک ہو گئی تھیں اور ہمارے پیچھے آرہی تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے قلعے کے بھوت ہمیں ہلاک کرنے کے لئے ہماری طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے ایک لمحے کے لئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے آگ کے شعلے تھے۔ ہر شعلے کی شکل سانپ کی طرح تھی اور یہ آگ کے سانپ لہراتے، پھنکارتے ہمارے اتنے قریب آگئے تھے کہ کسی بھی لمحے ہم دونوں کو جلا کر بھسم کر سکتے تھے۔ جب آگ کے ایک شعلہ نما سانپ نے میرے جسم کو اپنی لپیٹ میں لینا چاہا تو عورت نے مجھے زور سے اپنی طرف کھینچ لیا اور پھر ایسا ہوا کہ مجھے نہیں معلوم کس طرح سے میرے پاؤں اپنے آپ زمین سے دو تین فٹ بلند ہو گئے اور میں اس مادرائی عورت کے ساتھ فضا میں پرواز کرتا ہوا تیزی سے قلعے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ جنگل میں رات کے پچھلے پہر کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ عورت میری کلائی تھامے مجھے اپنے ساتھ لے کر درختوں کے درمیان سے اتنی تیزی سے پرواز کرتی چلی جا رہی تھی کہ جیسے درخت اس کو خود بخود راستہ دے رہے ہوں۔ میرا ایک ہاتھ اس مادرائی عورت کی گرفت میں تھا، دوسرے ہاتھ میں بندوق تھی۔ میں اپنے آپ کسی مرئی طاقت کے زیر اثر فضا میں تیرتا جا رہا تھا۔

درخت سامنے آتے تو میں آنکھیں بند کر لیتا کہ درخت سے ٹکرانے لگا ہوں لیکن درخت سے ٹکرائے بغیر میں عورت کے ساتھ آگے نکل جاتا۔ میں کب تک اس عورت کے ساتھ پرواز کرتا رہا؟ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ ہم رات کی تاریکی میں ایک دریا کے اوپر سے گزر گئے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر مجھے

اندھیرے میں ایک ویران سا کھنڈر دکھائی دیا۔ وہ عورت کھنڈر کے پاس جا کر زمین پر اتر گئی۔ میرے پاؤں بھی زمین پر لگ گئے۔ میں اس عورت سے بات کرتے ڈر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ عورت نارمل زندہ عورت نہیں ہے بلکہ ایک بدروح ہے جو میرے لئے کسی نہ کسی مصیبت کا باعث بن سکتی ہے۔ میں نے غلطی کی تھی کہ اسے مرتبان سے آزاد کر دیا تھا۔ اب معلوم نہیں یہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والی تھی۔ اس نے ابھی تک میری کلائی پکڑ رکھی تھی اس کے ہاتھ کی گرفت بڑی سخت تھی، اتنی سخت کہ میرے جیسے صحت مند شکاری آدمی کی کلائی درد کرنے لگی تھی۔

جب وہ مجھے ساتھ لے کر کھنڈر میں داخل ہونے لگی تو میں نے اپنے قدم روک لئے اور ہمت کر کے اس عورت سے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ تم مجھے چھوڑ دو۔ میں نے تمہیں آزاد کر دیا ہے۔ اب جہاں جی چاہے چلی جاؤ۔“

عورت نے میری کلائی چھوڑ دی۔ وہ بالکل میرے قریب کھڑی تھی۔ آسمان پر صبح کا اجالا نمودار ہونے لگا تھا۔ سحر کی دھندلی روشنی میں اس عورت کی آنکھیں سیاہ ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس چمک میں ایک محبت اور رحم کا احساس تھا۔ یہ عورت دراز قد تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کا رنگ گندی تھا مگر چہرے کے نقوش بڑے دلکش تھے۔ کہنے لگی۔ ”تم نے مجھے رگھو کی قید سے آزاد کر کے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ تمہاری زندگی کی حفاظت اب میرا فرض بن چکا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے تمہاری حفاظت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی حفاظت خود کر سکتا ہوں مجھ پر مہربانی کرو اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔“ یہ کہہ کر میں نے بندوق کندھے پر رکھی اور واپس جانے کے لئے مڑا تو اس عورت نے پیچھے سے میرا بازو پکڑ لیا اور بولی۔ ”میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔“

میں نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”میں مسلمان ہوں۔ میری زندگی اور

موت میرے اللہ کے اختیار میں ہے۔“

عورت نے ایک بار پھر میرا بازو پکڑ لیا اور کہا۔ ”میں جانتی ہوں تم مسلمان ہو۔ میں تمہارے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہوں کہ خود تم بھی نہیں جانتے۔ میں اگرچہ ہندو برہمن کے گھر پیدا ہوئی تھی لیکن میں اسلام قبول کر چکی ہوں۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ میں جانتی ہوں زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے لیکن اللہ پاک کا یہ بھی حکم ہے کہ اپنی زندگی کی حفاظت کرو اور جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔“

میں حیران سا ہو کر اس عورت کو دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک قتل ہو چکی عورت کی روح یا بدروح تھی مگر بالکل نارمل زندہ عورت کی طرح بول رہی تھی۔ عجیب بات تھی کہ اب مجھے اس سے بالکل خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا مگر میں اس کے پاس ایک سیکنڈ کے لئے بھی ٹھہرنے کو تیار نہیں تھا۔ میں اس روحوں بدروحوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔ ”خدا کے لئے میری جان چھوڑ دو۔ تم ایک بدروح ہو۔ میں نے تمہیں قتل ہوتے اور مرتے دیکھا ہے۔ تم ایک مردہ عورت ہو۔ تم ایک بدروح ہو۔ چھوڑ دو مجھے۔۔۔۔۔“

اور میں اپنا بازو چھڑا کر تیز تیز چل پڑا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا کہ اس عورت کی بدروح چلی گئی ہے یا وہیں کھڑی ہے۔ صبح کا نور چاروں طرف جنگل میں پھیلنے لگا تھا۔ میرا رخ دریا کی طرف تھا۔ یہ وہی دریا تھا جس کے اوپر سے وہ عورت مجھے پرواز کرتے ہوئے لائی تھی۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا جنگل زیادہ گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ درخت اپنے گنجان تھے کہ انہوں نے سارے جنگل پر ایک چھت ڈال رکھی تھی۔ ان درختوں کے نیچے دن کی روشنی شاید کبھی نہیں پہنچتی تھی۔ دریا اس جنگل کے پار تھا۔ مجھے امید تھی کہ دریا پر کوئی نہ کوئی گھاٹ ضرور ہو گا جہاں سے دیہاتی لوگ دریا پار کرتے ہیں۔ میں وہیں سے دریا پار کر کے کسی ریلوے اسٹیشن پر

پہنچنے کی کوشش کروں گا تاکہ وہاں سے کوئی گاڑی پکڑ کر اس منحوس جنگل سے نکل جاؤں۔

بھری ہوئی ڈبل بیرل بندوق میں نے کندھے پر رکھی ہوئی تھی۔ میگزین والا تھیلہ اس منحوس قلعے کی کوٹھڑی میں ہی بھاگتے وقت رہ گیا تھا۔ صرف ایک چاقو میری جیکٹ کی جیب میں تھا۔ چاقو میں نے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا کیونکہ درختوں کے درمیان اگی ہوئی جھاڑیاں اور درختوں سے لگتی بیلین میرے راستے میں آرہی تھیں۔ میں چاقو سے انہیں کاٹ کر گزرنے کے لئے راستہ بناتا جا رہا تھا۔ آخر یہ گنجان جنگل ختم ہو گیا اور میں نے اپنے سامنے ایک ٹیلے کو دیکھا جس کے دامن میں ایک سیاہ چٹان راستہ روکے کھڑی تھی۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ ابھی تک دریا کا کنارہ کیوں نہیں آیا۔

یہ سوچ کر کہ شاید دریا ٹیلے کے عقب میں بہہ رہا ہو میں ٹیلے کی طرف بڑھا۔ چٹان کے قریب پہنچا ہی تھا کہ جنگل ایک بھیانک انسانی چیخ کی آواز سے گونج اٹھا۔

میں ڈر کر وہیں کھڑا ہو گیا اور بندوق سیدھی کر لی۔ چیخ کی آواز کے فوراً بعد چٹان کے پیچھے سے ایک سیاہ فام آدمی نمودار ہوا اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ اس کی سرخ آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ وہ تلوار لہراتا میری طرف چلا آ رہا تھا۔ میں نے فوراً اس پر فائر کر دیا۔ بندوق کا دھماکہ ہوا مگر میں یہ دیکھ کر لرز گیا کہ اس سیاہ فام آدمی پر بندوق کے فائر کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اب تلوار اٹھائے مجھے قتل کرنے دوڑتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ جب وہ مجھ سے پندرہ بیس فٹ دور رہ گیا تو میں نے اس کے دل کا نشانہ لے کر ڈبل بیرل گن کا دوسرا فائر کر دیا۔ اس گن میں دو کارتوس تھے کہ جس کے ایک فائر سے طاقتور سے طاقتور شیر بھی گر پڑا تھا مگر اس سیاہ فام حبشی پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا حالانکہ دونوں فائر میں نے قریب سے کئے تھے۔ سیاہ فام حبشی کسی دیو کی طرح اونچا لمبا تھا۔ اس نے مجھ پر جیسے ہی تلوار کا بھرپور وار کرنا

چاہا وہ ایسے لڑکھڑا کر پیچھے کو گر جیسے کسی نے اسے آگے سے دھکا دے دیا ہو۔ یہ دھکا میں نے نہیں دیا تھا۔ مجھ پر تو موت سے پہلے کا سکتہ سا طاری ہو چکا تھا کیونکہ وہ دیو نیکل سیاہ فام حبشی تلوار اوپر اٹھائے اتنی تیزی سے میرے قریب پہنچ گیا تھا کہ اگر اسے دھکا نہ لگتا تو اس نے چشم زدن میں میری گردن اڑا دینی تھی۔

اب میں اس بات پر حیران تھا کہ اس کو آگے سے دھکا کس نے دیا تھا۔ وہاں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ سیاہ فام حبشی زمین پر پڑا تھا۔ اس کے سینے میں ایک لمبا خنجر اتر ا ہوا تھا اور خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے حبشی کی لاش سینے میں اترے ہوئے خنجر سمیت اسی طرح غائب ہو گئی جس طرح قلعے میں اس خوبصورت عورت کی لاش غائب ہو گئی تھی جسے میری آنکھوں کے سامنے تخت پر لٹا کر قتل کیا گیا تھا۔ یہ سارا بھٹکی ہوئی بدروحوں اور بھوتوں اور چڑیلوں کا کھیل تھا اور اس کا حقیقی اور پاکیزہ دنیا سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میرے ساتھ بھی ان بدروحوں کی مخلوق کا کوئی رشتہ نہ جڑتا اگر میں سیاہ آسٹری مرتبان نہ کھولتا۔ لیکن مجھے بدروحوں اور آسیب زدہ حویلیوں اور قلعوں کا سراغ لگانے کا شوق لے ڈوبا تھا۔ میں نے بدروحوں کی حقیقت معلوم کرنے اور ان کی پراسرار دنیا کا مشاہدہ کرنے کے شوق میں اس مرتبان کو کھول دیا تھا جس میں ایک بدروح قید تھی۔ یہ ساری مصیبت میری اپنی لائی ہوئی تھی۔ اسی لئے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ آدمی کو اپنی حد کے اندر رہ کر اللہ کے دکھائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے پاکیزہ اور سادہ زندگی بسر کرنی چاہئے۔ خواہ مخواہ ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے سے آدمی کو کچھ نہیں ملتا اور وہ نیکی اور سادگی کے راستے سے بھی بھٹک جاتا ہے۔

بہر حال اب میں پھنس گیا تھا اور اسی کوشش میں لگا تھا کہ کسی طرح ان بدروحوں کے چکر سے نجات حاصل کر لوں۔ مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے اور میرے بس میں بھی نہیں ہے۔ میری حالت اس آدمی جیسی ہو

گئی تھی جو دلدل میں پھنس گیا ہو۔ ایک پاؤں دلدل سے باہر نکالتا ہو تو دوسرا پاؤں دلدل میں اور زیادہ دھنس جاتا ہو۔ میں نے اپنے دل میں خدا کو حاضر ناظر جان کر توبہ کر لی تھی کہ آئندہ کبھی کسی جن، بھوت، چڑیل یا کسی آسیب کی کھوج میں نہیں نکلوں گا۔ آئندہ کے لئے تو خدا نے ضرور مجھے معاف کر دیا تھا لیکن جو کام میں خراب کر چکا تھا اسے ٹھیک ہوتے ہوتے بھی وقت چاہئے تھا۔

جیشی کی خون آلود لاش غائب ہوتے ہی میں اس منحوس جگہ سے آگے چل دیا۔ میں جنگل کی دریا والی سرحد کے قریب پہنچ چکا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میں جنگل سے باہر نکل آیا۔ سامنے دریا بہہ رہا تھا مگر وہاں نہ کوئی گھاٹ تھا نہ کشتی نظر آرہی تھی۔ دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا، میں اسے تیر کر پار کر سکتا تھا۔ میں دریا میں اترنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ مجھے ایک طرف سے ایک کشتی آتی دکھائی دی۔ میں وہیں رک گیا۔ کشتی میں ایک ملاح بیٹھا اسے چلا رہا تھا۔ کشتی کا رخ اسی طرف تھا جدرہ میں کھڑا تھا۔ کشتی میرے قریب آ کر کنارے پر رک گئی۔ کشتی کا ملاح ایک پندرہ سولہ سال کا لڑکا تھا۔ کہنے لگا۔ ”بابو! دریا پار جانا ہے تو آجاؤ۔ میں تمہیں دیکھ کر ہی آیا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں بھائی۔ مجھے پار لے چلو۔“

ملاح لڑکا بولا۔ ”دس روپے کرایہ ہو گا۔“

میں نے کہا۔ ”تم بے شک بیس روپے لے لینا۔“

لڑکے نے خوش ہو کر کہا۔ ”تو پھر بیٹھ جاؤ بابو۔“

میں کشتی میں سوار ہو گیا اور کشتی دریا کے بہاؤ کے رخ چلتی ہوئی آہستہ آہستہ دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے لگی۔ میں نے لڑکے سے کہا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

ملاح لڑکے نے جواب دیا۔ ”میرا نام بھلوا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بھلوا یہ بتاؤ دریا پار ادھر کون سا شہر ہے؟“

لڑکے نے چپو چلاتے ہوئے کہا۔ ”ادھر شہر تو کوئی نہیں ہے۔ ہمارا گاؤں منڈالا

ہے۔ تمہیں کہاں جانا ہے بابو؟“

میں نے کہا۔ ”بھائی مجھے جھانسی جانا ہے۔ یہ بتاؤ کہ میں جھانسی کیسے پہنچ سکتا ہوں؟“

ملاح لڑکا بولا۔ ”بابو جھانسی تو یہاں سے بہت دور ہے۔ یہ دریا بھی اس طرف کو نہیں جاتا۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ تمہیں ہسپتال گڑھ کے گھاٹ تک پہنچا دیتا ہوں۔ وہاں سے تمہیں جھانسی جانے والی کوئی نہ کوئی گاڑی شاید مل جائے۔ ہسپتال گڑھ میں ایک ریلوے سٹیشن ہے۔“

مجھے امید کی کرن نظر آئی۔ میں نے پوچھا۔ ”ہسپتال گڑھ یہاں سے کتنی دور ہے بھلوا؟“

لڑکے نے کہا۔ ”دریا کے بہاؤ پر چلتے دو گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔ مگر اس کے پچاس روپے لگیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”میں تمہیں ساٹھ روپے دوں گا مگر مجھے کسی طرح ہسپتال گڑھ پہنچا دو۔“

ملاح لڑکے نے کشتی کو کنارے کی طرف لے جانے کی بجائے اسے دریا کے بہاؤ پر ڈال دیا اور بولا۔ ”بھگوان بھلی کرے گا۔“

دھوپ خوب نکل آئی تھی۔ موسم دھوپ کی وجہ سے گرم ہو رہا تھا۔ میں نے خالی بندوق کشتی میں ایک طرف رکھ دی تھی۔ ملاح لڑکے نے بندوق کو دیکھا تو بولا۔ ”بابو تم شکاری ہو؟“

میں نے گہرا سانس بھر کر کہا۔ ”ہاں بھائی یہی سمجھ لو۔ شکاری ہوں۔“

لڑکے نے پوچھا۔ ”شیر مارتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”اگر شیر سامنے آجائے اور حملہ کر دے تو اسے مارنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔ ویسے میں سانپ اور ہرنوں وغیرہ کا شکار کرتا ہوں۔“

لڑکا کہنے لگا۔ ”بابو! جس جنگل سے تم آرہے ہو وہاں تو بھوت پریت رہتے ہیں۔“

میں لڑکے سے زیادہ گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس کے سوالوں کے جواب دینے پر مجبور تھا۔ ایک طرح سے میں اس کے رحم و کرم پر تھا۔ میں نے بے دلی سے کہا۔ ”پتہ نہیں۔ رہتے ہوں گے۔“

لڑکا بولا۔ ”بابو! معلوم ہے اس جنگل میں ایک رانی بائی کا قلعہ ہے۔ اس قلعے میں رات کو ایک عورت کے گانے اور رونے کی آوازیں آتی ہیں۔“

میں نے بے نیازی سے کہا۔ ”آتی ہوں گی۔“

لڑکے نے کہا۔ ”تم نے کوئی آواز ضرور سنی ہوگی۔“

”میں نے کوئی آواز نہیں سنی۔“ میں نے جواب دیا اور اس کے بعد اپنی آنکھیں بند کر کے سر نیچے کر لیا جیسے سونا چاہتا ہوں۔

لڑکا بولا۔ ”بابو! سونا مت۔“ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور لڑکے سے پوچھا۔ ”کیوں کیا بات ہے۔ کیا یہاں سونا منع ہے؟“

لڑکے نے کہا۔ ”منع نہیں ہے بابو جی۔ مگر گاؤں کے مندر کے پجاری جی کا کہنا ہے کہ دریا میں دن کے وقت سفر کرتے ہوئے اگر کوئی مسافر کشتی میں سو جائے تو دریا میں سے مگرچھ نکل کر حملہ کر دیتا ہے۔“

یہ لڑکا بھی عجیب مصیبت تھا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی بیتال گڑھ کے گھاٹ تک پہنچنے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ میں نے سونے کا خیال دل سے نکال دیا اور باتونی لڑکے کی باتیں سننے اور ان کے جواب دینے پر تیار ہو گیا۔

دو گھنٹے کے سفر کے بعد دریا کے دوسرے کنارے پر دور سے مجھے کسی بہتی کے مکان نظر آنا شروع ہو گئے۔

ملاح لڑکے نے کہا۔ ”وہ دیکھو بابو! وہ بیتال گڑھ کے مکان ہیں۔“

میں نے لڑکے سے پوچھا۔ ”بیتال گڑھ کاریلوے سٹیشن کس طرف ہے۔“

لڑکا کشتی کنارے کی طرف لارہا تھا۔ کہنے لگا۔ ”گاؤں سے تھوڑی دور آگے دریا کے کنارے پر ہی ہے۔“

میں نے لڑکے سے کہا کہ وہ مجھے کنارے پر اس جگہ لے جائے جہاں ریلوے سٹیشن ہے۔ اس کے جواب نے لڑکے نے کہا۔ ”نہیں بابو! میں اس طرف نہیں جا سکتا۔ میں گھاٹ پر بھی نہیں جاؤں گا۔ وہاں ٹھیکیدار مجھ سے کرائے کے آدھے پیسے لے لے گا۔ میں تمہیں اسی جگہ اتار دوں گا۔ تم خود ہی ریلوے سٹیشن پہنچ جانا۔“

میں نے کہا۔ ”چلو ٹھیک ہے بھائی تم مجھے اسی جگہ اتار دو۔ تمہارا شکریہ!“

لڑکا کشتی کو کنارے کے قریب لاتے ہوئے بولا۔ ”شکریہ کس بات کا بابو۔ تم نے مجھے ساٹھ روپے کرایہ دیا میں نے تمہیں بیتال گڑھ پہنچا دیا۔“

ملاح لڑکے نے کشتی کنارے پر ایک طرف کر کے گھڑی کر دی۔ میں بندوق کندھے سے لڑکا کشتی سے اتر گیا اور جیب سے پیسے نکالنے لگا کہ لڑکے کو ساٹھ روپے دوں۔ میری پشت کشتی کی طرف تھی۔ جیب سے روپے نکال کر میں نے کشتی کی طرف منہ کیا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ وہاں نہ کشتی تھی نہ ملاح لڑکا تھا۔ دریا کا کنارہ خالی پڑا تھا۔ دس دس روپے کے چھ نوٹ میرے ہاتھ میں تھے اور میں عالم حیرت میں ڈوبا دریا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دریا میں دور دور تک کسی کشتی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

میں نے کرنسی نوٹ واپس جیب میں رکھے اور گاؤں کی طرف چل پڑا۔ کافی بڑا گاؤں تھا۔ کھیتوں میں کچھ کسان کام کر رہے تھے۔ ملاح لڑکے نے کہا تھا کہ ریلوے سٹیشن گاؤں کی دوسری جانب دریا کے قریب ہی ہے۔ میں گاؤں کا چکر کاٹ کر اس کی دوسری طرف نکل آیا۔ یہاں مجھے ذرا اونچائی پر ایک ریلوے سگنل دکھائی دیا۔ اس کی راہ نمائی میں، میں بیتال گڑھ کے سٹیشن پر پہنچ گیا۔ یہاں سے بناو ایک مجھے ایک پیسجر

ٹرین مل گئی۔ بناوا چھوٹا سا جنگشن تھا وہاں سے ریلوے لائن جھانسی کو جاتی تھی۔ دو گھنٹے مجھے انتظار کرنا پڑا۔ میں نے سٹیشن پر ہی کچھ کھاپی لیا۔ جھانسی جانے والی گاڑی آئی تو میں اس میں بیٹھ گیا وہاں سے جھانسی کافی دور تھا۔ ریل گاڑی بھی ہر سٹیشن پر کھڑی ہوتی تھی۔ دن کے دو بجے اس نے مجھے جھانسی پہنچا دیا۔ یہاں سے مجھے ایک میل ٹرین مل گئی اس نے مجھے دوسرے دن بمبئی پہنچا دیا۔ سٹیشن سے آٹو رکشالے کر میں سیدھا اپنے دوست جمشید کی آٹو سپر پارش کی دکان پر آگیا۔

جمشید دکان پر ہی تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو کاؤنٹر چھوڑ کر میرے پاس آکر بولا۔ ”یہ کیا؟ کوئی شکار مار کر نہیں لائے۔ مامندر کے جنگلوں میں تو سانہر اور ہرن بہت ہوتے ہیں۔

میں نے رکشے سے اترتے ہوئے کہا۔ ”مجھے دیکھ کر ہرن، سانہر بھاگ گئے تھے۔“

جمشید نے رکشے میں مزید جھانک کر دیکھا اور بولا۔ ”میگزین کا تھیلا کہاں چھوڑ آئے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”جنگل میں ایک جگہ سو گیا تھا کوئی اٹھا کر لے گیا۔“

جمشید بولا۔ ”چلو نہادھو کر کپڑے بدلو۔ کھانا اکٹھے کھائیں گے۔“

جمشید کا مکان دکان کے اوپر ہی تھا۔ یہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ جمشید وہاں اکیلا ہی رہتا تھا۔ میں نے نہادھو کر کپڑے بدلے۔ اس دوران سوچتا رہا کہ رانی بائی کے قلعے میں میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے اس کے بارے میں جمشید کو بتاؤں یا اس سے اس بات کو راز ہی رکھوں۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ یہ راز مجھے اپنے تک ہی رکھنا چاہئے اور جمشید کو کچھ نہیں بتانا چاہئے اس کو بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں اسے بتا بھی دیتا تو اس نے مجھے برا بھلا ہی کہنا تھا کہ تم تو بمبئی کے قرب و جوار میں شکار کھینٹے گئے تھے جھانسی کی طرف کیسے نکل گئے اور رانی بائی کے آبی قلعے میں جانے کی

تمہیں کیا ضرورت تھی۔ ویسے بھی جمشید سیدھا سادھا شکاری ٹائپ کا دنیا دار آدمی تھا اس قسم کی ماورائے عقل اور مافوق الفطرت باتوں کے بارے میں وہ مجھے کوئی مفید مشورہ نہیں دے سکتا تھا۔“

O

فیروز مجھے اپنی زندگی کی پراسرار اور دہشت خیز داستان سنا رہا تھا جسے میں آپ کے لئے لکھ رہا ہوں۔ میں وہی کچھ لکھ رہا ہوں جو مجھے فیروز نے سنایا تھا۔ میں اپنی طرف سے ایک لفظ بھی فالتو نہیں لکھ رہا۔

فیروز کہنے لگا۔ ”میں نے آپ کو ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ پاکستان بننے سے پہلے میں پنجاب کے کس شہر میں رہتا تھا اور کیا کرتا تھا۔ میں آپ کو بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن چونکہ اب وہ شہر جہاں میں رہتا تھا اب انڈیا میں ہے اس لئے اس کا نام بتا دیتا ہوں۔ اس شہر کا نام امرتسر تھا۔ میں امرتسر میں جی ٹی روڈ پر محصول چوگی کے قریب ایک آبادی مقبول پورے میں رہتا تھا۔ میری پیدائش بنالے میں ہوئی تھی لیکن میرے ماں باپ میرے پیدا ہونے کے دو سال بعد امرتسر آکر آباد ہو گئے تھے۔ میں اپنے ماں باپ کی اکیلی اولاد تھا۔ نہ میرا کوئی بھائی تھا نہ بہن تھی۔ میں امرتسر کے سکول میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ میرے ماں باپ کا انتقال ہو گیا۔ میرے باپ نے تھوڑی سی زمین اور ایک پھل دار باغ چھوڑا تھا۔ میرے چچا نے میری پرورش کی ذمہ داری اٹھالی اور یوں باغ اور زمین کی آمدنی پر قبضہ کر لیا۔ مجھے زمین اور باغ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شروع ہی سے میرا مزاج آوارہ گردی کی طرف مائل تھا اور میں جنگلوں میں گھوم پھر کر شکار کھیلتا چاہتا تھا۔ میں نے ایک چھوٹی بندوق خریدی تھی جس میں چھرے کی بجائے شلگ پڑتے تھے۔ میں اپنی زمین اور باغ میں گھوم پھر کر پرندوں کا شکار کیا کرتا تھا۔ میں دسویں جماعت تک ہی پڑھ سکا اس کے بعد اپنے باپ

کی دکان سنبھال لی۔ دکان سے کافی آمدنی ہونے لگی۔ میں نے دو چار نوکر رکھ لئے اور انہیں دکان پر بٹھا کر شکار کھیلنے کبھی کسی طرف اور کبھی کسی طرف نکل جاتا تھا۔ اب میں کافی بڑا ہو گیا تھا۔ میرے چچا نے ایک جگہ میری شادی کر دی۔ میرے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ بیوی میری آوارہ گردیوں اور شکار کے شوق سے تنگ آکر مجھ سے طلاق لے کر اپنے گھر چلی گئی، میں نے بھی خدا کا شکر ادا کیا میں زندگی آزادی سے گزارنا چاہتا تھا۔ جمشید میرا دوست بن گیا تھا اسے بھی شکار کا شوق تھا۔ اس کے باپ کی بمبئی شہر میں آٹو سپئر پارٹس کی دکان تھی۔ جمشید کو اس کے باپ نے بمبئی بلا لیا۔ جمشید نے باپ کا کاروبار سنبھال لیا۔ جب اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تو جمشید بمبئی کا ہی ہو کر رہ گیا۔ میں کبھی کبھی اس سے ملنے بمبئی چلا جاتا تھا۔ اسی طرح وقت گزرنا چلا گیا۔ 1946ء کا سال آگیا۔ ملک کے مسلمانوں نے قائد اعظم کی قیادت میں پاکستان کے مطالبے کا اعلان کر دیا تھا اور تحریک پاکستان بڑے زور و شور سے جاری تھی۔ اسی سن 1946ء کے آخری ایام تھے جب میں امرتسر سے جمشید کے پاس بمبئی آیا ہوا تھا اور میں نے رانی بائی کے قلعے کے بارے میں دہشت انگیز اور روٹنے کھڑے کر دینے والی کہانیاں سنی تھیں اور ایک روز ان خوفناک روایتوں کا کھوج لگانے رانی بائی کے قلعے کی جانب روانہ ہو گیا تھا اور میرے ساتھ وہ ماورائے عقل اور حیرت انگیز واقعات پیش آئے تھے جو میں پوری تفصیل کے ساتھ آپ کو بتا چکا ہوں۔ اب میں کہانی کو آگے بیان کرتا ہوں۔۔۔۔۔“

فیروز ایک لمحے کے توقف کے بعد کہنے لگا۔

”میں نے اور جمشید نے اکٹھے بیٹھ کر رات کا کھانا کھایا۔ جمشید مجھ سے شکار کے بارے میں باتیں پوچھنے لگا۔ کہاں کہاں پھرے، راتیں جنگل میں کہاں گزاریں، کوئی شکار کیوں نہیں ملا؟ ان سب باتوں کا میں نے اسے ایک ہی جواب دیا کہ اس بار شکار میں میرا جی نہیں لگا تھا اور میں زیادہ تر جنگلوں میں گھومتا پھرتا رہا تھا۔ جمشید نے میری

طرف گھور کر دیکھا اور کہنے لگا۔ ”تم مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے فیروز؟“
آخر وہ میرا دوست تھا اور میری طبیعت اور میری نفسیات سے واقف تھا۔ اس نے میرے چہرے کی خاموشی سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میرے ساتھ جنگل میں کوئی پراسرار واقعہ ضرور ہوا ہے۔ میں نے کہا۔ ”تم سے مجھے کچھ چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر کوئی خاص بات ہوئی ہوتی تو میں سب سے پہلے تمہیں بتاتا۔“

پھر میں نے جان بوجھ کر گفتگو کا موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ”ملک کے سیاسی حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں۔ پاکستان بن کر رہے گا۔ ماسٹر تارا سنگھ نے اعلان کر دیا ہے کہ ہم پاکستان نہیں بننے دیں گے۔“

جشید بولا۔ ”ماسٹر جی سکھوں کے صحیح لیڈر نہیں ہیں۔ کانگریس نے انہیں ورغلا یا ہوا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ پنجاب میں فسادات شروع ہو جائیں گے۔“
میں بھی ایسے ہی سوچ رہا تھا۔ میں نے جشید سے کہا۔ ”تم بمبئی میں ہو۔ بمبئی ایک کاسموپولیٹن شہر ہے شاید یہاں کچھ نہ ہو لیکن پنجاب میں بہت خون خرابہ ہو گا۔ میں سوچتا ہوں میں امرتسر اپنے گھر چلا جاؤں.....“

جشید کہنے لگا۔ ”وہاں تمہارا کون ہے۔ ایک دکان ہے، ایک چھوٹا سا باغ ہے اور تھوڑی سے زمین ہے جس پر تمہارے چچا نے قبضہ کر رکھا ہے۔ نہ تمہارے وہاں ماں باپ ہیں، نہ بہن بھائی ہیں اور نہ بیوی بچے ہیں۔ وہاں جا کر کیا کرو گے؟ میں تو کہتا ہوں کہ بمبئی میں میرے پاس ہی رہ جاؤ۔ پاکستان بن گیا تو یہیں سے پاکستان چلے جانا۔“

میں نے کہا۔ ”کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ امرتسر میں میرا کچھ نہیں ہے لیکن میرے ماں باپ کی قبریں ہیں۔ میں پاکستان جانے سے پہلے ان کی قبروں پر فاتحہ ضرور پڑھنا چاہتا ہوں۔“

جشید بولا۔ ”جیسے تمہاری مرضی۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن ابھی میں بمبئی میں ہی رہوں گا۔ تمہارے پاس.....“
کچھ دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”آج میرا دل کوئی فلم دیکھنے کو چاہتا ہے۔ میٹرو سینما میں شیر کے شکار کی ایک انگریزی فلم لگی ہوئی ہے۔ 9 بجے والا شو ابھی شروع نہیں ہوا ہو گا۔ تم بھی میرے ساتھ چلو اکٹھے فلم دیکھیں گے۔“

جشید کہنے لگا۔ ”آج سارا دن گیراج میں کام کرتا رہا ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ تم چلے جاؤ۔“

رانی بائی کے قلعے میں اور اس کے بعد جنگل میں میرے ساتھ جو دہشت ناک واقعات گزرے تھے انہوں نے میرے ذہن کو کافی پریشان کیا تھا۔ میرا دل تفریح کرنے کو چاہتا تھا اور وہاں فلم ہی میرے لئے ایک تفریح کا ذریعہ تھی۔ چنانچہ میں جشید کو اس کے فلیٹ میں ہی چھوڑ کر فلم دیکھنے چل پڑا۔ دو منزلہ بس میں بیٹھ کر میٹرو سینما پہنچ گیا۔ اگر آپ کبھی بمبئی گئے ہیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ میٹرو سینما بمبئی کے گیٹ دے آف انڈیا کے قریب ہی واقع ہے اور وہاں انگریزی فلمیں لگا کرتی تھیں۔“
چھ بجے والا شو ختم ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ میں سینما کے پاس ہی ایک ایرانی ہوٹل میں چائے پینے بیٹھ گیا۔ اس زمانے میں بمبئی سے گجراتی، ہندی اور انگریزی کے علاوہ اردو کے بھی دو تین اخبار شائع ہوتے تھے جن میں روزنامہ ”خلافت“ بمبئی کے مسلمانوں میں بڑا مقبول تھا۔ ہوٹل میں ”خلافت“ کا ایک پرچہ پڑا تھا۔ میں چائے پیتے ہوئے اسے پڑھنے لگا۔ اس میں بھی یہی لکھا تھا کہ پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی سنہری منزل ہے اور قائد اعظم کی بے لوث قیادت میں مسلمان اپنی منزل کو حاصل کر کے رہیں گے۔

مجھے سیاست سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں بھی چاہتا تھا کہ مسلمانوں کا ایک الگ اسلامی ملک قائم ہونا چاہئے جہاں

وہ دین اسلام کی روشنی میں اپنی زندگی بسر کر سکیں۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ فلم کا آخری شو شروع ہونے میں آدھ گھنٹہ رہ گیا تھا۔ میں اٹھ کر میٹرو سینما آگیا۔ وہاں آخری شو کے لئے ٹکٹ والی کھڑکی کھل چکی تھی۔ میں نے سینڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور سینما ہال میں آکر بیٹھ گیا۔ ہال میں ہلکی ہلکی انگریزی موسیقی کی آواز آرہی تھی۔ لوگ آہستہ آہستہ ہال میں آرہے تھے۔ میں اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھا ان عجیب و غریب اور ناقابل یقین واقعات پر غور کر رہا تھا جو میرے ساتھ گزر چکے تھے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس قسم کے واقعات حقیقی زندگی میں بھی پیش آ سکتے ہیں۔ ایسی باتیں تو خواب میں ہوا کرتی ہیں اور وہ بھی ڈراؤنے خواب میں..... میری آنکھوں کے سامنے بار بار قلعہ رانی بائی کے بڑے کمرے کا وہ منظر آ جاتا تھا جب میری آنکھوں کے سامنے ایک خوبصورت نازک اندام عورت کو جس نے مہارانیوں والا ہیروں کا تاج پہن رکھا تھا ایک تخت پر لٹا کر قتل کر دیا گیا ہو اور پھر اس کی لاش غائب ہو کر دھواں بن گئی ہو اور اس دھوئیں نے عورت کے جسم کی شکل اختیار کر لی ہو اور زرد پوش آدمی نے اسے ایک مرتبان میں بند کر دیا ہو۔

پھر مجھے وہ خوفناک منظر یاد آ جاتا جب میں نے چبوترے کے شکاف میں سے مرتبان نکال کر اس کا ڈھکن کھول دیا تھا اور اس میں سے حسین و جمیل عورت کی روح یا بدروح ایک چیخ کے ساتھ آزاد ہو گئی تھی اور اس کی چیخ سے سارا جنگل لرز گیا تھا۔ پھر مجھے خیال آتا کہ کس طرح وہ بدروح زندہ عورت کی شکل میں میرے سامنے ظاہر ہو گئی تھی اور مجھے میرے دشمنوں سے بچا کر ہوا میں اڑاتی ہوئی دریا پار ایک پرانے کھنڈر میں لے گئی تھی اور اس نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”تم نے مجھے رگھو کی قید سے آزاد کر کے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اب تمہاری زندگی کی حفاظت میرا فرض بن چکا ہے۔“

اور پھر جب میں نے اسے کہا تھا کہ مجھے تمہاری حفاظت کی ضرورت نہیں ہے

اور مجھ پر مہربانی کرو اور میرا پیچھا چھوڑ دو میں مسلمان ہوں اور میری زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ تو اس حسین اور پر اسرار عورت نے جو اپنے مقتول جسم کی بدروح تھی کہا تھا۔ ”میں بھی اسلام قبول کر چکی ہوں۔ میں بھی مسلمان ہوں لیکن اللہ پاک کا حکم ہے کہ انسان کو جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈالنا چاہئے۔“

مگر میں اس بدروح کے پاس ایک منٹ کے لئے بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا تو میں اسے چھڑا کر جنگل میں دریا کی طرف چل دیا۔ پھر مجھے وہ حبشی یاد آ گیا جس نے جنگل میں مجھ پر تلوار سے حملہ کیا تھا لیکن عین وقت پر کسی غیبی روح نے اس سیاہ فام حبشی کو ہلاک کر دیا تھا اور میں وہاں سے ڈر کر دریا کی طرف بھاگنے لگا تھا۔ پھر مجھے وہ ملاح لڑکا یاد آ گیا جس نے مجھے کشتی میں بٹھا کر بیتال گڑھ پہنچایا تھا اور جب میں اسے کرائے کے لئے پیسے دینے کے لئے اس کی طرف مڑا تھا تو ملاح لڑکا کشتی سمیت غائب ہو چکا تھا۔ یہ سارے واقعات ایک فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

میرے کان میں اس حسین و جمیل عورت کی آواز ابھی تک گونج رہی تھی جب اس نے مجھے خبردار کیا تھا کہ میری زندگی خطرے میں ہے اور اب اس کا فرض بن گیا ہے کہ وہ میری جان کی حفاظت کرے۔

یہ ساری باتیں میری عقل اور فہم سے باہر تھیں لیکن جو کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اس پر مجھے یقین کرنا ہی پڑ رہا تھا۔ میں انہی پریشان خیالات کے ساتھ اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک سینما ہال کی روشنیاں بجھ گئیں اور پردہ سیمیں پر سے ریشمی پردہ آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھنے لگا۔

پھر فلم شروع ہو گئی۔ جنگل کا سین تھا۔ ایک شکاری شیر کی تلاش میں جنگل میں چلا جا رہا تھا۔ میرا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ صرف آنکھیں پردہ سیمیں پر تھیں۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی آدمی سیٹوں کے درمیان جھک کر چلتا چلا آ رہا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کو دیکھتا ہے اور پھر آگے چل پڑتا ہے۔ اس کا رخ میری طرف تھا۔ جب وہ میرے قریب آیا تو میں نے ہال کی ہلکی ہلکی روشنی میں اسے پہچان لیا۔ وہ میرا دوست جمشید تھا۔ جمشید نے بھی مجھے پہچان لیا اور میرے کان کے قریب منہ لے جا کر بولا۔ ”فیروز ایک امیر جنسی ہو گئی ہے۔ ذرا باہر آؤ۔“

میں جلدی سے اٹھا اور جمشید کے ساتھ سینما ہال سے باہر آ گیا۔ جمشید کچھ پریشان بھی تھا اور جلدی میں بھی تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”بات کیا ہے جمشید؟ میں نے تمہیں اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا۔“

جمشید جلدی جلدی چل رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ”پریشانی کی کوئی بات نہیں فیروز۔ بس مجھے تمہاری تھوڑی سی مدد کی ضرورت پڑ گئی ہے۔“

میں نے کچھ نہ کہا اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تیز قدموں سے چلنے لگا۔ دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ یا اللہ خیریت ہی ہو۔ اس شخص کو اچانک میری کیا ضرورت پڑ گئی ہے کہ مجھے سینما ہال سے لینے آ گیا ہے۔ سینما ہاؤس کے باہر اس کی پرانی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ گاڑی میں آیا تھا۔ اس نے مجھے گاڑی میں اپنے ساتھ بٹھایا اور گاڑی سٹارٹ کر کے سینما ہاؤس کے احاطے سے نکل کر بمبئی کی ایک سڑک پر روانہ ہو گیا۔

میں نے ایک بار پھر اس سے پوچھا۔ ”بھائی کچھ بتاؤ تو سہی۔ ہو کیا ہے؟ تمہیں میری مدد کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟“

سڑک کشادہ تھی۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ جمشید گاڑی کافی تیز چلا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ”بات یہ ہے کہ دو بئی کی ایک پارٹی اچانک آ گئی ہے۔ اس سے 80 ہزار روپے کا سودا طے پا گیا ہے۔ رقم میں نے وصول کر لی ہے۔ اب پارٹی کو مال لا کر دینا ہے۔ میں نے مال ایک خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس خفیہ جگہ سے مال باہر نکالنے کے

لئے ایک اعتباری آدمی کی ضرورت ہے۔ پہلے اس کام کے لئے میرا ملازم عبدل میرے ساتھ جاتا تھا۔ وہ کم بخت آج ہی اپنی پیار ماں کی خبر گیری کرنے ناسک چلا گیا ہے۔ کسی دوسرے آدمی کو میں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا۔ اچانک مجھے تمہارا خیال آ گیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔“

جمشید نے پہلے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ اس قسم کے مال کا کاروبار بھی کرتا ہے جس کو اسے کسی خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھنا پڑتا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ منشیات وغیرہ کا معاملہ ہے۔ گاڑی بمبئی سے باہر ایک کھلی سڑک پر پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ میں نے جمشید سے انجان بن کر پوچھا۔ ”یہ کس قسم کا مال ہے جس کو تم خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھتے ہو؟“

جمشید نے گاڑی کو ایک اور نسبتاً دیران سڑک پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”یار اب تم مجھے ذلیل کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں بتا دوں گا تمہیں کہ مال کیا ہے۔ پارٹی بڑی سائلڈ ہے اور اسے اچانک مال کی ضرورت پڑ گئی ہے۔“

80 ہزار روپے کی رقم سن 1946ء میں بہت بڑی رقم تھی۔ مجھے دل میں افسوس ضرور ہوا کہ میرا دوست یہ کس مذموم دھندے میں پڑ چکا ہے۔ میں اس کا جگری دوست ہوں اور اس نے مجھ سے بھی یہ بات پوشیدہ رکھی۔ میں خاموش ہو گیا اور کوئی بات نہ کی۔ مجھے خاموش دیکھ کر شاید جمشید کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ گاڑی اس وقت شہر کی مضافاتی آبادیوں کو چھوڑ کر ایک دیران علاقے میں داخل ہو چکی تھی جہاں ادھر ادھر جھاڑیاں اور تاز کے درخت رات کی تاریکی میں آسمان کی طرف اٹھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

جمشید کہنے لگا۔ ”تم دل میں ضرور مجھے برا بھلا کہہ رہے ہو گے کہ میں نے آج تک تم سے یہ بات کیوں چھپائے رکھی..... یہ میری مجبوری تھی۔ میں تمہیں اتنا ہی کہوں گا کہ ایک آدمی کی وجہ سے میں اس کام میں پھنس گیا کہ کوشش کے باوجود اس

دلدار سے نجات حاصل نہیں کر سکا لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد میں اس کام سے توبہ کر لوں گا چاہے اس کے لئے مجھے کتنی بھاری قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے.....“

گاڑی ویران علاقے کے کچے راستے پر اچھلتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ تین چار موٹر گھومنے کے بعد جمشید نے ایک جگہ گاڑی روک لی۔ گاڑی کی بتیاں روشن تھیں ان کی روشنی سامنے ایک گودام نما عمارت پر پڑ رہی تھی۔ جمشید نے بتیاں گل کر دیں اور گاڑی سے اترتے ہوئے بولا۔ ”مال اس شیڈ کے اندر ہے۔“

یہ ایک ویران سا شیڈ تھا اس کا دروازہ اکھڑ کر ایک طرف گڑا پڑا تھا۔ جمشید نے جیب سے نارچ نکال کر روشن کر لی تھی۔ جگہ جگہ اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے۔ ایک جگہ لوہے کی زنگ خوردہ گول پیسے والی کوئی ٹوٹی پھوٹی مشین پڑی تھی۔ اس کی دوسری جانب فرش پر پتھر کی ایک سیاہ سل رکھی ہوئی تھی۔ جمشید نے نارچ روشن کر کے ایک طرف اس طرح رکھ دی کہ اس کی روشنی پتھر کی بھاری سل پر پڑ رہی تھی۔ پھر وہ لوہے کی زنگ خوردہ مشین کے پاس گیا اور اس کے نیچے سے رسی کا ایک بڑا سا گچھا اٹھا کر لے آیا۔ رسی کا گچھا اس نے پتھر کی سل کے پاس ہی رکھ دیا اور بولا۔ ”فیروز! میرے ساتھ لگ کے اس سل کو ایک طرف ہٹا دو۔“

پتھر کی سل کافی وزنی تھی۔ ہم دونوں نے مل کر اسے بڑی مشکل سے ایک طرف کو سر کیا۔ جمشید نے نارچ اٹھا کر اس گول سوراخ کے اندر روشنی ڈالی جو پتھر کی سل کے نیچے نمودار ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ ”مال نیچے اینٹوں کے ڈھیر کے نیچے ٹین کے ایک چوکور ڈبے میں پڑا ہے۔ تم صرف اتنا کرو کہ نیچے اتر کر ڈبہ اوپر لے آؤ میں نیچے رسی لٹکاتا ہوں رسی کو میں اوپر سے پکڑے رکھوں گا۔“

اس نے رسی کا گچھا کھولا تو وہ رسی کی ایک میٹر بھی تھی۔ اس نے رسی کی میٹر بھی نیچے تہہ خانے میں لٹکا دی اور اس کا دوسرا سر اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ میں نے

نیچے جھانک کر دیکھا۔ نیچے کوئی پندرہ فٹ کی گہرائی میں اینٹوں کی ایک ڈھیری نظر آ رہی تھی۔ جمشید بولا۔ ”فکر نہ کرنا۔ میں نے رسی کو اپنے جسم کے گرد مضبوطی سے لپیٹ لیا ہے۔ عبدل بھی اسی طرح نیچے اتر کر تا تھا۔“

جمشید کا بدن بھاری تھا اور اس معاملے میں وہ مجھ سے دو گنی طاقت والا تھا۔ اس نے رسی کا سر بالکل ایسے جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا جس طرح رسہ کشی کے کھیل میں سب سے آخری آدمی نے رسہ جسم کے گرد لپیٹا ہوتا ہے۔ اس نے رسی اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنا ایک پاؤں آگے کو جما لیا تھا۔

وہ ایک ہاتھ سے نیچے تہہ خانے میں نارچ کی روشنی ڈالے ہوئے تھا۔ میں نے رسی کو پکڑا اور اس کے چھوٹے چھوٹے زینوں پر پاؤں رکھتا نیچے اترنے لگا۔ تہہ خانے کی فضا میں عجیب قسم کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ اوپر سے جمشید کہہ رہا تھا۔ ”اینٹوں کے ڈھیر کی دائیں جانب دو چار اینٹوں کے نیچے ٹین کا چوکور ڈبہ پڑا ہوگا۔ بس اسے اٹھا کر واپس اوپر چڑھ آنا میں نارچ کی روشنی ڈال رہا ہوں.....“

جمشید میرا ایسا جگر یار تھا کہ اس کی خاطر میں بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا تھا۔ یہ تو محض ایک پندرہ فٹ گہرے ایک اندھیرے تہہ خانے میں اترنے کی بات تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میرے پاؤں نیچے اینٹوں کے ڈھیر سے ٹکرائے۔ اوپر سے نارچ کی روشنی پڑ رہی تھی۔ میں نے رسی کی میٹر بھی کو چھوڑ دیا اور اینٹوں کے ڈھیر کی دوسری طرف آ گیا۔ اوپر سے جمشید کی آواز آئی۔ ”بس اسی جگہ الگ سے چار اینٹیں پڑی ہیں۔ ٹین کا ڈبہ ان اینٹوں کے درمیان رکھا ہوا ہے۔“

میں نے جھک کر دیکھا۔ وہاں کچھ اینٹیں ضرور پڑی تھیں۔ میں نے انہیں دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر ایک طرف پھینکا ان کے نیچے سوائے مزید اینٹوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے جمشید کو آواز دے کر کہا۔ ”یہاں کوئی ڈبہ نہیں ہے۔“

اوپر سے جمشید کی آواز آئی۔ ”دوسری طرف دیکھو۔ شاید وہاں پڑا ہوگا۔“

میں اینٹوں کے ڈھیر کی دوسری جانب آگیا وہاں بھی دس بارہ اینٹوں کو ہٹا کر دیکھا۔ وہاں بھی نیچے سوائے اینٹوں اور پتھروں کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے دوبارہ جمشید کو آواز دی اور کہا۔ ”یہاں بھی کچھ نہیں ہے۔“

اوپر سے جمشید کی آواز آئی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے خود ڈبہ مال سے بھر کر یہاں رکھا تھا۔ ذرا اچھی طرح سے دیکھو۔“

جمشید نے اوپر سے نارچ کی روشنی ڈال رکھی تھی۔ میں نے اس کی روشنی میں اینٹوں کے ڈھیر کو چاروں طرف سے اینٹوں کو ہٹا ہٹا کر دیکھا مگر وہاں مجھے کوئی ڈبہ نہ ملا۔ میں نے کہا۔ ”جمشید! یاد کرو۔ تم نے ڈبہ کسی دوسری جگہ تو نہیں چھپایا تھا؟“

اوپر سے جمشید نے کہا۔ ”ایسا کرو کرنے میں جا کر دیکھو۔ کہیں میں نے غلطی سے کوئے میں نہ رکھ دیا ہو۔“

اس نے نارچ کی روشنی کوئے میں پھینکی۔ کوئے میں بھی اینٹ، پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ میں کوئے میں جا کر جھک کر دیکھنے لگا۔ اچانک نارچ کی روشنی بجھ گئی۔ بالکل ایسے جیسے گھروں میں کبھی کبھی اچانک بجلی چلی جاتی ہے۔ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”نارچ کیوں بجھادی؟ نارچ روشن کرو۔ مجھے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا۔“

جمشید نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کنوئیں نما تہہ خانے کے منہ پر پتھر کی بھاری سل رکھنے کی آواز سنائی دی۔ میں دوڑ کر اس جگہ آگیا جہاں چھت کا سوراخ تھا۔ سوراخ پتھر کی سل سے بند ہو چکا تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔ ”جمشید! یہ مذاق مجھے بالکل پسند نہیں۔ سل کو ہٹاؤ اور نارچ کی روشنی ڈالو۔ مجھے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔“

میں اسے مذاق سمجھ رہا تھا۔ مگر بہت جلد مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہو گیا کہ یہ مذاق نہیں تھا۔ اوپر سے جمشید نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اسے دو تین بار آوازیں دیں مگر جمشید تو جیسے تہہ خانے کے منہ پر پتھر کی بھاری سل رکھ کر جا چکا تھا۔ میں نے

دونوں ہاتھ فضا میں ادھر ادھر ہلائے کہ اگر رسی لٹک رہی ہو تو اس کے سہارے اوپر چڑھ کر پتھر کی سل کو ہٹانے کی کوشش کروں۔ مگر وہاں کوئی رسی لٹکی ہوئی نہیں تھی۔ تہہ خانے کا منہ بند کرنے سے پہلے جمشید نے رسی کو اوپر کھینچ لیا تھا۔

یقین کریں میں سنائے میں آگیا۔

میں کبھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ جمشید بھی ایسی حرکت کر سکتا ہے کہ مجھے تہہ خانے میں بند کر کے چلا جائے۔ میں تہہ خانے کے گھپ اندھیرے میں حیران پریشان بالکل ساکت کھڑا اوپر دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر جمشید کو آوازیں دینی شروع کر دیں۔ ”جمشید! بس کافی مذاق ہو چکا۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے باہر نکالو۔“

لیکن اوپر کوئی ہوتا تو مجھے جواب دیتا۔ اوپر تو موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تب مجھے یقین کرنا ہی پڑا کہ جمشید مجھے تہہ خانے میں جھوڑ کر جا چکا ہے۔ مگر اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ کیا وہ پاگل ہو گیا ہے؟ ضرور وہ پاگل ہو چکا ہے اس کے دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہو گیا ہے ورنہ وہ ایسا کبھی کر ہی نہیں سکتا تھا کہ مجھے گاڑی میں بٹھا کر اس ویران جگہ پر لائے اور تہہ خانے میں بند کر کے چلا جائے۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ جمشید نے اپنے ہوش و حواس میں ایسا نہیں کیا تو میں نے وہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ پہلے تو مجھے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اندھیرے میں اینٹ، پتھروں کے ڈھیروں کے خاکے ابھرنے لگے۔ میں اس بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ کیا واقعی جمشید نے یہاں مٹیائیں کا کوئی ڈبہ چھپایا ہوا تھا یا نہیں۔ میں نے اندھیرے میں ہی کوئے میں اینٹوں کو ادھر ادھر ہٹا کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا اسی طرح میں نے چاروں کونوں کی چھان بین کی۔ کسی جگہ بھی مجھے وہ ٹین کا ڈبہ نہ ملا جس کو حاصل کرنے کی خاطر جمشید مجھے وہاں لایا تھا۔ تو کیا یہ سب اس کی سازش تھی؟ مگر اسے یہ جال بچانے کی کیا ضرورت تھی؟ میں تو اس کا جگری دوست تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟

میں پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ جمشید کی عقل ٹھکانے نہیں رہی۔ میں نے ادھر ادھر سے اینٹیں لا کر جہاں چھت کا منہ تھا اور جو پتھر کی سل سے بند تھا اس کے بالکل نیچے جو اینٹوں کی چھوٹی سی ڈھیری تھی وہاں اینٹوں کو جوڑنا شروع کر دیا تاکہ جب ڈھیری ذرا اونچی ہو جائے تو میں اس پر کھڑے ہو کر پتھر کی سل کو ہٹانے کی کوشش کروں۔ اندھیرے میں کسی وقت نظر آتا تھا اور کسی وقت کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور اینٹیں جوڑنا رہا۔ ڈھیری ڈھائی تین اونچی ہو گئی۔ پھر میں سنبھل سنبھل کر بڑی احتیاط کے ساتھ ڈھیری کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ اوپر بلند کئے۔ میرے ہاتھوں کی انگلیاں چھت کے دہانے پر رکھی ہوئی پتھر کی سل کو چھونے لگی تھیں۔

لیکن میں زور لگا کر سل کو کسی طرف کھسکا نہیں سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے سل کو ایک طرف کھسکانے کے لئے ذرا سا زور لگایا تو اینٹیں میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گئیں اور میں دھڑام سے اینٹوں کے ساتھ ہی ایک طرف گر پڑا۔ میرے ایک گھٹنے میں چوچل جم کی تھی اور وہ درد کرنے لگا تھا۔ مگر اس وقت میں نے درد کی پرواہ کئے بغیر دوبارہ اینٹوں کی ڈھیری بنانی شروع کر دی۔ مجھے کافی وقت لگ گیا۔ جب دوبارہ اینٹوں کی ڈھیری دو ڈھائی فٹ اونچی ہو گئی تو میں پہلے سے زیادہ احتیاط کے ساتھ اس کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اٹھنا شروع کیا۔ جیسے ہی میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا اینٹیں اپنی جگہ سے ہلیں اور مجھے ساتھ لے کر ساری اینٹیں نیچے گر پڑیں۔

میں سخت مایوسی کے عالم میں وہیں سر جھکا کر بیٹھ گیا اور خدا سے دعا مانگنے لگا کہ وہ مجھے اس مصیبت سے نکالے لیکن مقدر میں جو لکھا تھا اسے تو ہونا ہی تھا۔ ایک تو مجھ پر ایک ناگہانی مصیبت نازل ہو گئی تھی دوسرے مجھے یہ صدمہ بھی تھا کہ جمشید جو میرا اتنا عزیز دوست تھا اس نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا۔ کیا واقعی وہ پاگل ہو گیا تھا؟

تہہ خانے میں اترتے وقت مجھے فضا میں جو ناگوار بو محسوس ہوئی تھی وہ اب مجھے محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن اندر بند ہونے کی وجہ سے مجھے سانس لیتے وقت گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے اٹھ کر ایک بار پھر باہر نکلنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہاں جتنے اینٹ پتھر بکھرے ہوئے تھے میں نے وہ سارے اٹھا کر چھت کی سل کے نیچے ڈھیری پر جمع کر دیئے۔ اس کے باوجود ڈھیری دو ڈھائی فٹ سے زیادہ اونچی نہ ہوئی اور صرف میری انگلیاں ہی پتھر کی سل کو چھو رہی تھیں۔ صرف انگلیوں سے میں اتنی بھاری سل کو تہہ خانے کے منہ کے اوپر سے پرے نہیں ہٹا سکتا تھا۔

اس خیال سے کہ شاید وہاں سے اوپر جانے کا کوئی خفیہ راستہ بھی ہو۔ میں اندھیرے میں دیواروں کو ہاتھ پھیر پھیر کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک میرا ہاتھ ایک انسانی کھوپڑی سے ٹکرایا جو دیوار میں سے آدمی باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ میں ڈر کر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور آنکھیں سیڑ کر تار کی میں کھوپڑی کو تنکے لگا۔ عجیب بات ہے کہ کھوپڑی ایک دو سینٹ کے بعد مجھے بالکل صاف نظر آنے لگی تھی۔ اس انسانی کھوپڑی کا منہ کھلا تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو تاریک گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ اس دیوار میں یہ کھوپڑی کہاں سے آگئی ہے۔ کیا کسی نے کسی انسان کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش دیوار میں چن دی تھی؟ لیکن ایسی صورت میں دیوار میں انسانی پنجر بھی ہونا چاہئے تھا جبکہ دیوار میں صرف کھوپڑی ہی نظر آرہی تھی۔

میرے ذہن میں طرح طرح کے توہمات پیدا ہونے لگے تھے۔ کہیں اس تہہ خانے میں بھی تو کسی بدروح کا بسیرا نہیں ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جبکہ تہہ خانے میں باقی ہر جگہ گہری تاریکی تھی تو پھر اس کھوپڑی پر روشنی کہاں سے پڑ رہی تھی۔ اس سے پہلے وہاں روشنی کا نشان تک نہیں تھا۔ میرے ہاتھ لگانے کے بعد کھوپڑی پر دھیمی دھیمی روشنی سی آگئی تھی۔ میں خوف زدہ نظروں سے دیوار میں سے ابھری ہوئی کھوپڑی کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے پھنکار کی آواز سنائی دی۔ یہ کسی سانپ

کی پھنکار تھی اور بڑی غصیلی اور غضب ناک آواز تھی۔ میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میری خوف زدہ نظریں کھوپڑی پر جمی ہوئی تھیں کیونکہ مجھے پھنکار کی آواز اس کھوپڑی میں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ ہی میں نے ایک منظر دیکھا جسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ کھوپڑی کے منہ میں سے ایک کالا سانپ نکلا اور اس نے اپنا پھن کھول کر کھوپڑی کی پیشانی پر ڈنسا شروع کر دیا۔ کھوپڑی کے حلق میں سے کراہنے کی بڑی دردناک آوازیں نکلنے لگیں۔ اب میں واقعی بہت خوف زدہ ہو گیا تھا اور خوف کے مارے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میرے پاؤں ایک ایک من بھاری ہو گئے تھے۔ میں نے دوڑ کر سامنے والی دیوار کے پاس جانے کی کوشش کی لیکن میرے پاؤں نے ہلنے سے انکار کر دیا جیسے زمین نے میرے پاؤں جکڑ لئے تھے۔ سانپ اب دیوار سے آدھی باہر نکلی ہوئی انسانی کھوپڑی کے اوپر کنڈلی مار کر بیٹھا تھا۔ اس کا پھن پھیلا ہوا تھا اور اس کے ہونٹوں پر سرخ خون لگا ہوا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد پھنکار رہا تھا۔ پھر اچانک سانپ نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ میرے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔

دوسرے لمحے میں نے دیکھا کہ جیسے ہی سانپ میرے چہرے سے ٹکرایا کسی نے جیسے اسے دُم سے پکڑ کر زور سے دیوار کے ساتھ پٹخ دیا۔ سانپ کے دیوار کے ساتھ ٹکراتے ہی ایک بھیاںک انسانی چیخ بلند ہوئی اور سانپ بھی غائب ہو گیا اور دیوار میں سے ابھری ہوئی کھوپڑی بھی غائب ہو گئی۔ میں نے دل میں کلمہ پاک کا ورد شروع کر دیا تھا کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ سب بد روحوں کا کھیل ہے جو مجھ پر حملہ کر رہی ہیں اور قدرت مجھے ان سے محفوظ رکھ رہی ہے۔ تہہ خانے کی کھٹن بہت بڑھ گئی تھی اور اب میرے لئے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ میں ایسے جلدی جلدی سانس لے رہا تھا جیسے آدمی نزع کے عالم میں ہو۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ تہہ خانے کی فضا میں سے

آکسیجن غائب ہونا شروع ہو گئی ہے۔

میرے اندازے کے مطابق اتنی جلدی تہہ خانے سے آکسیجن کم نہیں ہونے چاہئے تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ کوئی غیبی طاقت فضا کی آکسیجن کو جذب کر رہی ہے۔ میرا سانس اکھڑنا شروع ہو گیا مجھے اپنے کانوں میں گھنٹیوں اور چیخوں کی آوازیں آنے لیں۔ آنکھوں کے آگے ڈراؤنی شکلیں گردش کرنے لگیں۔ پھر مجھ پر نیم بے ہوشی طاری ہو گئی اور میں کھڑے کھڑے وہیں اینٹوں کے ڈھیر پر گر پڑا۔ میں کچھ ہوش میں تھا۔ کچھ ہوش میں نہیں تھا۔ میری آنکھیں نیم داغ تھیں۔ یعنی تھوڑی سی کھلی ہوئی تھیں۔ مجھے تہہ خانے کی تاریکی میں دیوار کا دھندلا دھندلا خاکہ نظر آ رہا تھا۔

اس دیوار میں سے ایک سایہ دھوئیں کی طرح لہراتا ہوا نمودار ہوا۔ دیوار سے باہر آتے ہی اس سائے نے ایک بھیڑیے کی شکل اختیار کر لی جس کی سرخ آنکھوں میں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ پھر سائے نے ایک مگر مجھ کی شکل اختیار کر لی جو منہ پھاڑے میری طرف بڑھ رہا تھا جیسے مجھے اپنے نوکیلے دانتوں میں دبوچ لے گا۔ یہ مگر مجھ میرے قریب آتے آتے ایک سیاہ فام عورت بن گئی جس کے جبروں سے خون کے قطرے اس کے جسم پر ٹپک رہے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں چھریاں تھیں۔ ان چھریوں کے ساتھ بھی خون لگا ہوا تھا۔ وہ اپنے زرد نوکیلے دانت نکالے غراتے ہوئے میری طرف بڑھ رہی تھی۔

میں جانتا تھا وہ مجھے قتل کرنے والی ہے مگر میں پتھر کی طرح پڑا تھا اور اپنی جگہ سے ذرا سی بھی حرکت نہ کر سکتا تھا۔ میرے پاس آکر اس نے دونوں چھریوں والے ہاتھ اوپر اٹھائے اور ایک چیخ کے ساتھ میرے سینے اور پیٹ پر وار کیا۔ لیکن ابھی اس کی چھریاں میرے جسم سے ایک فٹ اونچی ہوں گی کہ اس سیاہ فام چڑیل نما عورت کے حلق سے نکلتی چیخ آدھی اس کے حلق کے اندر ہی رہ گئی اور اس کی گردن ایسے کٹ کر

اس کے کندھوں سے نیچے گر پڑی جیسے کسی غیبی انسان نے اس کی گردن پر تلوار کا بھرپور وار کیا ہو۔

سیاہ فام عورت کا سر دھڑ سے الگ ہو گیا تھا۔ سر زمین پر گرا ہوا تھا مگر دھڑ اپنی جگہ پر اسی طرح کھڑا تھا۔ میں ادھ کھلی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی کئی ہوئی گردن میں سے خون نکل نکل کر اس کے جسم پر آبشاروں کی طرح بہہ رہا تھا۔ پھر اس کا دھڑ کھڑے کھڑے ایسے کانپنے لگا جیسے اس پر لرزہ طاری ہو گیا ہو۔ اچانک سیاہ فام عورت کی کئی ہوئی گردن کے اندر سے ایک سیاہ سانپ خون آلود شاہ رگ کی طرح تڑپ کر باہر نکلا اور اس نے پھن کھول کر پھنکار ماری اور عورت کے سینے پر تین چار مرتبہ ڈس لیا۔ عورت کا جسم کھڑے کھڑے موم کی طرح پگھل کر بہنے لگا اور چند لمحوں کے اندر اندر سیاہ فام عورت کا مردہ دھڑ پانی کی طرح بہتے بہتے غائب ہو گیا۔ پھر دیوار میں میری نگاہوں کے بالکل سامنے روشنی کا ایک گولہ نمودار ہوا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ روشنی کے اس دائرے میں باغ کا ایک راستہ بنا ہوا تھا جس کی دونوں جانب پھولوں والی کیاریاں تھیں۔

روشنی کے اس دائرے کی طرف سے تازہ ہوا آ کر میرے چہرے کو چھونے لگی۔ اس ہوا میں خدا جانے کیا طاقت تھی کہ میرے جسم کی کھوئی ہوئی توانائی واپس آ گئی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر میں اٹھا اور خداوند کریم کی اس غیبی امداد پر اس کا شکر ادا کرتے روشنی کے دائرے کے اندر چلا گیا۔ روشنی کے دائرے کے اندر آتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک خوشنما خوب صورت باغ میں ہوں جس کے آسمان پر موتیوں کی طرح تارے چمک رہے ہیں۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے کوئی تہہ خانہ اور تہہ خانے کی دیوار نہیں تھی۔ پیچھے بھی اسی باغ کی ایک خوبصورت روش تھی جس پر ستاروں کی روشنی پڑ رہی تھی۔ میں کھڑے ہو کر حیرت سے دائیں بائیں دیکھنے لگا کہ میں کہاں تھا اور کہاں آ گیا ہوں۔ اگر قدرت خداوندی میری مدد نہ کرتی تو خدا جانے

میرا اس بند تہہ خانے میں کیا حشر ہوتا۔ جمشید تو مجھے اس دوزخ میں ڈال کر چلا گیا تھا۔ میں حیران تھا کہ آخر اس نے مجھ سے کس جنم کا بدلہ لیا تھا کہ مجھے ایسی ہلاکت خیز جگہ پر پھینک گیا تھا۔ میں باغ میں سے باہر ایک سڑک پر آ گیا تھا۔ میں نے اتنی سعی کر لی تھی کہ میں بمبئی شہر میں ہی تھا۔

O

پرل کے علاقے میں جانا تھا جہاں میرے دشمن دوست جشید کی گیراج نمادکان اور اوپر فلیٹ تھا۔ کولایہ پہنچ کر میں ٹرک سے اتر گیا۔ بمبئی بہت وسیع شہر تھا۔ ساری رات سڑکوں پر ٹیکسیاں وغیرہ چلتی رہتی تھیں۔ میری جیب میں پیسے موجود تھے۔ میں نے ایک ٹیکسی لی اور پرل کے علاقے میں جشید کے فلیٹ کے باہر آکر ٹیکسی چھوڑ دی۔

جشید کا گیراج بند تھا۔ ایک طرف اس کی پرانی گاڑی کھڑی تھی۔ جشید کے فلیٹ کو سیڑھیاں جاتی تھیں اور سیڑھیوں کے دروازے پر گھنٹی کا بٹن لگا ہوا تھا۔ اس بٹن کے اوپر رات کے وقت ایک سرخ بتی جلتی رہتی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ جی تو میرا چاہتا تھا کہ میرے پاس بھری ہوئی بندوق ہو اور گھنٹی بجانے پر جب جشید نیچے آئے تو میں اسے فوراً گولی سے اڑا دوں۔ میں گھنٹی کا بٹن دبانے کے لئے آگے بڑھا تو میں نے دیکھا کہ جشید کی گاڑی کا بونٹ ایک طرف سے اوپر کواٹھا ہوا تھا اور گاڑی کا سارا انجن غائب تھا۔

میں نے دل میں جشید کو گالی دی اور سوچا کہ کس قدر عیار شخص ہے یہ جشید..... مجھے اندھے تہہ خانے میں مرنے کے لئے چھوڑ کر آنے کے بعد اس نے گاڑی کا انجن نکلا کر ایک طرف رکھوا لیا تاکہ اگر میں اس پر کسی قسم کا الزام لگا دوں تو وہ کہہ سکے کہ میری گاڑی کا تو انجن ہی نکلا ہوا ہے میں تمہارے پاس گاڑی لے کر سینما ہاؤس کیسے آسکتا تھا۔

میں نے کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ فلیٹ میں اوپر کسی جگہ گھنٹی بجی جس کی دھیمی سی آواز مجھے وہاں کھڑے کھڑے بھی سنائی دی۔ تیسری گھنٹی پر جشید نے فلیٹ کی بازار والی کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا اور نیند بھری آواز میں پوچھا۔ ”کون ہے اس وقت؟“ جشید کی آواز سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ میرا جی اسے وہ تمام گالیاں دینے کو چاہا جو میں بچپن سے لے کر اس وقت تک سنی تھیں۔ مگر میں نے اپنے غصے پر ضبط

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

رات کے تین بج رہے تھے۔ پہلے تو میرا جی چاہا کہ وہیں سے بمبئی کے ریلوے اسٹیشن پر چلا جاؤں اور پنجاب کو جاتی جو پہلی ٹرین ملے اس میں سوار ہو کر اپنے شہر امرتسر پہنچ جاؤں اور جشید ایسے بے وفا بلکہ دشمن دوست کی پھر کبھی شکل تک نہ دیکھوں۔ پھر خیال آیا کہ کم از کم ایک بار تو اس کے پاس ضرور جا کر اسے ذلیل کروں اور اس سے پوچھوں کہ آخر میں نے اس کے ساتھ کیا برائی کی تھی جس کا اس نے مجھ سے یوں بدلہ لیا کہ مجھے اندھے تہہ خانے میں بند کر کے موت کے حوالے کر دیا۔ سڑک دونوں جانب دور دور تک خالی پڑی تھی۔ کھبوں کی بتیاں روشن تھیں۔ یہ بمبئی شہر سے باہر جانے والی کوئی سڑک تھی۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں بمبئی کے کس علاقے میں ہوں۔ میں نے یونہی ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ پیچھے سے کسی گاڑی کی مجھ پر روشنی پڑی۔

میں نے رک کر پیچھے دیکھا۔ کوئی بہت بڑا ٹرک آ رہا تھا۔ میں نے اس خیال سے اسے ہاتھ دے دیا کہ شاید رک جائے۔ مجھے بہت کم امید تھی مگر ٹرک مجھ سے تھوڑا آگے جا کر رک گیا۔ میں دوڑ کر اس کے پاس گیا۔ ڈرائیور نے کھڑکی میں سے سر نکال کر پوچھا۔ ”میں کولایہ جا رہا ہوں۔ جانا ہے تو پیچھے بیٹھ جاؤ۔“

میں نے کہہ دیا کہ مجھے بھی کولایہ جانا ہے۔ اور میں ٹرک کے پیچھے جا کر اس پر چڑھ گیا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ ٹرک چل پڑا۔ حالانکہ مجھے کولایہ نہیں جانا تھا بلکہ

میری مدد نہ کرتی تو صبح تک وہاں میری لاش کو چپو نیٹیاں کھا رہی ہوتیں۔“
جمشید حیران ہو کر میری صورت تک رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ”تم کس اندھے کنوئیں کا ذکر کر رہے ہو؟ میں نے تمہارے ساتھ کون سا ڈرامہ کھیلا ہے۔ میں تو جب سے تم میٹر و سینما ہاؤس میں فلم دیکھنے گئے ہو اس وقت سے لے کر اب تک اپنے گیراج اور فلیٹ پر ہی ہوں۔ ایک لمحے کے لئے یہاں سے نہیں گیا۔“

میں نے کہا۔ ”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کیا تم گاڑی لے کر میٹر و سینما نہیں آئے تھے اور وہاں سے مجھے گاڑی میں بٹھا کر یہ کہہ کر ایک دیران شیڈ میں نہیں لے گئے تھے کہ دوئی سے ایک پارٹی مال لینے آئی ہے.....“
جمشید پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ”میری گاڑی تو انجن کے بغیر باہر پڑی ہے۔ میں تو پرسوں سے اس کا انجن اور ہال کر رہا ہوں۔ بے شک نیچے جا کر دیکھ لو۔ گاڑی کا انجن نہیں ہے۔“

جب میں نے اسے پورا واقعہ بیان کیا تو جمشید مجھے ایسے دیکھنے لگا جیسے اسے میری دماغی حالت کے نارمل ہونے پر شک پڑ گیا ہو۔ کہنے لگا۔ ”فیروز! میں نے زندگی میں کبھی منشیات کا کام نہیں کیا۔ میرے پاس کوئی دوئی والی پارٹی نہیں آئی۔ میں تمہارے پاس میٹر و سینما نہیں پہنچا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”تو پھر وہ کون تھا؟ وہ تم ہی تھے۔ تم..... جمشید تھے۔ کیا میں تمہیں پہچانتا نہیں؟“

جمشید کہنے لگا۔ ”تم کہہ رہے ہو کہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ میرا نوکر عبدل اپنی بیمار ماں کی خبر گیری کرنے ناسک گیا ہوا ہے۔ نوکر عبدل کہیں نہیں گیا جا کر دیکھ لو۔ وہ نیچے گیراج میں سو رہا ہے۔ وہ گزشتہ کئی مہینوں سے ناسک نہیں گیا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہ سب کچھ کیا کہہ رہے ہو۔“

جمشید کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ آدمی جھوٹ بول رہا ہو تو اس

کرتے ہوئے اسے صرف اتنا ہی کہا۔ ”نیچے آؤ۔“
جمشید نے مجھے دیکھا تو بولا۔ ”تم اوپر کیوں نہیں آ جاتے۔ کہاں تھے تم؟“
میں نے طیش میں آ کر کہا۔ ”جس قبر میں تم مجھے زندہ دفن کر آئے تھے میں وہیں تھا۔“

”یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ میں آ رہا ہوں۔“ جمشید نیچے آ گیا۔ جیسے ہی وہ میرے سامنے آیا میں نے زور سے اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارا اور دوسرے ہاتھ سے تھپڑ مارنے ہی والا تھا کہ جمشید نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”پاگل ہو گئے ہو؟ لگتا ہے بہت شراب پی رکھی ہے تم نے..... چلو..... اوپر چلو۔“

میں نے غصے میں اسے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ وہ مجھے کھینچتا ہوا، گھینٹا ہوا اوپر لے گیا اور مجھے صوفے پر گراتے ہوئے بولا۔ ”یہ تم نے شراب کب سے شروع کر دی ہے؟“

میں نے اسے گالی دے کر کہا۔ ”میں نے شراب نہیں پی۔ اگر شراب پی ہوتی تو میں تمہیں دیکھتے ہی قتل کر ڈالتا.....“

جمشید نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ میں نے شراب نہیں پی ہوئی۔ شاید اس لئے کہ میرے منہ سے شراب کی بالکل بو نہیں آرہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے مجھے سنبھالا اور بولا۔ ”فیروز! فیروز! خدا کے لئے ہوش میں آ جاؤ۔ مجھے بتاؤ آخر بات کیا ہوئی ہے۔ ٹھیک ہے تم نے شراب نہیں پی رکھی۔ لیکن تم مجھے کیوں گالیاں دے رہے ہو؟ میں نے کیا کیا ہے؟“

میں نے بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پا لیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”جمشید! پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے مجھ سے کس چیز کا بدلہ لیا ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ ایسا کون سا برا سلوک کیا تھا کہ تم مجھے درغلا کر مال لانے کے بہانے دیران علاقے میں لے گئے اور پھر ایک جھوٹا ڈرامہ کھیل کر مجھے ایک اندھے کنوئیں میں پھینک کر آ گئے؟ اگر قدرت

کا پتہ چل جاتا ہے اور جمشید تو میرا بچپن کا دوست تھا۔ میں اس کے مزاج کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ آخر وہ کون تھا جو جمشید بن کر میرے پاس آیا تھا اور مجھے ہلاک کرنے کے لئے اندھے تہہ خانے میں پھینک گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ ان بدروحوں کا کام تو نہیں تھا جو مجھے رانی بائی کے قلعے کی حسین روح یا بدروح کو مرتبان سے آزاد کرنے کی وجہ سے میری جان کی دشمن بن گئی تھیں اور اس سے پہلے بھی مجھے دوبار ہلاک کرنے کی کوشش کر چکی تھیں۔

چونکہ میں نے جمشید سے قلعہ رانی بائی میں اپنے ساتھ گزرے ہوئے مافوق الفطرت واقعات کا بالکل ذکر نہیں کیا تھا اس لئے اب بھی میں نے اسے یہ نہ بتایا کہ ویران علاقے کے اندھے تہہ خانے میں میرے ساتھ کیا گزری اور پھر کیسے دیوار میں روشنی کا ایک دائرہ اپنے آپ ظاہر ہو گیا اور اس دائرے کے اندر باہر جانے کا راستہ مل گیا۔

اس خیال سے کہ جمشید اس واقعے کو میری دماغی کمزوری پر محمول نہ کرے میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے یہ کسی جن، بھوت یا آسیب کی کارستانی ہے۔ ایک بار امرتسر میں جب میں چھوٹا سا تھا تو پہلے بھی ایک جن مجھے گھر سے اٹھا کر بڑی نہر پر لے گیا تھا اور وہاں مجھے نہر کی سیر کروانے کے بعد گھر لا کر چھوڑ گیا تھا۔“

جمشید نے انتہائی تعجب کے ساتھ کہا۔ ”شاید ایسا ہی ہوا ہو۔ لیکن کسی جن بھوت کو کیا ضرورت تھی کہ وہ میری شکل بنا کر تمہارے پاس میٹرو سٹما ہاؤس میں آتا۔ وہ ویسے بھی تمہیں وہاں سے اٹھا کر لے جاسکتا تھا۔“

یہ بات میری سمجھ سے بھی باہر تھی۔ میں اس کے بعد وہیں صوفے پر ہی سو گیا۔ دوسرے روز گیارہ بجے اٹھا۔ نیچے جا کر جمشید کی گاڑی کا بغور معائنہ کیا۔ اس کی گاڑی کا انجن غائب تھا۔ یہ وہی گاڑی تھی جس پر جمشید کی شکل کا جن بھوت یا وہ جو کوئی بھی تھا سوار ہو کر میرے پاس میٹرو سٹما آیا تھا۔ لیکن جمشید کے ایک مستری نے مجھے بتایا

کہ جمشید صاحب کی گاڑی کا انجن تو تین روز سے باہر نکلا ہوا ہے۔

میرے ساتھ اوپر تلے دو تین اس قسم کے واقعات گزرے تو میں گھبر گیا۔ جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ قلعہ رانی بائی کے زرد پوش کاہن کی بدروح میری دشمن بن گئی ہے کیونکہ میں نے قلعے کی حسین و جمیل رانی کی روح یا بدروح کو اس مرتبان سے آزاد کر دیا ہے جس میں زرد پوش کاہن نے رانی کو قتل کرنے کے بعد بند کر کے چبوترے کے شکاف میں چھپا دیا تھا۔ زرد پوش کاہن کی بدروح اپنی غلام بدروحوں سے تین بار مجھ پر قاتلانہ حملہ کر اچکی تھی لیکن قدرت کی کوئی خفیہ طاقت میری مدد کر رہی تھی اور اس نے ہر بار مجھے اس شیطانی زرد پوش کی بدروح کے حملے سے بچا لیا تھا۔

میں نے سوچا کہ میں بمبئی سے چلا ہی جاؤں تو اچھا ہے۔ یہاں رہا تو زرد پوش شیطان میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس زرد پوش پجاری کا نام رانی بائی کے قلعے والی پر اسرار حسین عورت کی روح نے رگو بتایا تھا۔ اُس حسین عورت نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا تھا لیکن اس نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ تم نے مجھے مرتبان سے آزاد کر دیا ہے اس کی وجہ سے رگو تمہاری جان کا دشمن بن گیا ہے۔ وہ تمہیں جان سے مار دینے کی ہر ممکن کوشش کرے گا لیکن تمہاری حفاظت مجھ پر فرض ہو گئی ہے۔

میں نے ان حالات کے پیش نظر فیصلہ کر لیا کہ بمبئی میں نہیں رہوں گا، واپس امرتسر چلا جاؤں گا۔ ویسے بھی حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے تھے۔ پنجاب کے ایک دو شہروں میں فسادات بھی شروع ہو گئے تھے۔ جب میں نے جمشید سے کہا کہ میرا امرتسر واپس جانے کا ارادہ ہے تو اس نے کسی قسم کا اعتراض نہ کیا بلکہ کہنے لگا۔ ”میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ امرتسر جا کر اپنی تھوڑی سی جو زمین اور پھلوں کا ایک باغ ہے وہ فروخت کر ڈالو۔ حالات کا کچھ پتہ نہیں ہے پاکستان ضرور بن جائے گا، پھر لگتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو ہندوستان کے شہروں اور دیہات میں نہیں رہنے

ذیں گے۔ ہو سکتا ہے امر تر کے مسلمانوں کو بھی لاہور یعنی پاکستان کی طرف ہجرت کرنی پڑ جائے۔“

ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے آخر میں ایک روز بمبئی سے امر تر کی جانب روانہ ہو گیا۔ 1947ء شروع ہو چکا تھا۔ جنوری کا مہینہ تھا پنجاب میں اس موسم میں بہت سردی پڑتی ہے۔ حالات ابھی نارمل تھے فضا میں کشیدگی ضرور تھی۔ گھر آکر میں نے دکان پر کاروبار سنبھال لیا۔ امر تر میں مسلم لیگ کے جلے جلوس ضرور نکلتے تھے مگر ابھی فسادات شروع نہیں ہوئے تھے۔ میں نے جب اپنے چچا سے زمین اور باغ فروخت کر دینے کی بات کی تو اس نے اس کی مخالفت کی۔ کہنے لگا۔ ”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ہمارے پاس اس تھوڑی سی زمین اور باغ کے سوا اور ہے کیا؟ یہ بھی بیچ دیا تو کھائیں گے کہاں سے؟“

میں نے چچا کو سمجھانے کی کوشش کی کہ حالات کا کچھ پتہ نہیں کب بدل جائیں اور ہمیں امر تر سے ہجرت کر کے پاکستان جانا پڑے۔ مگر چچا نہ مانا۔ مارچ کے مہینے میں فسادات شروع ہو گئے۔ پھر فسادات کی آگ بھڑکتی ہی چلی گئی۔ کرفیو لگنے لگے۔ چچا کو نہ جانے کیا سوچھی کہ اپنے بال بچوں کو لے کر جموں چلا گیا۔ وہاں اس کے چھوٹے بھائی کا بڑا وسیع کاروبار تھا۔ چچا یہ کہہ کر جموں گیا کہ جب حالات بہتر ہو جائیں گے تو وہ امر تر واپس آجائے گا۔

میں پیچھے اکیلا رہ گیا۔ دکانداری ختم ہو چکی تھی۔ میرا سارا دن محلے کے لوگوں کے ساتھ بیٹھے گزرتا۔ فسادات تیز ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ 14 اگست کا دن قریب آ گیا۔ مشرقی پنجاب سے مہاجرین کے لئے پٹے قافلے پاکستان کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ ہمارا محلہ ہندو، سکھوں کے محلوں میں گھرا ہوا تھا۔ حملے کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ لیکن امر تر کے مسلمان بڑی دلیری کے ساتھ فسادوں کے ہر حملے کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ لیکن جب ڈوگرہ اور ہندو گورکھا فوج بھی فسادوں کے ساتھ مل

گئی تو حالات نازک شکل اختیار کر گئے۔ پھر بھی ہماری گلی کے مسلمان پاکستان ہجرت کرنے کے لئے ان ٹرکوں کے انتظار میں تھے جنہوں نے انہیں پاکستان پہنچانا تھا۔ ٹرک تو کوئی نہ آئے مگر ڈوگرہ فوج آگئی۔ فوج نے دستی بموں سے گلی کے منہ پر چڑھا ہوا بوجھ کا دروازہ اڑا دیا۔ گلی میں افرا تفری مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا دوڑ پڑا۔ میں بھی ایک مکان کے خفیہ دروازے میں سے نکل کر ساتھ والے بازار میں آ گیا۔ شام کا وقت تھا۔ بازار سنسان پڑا تھا، کہیں کہیں انسانوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ سامنے ایک مکان میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ریلوے لائن کے پار مہاجرین کا ایک کیمپ تھا جہاں سے مہاجرین کو مال گاڑیوں کے ذریعے واپس پاکستان کے بارڈر تک پہنچایا جاتا تھا۔ میں اس کیمپ میں جانا چاہتا تھا۔

میں آبادی کو چھوڑ کر ویران کھیتوں میں سے دوڑ کر گزر تاریلوے لائن پر آ گیا۔ وہاں سے مہاجرین کیمپ ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا جا رہا تھا۔ ریلوے لائن کی دوسری طرف آموں کا باغ تھا۔ وہاں شام کا اندھیرا اچھایا ہوا تھا۔ اچانک مجھے ”جے بجرنگ بلی“ کے نعروں کی آواز سنائی دی۔ میں زیادہ تیز دوڑنے لگا۔ اتنے میں آموں کے باغ میں سے ہندو، سکھ فسادوں کا ایک جتھہ تلواریں، بندوقیں اور نیزے لہراتا نمودار ہوا۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا اور مجھے قتل کرنے ہی والے تھے کہ ایک ہندو نے کہا۔ ”اسے شمشان بھومی میں لے چلو۔ ہم اسے ستی کریں گے۔“

انہوں نے میرے گلے میں رسی باندھی اور مجھے کھینچتے ہوئے واپس آموں کے باغ میں لے آئے۔ یہاں سے وہ مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف نعرے لگاتے ایک ویران جگہ پر آ گئے جہاں شروع رات کے ٹیالے اندھیرے میں ایک احاطہ سا نظر آ رہا تھا۔ وہ مجھے احاطے کے اندر لے گئے۔

یہ اصل میں شمشان بھومی کی چار دیواری تھی جہاں ہندو لوگ اپنے مردوں کو جلاتے تھے۔ وہاں ایک طرف چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ کوٹھڑی کے دروازے پر ہلکی

روشنی والا بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ اس کی کمزوری روشنی میں، میں نے ایک چبوترہ دیکھا جس پر لکڑیاں چنی ہوئی تھیں۔ جب کسی مردے کو جلانا ہوتا تھا تو چبوترے پر لکڑیوں کا فرش بچھا کر مردے کو اس پر لٹادیا جاتا تھا اور پھر اس کے اوپر بھی دو تین فٹ اونچی لکڑیاں چن دی جاتی تھیں اس کو چتا کہتے تھے۔ اس کے بعد مردے کا کوئی بیٹا یا قریبی عزیز چتا کی لکڑیوں پر گھی یا تیل چھڑک کر لکڑیوں کو آگ دکھاتا تھا اور چتا مردے سمیت جلنے لگتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ چتا میں پہلے سے کوئی مردہ موجود ہے جس کو کسی وجہ سے ابھی جلایا نہیں گیا۔

وہ وجہ دوسرے ہی لمحے میری سمجھ میں آگئی۔ ان ہندو غنڈوں کو کسی ایسے مسلمان کی تلاش تھی جس کو ہندو مردے کے ساتھ جلایا جائے۔ میں انہیں ایک ایسا مسلمان مل گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے پکڑ کر چتا کی ایک جانب لٹادیا اور میرے ہاتھ اور پاؤں چتا کی لکڑیوں کے بڑے بڑے ٹڈھوں کے ساتھ لوہے کی تار سے باندھ دیئے۔ میں سمجھ گیا کہ میرا آخری وقت آن پہنچا ہے اور قدرت نے میری موت اسی طرح لکھی تھی۔ میں نے اس مردے کو بھی دیکھ لیا تھا جو میری دائیں جانب لکڑیوں کی دو تین تہوں کے نیچے پڑا مجھے نظر آگیا تھا۔

وہ مرا ہوا تھا۔ میں انسان تھا۔ مگر مجھے اس مردے کے ساتھ جل کر راکھ ہونا تھا جس کا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا مگر اب ایسا میرے ساتھ ہونے والا تھا، بلکہ ہو رہا تھا۔ ہندو غنڈوں میں سے ایک غنڈے کے ہاتھ میں ہاکی تھی۔ اس نے ”جے بجرنگ بلی“ کا نعرہ لگا کر کہا۔ ”اس مُسلے کو جلادو۔“

اس کے ساتھ ہی ایک غنڈہ کو ٹھڑی میں سے تیل کا کنسٹر اٹھا کر لایا اور لکڑیوں پر تیل چھڑکنا شروع کر دیا۔ باقی غنڈے نعرے لگا رہے تھے۔ ایک نے چتا کو آگ لگا دی۔ تیل کی وجہ سے لکڑیوں نے فوراً آگ پکڑ لی۔ غنڈے چتا کے چبوترے کے ارد گرد وحشیوں کی طرح ناچنے لگے۔

مجھے اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ میں نے کلمہ پاک کا ورد شروع کر دیا۔ مجھے اپنے خدا پر یقین تھا کہ جب تک وہ نہیں چاہے گا مجھے دنیا کی کوئی طاقت ہلاک نہیں کر سکے گی۔ لیکن آگ کے شعلے میری چاروں طرف بلند ہو رہے تھے۔ ان شعلوں نے میرے ارد گرد ایک دیوار بنادی تھی۔ میں اس بات پر حیران تھا کہ مجھے ان شعلوں کا سینک محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں لکڑیوں کے بھاری ٹڈھوں کے ساتھ جکڑے ہوئے تھے۔ میں اٹھ کر بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ ہندو غنڈوں کے نعروں کی آواز اب دور چلی گئی تھی۔ وہ مجھے سپرد آتش کر کے شاید جا چکے تھے۔

اچانک ایسی بات ہوئی جس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے ہاتھ پاؤں کھول رہا ہے۔ دوسرے لمحے میرے ہاتھ پاؤں رسیوں سے آزاد ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں کسی عورت کی سرگوشی کی آواز آئی۔ ”چتا پر سے کود جاؤ۔“

میں اٹھا اور چتا کے شعلوں میں سے باہر چھلانگ لگا دی۔ میں زمین پر گرا۔ میرے کپڑے اور جسم بالکل صحیح سلامت تھا۔ آگ کے شعلوں نے جیسے انہیں چھوا تک نہیں تھا۔ میں نے اس عورت کی سرگوشی کو پہچان بھی لیا۔ یہ وہی ویران قلعہ نما حویلی والی آسبی عورت تھی جس کی بدروح کو میں نے مرتبان سے آزاد کر دیا تھا اور جس نے مجھے کہا تھا کہ میری حفاظت کرنا اس کا فرض بن چکا ہے۔

چتا میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ شعلوں کی روشنی میں، میں شمشان کے گیٹ کی طرف دوڑا۔ جیسے ہی گیٹ سے باہر نکلا میرے کانوں میں اس عورت کی سرگوشی ایک بار پھر سنائی دی۔ ”فیروز! اس طرف مت جاؤ۔“

اس کے فوراً بعد کسی نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور مجھے ایک طرف دھکیلنا شروع کیا۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ میرے سامنے بائیں جانب جی ٹی روڈ تھی جو پاکستان کی طرف جاتی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی پراسرار حسین و جمیل

عورت ہے جس نے مجھے بازو سے پکڑ رکھا ہے اور مجھے کسی محفوظ مقام کی طرف لے جا رہی ہے۔ وہ مجھے جی ٹی روڈ سے ہٹا کر کھیتوں میں لے جا رہی تھی۔ وہ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی مگر مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم رانی بانی کی دیران حویلی والی عورت کی بدروح ہی ہو؟“

اب مجھے اس عورت کی باقاعدہ آواز سنائی دی۔ ”ہاں! میں وہی ہوں۔“

”تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

اس غیبی عورت نے جواب دیا۔ ”وہاں جہاں تمہاری زندگی محفوظ ہوگی۔“

میں اس عورت کا ممنون احسان ضرور تھا۔ خدا نے اس عورت کے وسیلے سے میری زندگی بچالی تھی لیکن یہ الجھن بھی ہو رہی تھی کہ یہ بدروح آخر کب تک میرا پیچھا کرتی رہے گی۔ میں اس قسم کی خرافات اور توہمات میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میرا ہندو نام روہنی ہے۔ مگر جیسا کہ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں میں نے روہت گڑھ کے مغل صوبیدار ہاشم خان سے شادی کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا اور میرے پتی دیو ہاشم خان نے میرا اسلامی نام قمر النساء سلطانہ رکھ دیا تھا جو مجھے بہت پسند تھا۔ میرا خاوند ہاشم خان مجھے سلطانہ کہہ کر بلاتا تھا۔ مجھے بھی اپنا یہ نام پسند ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس بدروح کے ہندو نام سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ اس کے مسلمان نام سے کوئی سروکار تھا۔ میں تو کسی طرح اُس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ہم رات کے دھندلے اندھیرے میں ایک اونچی فصل والے کھیت میں سے گزر رہے تھے۔ میں نے اُس سے کہا۔ ”مجھے ایک بات بتاؤ۔“

”پوچھو۔“ اس عورت کی مجھے آواز آئی۔

مجھے اس کی آواز ہی آسکتی تھی کیونکہ وہ اگرچہ میرا بازو چھوڑ کر میرے ساتھ

ساتھ چل رہی تھی اور مجھے اس کے ریشمی ملبوس میں سے اٹھتی ایک پراسرار سی لوشو باقاعدہ محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”تم کہاں تک میرے ساتھ ساتھ چلتی رہو گی؟“

اُس نے کہا۔ ”میں تمہیں پاکستان چھوڑ کر واپس آؤں گی۔“

میں نے اسے کہا۔ ”آگے راستہ بالکل صاف ہے میں خود ہی چلا جاؤں گا تم یہاں سے واپس چلی جاؤ۔“

اُس نے کہا۔ ”پجاری رگھو تمہاری جان کا دشمن بن چکا ہے۔ کوئی پتہ نہیں وہ تم پر کہاں حملہ کر کے تمہیں موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کرے۔ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔“

میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہو۔ میں تم سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ بدروح کہنے لگی۔ ”مجھے تمہاری پریشانی کا احساس ہے لیکن تم میری مجبوری کو نہیں سمجھ رہے۔ جب تک مجھے یقین نہیں ہو جاتا کہ تمہاری زندگی پجاری رگھو کی بدروح سے محفوظ ہو گئی ہے میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی اور میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ میری اپنی نجات بھی اسی میں ہے کہ تم زندہ رہو۔“

میں نے تنگ آ کر کہا۔ ”آخر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔ تم جو کچھ چاہتی ہو مجھے ایک بار بتا دو اور میری جان چھوڑ دو۔“

حسین و جمیل بدروح کی ٹھنڈا سانس بھرنے کی آواز آئی۔ پھر اس نے کہا۔ ”دقت آنے پر میں تمہیں یہ بھی بتا دوں گی کہ میں تم سے کیا چاہتی ہوں اور میں تمہاری جان بچانے کی کس لئے کوشش کر رہی ہوں۔“

معاملہ اور زیادہ الجھتا جا رہا تھا۔ یہ بدروح میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھی اور میں اس سے ہر حالت میں پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ میں چلتے چلتے رک گیا اور ہاتھ جوڑ کر

کہا۔ ”خدا کے لئے اب واپس جاؤ۔ میں پاکستان پہنچ جاؤں گا۔ تم نے میری جان بچائی میں اس کے لئے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔“

اس عورت کی طرف سے مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اس کے لباس میں سے جو پراسراری ہلکی ہلکی خوشبو آرہی تھی اب وہ بھی غائب ہو گئی تھی۔ میں نے اندھیرے میں چاروں طرف غور سے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”کیا تم چلی گئی ہو؟“

کوئی جواب نہ ملا۔ وہ جا چکی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور جس طرف وہ مجھے لے جا رہی تھی اسی طرف چلنے لگا۔ میرے ارد گرد کھیت ہی کھیت تھیں۔ رات کے اندھیرے میں کہیں کھیتوں میں اونچی اونچی فصل نظر آرہی تھی کہیں کھیت خالی پڑے تھے۔ نہ کوئی گاؤں قریب نظر آتا تھا اور نہ کسی کتے کے بھونکنے کی ہی آواز سنائی دیتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ابھی پاکستان کا بارڈر بہت دور ہو گا کیونکہ امرتسر سے لاہور کا فاصلہ جی ٹی روڈ پر تیس پینتیس میل ہوا کرتا تھا اور میں دائم گنج کے علاقے سے اس عورت کے ساتھ کھیتوں میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ایک میل ہی چلا ہوں گا۔ مجھے امرتسر سے لاہور کے فاصلے کا پورا اندازہ تھا۔ میرے خیال میں، میں اس وقت چھ ہرٹہ گاؤں کے قریب ہوں گا مجھے کھیتوں میں کچھ فاصلے پر بجلی کی دو چار روشنیاں جھلملاتی نظر آئیں۔

میں سمجھ گیا کہ چھ ہرٹہ میں سکھوں کا جو متبرک گردوارہ ہے یہ اس کی روشنیاں ہیں۔ یہ گردوارہ چھ ہرٹہ ریلوے سٹیشن کے قریب ہی تھا اور میرا دیکھا ہوا تھا۔ میں نے ان روشنیوں سے ہٹ کر کھیتوں میں دوسری طرف چلنا شروع کر دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہاں ہندو غنڈے ضرور ہوں گے جو پاکستان کی طرف جانے والے مسلمان مہاجرین کے قافلوں پر حملے کر رہے ہوں گے۔ میں کھیتوں میں چلتا چلتا دوسری طرف سے ہو کر کافی آگے نکل گیا۔ میرا رخ لاہور ہی کی طرف تھا۔

رات کے اندھیرے میں مجھے اتنا ضرور اب نظر آنے لگا تھا کہ میں راستہ دیکھ کر اور سمت کو برقرار رکھ کر چل رہا تھا۔ اپنی دائیں جانب مجھے کھیتوں کے پار بہت سے آدمیوں کے سائے سے چلتے دکھائی دیئے۔ پھر ایک جیپ کی آواز بھی دور سے سنائی دی۔ میں رُک گیا۔ یہ سوچ کر رُک گیا کہ کہیں یہ ہندو سکھوں کا جتھہ نہ ہو جو پاکستان کی طرف جاتے مہاجرین کا بے دریغ قتل عام کر رہے تھے۔ پھر بھی میں کھیتوں میں اُگی ہوئی اونچی فصل کی آڑ لیتا اسی طرف بڑھنے لگا۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد میں قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ مہاجرین کا قافلہ ہے جو ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان کی طرف جا رہا ہے۔ لٹے پٹے بد حال لوگ سڑک پر پیدل چلے جا رہے تھے۔ عورتیں اور بچے گڈوں پر سوار تھے۔ ان میں شدید زخمی بھی تھے۔ بلوچ رجمنٹ کے فوجیوں کی ایک جیپ ان کی حفاظت کے لئے ان کے ساتھ تھی۔ یہ جیپ سڑک پر کبھی آگے چلی جاتی تھی اور کبھی واپس آکر قافلے کے پیچھے چلنے لگتی تھی کہ کہیں قافلے پر کوئی جتھہ پیچھے سے حملہ نہ کر دے۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور میں بھی اسی قافلے میں شامل ہو گیا۔ قافلہ بمشکل ایک ڈیڑھ میل ہی چلا ہو گا کہ دور سے پاکستان زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد کے نعروں کی گونج سنائی دینے لگی۔ معلوم ہوا کہ قافلہ پاکستان کے واہگہ بارڈر کے قریب پہنچ گیا ہے۔ مجھے خوشی بھی ہو رہی تھی اور حیرانی بھی ہو رہی تھی۔ خوشی اس بات کی ہو رہی تھی کہ میں آخر جان بچا کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ پینتیس میل کا فاصلہ اتنی جلدی کیسے طے ہو گیا میں تو ابھی امرتسر کی آبادی دائم گنج سے چلا ہی تھا اور میرے اندازے کے مطابق تو ابھی چھ ہرٹہ کا سٹیشن بھی نہیں آتا تھا جو امرتسر سے لاہور آتے ہوئے پہلا سٹیشن تھا۔ قافلہ پاکستان کی سرحد میں داخل ہوا تو مہاجرین کے مردہ جسموں میں جیسے جان پڑ گئی۔ قافلے میں بھی پاکستان زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگے۔

پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد جان و مال کے جس تحفظ اور جس خوشی کا احساس ہوا وہ آج بھی مجھے یاد ہے۔ میرے پاس اسے بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ بے پایاں مسرت کا یہ ایسا ہی احساس تھا جیسے کسی کو پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا جا رہا ہو اور پھر اچانک اس کی جان بخشی کے آرڈر آگئے ہوں۔ یہ وہ خون آشام زمانہ تھا جب مشرقی پنجاب میں خاص طور پر کسی مسلمان کی عزت اور جان محفوظ نہیں تھی۔ شہروں اور گاؤں میں جگہ جگہ ہندو، سکھ غنڈے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ جگہ جگہ میں نے مسلمان مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی کٹی ہوئی لاشیں بکھری دیکھی تھیں۔ بچوں کو ماؤں کی گودیوں سے چھین کر انہیں نیزوں کی نوک پر اچھالا اور نیزوں میں پرو دیا گیا تھا۔ مسلمان عورتوں کو ان کے بالوں سے درختوں کی شاخوں پر لٹکا کر ان کے پیٹ چاک کئے گئے تھے۔ معصوم بچوں کو میخوں کے ساتھ درختوں میں ٹھونک دیا گیا تھا۔ پاکستان کی موجودہ ڈسکو بوائز کی نسل کو شاید اس کا احساس نہ ہو لیکن آنے والا مورخ جب پاکستان کی تاریخ رقم کرنے بیٹھے گا تو وہ یہ دیکھ کر ایک بار ضرور لرز اٹھے گا کہ مسلمانوں نے کس قدر بے مثال اور ہوش ربا قربانیاں دے کر پاکستان حاصل کیا تھا۔ اس زمانے کو یاد کرتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے قیامت خیز آگ کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں۔ مسلمانوں کے خون ناحق کے

چھینٹے اڑنے لگتے ہیں۔ میں کبھی یقین نہیں کر سکتا کہ پاکستان کی موجودہ اور آنے والی نسلوں کے نوجوان اپنے اجداد کی ان اندوہناک بے مثال قربانیوں کو فراموش کر دے گی۔

خدا نہ کرے کہ ایسا ہو..... آمین!

بہر حال میں اپنی دہشت خیز داستان کو آگے چلاتا ہوں۔ میں بھی دوسرے مہاجرین کے ساتھ پاکستان پہنچ گیا۔ پاکستان میں ہمارا کوئی عزیز یا رشتے دار نہیں تھا۔ ایک ہفتہ میں والٹن لاہور کے مہاجرین کیمپ میں رہا جہاں سن سنٹالیس کے زمانے میں لئے پٹے مہاجرین کا والٹن کیمپ ہوا کرتا تھا وہاں آج کل لاہور کی سب سے بڑی ماڈرن اور خوبصورت ڈیفنس کالونی آباد ہے۔ رات کو یہاں کی جگمگاتی سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے یہاں کی روشنیاں اور شاہنگ سینٹروں اور کشادہ سڑکوں کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ آدمی یورپ کے کسی شہر میں آگیا ہے۔ ڈیفنس کی آبادی کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کے ہر شہر، شہر کی ہر آبادی اور یہاں کی جگمگاتی روشنیوں کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ قائم و دائم رکھے۔ آمین!

لیکن ڈیفنس کی جگمگاتی سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے کبھی کبھی ایک لمحے کے لئے ہی سہی ہمیں یہ ضرور یاد کر لینا چاہئے کہ جب پاکستان بن رہا تھا یہاں وہ لوگ بھی آئے تھے جن کے ننگے پاؤں زخمی تھے، جسموں سے خون بہہ رہا تھا اور جو اپنے پیاروں کی کٹی ہوئی لاشیں مشرقی پنجاب کے گلی کوچوں میں بے گور و کفن چھوڑ آئے تھے جن کے چہروں پر گرد جہی تھی اور جن کی آنکھوں کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے پاکستان بنایا تھا۔

ایک ہفتہ والٹن کے مہاجرین کیمپ میں رہنے کے بعد میں فکر معاش کی تنگ و دو میں لاہور سے راولپنڈی آگیا۔ میں مشرقی پنجاب سے کچھ روپے بچا کر ساتھ لانے میں کامیاب ہو گیا تھا وہی خرچ کر کے گزارہ کر رہا تھا۔ جب پنڈی میں کام کا کوئی

سلسلہ نہ بنا تو واپس لاہور آگیا۔ یہاں لاہور کے ایک سینما ہاؤس میں بنگلہ کلرک کی نوکری مل گئی ساتھ ہی سینما کی عمارت میں ایک چھوٹا سا کمرہ بھی رہنے کو مل گیا۔ حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے۔ اس دوران بمبئی سے میرے پرانے اور بچپن کے دوست جمشید کا خط آیا کہ اگر پاکستان میں کوئی کام وغیرہ نہیں مل رہا تو بمبئی میرے پاس آ جاؤ۔ میں نے اسے لکھ دیا کہ میں پاکستان میں ہی رہنا چاہتا ہوں اور مجھے اب نوکری بھی مل گئی ہے۔ کچھ میں اس لئے بھی بھارت کے شہر بمبئی نہیں جانا چاہتا تھا کہ وہاں وہ پرانی قلعہ نما حویلی ہے جہاں روہنی عرف سلطانہ کی بدروح سے میرا واسطہ پڑ گیا تھا اور جو ابھی تک میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور جس سے میں چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

مگر کہتے ہیں کہ مقدر کے لکھے کو کوئی نہیں ٹال سکتا، وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ اس کی شدت میں کئی بیشی انسان کے اعمال کے مطابق ہو سکتی ہے مگر وہ ٹل نہیں سکتا۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کو اس سے اختلاف ہو مگر میرا تجربہ یہی کہتا ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد میں لاہور کے ایک سینما ہاؤس میں گمنامی اور خاموشی سے بنگلہ کلرک کر رہا تھا۔ یہ کھٹکا مجھے برابر لگا رہتا تھا کہ پرانی حویلی نما قلعے کی حسین و جمیل بدروح روہنی عرف سلطانہ کسی بھی وقت نمودار ہو سکتی ہے اور اس کو آزاد کر دینے کی پاداش میں اس کے اور میرے دشمن رگھو پجاری عرف زرد پوش کی بدروح کسی بھی وقت مجھ پر حملہ کر سکتی تھی۔ میں لاہور میں ایک بزرگ عامل سے اس سلسلے میں ملا۔ انہیں ساری حکایت بیان کی تو انہوں نے مجھے کوئی تعویذ وغیرہ تو نہ دیا صرف مجھے باقاعدگی سے نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی اور میں نے نماز پڑھنی شروع کر دی۔ لیکن میری سینما کی ملازمت کی نوعیت ایسی تھی کہ دوپہر اور شام کی نماز اکثر قضا ہو جاتی تھی۔

دن گزرتے چلے گئے۔ ایک سال گزر گیا۔ پرانی حویلی کی بدروح روہنی اور زرد

پوش پجاری رگھو کی بدروح کی طرف سے اس دوران کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ بلائیں میرے سر سے ٹل گئی تھیں۔ لاہور سے ہندو اور سکھ شرنا رتھی ہندوستان جا چکے تھے۔ ان کے خالی مکان مشرقی پنجاب اور ہندوستان سے آنے والے دوسرے مسلمان مہاجرین کو الاٹ ہو گئے تھے۔ سینما ہاؤس کا ایک گیٹ کیپر انور میرا دوست بن گیا تھا۔ ہم اکثر ہوٹل میں اکٹھے ناشتہ کرنے اور کھانا کھانے جایا کرتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم شام کا شو شروع کرانے کے بعد ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ میرے دوست گیٹ کیپر انور نے کہا۔ ”فیروز! تمہیں معلوم ہے ہندو سکھ لاہور سے جاتے ہوئے یہاں کئی جگہوں پر اپنا سونا اور زیورات مکانوں میں دبا گئے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”سنا تو میں نے بھی ہے لیکن آج تک کسی مکان سے دبا ہوا سونا چاندی نکلتے نہیں سنا۔“

انور کہنے لگا۔ ”وہ کسی کو بتا کر تھوڑی گئے ہیں کہ ہم نے سونا چاندی کہاں دبا دیا ہوا ہے۔“

”تو پھر وہ کس لئے دبا گئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”انور نے کہا۔ ”وہ اس خیال سے اپنی دولت مکانوں کے اندر، زمین اور دیواروں میں گاڑ گئے ہیں کہ جب ذرا حالات ٹھیک ہوں گے تو آکر لے جائیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ ان کا مال ہے۔ لے جائیں۔“

انور بولا۔ ”کیوں؟ اب یہ ان کا مال نہیں ہے۔ اب یہ پاکستان کی دولت ہے۔ ہمارے بھائی بھی تو ادھر بہت کچھ چھوڑ آئے ہیں۔ وہ تو اپنے ساتھ ایک تنکا تک اٹھا کر نہیں لاسکے۔“

میں نے کہا۔ ”یار تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں

ہے۔“

انور خاموش ہو کر کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”میں تمہیں ایک بات بتانے والا ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم آگے کسی کو نہیں بتاؤ گے۔“

میں نے کہا۔ ”میرے یہاں تم ہی ایک دوست ہو جس کو میں بتا سکتا ہوں۔ اور تو کوئی دوست نہیں ہے جس کو میں بتاؤں۔“

انور بولا۔ ”ابھی بتاتا ہوں۔“

ہم کھانا کھا چکے تو میں نے چائے کا آرڈر دے دیا۔ انور ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ چائے آگئی۔ ہم چائے پینے لگ گئے۔ چائے کا ایک گھونٹ پی کر انور کہنے لگا۔ ”فیروز! تم میرے دوست ہو اس لئے تمہیں یہ بات بتا رہا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”بات کیا ہے۔ وہ بھی تو بتاؤ۔“

انور نے ایک نگاہ اپنے دائیں بائیں ڈالی۔ چھوٹا سا دکان نما ہوٹل تھا کچھ اور لوگ بھی بیٹھے کھانا وغیرہ کھا رہے تھے لیکن ہمارے ساتھ والی میز خالی تھیں۔ انور نے میری طرف ذرا جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ہندوؤں کے دبائے ہوئے ایک خزانے کا پتہ چلا ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

انور بڑی رازداری سے بولا۔ ”تم اسے ضرور مذاق سمجھ رہے ہو گے مگر یہ مذاق نہیں ہے۔ یہ راز مجھے یا میری خالہ کے بیٹے سراج کو معلوم ہے۔“

میں نے بھی یونہی دلچسپی کی خاطر پوچھا۔ ”اچھا تو یہ خزانہ کہاں دفن ہے؟“

انور بولا۔ ”لاہور سے قصور کی طرف تین چار میل کے فاصلے پر ہندوؤں کی ایک بستی تیر تھ گڑھ ہوتی تھی اب تو وہاں سب مسلمان مہاجرین آباد ہیں۔ اس بستی کے باہر ایک تالاب کے پاس ہندوؤں کا ایک مندر ہے جو کالی مندر کے نام سے مشہور ہے۔ اس بستی تیر تھ گڑھ میں سراج کا ایک ہندو دوست شیو رام رہتا تھا۔“

بچھلے دنوں سراج ویزالے کر ہندوستان گیا ہوا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات شیو رام سے ہوئی تو شیو رام نے اسے بتایا کہ اس کے پتا جی نے پانچ سیر وزن کے سونے کے زیورات کالی مندر کی پچھلی کوٹھڑی میں زمین کے نیچے دبائے ہوئے ہیں اور وہ حالات ذرا ٹھیک ہو جانے کے بعد پاکستان جا کر یہ زیورات نکال کر لے آئیں گے۔“

میں نے انور سے کہا۔ ”اگر یہ راز تمہارے خالہ زاد بھائی سراج کو بھی معلوم ہے تو وہ تو اب تک سونا نکال کر لے گیا ہو گا۔“

انور نے ہنس کر کہا۔ ”سراج بڑا ڈرپوک ہے۔ میں نے یہ کہہ کر اسے اور بھی ڈرا دیا ہے کہ یہ سونا ایک طرح سے اب پاکستان کی حکومت کی ملکیت ہے۔ اگر تم نے اسے نکالا اور کسی کو پتہ لگ گیا تو تم پکڑے جاؤ گے اور تمہیں سات سال قید ہو جائے گی۔ میں نے ساتھ ہی اسے یہ بھی یقین دلایا ہے کہ میں سوہے بازار کے ایک سنیا رے سے بات کرتا ہوں۔ ہم سونا نکال کر اپنے پاس رکھنے کی بجائے فوراً اس کے حوالے کر کے رقم وصول کر لیں گے۔ پھر وہ سنیا راجانے اور حکومت جانے۔ سراج میری اس بات پر لگ گیا ہے اور میری اجازت کے بغیر وہ زیورات کبھی نہیں نکالے گا۔“

وہ کہنے لگا۔ ”فیروز! تم میرے جگری یار ہو۔ میں اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا۔ میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ چلو۔ ہم رات کے اندھیرے میں یہ زیورات نکال کر لے آئیں گے۔ میں نے ایک سنیا رے سے بات کر لی ہوئی ہے وہ اس کے عوض مجھے اسی وقت ساری رقم ادا کرنے کو تیار ہے۔ ہم وہ رقم آدھی آدھی کر لیں گے کچھ نہیں تو پچاس ساٹھ ہزار کی مالیت کا سونا تو ضرور ہو گا۔“

اس زمانے میں سونے کا بھاؤ جہاں تک مجھے یاد رہ گیا ہے بارہ تیرہ روپے تولہ ہوا کرتا تھا۔ مگر اس زمانے کے بارہ تیرہ روپے آج کے زمانے کے بارہ تیرہ سو بلکہ اس سے بھی زیادہ کی مالیت کے ہوتے ہیں۔ میں نے انور سے کہا۔ ”بھائی! مجھے روپے پیسے کا کوئی لالچ نہیں ہے۔ میں ان چند روپوں کی نوکری میں بڑا خوش ہوں۔ اور میں اس

قسم کے کام میں پڑنا بھی نہیں چاہتا۔ جو روپیہ میں نے اپنی محنت سے نہ کمایا ہو میں اس کو ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہتا۔“

انور بولا۔ ”یار! تم میرے جگری یار ہو۔ کم از کم میری اتنی مدد تو کر دو کہ میرے ساتھ رات کے وقت مندر تک چلو۔ میں اکیلا زمین نہیں کھود سکتا۔ کیا معلوم خزانہ کتنی گہرائی میں دبایا ہوا ہے۔ تمہارے سوا میں کسی کے آگے یہ راز ظاہر بھی نہیں کر سکتا۔“

انور میرے چھوٹے چھوٹے کئی کام کر دیا کرتا تھا۔ میں اس کے آگے انکار نہ کر سکا اور میں نے اس کے ساتھ کالی مندر جانے کی حامی بھر لی۔

ایک روز شام کے وقت ہم دونوں نے اپنی جگہوں پر دوسرے آدمی بٹھا کر سینما والوں سے چھٹی لے لی اور مزنگ چوگلی سے قصور جانے والی لاری میں بیٹھ گئے۔ ستمبر کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ بارشوں کا موسم گزر چکا تھا۔ رات کو ہلکی خنکی ہو جاتی تھی۔ انور نے اپنے ساتھ ایک تھیلا رکھ لیا تھا جس میں ہاتھ سے زمین کھودنے والی دو کھریاں تھیں۔ ہم احتیاطاً رات کے دس سوا دس بجے لاہور سے روانہ ہوئے تھے۔ تیر تھ گڑھ قصور جانے والی سڑک پر زیادہ دور نہیں تھا۔ انور نے کالی مندر دیکھ رکھا تھا بلکہ وہ ایک روز دن کے وقت خفیہ طور پر اس کا سروے بھی کر آیا تھا۔ اب تو فیروز پور روڈ پر بڑی بتیاں بھی لگ گئی ہیں جو رات کو جھلکاتی ہیں۔ اس زمانے میں یہ سڑک چھوٹی بھی تھی اور لاہور سے نکلنے کے بعد یہ سڑک رات کے وقت اندھیرے میں ڈوب جاتی تھی اور لاریاں اپنی بتیوں کی روشنی میں چلا کرتی تھیں اور ان کی سپید بھی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ انور لاری کی کھڑکی میں سے باہر اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ جب دور سے اسے تیر تھ گڑھ گاؤں کی چند ایک روشنیاں اندھیرے میں جھلملاتی دکھائی دیں تو اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ”ہمیں تیر تھ گڑھ والے شاپ پر اترنا ہے۔“ اور لاری تیر تھ گڑھ کے شاپ پر کھڑی ہو گئی۔

ہم لاری سے اتر پڑے۔ سڑک پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لاری آگے نکل گئی۔ ہم سڑک سے اتر کر تیر تھ گڑھ جانے والے کچے راستے پر پڑ گئے۔ ہم اندھیرے میں چل رہے تھے۔ آس پاس جھاڑیاں اور شاید پھلائی کے درخت تھے۔ کسی طرف سے جھینگر کے بولنے کی مسلسل آواز آرہی تھی۔

انور کہنے لگا۔ ”گاؤں کی پیچھے ایک پرانا تالاب ہے۔ کالی مندر اس تالاب کے پاس ہی ہے۔ پہلے یہاں بڑی پوجا پاٹ ہوا کرتی تھی۔ ہندوؤں کے چلے جانے کے بعد یہ مندر ویران ہو گیا ہے۔ یہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ کسی کسی وقت رات کو کالی مندر میں گھنٹیوں کی آوازیں آتی ہیں۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جب پوجا پاٹ کرنے والے ہی نہیں ہیں تو پھر گھنٹیوں کی آواز کیسے آسکتی ہے۔“

اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں نے انور کے ساتھ آکر غلطی کی ہے۔ مجھے نہیں آتا چاہئے تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سوئی ہوئی کلا پھر سے جاگ اٹھے۔ مگر اب میں اپنے دوست کو اکیلا چھوڑ کر واپس بھی نہیں جاسکتا تھا۔

تیر تھ گڑھ گاؤں کی اکاد کا بتیاں نظر آنے لگی تھیں۔ دور سے انسانوں کی بوپا کر گاؤں کے ایک دو کتے بھونکنے لگے۔ انور مجھے لے کر گاؤں کے پیچھے سے چکر کاٹ کر پرانے تالاب کے پاس آ گیا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہر طرف عجیب ڈراؤنی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تیر تھ گڑھ کی طرف سے آنے والی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی خاموش ہو گئی تھیں۔ تالاب اندھیرے میں بڑا ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کی سطح ساکت اور دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے یہ تالاب بھی مر چکا ہے۔ اس کے عقب میں ایک کھنڈر سا اندھیرے میں کسی بھوت کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ انور مجھے لے کر اسی بھوت نما کھنڈر کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے اُس ڈراؤنے ویران کالی مندر سے اتنا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا جتنا خوف مجھے اس بات کا محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں مجھ پر زرد پوش پجاری رگھو کی بدروح حملہ نہ

کر دے کیونکہ وہاں ماحول بد روحوں کا ہی بنا ہوا تھا۔

کالی مندر زمین سے تین چار فٹ اونچے چوترے پر بنا ہوا تھا اس کی سیڑھیوں کی اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ صرف اتنی اینٹیں باقی تھیں کہ آدمی ان پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھ سکتا تھا۔ انور میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ مندر کی ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا۔ انور نے تھیلے میں سے نارچ نکال کر روشن کر دی۔ کہنے لگا۔ ”جس کو ٹھڑی میں زیورات دفن ہیں وہ آگے ہے۔“

ڈیوڑھی میں سے ایک تنگ سرنگ نما راستہ دوسری کو ٹھڑی کو چلا گیا تھا۔ ہم دونوں کو ٹھڑی میں آگئے۔ انور نے نارچ کی روشنی کو ٹھڑی کے فرش پر ڈالی۔ فرش پر ٹوٹی پھوٹی اینٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ چھوٹی سی کو ٹھڑی تھی۔ دیوار میں کسی دیوی کا کالا بت لگا ہوا تھا جس کے بازو، ٹانگیں اور سر غائب تھا، صرف دھڑ دیوار میں باقی رہ گیا تھا۔ مجھے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اپنے دوست کی وجہ سے وہاں کھڑا تھا۔ انور جھک کر نارچ کی روشنی میں فرش کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایک جگہ کونے میں ٹوٹی ہوئی اینٹوں کا چھوٹا سا ڈھیر بڑا تھا۔ انور نے تھیلا ایک طرف رکھ دیا اور بولا۔ ”زیورات یہاں دفن ہیں۔ مجھے یقین ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جو بھی کرنا ہے جلدی کرو۔ کوئی آگیا تو مصیبت پڑ جائے گی۔“ انور نے نارچ ایک طرف اس طرح رکھ دی کہ اس کی روشنی اینٹوں کے ڈھیر پر پڑ رہی تھی۔ اس نے تھیلے میں سے ایک کھرپی نکال کر مجھے دی اور دوسری اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔ پہلے اس نے اینٹوں کو ادھر ادھر ہٹایا۔ پھر زمین کھودنی شروع کر دی۔ میں اس کے سامنے کے رخ پر آکر بیٹھ گیا اور کھرپی سے زمین کھودنے لگا۔ زمین بھر بھری تھی۔ بڑی جلدی ہم نے دو ڈھائی فٹ زمین کھود ڈالی نیچے سے کچھ بھی نہ نکلا۔

میں نے کہا۔ ”انور! تمہیں غلط اطلاع دی گئی ہے۔ یہاں کوئی زیورات وغیرہ

نہیں ہیں۔“

وہ برابر کھرپی چلا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ”ابھی معلوم ہو جائے گا۔“ ہم نے ایک فٹ اور زمین کھودی ہوگی کہ میری کھرپی کسی سخت چیز سے ٹکرائی۔ ٹکرانے کی آواز سن کر انور نے خوش ہو کر کہا۔ ”فیروز! ضرور یہ زیوروں کا ڈبہ ہو گا۔“

ہم اور تیزی سے زمین کھودنے لگے۔ انور نے نارچ کو گڑھے کے کنارے پر اس طرح رکھ دیا تھا کہ اس کی روشنی گڑھے میں پڑتی تھی۔ بہت جلدی ہمیں مٹی میں دبی ہوئی کوئی چمکتی ہوئی شے دکھائی دی۔ اس کا رنگ سونے کی طرح زرد تھا۔ انور بولا۔ ”یہ سونے کا ڈالا ہو گا۔“

ہم نے کھرپی کی مدد سے اس شے کو مٹی میں سے باہر نکالا تو دیکھا کہ وہ ایک سوڈا دائر کی بوتل کے سائز کا ایک بت تھا۔ انور نے اس کی مٹی صاف کی اور اس پر اپنا ناخن زور سے رگڑتے ہوئے کہنے لگا۔ ”فیروز! ہماری قسمت کھل گئی ہے۔ یہ سونے کا بت ہے۔“

نہ جانے مجھے کیوں خیال آگیا کہ یہ بت کہیں ہماری بد قسمتی کا باعث نہ بن جائے۔ میں نے انور سے کہا۔ ”انور میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ اس بت کو اسی جگہ دبا ہوا رہنے دو۔“

انور نے بت کو تھیلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں پاگل نہیں ہوں کہ ہاتھ آئی ہوئی دولت کو چھوڑ دوں۔“

ہم مندر سے باہر آگئے اور تیز تیز قدموں سے قصور لاہور روڈ کی طرف چلنے لگے۔ انور کہنے لگا۔ ”میرا خیال تھا زیور ہوں گے مگر اب معلوم ہوا کہ یہاں سونے کا بت دبا ہوا ہے۔ یہاں سے ہندوستان بھاگتے ہوئے پجاری نے اسے دبا دیا ہو گا۔ مجھے تو خالص سونا لگتا ہے۔ یہ لوگ اپنی مورتیوں میں خالص سونا استعمال کرتے تھے۔“

میں چپ رہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی منحوس سایہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے بدن میں دوڑ گئی جس نے میری ہتھیلیوں کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ میرے دوست انور کو بالکل علم نہیں تھا کہ کیسے کیسے دہشت ناک واقعات مجھ پر گزر چکے تھے۔ میں خوف محسوس کرنے میں حق بجانب تھا۔ انور خوفزدہ بالکل نہیں تھا۔ اس پر ایک ایسے شخص کی جذباتی کیفیت طاری تھی جس کو اچانک قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔ اگر وہ بت سونے کا ہی تھا تو اس کی قیمت ایک لاکھ روپے سے کم نہیں تھی اور اس زمانے میں ایک لاکھ روپیہ آج کے کروڑوں کے برابر تھا۔

انور نے دونوں کھریاں کھیتوں میں پھینک دی تھیں۔ بت کو تھیلے میں لپیٹ کر اس نے بغل میں دبایا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”اس وقت لاہور کی طرف جاتی ہوئی کوئی لاری بھی شاید ہی ملے۔“

میں نے کہا۔ ”شاید مل جائے۔“

مجھے بت کے سونے کی مالیت سے کوئی دلچسپی اور سروکار نہیں تھا۔ میں اس بت کو ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہتا تھا۔ انور نے کہا۔ ”میں صبح صبح اسے لے کر سوہے بازار جا کر اس کا وزن کراؤں گا۔ بڑا بھاری ہے فیروز مجھے تو تین سیر کا لگتا ہے۔ تین سیر سونا..... یار! تم کوئی خیال نہ کرنا۔ جتنی رقم ملے گی ادھی ادھی بانٹ لیں گے۔ تم بے شک میرے ساتھ ہی سوہے بازار جانا۔“

ہم لاہور قصور روڈ پر آگئے۔ رات کے اندھیرے میں سڑک سنسان پڑی تھی۔ انور کہنے لگا۔ ”اس وقت لاہور جانے والی لاری نہیں ملے گی۔ پیدل ہی چل پڑتے ہیں۔“

ہم سڑک کے کنارے کنارے لاہور کی طرف پیدل ہی چل پڑے۔ کچھ دور چلنے کے بعد انور نے تھیلے کو بغل میں سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ کہنے لگا۔ ”یہ گرم

کیوں ہو رہا ہے؟“

میں نے چونک کر پوچھا۔ ”کون گرم ہو رہا ہے؟“

انور بولا۔ ”سونے کا بت لگتا ہے گرم ہو گیا ہے۔ ہاتھ لگا کر دیکھو۔“

اس نے تھیلا میری طرف کر دیا۔ میں نے ہاتھ لگایا تو واقعی بت گرم تھا۔ میں نے دل میں کہا مصیبت شروع ہو گئی ہے۔ میں انور کو سمجھا نہیں سکتا تھا اس کی آنکھوں پر دولت حاصل کرنے کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اسے آج کے ایک کروڑ روپے کے برابر دولت مل گئی تھی۔ اسے اور کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا پھر بھی میں نے اسے کہا۔ ”انور! میں جانتا ہوں تم میری بات نہیں مانو گے۔ مگر میں تمہیں کہنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میری مانواور اس بت کو یہیں کھیتوں میں پھینک دو۔“

انور جھنجھلا کر بولا۔ ”یار! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ مجھے بتاؤ میں اسے کیوں پھینک دوں؟ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے کہ ہاتھ آئی دولت کو پھینک دوں؟ یہ اللہ کی زمین میں دبی ہوئی ملی ہے۔ اس پر ہم دونوں کا حق ہے۔ بس اب تم چپ رہو۔“

ظاہر ہے مجھے خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ انور تھوڑی تھوڑی دیر بعد سڑک پر کھڑے ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا تھا۔ ”ایک لاری رات کے بارہ بجے قصور سے چلتی ہے۔ اسے اب تک آ جانا چاہئے۔“

مگر ہمیں کوئی لاری نہ ملی۔ اس زمانے میں لوگوں کے پاس کہاں اتنی موٹر کاریں ہوتی تھیں۔ کوئی موٹر کار بھی پیچھے سے نہ آئی۔ انور نے بت والے تھیلے کو دوبارہ بغل میں دبایا تھا۔ کہنے لگا۔ ”اب یہ اتنا گرم نہیں ہے۔ وہ زمین کی گرمی تھی۔ میرے استاد نے ایک بار کہا تھا کہ زمین کے اندر زیور یا سونا ایک سال تک دبا رہے تو وہ گرم ہو جاتا ہے۔“

انور اسی قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا میرے ساتھ چل رہا تھا۔ آخر دور سے ہمیں ماڈل ٹاؤن کی اکاڈکائیاں نظر آئیں۔ ابھی لاہور کی اضافی کالونیاں کوٹ لکھت

وغیرہ آباد نہیں ہوئی تھیں۔ ماڈل ٹاؤن پاکستان سے پہلے کی کالونی تھی۔ اتنے میں سڑک پر پیچھے سے لاری کے ہارن کی آواز آئی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا۔ سڑک پر دور لاری کی بتیاں روشن تھیں۔ انور خوش ہو کر بولا۔ ”یہ لاہور والی لاری ہے۔“

اس نے لاری کو زور زور سے ہاتھ کے اشارے کرنے شروع کر دیئے۔ لاری ہمارے قریب آ کر رُک گئی۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ لاری میں دس بارہ سواریاں ہی بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔ لاری نے ہمیں مزنگ چوکی اتار دیا۔ وہاں سے ہم پیدل چل کر اپنے سینما ہاؤس آ گئے۔ انور نے کہا۔ ”اگر تم چاہو تو یہ سونے کا بت اپنے پاس رکھ لو۔ مجھے تم پر اعتبار ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے تم پر بھی اعتبار ہے انور! اسے تم اپنے پاس ہی رکھو۔ مگر کہاں رکھو گے؟“

انور بولا۔ ”فکر نہ کرو۔ میں اسے اپنے سر ہانے کے نیچے رکھ کر سوؤں گا۔ کل صبح صرافہ بازار کھلتے ہی میں تمہیں ساتھ لے لوں گا پھر ہم سو بے بازار جا کر اس کی قیمت ڈلوائیں گے۔ وہاں ایک سنیا ر امیر واقف ہے۔ اب تم بھی آرام کرو۔“

انور کی کوٹھڑی سینما ہاؤس کی پہلی منزل میں پیچھے کی طرف تھی۔ میرا چھوٹا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ وہ اپنی کوٹھڑی کی طرف چل دیا۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ بہت تھک گیا تھا۔ چارپائی پر اسی طرح پڑ گیا۔ کچھ دیر تک کالی مندر کے بت یا مورتی کے متعلق سوچتا رہا۔ طرح طرح کے تشویش پیدا کرنے والے خیالات آتے رہے پھر نیند غالب آ گئی اور میں سو گیا۔

دوسرے روز دن کے دس بجے کے قریب کسی نے میرے کمرے کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔ میں سو رہا تھا، دروازے کے شور سے ہڑبڑا کر اٹھا۔ دروازہ کھولا سامنے تھر ڈکلاس کا گیت کیپر حنیف شاہ کھڑا تھا۔ سخت گھبرا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ ”بڑا برا ہوا ہے بھاجی۔“

”کیا ہوا ہے؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

حنیف شاہ بولا۔ ”انور شاہ قتل ہو گیا ہے۔“

میں اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ ”یہ تم کیا کہہ کہے ہو۔“

حنیف شاہ بولا۔ ”بھاجی! جلدی آئیں۔ کسی نے انور شاہ کا سر ہتھوڑے سے پکل دیا ہے۔۔۔۔۔ پولیس آئی ہوئی ہے۔“

میں اسی طرح گیٹ کیپر حنیف کے ساتھ انور کی کوٹھڑی کی طرف گیا۔ وہاں سینما ہاؤس کا منیجر، دوسرا شاف اور پولیس پہلے سے موجود تھی۔ سینما کا منیجر پولیس انسپکٹر کو اپنا بیان دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”کل انور شاہ نے شام کی چھٹی لے لی تھی۔ کہنے لگا مجھے ایک ضروری کام ہے اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا کہیں رات کو آ کر کوٹھڑی میں سو گیا ہو گا۔“

پولیس انسپکٹر نے پوچھا۔ ”اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کس کام کی وجہ سے چھٹی لے رہا ہے؟“

منیجر نے کہا۔ ”کچھ نہیں بتایا۔“

وہاں سوگ کی فضا طاری تھی۔ انور کی لاش اس کی کوٹھڑی کے باہر چارپائی پر چادر سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ پولیس انسپکٹر نے کہا۔ ”رات کو کسی نے ہتھوڑے کی ضربات سے اس کا سر نچل دیا ہے۔ یہ پرانی دشمنی کا معاملہ ہی ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔“

مجھ سے کسی نے کوئی سوال نہ کیا۔ سونے کے بت یا مورتی کا بھی کسی نے ابھی تک ذکر نہیں کیا تھا کہ انور کے سر ہانے کے نیچے سے سونے کی مورتی برآمد ہوئی ہے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ بد قسمت انور کا سر سونے کی مورتی کی ضربات سے ہی پکلا گیا ہے۔ مگر ایسا کس نے کیا تھا؟

جب پولیس انور کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے لے گئی تو میں نے حنیف شاہ سے پوچھا۔ ”انور شاہ کی کوٹھڑی سے آلہ قتل بھی برآمد نہیں ہوا؟“
حنیف شاہ بولا۔ ”بھابی! اگر آلہ قتل وہاں ہوتا تو پولیس ضرور برآمد کرتی۔ مگر ایسی کوئی شے کوٹھڑی میں نہیں تھی۔“

پولیس انور کی لاش اپنی گاڑی میں ڈال کر لے گئی تھی۔ اس کی چارپائی ابھی تک کوٹھڑی کے باہر ایک طرف پڑی تھی۔ میں چارپائی کے قریب چلا گیا۔ سرہانے پر خون ہی خون جما ہوا تھا۔ بستر پر بھی خون تھا۔ انور نے رات کو مجھے کہا تھا کہ وہ سونے کا بت اپنے سرہانے کے نیچے رکھ کر سوئے گا۔ حنیف شاہ میرے ساتھ ہی تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سرہانے کو ایک طرف ہٹا کر دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ سرہانے کے نیچے کالی مندر والا سونے کا بت ضرور موجود ہوگا۔ مگر سرہانے کے نیچے کچھ نہیں تھا۔ سونے کا بت غائب تھا۔

اب مجھے اپنی فکر پڑ گئی۔ اگر انور کی موت کالی مندر کے بت کی وجہ سے ہوئی تھی تو میری جان بھی خطرے میں تھی کیونکہ میں بھی بت کو چرانے کے لئے انور کے ساتھ کالی مندر میں گیا تھا۔ اگر کالی مندر کا بت انور کی کوٹھڑی سے برآمد ہو جاتا تو پھر بھی میری تسلی ہو جاتی لیکن بت غائب تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کام انور کے خالہ زاد بھائی کا ہو جس نے انور کو بتایا تھا کہ کالی مندر میں زیورات دفن ہیں۔ ہو سکتا ہے رات کے وقت وہ چھپ کر ہمارا تعاقب کرتا رہا ہو اسے معلوم

ہو گیا ہو کہ میں اور انور سونے کا بت نکال کر لے آئے ہیں اور اسے انور اپنی کوٹھڑی میں لے گیا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے کسی ساتھی کو لے کر انور کی کوٹھڑی میں آگیا ہو یا اکیلا ہی انور کی کوٹھڑی میں گھس گیا ہو اور اسے جگا کر سونے کے بت کی بابت بات کی ہو انور نے انکار کیا ہو اور کہا ہو کہ اس کو کالی مندر سے کچھ نہیں ملا۔ دونوں کی تکرار ہو گئی ہو اور انور کے خالہ زاد بھائی نے تلاشی لیتے ہوئے سرہانے کے نیچے سے بت نکال لیا ہو۔ اس کے بعد دونوں کی ہاتھ پائی ہوئی ہو اور اس کے خالہ زاد بھائی نے اسی بت سے اس کا سر کچل دیا ہو اور بت لے کر فرار ہو گیا ہو۔

مجھے یقین ہو گیا کہ ایسا ہی ہوا ہو گا ورنہ اگر کوئی دشمن انور کا سر ہتھوڑے سے کچل کر فرار ہوتا تو سونے کا بت اس کے سرہانے کے نیچے موجود ہونا چاہئے تھا جو نہیں تھا۔ میرے ذہن میں کالی مندر کے بت کے بارے میں جو طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو رہے تھے وہ اس کے بعد غائب ہو گئے اور میں مطمئن ہو گیا کہ یہ کام کسی بدروح کا نہیں ہے بلکہ انور کا خون اس کے خالہ زاد بھائی نے یا اس کے کسی ساتھی نے ہی کیا ہے۔

میرے اندیشے تو ختم ہو گئے تھے لیکن انور کی موت کا مجھے بہت افسوس ہوا تھا۔ یہ خون سونے کے بت کی وجہ سے کیا گیا تھا۔ اب اس سینما ہاؤس سے میرا دل اچاٹ ہو گیا اور کچھ روز بعد ہی میں نے سینما کی نوکری چھوڑ دی۔ میں پڑھا لکھا تھا۔ ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ سینما کی نوکری تو اس لئے کر لی تھی کہ اس وقت کوئی اچھی نوکری ملنی مشکل تھی۔ افراتفری کا زمانہ تھا۔ مہاجرین آرہے تھے ابھی لوگ اپنی اپنی جگہوں پر جم کر نہیں بیٹھے تھے۔

اب پاکستان بنے ڈیڑھ سال گزر گیا تھا۔ حالات بہتر ہونے لگے تھے۔ کاروبار بھی شروع ہو گئے تھے۔ مجھے لاہور ہی میں ایک انشورنس کمپنی کے دفتر میں کلرک کی نوکری مل گئی۔ میں نے دفتر کے پچھواڑے میں ایک کٹڑی میں ایک کمرہ کرائے پر لے

لیا اور خاموشی سے اپنے کام میں لگ گیا۔

انور کی موت کو دو مہینے گزر گئے تھے۔

میرا سارا دن اپنے آفس میں گزر جاتا۔ دفتر سے فارغ ہونے کے بعد میں کبھی محلے کے ایک ریستوران میں چائے پینے بیٹھ جاتا اور کبھی موسم اچھا ہوتا تو سیر کرنے جناح باغ کی طرف نکل جاتا۔

روہت گڑھ کے پرانے قلعے کی حویلی کی حسین و جمیل بدروح روہتی عرف سلطانہ اور اس کے اور میرے دشمن زرد پوش پجاری رگھو کی خوفناک یادیں اب میرے دل و دماغ سے محو ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک سے واسطہ پڑے ایک طویل مدت گزر چکی تھی۔ لگتا تھا کہ ایک بھیانک خواب دیکھا تھا۔ اس وقت تک ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے درمیان پاسپورٹ ویزا سسٹم رائج ہو چکا تھا اور بغیر ویزا پاسپورٹ کے بارڈر کراس کرنے والے کو پکڑ کر جیل بھیج دیا جاتا تھا۔

بھارت کا رویہ اس معاملے میں ایک دشمن ملک کے رویے جیسا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھارت کو پاکستان کے بن جانے کا بے حد صدمہ تھا اور وہ شروع دن ہی سے کبھی کھل کر اور کبھی اندر ہی اندر پاکستان سے دشمنی کرنے لگا تھا۔ کشمیر پر اپنی فوج بھیج کر اس نے غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ کشمیری اپنا حق خود ارادی اور بھارتی تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور بھارتی حکومت نے مقبوضہ کشمیر میں ظلم و تشدد کا سلسلہ شروع کر دیا جو اس وقت تک جاری ہے۔ چنانچہ بھارت میں اگر کوئی بھارتی مسلمان بھی بارڈر ایریا کے قریب چلتا پھرتا نظر آ جاتا تھا تو اسے پاکستانی جاسوس کہہ کر گرفتار کر لیا جاتا تھا اور پھر اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں گیا۔

میرا بچپن کا دوست جمشید ابھی تک بمبئی میں ہی تھا اور وہیں اپنا کاروبار کر رہا تھا۔

اس نے کئی بار بلایا کہ بمبئی آکر اسے مل جاؤں۔ میں نے اسے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ پاسپورٹ بنالوں پھر ویزا لگوا کر دو ایک دن کے لئے آ جاؤں گا۔ میری صحت پہلے سے اچھی ہو گئی تھی۔ جسم بھر گیا تھا۔ امرتسر میں میری شادی میری کم عمری میں ہی ہو گئی تھی اور چند ایک سال کے بعد یہ ڈرامہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنے آفس کے ہیڈ کلرک سے میری سلام دعا ہو گئی تھی۔ ایک بار اس نے بھی کہا کہ فیروز! تم برس برس روزگار ہو گئے ہو۔ اب شادی کر کے اپنا گھر بسالو۔ لیکن میری شادی کا تجربہ اس قدر تلخ تھا کہ مجھے شادی کے نام سے ہی نفرت ہو گئی تھی۔ عورتوں سے الٹی سیدھی دوستی کرنے کا مجھے کبھی شوق نہیں رہا تھا۔ بس اکیلا زندگی بسر کر رہا تھا اور اسی میں ہی خوش تھا۔

صرف اتنی تفریح کر لیتا تھا کہ کبھی کبھی پلازا یا ریگل سینما میں انگریزی فلم دیکھنے چلا جاتا تھا۔ مجھے انگریزی کی مار دھاڑ والی فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ انور کے قتل ہو جانے کے بعد میں نے کسی کو اپنا دوست نہیں بنایا تھا۔ تنہا زندگی بسر کر رہا تھا اور اس میں بڑا خوش تھا۔

ایک رات ایسا ہوا کہ سردیوں کا موسم تھا۔ میں رات کے وقت اپنے کمرے میں لحاف اوڑھ کر ایک جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں اور دروازہ بند تھا۔ میں نے اندر سے کنڈی لگا رکھی تھی۔ میرے سر ہانے کی جانب دیوار والا بلب روشن تھا اور میں پلنگ پر نیم دراز ناول پڑھنے میں محو تھا۔ باہر کنڈی میں خاموشی تھی ویسے بھی ابھی آبادی کا سیلاب نہیں آیا تھا۔ شام ہونے کے بعد لاہور کی سڑکوں پر ٹریفک بہت ہی کم ہو جاتی تھی اور سردیوں میں تو رات دس گیارہ بجے تک سڑکیں خاموش ہو جاتی تھیں۔ یہی حالت اس رات کنڈی کی اور کنڈی کے باہر والی سڑک کی تھی۔ میں جاسوسی ناول کی فضاؤں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک مجھے کمرے میں کسی دوسرے شخص کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے ناول پر سے نگاہیں ہٹا کر کمرے کا جائزہ لیا۔

دروازہ میں نے اندر سے چٹخنی لگا کر بند کیا ہوا تھا۔ وہاں کسی دوسرے شخص کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے اسے محض اپنا وہم خیال کیا اور دوبارہ ناول کے مطالعے میں کھو گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سی سنائی دی۔ میں دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے ایسے لگا جیسے باہر جو چھوٹی سی راہ داری تھی وہاں کوئی دبے پاؤں چلتے چلتے دروازے کے پاس آکر رک گیا ہے۔ میں بند دروازے کی طرف مسلسل تک رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر محلے کا کوئی شخص مجھ سے ملنے آیا ہے تو وہ ابھی دستک دے گا۔ لیکن ایک تو کڑی میں میری سلام دعا کے علاوہ کسی سے کوئی دوستی نہیں تھی دوسرے رات کے گیارہ بجے اتنی سردی میں مجھ سے ملنے کون آسکتا تھا۔ لیکن پھر بھی میں دستک کی آواز کا انتظار کرتا رہا۔ دو تین منٹ گزر گئے۔ کسی نے دروازے پر دستک نہ دی تو میں نے اسے بھی اپنا وہم سمجھا اور ایک بار پھر ناول کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس کے بعد مجھے پڑھتے پڑھتے نیند آنے لگی۔ میں نے ناول ایک طرف رکھا۔ دیوار والے بلب کے تار کا سوچ میں نے اپنے سر ہانے کے پاس لگوار کھا تھا۔ میں نے سوچ دبا کر بتی بجھائی اور لحاف اوپر کر کے لیٹ گیا۔ نیند سے میری آنکھیں اپنے آپ بند ہونے لگیں۔ میں ابھی پوری طرح سویا نہیں تھا، نیند اور عالم بیداری کی درمیانی حالت میں ہی تھا کہ اچانک مجھے کسی کے لباس کی سرسراہٹ سنائی دی جیسے کوئی کمرے میں داخل ہوا ہو اور میرے پلنگ کے پاس آکر ٹھہر گیا ہو۔

میری نیند ایک دم جیسے غائب ہو گئی اور بدن میں خوف کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ لحاف سے میں نے اپنا منہ ڈھانپ رکھا تھا۔ میں اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پارہا تھا کہ لحاف منہ سے ہٹا کر بتی جلا کر دیکھوں کہ کمرے میں کون ہے۔ پھر مجھے کمرے میں وہی پر اسرار خوشبو محسوس ہوئی جو روہت گڑھ کے قلعے والی پرانی حویلی میں پہلی بار محسوس ہوئی تھی۔ مجھے ایک دم سے پرانے قلعے والی حسین بدروح کا خیال آگیا۔ میں

نے جلدی سے لحاف منہ سے ہٹا دیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر کسی کے سرد آہ بھرنے کی آواز آئی۔ میں نے ہاتھ پیچھے کر کے کمرے کی بتی کا سوچ آن کر دیا۔

کمرے میں روشنی ہو گئی۔ مگر کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ یا خدا یہ کیا معاملہ ہے۔ کہیں وہی منحوس ڈرامہ پھر سے تو شروع نہیں ہو گیا۔ میں نے پانچ مرتبہ کلمہ شریف پڑھ کر اپنے جسم پر پھونک ماری اور دعا مانگ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے بتی نہیں بجھائی تھی۔ کمرے میں روشنی ہی رہنے دی تھی اور لحاف میں نے منہ کے اوپر نہیں کیا تھا۔ بس کبھی آنکھیں بند کر لیتا اور کبھی ڈر کے مارے آنکھیں کھول دیتا۔ اچانک مجھے اپنے سر کے نیچے کچھ گرمی سی محسوس ہوئی۔ اس زمانے میں ابھی فوم کے گدوں اور سرہانوں کا رواج نہیں چلا تھا۔ لوگ روئی دار گدے اور سرہانے استعمال کرتے تھے۔ میں نے یہی خیال کیا کہ یہ روئی دار سرہانے کی اپنی گرمائش ہے جو میرے جسم کی حرارت سے پیدا ہوئی ہے۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ سرہانے کی گرمی میں اضافہ ہو رہا ہے جیسے سرہانے کے اندر کسی نے گرم پانی کی بوتل رکھ دی ہو۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لحاف پرے کر کے میں میں سرہانے کو غور سے دیکھا۔ عام قسم کا معمولی سرہانہ تھا۔ میں نے اس پر ہاتھ رکھا تو میرا ہاتھ بھی گرم ہو گیا۔ میں نے جلدی سے ہٹا دیا پھر میں نے سرہانے کو بھی ہٹا دیا۔ یہ دیکھ کر خوف کے مارے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کہ سرہانے کے نیچے کالی مندر والا سونے کا بت پڑا تھا۔

میں اچھل کر پلنگ سے اتر گیا اور غور سے سنہری بت کو تنکے لگا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ بات ہی ایسی ہوئی تھی۔ میں حیران تھا کہ کالی مندر کا بت یہاں میرے سرہانے کے نیچے کہاں سے آگیا ہے۔ یہاں اسے کس نے رکھ دیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں ہمت کر کے آگے بڑھا اور سونے کے بت کو ہاتھ سے

چھو۔ بت سخت گرم تھا جیسے ابھی ابھی کسی نے اسے آگ میں سے نکالا ہو۔
یا اللہ! یہ کیا مصیبت شروع ہو گئی ہے۔

میں پلنگ سے دو قدم پیچھے ہٹ کر حیران پریشان کھڑا تھا اور کالی مندر کے بت کو تک رہا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں یہ بت آج کل کے کوکا کولا کی بوتل کے سائز کا تھا۔ اس کے چہرے پر آنکھوں کی جگہ دو گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ منہ کی جگہ ایک چوکور گڑھا بنا ہوا تھا جس میں اوپر کی جانب دو نوکیلے دانت اندر کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ اس بت کی شکل صورت کافی خوفناک تھی۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ بستر پر لیٹ نہیں سکتا تھا کمرے سے باہر بھی نہیں جاسکتا تھا۔ سوچا یہی ہو سکتا ہے کہ اس منحوس بت کو کسی چیز سے پکڑ کر کمرے سے باہر پھینک آؤں۔ میں کمرے میں کوئی چیز دیکھنے لگا۔

اچانک مجھے ایسی روٹکتے کھڑے کر دینے والی آواز آئی جیسے کوئی مگر چھ غصے میں پھنکا رہا ہو۔ میں نے پلٹ کر بت کو دیکھا۔ اس لمحے واقعی میرے پاؤں ایک ایک من بھاری ہو گئے۔ بھاگنا چاہتا تھا مگر زمین میرے پاؤں نہیں چھوڑ رہی تھی۔ ایک انچ بھی میرے پاؤں اپنی جگہ سے نہیں ہل رہے تھے۔ کالی مندر کا بت میرے سر ہانے والی جگہ پر لیٹا ہوا تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ سیدھا ہوا رہا تھا۔ میرے جسم میں سے بھاگنے کی طاقت بھی ختم ہو گئی تھی۔ بت بالکل سیدھا ہو گیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بلند ہونے لگا۔ بلند ہوتے ہوئے وہ کمرے کی چھت کے قریب پہنچ گیا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور اپنی جگہ سے ذرا سی بھی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح کمرے سے بھاگ جاؤں مگر میرے پاؤں میری کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے نہیں ہل رہے تھے۔ بت ایک جگہ پہنچ کر ایک لمحے کے لئے رک گیا۔ اس کے چہرے کا رخ میری طرف تھا۔ اچانک بت کی آنکھوں کے گڑھوں میں سے سرخ روشنی نکلنے لگی۔ پھر ایسی آواز گونج اٹھی جیسے اچانک تیز آندھی چلنے لگی ہو۔ بت بڑی تیزی سے

میری طرف آیا جیسے کسی نے اس کو ہاتھ میں تھام رکھا ہو اور پوری طاقت سے میرے سر کا نشانہ لے کر میری طرف پھینک دیا ہو۔ میں نے گھبرا کر اپنا سر نیچے کر لیا۔ بت ایک شوکر کی آواز کے ساتھ میرے سر کے اوپر سے نکل گیا۔ اس کے بعد وہ ایک بار پھر میری طرف آیا۔

میں اپنی جگہ سے حرکت تو نہیں کر سکتا تھا لیکن میں نے نیچے کو جھک کر اپنے سر کو بچا لیا۔ جب تیسری بار بت میرے سر کا نشانہ لے کر میری طرف آیا تو ایک چیخ کی آواز بلند ہوئی اور میرے دیکھتے دیکھتے کالی مندر کا بت فضا میں ہی غائب ہو گیا۔ جیسے ہی بت غائب ہوا میرے پاؤں ہلکے ہو گئے۔ زمین نے میرے پاؤں چھوڑ دیئے۔ میں نے دوڑ کر دروازہ کھولا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ کمرے کے باہر ایک تنگ راہ داری تھی جس کے آگے کٹڑی کا صحن آ جاتا تھا۔ صحن میں چاروں طرف کوٹھڑیاں اور کمرے بنے ہوئے تھے جہاں نوکر پیشہ اور محنت کش لوگ رہتے تھے۔ سردرات میں صحن خالی پڑا تھا۔ میں دوڑتا ہوا صحن میں سے نکل کر باہر سڑک پر آ گیا۔ سڑک کے کنارے ایک چبوترہ تھا جہاں دن کے وقت ایک چھابڑی والا بیٹھا کرتا تھا۔ میں چبوترے پر بیٹھ گیا۔ سخت سردی میں بھی میرا جسم پسینے میں بھیگ گیا تھا۔

دیر تک وہیں چبوترے پر بیٹھا سوچتا رہا کہ کمرے میں واپس جاؤں یا نہ جاؤں۔ اب مجھے سردی بھی لگنے لگی تھی۔ جو کچھ میں نے کمرے میں دیکھا تھا اس پر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اب مجھ پر انور شاہ کی موت کا راز کھل گیا تھا۔ اسے کالی مندر کے بت نے ہی قتل کیا تھا اور اب وہ مجھے قتل کرنا چاہتا تھا کہ کسی غیبی طاقت نے مجھے بچا لیا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ سردیوں کی رات تھی۔ سڑک پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں سردی سے ٹھٹھرنے لگا تھا۔ کیونکہ میں بستر سے نکلا تھا اور میں نے صرف قمیض پہنا تھا۔ ہی پہنا ہوا تھا۔ جب سردی میرے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تو میں چبوترے سے اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف چلا۔ کچھ میں نے بھی حوصلہ کیا اور دل کو سمجھایا کہ جس خدا

نے مجھے اس بت کے حملے سے بچایا ہے وہ اب بھی میری حفاظت کرے گا۔
میں اپنے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ آیا تھا۔ کمرے میں جی جی رہی تھی۔ اس کی روشنی باہر راہداری میں آرہی تھی۔ میں نے کھلے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔
کمرہ ویسے کا ویسا ہی تھا جیسے میں اسے چھوڑ گیا تھا۔ میں کلمہ پاک کا ورد کرتا کمرے میں داخل ہو گیا۔ دروازے کو بند کر کے کنڈی لگائی اور وہیں کھڑے کھڑے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہاں کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میری کتاب اسی طرح پٹنگ کے پاس میز پر پڑی تھی۔ سرہانے کو ٹھیک کر کے اس پر سر رکھتے ہوئے گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ ٹیلی ویژن تو اس زمانے میں نہیں تھا ایک چھوٹا ریڈیو ٹرانسمیٹر میرے سرہانے میز پر پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا، اس کو آن کیا اور سوئی گھمانے لگا۔ ایک جگہ کسی سٹیشن پر سے قرآن پاک کی تلاوت ہو رہی تھی۔ میں نے اسی جگہ سوئی رہنے دی اور قرآن پاک کی تلاوت سننے لگا۔

اللہ کے کلام نے میرے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ میرا سارا ڈر خوف دور ہو گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی بدروح میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں نے سرہانے کو پٹنگ کی پشت کے ساتھ سیدھا لگا دیا اور اس کے ساتھ ٹیک لگا کر پٹنگ پر نیم دراز ہو گیا اور بڑے خصوص و خشوع سے کلام پاک کی تلاوت سننے لگا۔ کچھ دیر بعد تلاوت ختم ہو گئی۔ میں نے ریڈیو بند کر دیا اور جی جی آنکھیں بند کئے بغیر ویسے ہی پٹنگ پر نیم دراز ہو کر بیٹھا رہا۔ نیند کے غلبے سے میری آنکھیں بار بار اپنے آپ بند ہو رہی تھیں مگر میں آنکھیں کھلی رکھنے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کب اور کس وقت میری آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں اور میں سو گیا۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب کمرے کے روشندان میں سے دھوپ کمرے میں آرہی تھی۔ جی جی اسی طرح جل رہی تھی۔

میں نے میز پر رکھے ٹائم پیس پر نگاہ ڈالی۔ دن کے دس بج چکے تھے۔ جلدی سے

اٹھا، منہ ہاتھ دھویا، کپڑے بدلے اور سائیکل پکڑ کر دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ دفتر میں دو گھنٹے لیٹ پہنچا تھا۔ رات کے بھیاں واقعات میری آنکھوں کے سامنے ایک فلم کی طرح چل رہے تھے۔ کسی وقت لگتا میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ کسی وقت لگتا تھا کہ نہیں میں نے حقیقت میں ایسا ہوتے دیکھا ہے۔ ایک بات طے شدہ تھی کہ میں اب اس کمرے میں نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے پاس فوری طور پر رہائش کے لئے کوئی دوسری جگہ نہیں تھی۔ دفتر میں چھٹی کے بعد میں اپنی رہائش گاہ کی طرف جانے کی بجائے باغ جناح میں آکر بیٹھ گیا۔ ابھی اس باغ کا نام لارنس باغ ہی تھا۔ کچھ دیر میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا رہا پھر اٹھ کر باغ کے اوپن ایئر کیفے میں آکر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا پرانا لمبا گرم کوٹ پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے میں باغ کی کھلی فضا کی سردی سے کافی محفوظ تھا۔ میں اوپن ایئر کیفے کے برآمدے کی چھت کے نیچے ایک میز کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے چائے منگوائی اور چائے پینے لگا۔

یہی سوچ رہا تھا کہ اگر اپنے کمرے میں نہ گیا تو رات کہاں بسر کروں گا۔ کسی دوسری جگہ کا انتظام دوسرے روز ہی کر سکتا تھا۔ میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ کسی ہوٹل میں کمرہ لے کر رات بسر کر سکتا۔ کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد آخر یہی فیصلہ کیا کہ ریلوے سٹیشن پر جا کر رات ویٹنگ روم میں گزارنی چاہئے۔ شام کا اندھیرا باغ میں گہرا ہو رہا تھا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور باغ میں سے گزرتا ہوا مال روڈ پر آ گیا۔ وہاں سے ایک بس پکڑی اور ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ ریلوے سٹیشن پر کافی رونق تھی۔ میں نے پلیٹ فارم کا ٹکٹ لیا اور نمبر 4 پلیٹ فارم پر آ گیا۔ اس پلیٹ فارم پر سیکنڈ کلاس کا ویٹنگ روم تھا۔ میں نے ویٹنگ روم میں جھانک کر دیکھا وہ پہلے ہی مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ اندر جانے کی بجائے پلیٹ فارم پر ہی ایک جگہ بیٹھ گیا۔ رات ہو گئی تھی مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہیں چائے کے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر تھوڑا بہت کھایا، چائے پی اور ایک بار پھر جا کر ویٹنگ روم کا جائزہ لیا۔ وہاں

مسافروں نے رات بسر کرنے کے لئے اپنے اپنے بستر بچھادیئے تھے۔ وہاں بیٹھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔

مجھے خیال آگیا کہ ریلوے یارڈ میں خالی بوگیاں بھی کھڑی ہوتی ہیں ان خالی بوگیوں کے کسی ڈبے میں رات بڑی آسانی سے بسر کی جاسکتی ہے۔ یہ سوچ کر میں اس پلیٹ فارم پر آگیا جس کے آگے ریلوے یارڈ شروع ہو جاتا تھا۔ وہاں ایک طرف کچھ خالی ڈبے کھڑے تھے جن میں اندھیرا اچھایا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم بھی رات کی سردی میں دور تک خالی پڑا تھا۔ میں ایک ڈبے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ پہلا احساس یہ ہوا کہ ڈبے کی فضا میں ہلکی ہلکی بڑی خوشگوار گرمائش تھی۔ میں نے دوسری طرف کی دو کھڑکیاں نیچے گرا دیں۔ یارڈ کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ یہ انٹر کلاس کا ڈبہ تھا اور سیٹوں پر گدے لگے ہوئے تھے۔ سٹیشن پر رات بسر کرنے کے لئے اس سے بہتر جگہ مجھے اور کہیں نہیں مل سکتی تھی۔ میں ٹانگیں سیدھی کر کے ایک سیٹ پر ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

ڈبے میں اندھیرا تھا۔ دو کھڑکیاں جو میں نے کھول دی تھیں ان میں سے یارڈ کے کھمبوں پر جلتی ہوئی تیلیوں کی دھیلی دھیلی روشنی اندر آرہی تھی۔ میں نے ایک کھڑکی بند کر دی کیونکہ سرد ہوا بھی ڈبے میں آنے لگی تھی۔ کچھ بند ڈبے میں جو فضا تھی وہ نیم گرم تھی یعنی جس کو ہم پنجابی میں نگ کہتے ہیں فضا میں نگ تھا۔ افسوس کہ مجھے پنجابی کے لفظ نگ کا اردو میں کوئی ایسا لفظ نہیں مل سکا جو اس کے مفہوم کو پوری طرح ادا کر دے اس لئے میرے اس لفظ کو ہی قبول کر لیں۔ کچھ میں تھکا ہوا بھی تھا۔ پچھلی رات بھی جاگتا رہا تھا۔ جیسے ہی میں نے سر ڈبے کی دیوار سے لگا کر آنکھیں بند کیں تو مجھے نیند آگئی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میں کب تک سویا رہا۔ اچانک ایک دھچکا لگنے سے میری آنکھ کھل گئی۔

مجھے ایسے لگا جیسے ڈبہ چلتے چلتے رک گیا ہے۔ میں نے ڈبے کا جائزہ لیا۔ وہاں

میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ باہر سے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ پھر ڈبے کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی لائٹیں ہاتھ میں لئے ڈبے میں داخل ہوا۔ اس نے لائٹیں کی روشنی میں مجھے دیکھا تو بولا۔ ”کون ہو بھائی تم؟“

میں اتنی دیر میں سنبھل گیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ رات گزارنے کے لئے خالی ڈبے میں آکر سو گیا ہوں۔

وہ بولا۔ ”مگر یہ بوگی تو راولپنڈی لے جانی جا رہی ہے۔“

میں چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس آدمی سے پوچھا۔ ”یہ کون سا سٹیشن ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ہیمن اتر جاؤ۔ یہ بادامی باغ کا سٹیشن ہے۔ ہم ڈبے کی چینگ کے لئے نہ آتے تو تم پنڈی پہنچ گئے ہوتے۔“

میں جلدی سے ڈبے میں سے اتر گیا۔

پلیٹ فارم پر جو مسافر ٹرین کھڑی تھی یہ بوگی اس کے آخر میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میری آنکھ کھل گئی تھی ورنہ میں خدا جانے کہاں پہنچ جاتا۔ بادامی باغ لاہور شہر کا ایک حصہ ہی تھا۔ میں سٹیشن سے نکل کر پیدل ہی چل پڑا۔ ابھی بادامی باغ کے ارد گرد اتنی آبادی نہیں ہوئی تھی جتنی اب ہو گئی ہے ارد گرد کا علاقہ ویران پڑا تھا۔ جھاڑیاں اور درخت ہی درخت تھے۔ میں اندھیرے میں چلا جا رہا تھا کہ مستی گیٹ کے پاس نکل آؤں گا اور وہاں سے پیدل ہی لاہور ریلوے سٹیشن پر آ جاؤں گا اور باقی کی رات وہیں چل پھر کر گزاروں گا اور صبح وہیں سے اپنے دفتر چلا جاؤں گا۔

اُس زمانے میں بادامی باغ کے سٹیشن کے قریب ہی ایک ویران سی جگہ پر ایک پرانا قبرستان ہوا کرتا تھا۔ معلوم نہیں اب یہ قبرستان ہے یا نہیں ہے۔ جو چھوٹا سا کچا راستہ درختوں اور جھاڑیوں سے ہو کر مستی دروازے والی سڑک کی طرف جاتا تھا یہ پرانا قبرستان وہیں دائیں جانب آتا تھا۔ میں قبرستان کے قریب سے گزر رہا تھا کہ

قبروں میں سے ایک عورت کو دوڑ کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ میں واقعی ڈر گیا کہ یہ عورت کوئی بدروح ہی ہو سکتی ہے۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ میرے پاس آتے ہی اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ اگر میں اپنے ہوش و حواس کو قابو میں نہ رکھتا تو ضرور میری چیخ نکل جاتی۔

عورت کا سانس پھول رہا تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ گورے رنگ کی تھی۔ شلوار قمیض میں تھی۔ سویٹر پہن رکھا تھا۔ اچھی فیملی کی عورت لگتی تھی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کہنے لگی۔ ”بھائی! خدا کے لئے مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ میں ڈر گئی ہوں۔“

میں نے پوچھا۔ ”بی بی! کیا بات ہے۔ تم اتنی رات گئے قبرستان میں کیا کر رہی ہو؟“

وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”خدا کے لئے مجھے یہاں سے سڑک پر لے چلو۔ میں سب کچھ بتاتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ اگر تم کوئی بدروح نہیں ہو تو میں تمہیں اپنے ساتھ سڑک پر لئے چلتا ہوں۔“

وہ میرے بائیں جانب آگئی، یعنی اس جانب جس طرف قبرستان نہیں تھا۔ اس نے ابھی تک میرا بازو تھام رکھا تھا اور سہمی ہوئی میرے ساتھ لگ کر چل رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر سڑک کے کھمبوں کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر سڑک پر آگیا۔ کہنے لگی۔ ”بھائی! میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے میرے گھر تک چھوڑ آؤ۔“

میں نے کہا۔ ”بی بی! تمہارا گھر کہاں ہے؟“

عورت نے اپنا سانس درست کرتے ہوئے کہا۔ ”ماڈل ٹاؤن میں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ماڈل ٹاؤن تو یہاں سے بہت دور ہے۔ اس وقت کوئی بس بھی

اُدھر نہیں جاتی اور کوئی تاکہ بھی نہیں ملے گا۔“

اس زمانے میں کوئی رکشہ ٹیکسی تو چلا نہیں کرتی تھی۔ ایک بس ہی تھی جو ماڈل ٹاؤن جایا کرتی تھی۔ کہنے لگی۔ ”وہ سامنے میری کار کھڑی ہے۔ پلیز مجھے میرے گھر تک چھوڑ آؤ۔“

عورت کھاتے پیتے گھرانے کی لگتی تھی۔ گاڑی بھی اس کے پاس تھی۔ اسے ماڈل ٹاؤن اس کے گھر تک چھوڑنے میں کوئی حرج بھی نہیں لگتا تھا اور کوئی ایسی تشویش والی بات بھی نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے بی بی! میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں۔“

اُس وقت میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ اس عورت کو ماڈل ٹاؤن چھوڑ کر رات کے تین بجے میں خود لاہور واپس کیسے آؤں گا۔

اسے میری حماقت سمجھ لیں یا یہ سمجھ لیں کہ مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا۔ سڑک کی دوسری طرف اس کی سیاہ رنگ کی چھوٹی سی گاڑی کھڑی تھی۔ اس زمانے میں گاڑی کسی کسی کے پاس ہی ہوتی تھی۔ گاڑی پرانے ماڈل کی تھی۔ پتہ نہیں اس کا ماڈل کیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھالیا اور پرس میں سے گاڑی کی چابیاں نکال کر گاڑی سٹارٹ کی اور اسے سڑک پر ڈال دیا۔ کہنے لگی۔ ”بھائی صاحب! اس وقت اگر آپ میری مدد نہ کرتے اور مجھے دیکھ کر ڈر کر بھاگ جاتے تو میں وہیں بے ہوش ہو کر گرنے والی تھی۔“

میں نے اس سے پوچھا۔ ”بی بی! تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ رات کے ڈھائی تین بجے تم اس قبرستان میں کیا کر رہی تھیں؟“

گاڑی چلاتے چلاتے اس عورت نے پرس میں سے چھوٹا سا رومال نکال کر اپنی آنکھیں پونچھیں۔ معلوم ہوا کہ میرے اس سوال پر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ کہنے لگی۔ ”بھائی جان! میں بڑی بد نصیب عورت ہوں۔ میرا خاوند فوت ہو چکا

ہے۔ میری ایک ہی جوان بیٹی تھی۔ پاکستان پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس وقت ہم بادامی باغ سٹیشن کے پاس ایک مہاجر کیمپ میں تھے۔ میرے ساتھ کچھ رشتے دار بھی تھے۔ میں نے اپنی بیٹی کو وہیں بادامی باغ کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ مشرقی پنجاب میں ہم لوگ دو تین حویلیاں اور کچھ زمین چھوڑ کر آئے تھے۔ ان کے کلیم میں مجھے ماڈل ٹاؤن میں ایک چھوٹی سی کوٹھی الاٹ ہو گئی۔ میری خالہ اور اس کے بچے بھی میرے ساتھ ہی رہنے لگے۔ پھر ایسا ہوا کہ میرے خالو کو لندن میں ایک ملازمت مل گئی اور وہ میری خالہ اور بال بچوں کو لے کر پاکستان سے لندن چلے گئے۔ میں دو نوکروں کے ساتھ ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں اکیلی رہنے لگی۔ جھنگ میں تھوڑی سی زمین بھی الاٹ ہو گئی تھی۔ وہاں سے ہر فصل پر کچھ پیسے اور گندم وغیرہ آ جاتی تھی اور میرا گزارہ ہو رہا تھا۔ شروع شروع میں میں ہر جمعرات کو اپنی بیٹی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے بادامی باغ والے قبرستان میں جایا کرتی تھی۔ قبر پر گلاب کے ہار ڈالتی، اگر بتیاں سلگاتی اور بیٹھ کر فاتحہ پڑھتی اور اپنی بیٹی کی مغفرت کے لئے دعا مانگتی۔ لیکن پھر جیسے جیسے وقت گزر تا گیا میرے اس معمول میں وقفہ آتا گیا۔ اب میں کبھی ایک جمعرات اور کبھی دو ہفتے چھوڑ کر بیٹی کی قبر پر جاتی۔ پھر اس میں بھی کافی وقفے آنا شروع ہو گئے اور میرا کبھی ایک مہینے اور کبھی دو مہینوں کے بعد بیٹی کی قبر پر جانا ہوتا۔ کل رات میں سو رہی تھی کہ خواب میں میری بیٹی آئی۔ کہنے لگی اماں! تم نے مجھے بھلا دیا مگر میں تمہیں یاد کرتی رہتی ہوں.....“

اتنا کہہ کر گاڑی چلاتے چلاتے عورت سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ پھر جلدی ہی سنبھل کر اس نے رومال سے اپنے آنسو پونچھے اور کہنے لگی۔ ”معاف کرنا بھائی جان! خدا کسی کو جوان بیٹی کا غم نہ دکھائے۔ اور میری بیٹی سیکنہ تو مجھے بہت ہی پیاری تھی۔ ابھی تو اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔“

وہ گہری آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔ میں بھی ادا اس ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں

کہ غیر شادی شدہ جوان بیٹی کی موت کا غم کیا ہوتا ہے۔ اسے ایک ماں کا دل ہی محسوس کر سکتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

اس دوران ہم ماڈل ٹاؤن کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ اتنی جلدی ہم ماڈل ٹاؤن اس لئے بھی پہنچ گئے تھے کہ ایک تورات کا وقت تھا دوسرے اس زمانے میں سڑکوں پر دن کے وقت ٹریفک بہت معمولی ہوتا تھا اور رات کو تو خاص طور پر ماڈل ٹاؤن جانے والی سڑک سنان پڑی ہوتی تھی۔ ماڈل ٹاؤن کی کوٹھیاں ابھی پرانے ٹائپ کی تھیں اور اسی حالت میں تھیں جس حالت میں وہاں سے جانے والے انہیں چھوڑ گئے تھے۔ ہر کوٹھی کا وسیع و کشادہ لان تھا۔ ان میں جامن اور آم کے درخت اگے ہوئے تھے اور دن کے وقت بھی ان پرانی کوٹھیوں پر ایک پراسرار سی خاموشی چھائی رہتی تھی۔ رات کے وقت تو یہاں ایک سکوت سا طاری رہتا تھا۔ میرے سوال پر وہ عورت کہنے لگی۔ ”ہمارا مکان آگیا ہے۔ اس کے بعد کے واقعات میں آپ کو مکان میں جا کر سناؤں گی۔ آپ پلیز میرے ساتھ مکان میں چلیں گے نا؟ میں نے قبرستان میں ایسی خوفناک بات دیکھی ہے کہ میں ابھی تک خوف زدہ ہوں۔“

میں نے سوچا کہ اس وقت دیے بھی مجھے واپس جانے کے لئے کوئی بس نہیں ملے گی۔ رات بھی تھوڑی سی باقی رہ گئی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس عورت کے مکان میں باقی کا وقت گزار دیا جائے۔ دن نکلنے ہی بسیں چلنا شروع ہو جائیں گی تو یہاں سے سیدھا اپنے آفس چلا جاؤں گا۔“

گاڑی رات کی تاریکی میں ایک اونچے درختوں والی پرانی سی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو کر ایک بغیر دروازے کے گیراج میں جا کر رُک گئی۔ عورت نے انجن بند کرتے ہوئے میری طرف ہلکی سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پلیز! میرے ساتھ اندر آ جائیں۔ دونوں نوکر اس وقت سو رہے ہوں گے مجھے اکیلی کو بہت ڈر لگے گا۔ دن نکلنے ہی میں آپ کو خود گاڑی میں چھوڑ آؤں گی۔“

میں پہلے ہی اس کے ساتھ کوٹھی کے اندر تھوڑا سا وقت گزارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے بی بی۔“

وہ مجھے کوٹھی کے اندر ایک کمرے میں لے آئی۔ پرانے زمانے کی کوٹھی کا ڈرائنگ روم تھا۔ چھت اونچی تھی، بھاری بھر کم بوسیدہ سے صوفے پڑے تھے۔ فرش پر میلا سا قالین بچھا ہوا تھا۔ درمیان میں پرانے فیشن کی چھوٹی گول میز رکھی ہوئی تھی جس پر نیلا غلاف پڑا تھا۔ میز کے درمیان ایک گلدان میں کاغذی پھول سجائے ہوئے تھے۔ دروازوں پر لکڑی کی بریکٹوں میں پردے ہوئے لمبے لمبے پردے لٹک رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ لگا ہوا صرف ایک بلب روشن تھا۔ کمرے کی فضا میں ہلکی ہلکی سیلن کی بورچی ہوئی تھی۔ باہر بڑی سخت سردرات تھی مگر ڈرائنگ روم کی فضا ہلکی ہلکی گرم تھی۔ میں صوفے پر اپنے لمبے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ گیا۔ وہ عورت بار بار میرا شکریہ ادا کر رہی تھی کہ میں اس کے مکان میں اس کی دلجوئی کی خاطر اس کے ساتھ آیا ہوں۔ اس نے پرس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”بھائی جان! نوکر سو رہے ہیں۔ میں خود چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

اگرچہ مجھے اس وقت چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی مگر میں نے اسے روک دیا۔ ”نہیں بی بی! چائے کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ بولی۔ ”بھائی جان! ابھی صبح ہونے میں ایک گھنٹہ باقی ہے۔ میرے سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نے بھائی بن کر ایک بہن کی جس طرح دلجوئی کی ہے میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ مجھے اتنی اجازت ضرور دیں کہ میں آپ کے لئے خود چائے بنا کر پیش کر سکوں.....“

میں نے کہا۔ ”اگر آپ اصرار کرتی ہیں تو ٹھیک ہے۔“

”خدا آپ کو خوش رکھے۔“ یہ کہہ کر وہ عورت ایک دروازے کا پردہ ہٹا کر دوسری طرف چلی گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے سر صوفے کی پشت سے لگا دیا۔ نیند

مجھے بھی نہیں آرہی تھی۔ کسی نہ کسی طرح مجھے وہاں ایک ڈیڑھ گھنٹہ گزارنا تھا اس کے بعد صبح ہو جانی تھی اور ماڈل ٹاؤن سوسائٹی کی بیس ماڈل ٹاؤن سے لاہور کی جانب چلنے لگنی تھیں۔ مجھے دوسرے کمرے سے برتن رکھنے کی آواز آرہی تھی۔ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ یہ عورت جلدی سے آجائے اور یہ بتائے کہ قبرستان میں اس کے بعد کیا ہوا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ شاید اس کے ساتھ یہی ہوا ہو کہ اسے اپنی بیٹی کی قبر یا کسی دوسری قبر میں سے آتی کوئی ڈراؤنی آواز سنائی دی ہو اور وہ ڈر کر بھاگ گئی ہو۔ اتنے میں دروازے کا بھاری پردہ ہٹا اور وہ عورت نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں مہوٹا سا سٹیل کانٹے تھا جس میں دو پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کہنے لگی۔ ”جلدی جلدی چائے بنا کر لے آئی ہوں۔ خدا کرے میرے بھائی کو پسند آجائے۔“

وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی اور ایک پیالی میرے سامنے میز پر رکھ دی اور دوسری پیالی خود اٹھالی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ وہ چائے کا ہلکا سا گھونٹ لینے کے بعد بولی۔ ”پیارے بھائی! اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ یاد کر کے میری روح کانپ جاتی ہے..... ایسا ہوا کہ میں نے اپنی بیٹی کی قبر پر جا کر پھولوں کے ہار ڈالے، دو اگر بتیاں سلگائیں اور دعا مانگنے لگی۔“

اچانک میرے دل میں ایک سوال اٹھا۔ میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ میں نے پوچھا۔ ”لیکن آپ آدھی رات کے بعد قبر پر کیوں گئیں۔ آپ دن کے وقت بھی تو جاسکتی تھیں۔“

اس کے جواب میں وہ کہنے لگی۔ ”اب میں سوچتی ہوں کہ میری بیٹی نے خاص طور پر مجھے آدھی رات کے بعد اپنی قبر پر آنے کے لئے کیوں کہا تھا۔ درحقیقت وہ مجھے ایک ایسا سبق سکھانا چاہتی تھی جو ساری زندگی میرے لئے درس عبرت بنا رہے۔ اب میری بیٹی کل رات میرے خواب میں آئی تھی تو اس نے یہ بات خاص طور پر مجھے بڑی تاکید کر کے کہی تھی کہ میں اس کی قبر پر اب جب بھی آؤں آدھی رات

کے بعد آؤں۔ اس لئے میں آج آدھی رات کے بعد گئی تھی۔ ورنہ میں عام طور پر جمعرات کو دن کے وقت ہی جایا کرتی تھی۔“

میں بڑے غور سے اس کی کہانی سن رہا تھا۔ چائے کی پیالی میرے سامنے میز پر اسی طرح پڑی تھی اور میں اس عورت کی خوفناک کہانی سننے میں اس قدر محو تھا کہ مجھے چائے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”بھائی جان چائے پیجئے نا۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

”اوہ..... شکریہ!“ میں نے چائے کی پیالی اٹھالی اور اس کا ہلکا سا گھونٹ بھرا۔ چائے کا ذائقہ بڑا خوشگوار تھا۔ اس میں سے الائچی کی ہلکی ہلکی خوشبو آرہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”آپ نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ اس میں الائچی کی خوشبو ہے۔ دراصل میں چائے میں ہمیشہ ایک الائچی ڈال لیا کرتی ہوں۔ ہمارے مرشد نے جب میں ابھی دسویں جماعت میں پڑھتی تھی تو میری والدہ کو ہدایت کی تھی کہ اس لڑکی کو جب بھی چائے یا دودھ پلاؤ اس میں بسم اللہ پڑھ کر ایک الائچی ضرور ڈال دیا کرو۔ میری والدہ اس کے بعد ہمیشہ میری چائے یا گرم دودھ میں الائچی ڈال دیا کرتی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد جب میری شادی ہو گئی تو میں نے اس روایت کو اب تک قائم رکھا ہوا ہے۔ اگر آپ کو ذائقہ اچھا نہیں لگا تو میں دوسری چائے بنا کر لے آتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں، نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ الائچی سے تو چائے کا ذائقہ بڑا خوشگوار ہو گیا ہے۔ آپ یہ سنائیں کہ پھر کیا ہوا؟“

پہلی بار میں نے اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوتے دیکھی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ بے چاری غم زدہ ماں کا کچھ تو غم ہلکا ہوا۔ کہنے لگی۔ ”آپ ساتھ ساتھ چائے بھی پیتے جائیں۔ میں ہمیشہ گرم چائے پیتی ہوں۔ چائے ٹھنڈی ہو جائے تو شربت بن جاتی ہے۔“

میں نے بھی اس کے سامنے پہلی بار مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو آپ ٹھیک کہتی

ہیں۔“

اور میں چائے کا ایک اور گھونٹ بھر کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں بیٹی کی قبر پر بیٹھی فاتحہ پڑھنے کے بعد اس کی مغفرت کے لئے دعا مانگتے لگی۔ قبرستان میں بڑی ڈراؤنی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رات کے وقت میں کبھی قبرستان میں نہیں آئی تھی۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن یہ خیال کہ میں اپنی بیٹی کی قبر پر بیٹھی ہوں مجھے حوصلہ دے رہا تھا۔ اس کے باوجود قبرستان قبرستان ہی ہوتا ہے۔ کسی وقت لگتا کہ کوئی میرے پیچھے آکر چپکے سے کھڑا ہو گیا ہے۔ میں دعا مانگتے مانگتے نہ چاہتے ہوئے بھی پیچھے دیکھ لیتی۔ پیچھے سوائے درختوں، جھاڑیوں اور رات کے اندھیرے میں دھندلی قبروں کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ کسی وقت ایسے محسوس ہوتا جیسے کوئی روح میرے قریب سے ہو کر گزر گئی ہو۔ دہشت کے مارے میرے روٹنے لگے کھڑے ہو جاتے۔ پھر ایسا ہوا کہ.....“

وہ رُک گئی اور چائے پیتے ہوئے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کا دیکھنا کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ میں نے بھی چائے کا ایک گھونٹ لیا اور بڑے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔ ”ایسا کیا ہوا؟“

اس نے کہا۔ ”پھر ایسا ہوا کہ مجھے اپنی بیٹی سیکینہ کی آواز سنائی دی۔“ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا۔ ”مگر آپ کی بیٹی تو فوت ہو چکی تھی۔ پھر اس کی آواز کہاں سے آگئی؟“

وہ بڑے سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ”یہی سوچ کر میں حیران ہوئی تھی۔ پہلے تو خیال آیا کہ یہ میرا وہم ہے۔ مرے ہوؤں کی آوازیں نہیں آیا کرتیں۔ لیکن جب دوسری اور تیسری بار وہی آواز سنائی دی تو مجھے یقین کرنا ہی پڑا کہ میری بیٹی مجھے آواز دے رہی ہے۔“

میں اس کی پر اسرار کہانی میں محو ہو چکا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح بچپن میں

ہم نانی اماں سے چڑیلوں کی کہانیاں سنتے سنتے ان میں کھو جاتے تھے۔ میں نے پوچھا۔
”کیا وہ آپ کا نام لے کر آواز دے رہی تھی؟“

وہ کہنے لگی۔ ”میں آپ کو پورا فقرہ سناتی ہوں جو وہ بول رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ اماں! میرے پاس آکر مجھے پیار کرو۔ تم تو مجھے بہت پیار کیا کرتی تھیں۔ اماں! میرے پاس آکر مجھے پیار کرو۔ تم تو مجھے بہت پیار کیا کرتی تھیں۔“

مگر یہ آوازیں کہاں سے آرہی تھیں؟ میں نے پوچھا۔
اس نے کہا۔ پہلی بار میں نے یہ آواز سنی تو مجھے ایسے لگا تھا کہ جیسے یہ آواز میری دائیں جانب سے آرہی ہو۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دائیں جانب دیکھا۔ اس طرف کچھ نہیں تھا۔ پھر میں نے بائیں جانب دیکھا۔ اس طرف بھی کچھ نہیں تھا۔ جب تیسری بار آواز آئی تو میری بیٹی نے کہا۔ اماں! میں قبر کے اندر سے بول رہی ہوں۔ مجھے قبر کے اندر آکر پیار کرو۔ خوف کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جب ایک بار پھر میری بیٹی نے کہا کہ اماں! میں قبر کے اندر سے بول رہی ہوں مجھے قبر کے اندر آکر پیار کرو تو مجھے ایسے لگا جیسے میرا سارا جسم پتھر کی طرح ساکت ہو گیا ہے۔ میری بیٹی کی آواز ایک بار پھر آئی۔ اس نے کہا۔ اماں! ڈرو نہیں۔ میں قبر میں پھولوں کے بستر پر لیٹی ہوئی ہوں۔ اماں! بے شک مجھے دیکھ لو۔ میں تمہیں اپنا پلنگ دکھاتی ہوں۔۔۔۔۔ میری آنکھیں خود بخود بیٹی کی قبر کی طرف اٹھ گئیں اچانک قبر شق ہو گئی۔ پھٹ کر الگ الگ ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ قبر کے گڑھے کے اندر میری بیٹی گھٹنوں کے بل دوہری ہو کر اس طرح بیٹھی ہے کہ اس کے سر کے لمبے بال کھنچ کر پیچھے اس کے گٹنوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں اور اس کے سارے جسم کے ساتھ سانپ چبے ہوئے ہیں جو اس کا گوشت نوج نوج کر کھا رہے ہیں۔۔۔۔۔ میرے خدا۔“

اس عورت نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور کانوں کو ہاتھ لگا کر اس نے ایک سسکی بھری اور بولی۔ ”اپنی بچی کی یہ حالت دیکھ کر میں ڈر بھی گئی اور مجھے بڑا شدید

صدمہ بھی ہوا۔ بس اس کے بعد نہیں معلوم کہ مجھے کیا ہو گیا۔ ایک چنچ میرے حلق سے نکلی اور میں نے اٹھ کر بے اختیار دوڑنا شروع کر دیا۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے ذرا آگے کو ہو کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔
”پیارے بھائی جان! کیا آپ نے کبھی ایسا ڈراؤنا منظر دیکھا ہے؟“

میں نے ساری چائے اس دوران پی لی تھی۔ خالی پیالی ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھی۔ میں اس عورت کی کہانی سننے میں اس قدر کھو چکا تھا کہ مجھے خالی پیالی میز پر رکھنی بھی یاد نہیں رہی تھی۔ میں بھی اس عورت کو ٹھنکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے مجھے اس عورت کے دو چہرے نظر آنے لگے۔ مگر یہ دو چہرے نہیں تھے ایک ہی چہرہ تھا جو دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ کسی وقت دونوں چہرے آپس میں مل جاتے اور دوسرے ہی لمحے پھر الگ الگ ہو جاتے تھے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اپنے آپ ہی دل میں خیال آ گیا کہ یہ کل کی اور آج کی رات کا رت جگا ہے جس کی وجہ سے میرا ذہن نیند نہ لینے کی وجہ سے تھکن سے چور ہو کر مجھے ایک ایک کی دو دو شکلیں دکھانے لگا ہے۔

وہ عورت میری طرف مزید جھک گئی۔ اس نے پھر وہی بات پوچھی۔ ”کیا آپ نے کبھی ایسا ڈراؤنا منظر دیکھا ہے؟“

مجھے آج بھی اچھی طرح سے یاد ہے کہ میں نے کچھ بولنے، کوئی جواب دینے کی کوشش کی تھی مگر میرے ہونٹوں نے اپنی جگہ سے ہلنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے اپنے ہونٹ بڑے بھاری محسوس ہونے لگے تھے۔ وہ عورت میرے سامنے بیٹھی میری طرف جھک کر مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ ”بھائی جان! میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ کیا آپ نے کبھی زندگی میں ایسا ڈراؤنا منظر دیکھا ہے؟“

اس وقت میں نے اپنے حلق سے ہونٹوں کو ہلائے بغیر غوغاں ایسی آواز نکلتی سنی اور اس کے بعد میرا سر بھاری ہونے لگا۔ بھاری ہوتے ہوتے وہ اتنا بھاری ہو گیا

کہ میں اسے سنبھال نہ سکا اور وہ کبھی دائیں اور کبھی بائیں اس طرح اپنے آپ گرنے لگا جیسے آدمی کو اونگھ آجائے تو اس کا سر اپنے آپ ایک طرف کو گر جاتا ہے۔ اس کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چائے کی خالی پیالی گر پڑی تھی۔ پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

O

ہوش اس وقت آیا جب میں نے دیکھا کہ میں ایک سٹرچر پر پڑا ہوں۔ میرے دونوں ہاتھ پاؤں رسیوں سے سٹرچر کے ساتھ اس قدر سختی سے بندھے ہوئے ہیں کہ میں انہیں ذرا سا بھی نہیں ہلا سکتا۔ چڑے کی ایک بیلٹ میرے سینے پر بھی بندھی ہوئی تھی۔ چڑے کی ایک بیلٹ میرے سر پر اس طرح باندھی گئی تھی کہ میں اپنا سر دائیں، بائیں بالکل نہیں ہلا سکتا تھا۔ میں پوری طرح سے اپنے ہوش و حواس میں واپس آچکا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جہاں مجھے سٹرچر پر باندھ کر رکھا گیا ہے وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں۔ مجھے ان کی دھیمی سرگوشیوں میں باتیں کرنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ اوپر چھت پر بجلی کا ایک بلب روشن تھا۔ میری آنکھیں کھلی تھیں۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر میرے ہونٹ اسی طرح پتھر کی طرح سخت اور بھاری تھے اور میں انہیں الگ نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے انسانی قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی۔ پھر میں نے دیکھا کہ دو عورتیں میرے دائیں اور بائیں آکر کھڑی ہو گئی ہیں۔ دونوں گورے رنگ کی دراز قد اور بڑی خوبصورت عورتیں تھیں۔ انہوں نے سیاہ لمبے کرتے پہنے ہوئے تھے جن کے گریبان کھلے تھے۔ سر کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہروں پر بڑا گہرا میک اپ کیا ہوا تھا۔ ان کی سیاہ آنکھوں میں بلی کی آنکھوں کی سی چمک تھی۔ وہ ساکت چہروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ دونوں جھک گئیں۔ ان کے لباس سے عجیب سی طلسمی خوشبو آرہی تھی۔ انہوں نے جھک کر میرے سٹرچر کو سرہانے کے

جانب سے اتنا اوپر اٹھا دیا کہ مجھے سامنے کا منظر نظر آنے لگا۔ میرا سٹرچر سرہانے کی جانب سے ذرا سا اوپر اٹھا کر وہ چلی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ کسی پرانے دیران محل کا ایک دیران سا کمرہ ہے۔ دیواروں پر کہیں سرخ اور کہیں نیلا روغن پھرا ہوا ہے۔ دیواروں پر ایک دو مزید بجلی کے بلب روشن ہیں۔ دیواروں کے سرخ اور نیلے روغن کی وجہ سے کمرے کی فضا نیم روشن، دھندلی دھندلی اور آسب زدہ ماحول والی معلوم ہو رہی تھی۔

میرے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر میری ہی طرح کا ایک اور سٹرچر دیوار کے ساتھ پڑا تھا۔ وہ بھی سرہانے کی جانب سے تھوڑا سا اوپر کو اٹھا ہوا ہے۔ بجلی کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ اس سٹرچر پر میری ہی طرح ایک نوجوان لڑکی رسیوں اور چمڑے کی بیلٹوں سے جکڑی ہوئی ہے۔ بلب کی روشنی میں مجھے اس کی کھلی ہوئی آنکھیں صاف نظر آرہی تھیں۔ وہ بد قسمت لڑکی بھی ہوش میں تھی اور میری طرح وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ کمرے کے کونوں میں اندھیرا اندھیرا سا تھا۔ کمرے میں سیاہ لبادوں اور کھلے بالوں والی چارپانچ عورتیں ادھر ادھر بڑے پرسرار طریقے سے چل پھر رہی تھیں۔

میرے لئے یہ سب کچھ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ مجھے یہاں کس لئے لایا گیا ہے اور وہ عورت کون تھی جو مجھے بادامی باغ کے قبرستان کے باہر ملی تھی اور اپنی دردناک اور ڈراؤنی کہانی سنا کر مجھے اپنے گھر ماڈل ٹاؤن لے گئی تھی اور پھر اس نے چائے پلا کر مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ وہ عورت مجھے ان عورتوں میں کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ عورتیں میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والی تھیں۔ آخر مجھے اس طرح سٹرچر پر کیوں جکڑا گیا ہے۔ میں بول بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے ہونٹ ابھی تک بند تھے۔ میں کوشش کے باوجود انہیں ہلانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ شاید یہ اس بے ہوشی کی دوا کا اثر تھا جو چائے میں ملا

کر مجھے اس غیار عورت نے پلا دی تھی۔ میں سامنے چند قدموں کے فاصلے پر ذرا اٹھ کر اوپر کو اٹھتے ہوئے سٹرچر پر جکڑی ہوئی لڑکی کو دیکھ رہا تھا کہ یہ بھی میری طرح کی کوئی بد قسمت لڑکی ہے جو اس عورت کے پھندے میں آکر یہاں پہنچا دی گئی ہے۔ مگر یہ سیاہ پوش عورتیں کون تھیں؟ یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرنے والی تھیں۔ ہمیں یہاں کس لئے لایا گیا تھا۔ وہاں چارپانچ سیاہ پوش عورتیں تھیں۔ وہ سب کی سب جوان تھیں۔ سب کی سب حسین اور خوبصورت تھیں۔ سب نے بڑے گہرے میک اپ کئے ہوئے تھے۔ سب نے بڑے اعلیٰ قسم کے طلسمی خوشبوؤں والے پرفیوم لگا رکھے تھے۔ ان کی خوشبو ساری فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ پانچوں کی پانچوں سیاہ پوش عورتیں کمرے سے چلی گئیں۔

کمرے میں، میں اور لڑکی سٹرچروں پر جکڑے ہوئے اکیلے رہ گئے۔ میں بول نہیں سکتا تھا۔ شاید لڑکی بھی میری طرح نہیں بول سکتی تھی۔ شاید اس کے ہونٹ بھی میرے ہونٹوں کی طرح پتھر بن چکے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھ سے ضرور پوچھتی کہ یہ لوگ ہمیں یہاں کیوں لائے ہیں؟ ہمیں سٹرچروں پر کیوں جکڑا گیا ہے؟ ہمیں یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ مگر میری طرح اس کے ہونٹوں پر بھی سکوت کی مہر ثبت تھی۔ میری طرح وہ بھی صرف دیکھ سکتی تھی بول نہیں سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں بول نہیں سکتا لیکن اپنے حلق سے غوغا کی آوازیں نکال کر ہی اسے اپنے زندہ ہونے کا یقین دلاؤں۔ میں نے حلق سے آواز نکالنے کی کوشش کی تو سوائے خراہٹ کی آواز کے میرے حلق سے اور کوئی آواز نہ نکلی۔ شاید لڑکی کی بھی ایسی ہی حالت تھی۔ چند قدموں کے فاصلے پر میرے سامنے وہ بھی سٹرچر پر جکڑی ہوئی میری طرف بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر بول نہیں سکتی۔

اتنے میں کمرے کے کونے میں جہاں اندھیرا اندھیرا سا تھا چاروں سیاہ فام

عورتیں برآمد ہوئیں۔ انہوں نے ہاتھوں میں شمع دان تھام رکھے تھے۔ ہر شمع دان کے اوپر تین تین موم بتیاں روشن تھیں۔ وہ سیاہ پوش روحوں کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اسی طرف آرہی تھیں جہاں میں اور لڑکی سڑیچروں پر جکڑے ہوئے تھے۔ وہ زیر لب کچھ پڑھ رہی تھیں۔ ان کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ قریب آنے کے بعد وہ سیاہ پوش عورتیں لڑکی کے سڑیچر کی طرف چلی گئیں اور اس کے ارد گرد چکر لگانے لگیں۔ دو سیاہ پوش عورتیں میرے سڑیچر کے گرد چکر لگانے لگیں۔ وہ قدم قدم چل کر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ایسے چکر لگا رہی تھیں جیسے کوئی طلسمی عمل کر رہی ہوں۔ مجھے ان کی سرگوشیوں ایسی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کیا پڑھ رہی تھیں یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ہمارے گرد چھ سات چکر لگانے کے بعد وہ ایک قطار میں ہو گئیں اور کمرے کے دوسرے کونے کی طرف چلی گئیں۔ میں گردن تو نہیں گھما سکتا تھا صرف آنکھیں گھما کر جس قدر دیکھ سکتا تھا انہیں دیکھ رہا تھا اور دل میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ خدا جانے یہ میرے ساتھ کیا کرنے والی ہیں۔

کمرے کے دوسرے نیم روشن کمرے میں جا کر انہوں نے شمع دان دیوار کے ساتھ بنے ہوئے مینٹل پیس پر رکھ دیئے اور شمع دانوں میں جلتی موم بتیوں کے آگے سر جھکا کر کچھ دیر تک ساکت کھڑی رہیں۔ پھر واپس پلٹ کر ہماری طرف بڑھنے لگیں۔ جب وہ ذرا قریب آئیں تو یہ دیکھ کر میری روح لرز اٹھی کہ ان میں سے ہر سیاہ پوش عورت کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی دھار والا خنجر تھا۔ خنجر انہوں نے ایسے پکڑ رکھا تھا جیسے کسی کے پیٹ میں گھونپنے جارہی ہوں۔ انہوں نے ایسے سر جھکا رکھے تھے جیسے وہ کوئی بڑی مقدس رسم ادا کر رہی ہوں۔ وہ سب سے پہلے لڑکی کے سڑیچر کی طرف گئیں۔ چاروں عورتیں لڑکی کے سڑیچر کی بائیں جانب بڑے ادب کے ساتھ کھڑی ہو گئیں۔ میں یہ منظر سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر ان میں سے ایک سیاہ

پوش عورت سڑیچر کے پاس آگئی۔ اس نے جھک کر لڑکی کے ماتھے پر بوسہ لیا اور خنجر سے لڑکی کے لباس کو کاٹنا شروع کر دیا۔ جب لڑکی کے اوپر کا دھڑبے لباس ہو گیا تو سیاہ پوش عورت نے دونوں بازو پھیلا دیئے اور چہرہ اوپر اٹھا کر حلق سے ایسی چیخ کی آواز نکالی کہ میری روح تک کانپ گئی۔

آپ اندازہ نہیں کر سکتے ہیں کہ سڑیچر پر جکڑی ہوئی لڑکی کا کیا حال ہو رہا تھا جو بد قسمت بول بھی نہیں سکتی تھی، آواز بھی نہیں نکال سکتی تھی۔ چیخ مارنے کے بعد عورت نے خنجر کی نوک لڑکی کے بے لباس پیٹ کے اوپر رکھ کر ایک چیرا دیا۔ لڑکی کے پیٹ میں سے سرخ سرخ خون کی دھار نکل کر بہنے لگی۔ چھت پر لگے بجلی کے بلب کی روشنی میں مجھے سب کچھ بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے ہی خون کی سرخ دھار نکلی سیاہ پوش عورت نے اس پر اپنا منہ رکھ دیا اور اس طرح گھونٹ بھرنے لگی جیسے خون پی رہی ہو۔ لڑکی کے حلق سے نکلنے والی تکلیف دہ خرخراہٹ کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ سیاہ پوش عورت نے خون کے تین چار گھونٹ پینے کے بعد منہ اوپر اٹھایا تو اس کے ہونٹ خون سے سرخ ہو رہے تھے۔

سیاہ پوش عورت چیخے ہٹ گئی۔ اس کے فوراً بعد تینوں سیاہ پوش عورتیں آگے بڑھیں اور باری باری بد نصیب لڑکی کے خون سے اپنی پیاس بجھانے لگیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ان خون آشام عورتوں کا تعلق خون پینے والی ویسپائر عورتوں کے بد کردار قبیلے سے ہے۔ میں یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ تھوڑی دیر میں میرا بھی یہی حشر ہونے والا تھا۔ میں نے دل میں گڑگڑا کر خدا سے اپنی زندگی کی دعائیں مانگنی شروع کر دیں کہ یا اللہ پاک مجھے ان منحوس چیزیلوں سے اپنی پناہ میں رکھنا۔ میں خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اپنا خوفناک خونیں انجام صاف نظر آرہا تھا۔ میں اس گھڑی کو کوس رہا تھا جب میں بادامی باغ کے قبرستان سے اس منحوس عورت کے ساتھ ماڈل ٹاؤن کی طرف چل پڑا تھا۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

صرف خدا کی ذات ہی مجھے ان خونخوار بلاؤں سے نجات دلا سکتی تھی۔ جب تین سیاہ پوش چڑیلیں بھی لڑکی کے پیٹ کے زخم سے بہنے والے خون سے اپنے ہونٹ اور منہ لال کر چکیں تو وہ پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئیں اور اپنے سر اس طرح ہلانے لگیں جیسے نشے میں جھوم رہی ہوں۔ اب وہ سیاہ پوش چڑیل آگے بڑھی جس نے سب سے پہلے لڑکی کے جسم میں خنجر کی نوک گھونپی تھی۔ وہ لڑکی کے سر ہانے کی جانب آگئی۔ چمکتا ہوا خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیاں اس نے لڑکی کے گلے پر رکھیں اور انہیں آہستہ آہستہ لڑکی کے گلے پر پھیرنے لگی۔ پھر ایک جگہ اس نے دو انگلیوں سے لڑکی کے گلے کو ذرا اساد پایا اور دوسرے ہاتھ سے خنجر کی نوک وہاں رکھی اور میرے دیکھتے دیکھتے بد قسمت لڑکی کا آدھا گلا کاٹ ڈالا۔ وہاں سے خون کا فوارہ اچھل کر سیاہ پوش چڑیل کے جسم پر پڑا۔ اس کا سارا جسم خون آلود ہو گیا۔ اس پر ایک وحشت سوار ہو گئی۔ اس نے اپنا منہ لڑکی کی گردن کی کٹی ہوئی رگ پر رکھ دیا اور خون پینے لگی۔

پھر وہ پیچھے ہٹ گئی اور دوسری سیاہ پوش چڑیل دیوانہ وار آگے بڑھیں اور انہوں نے خنجر مار مار کر لڑکی کی گردن کو آدھی سے زیادہ کاٹ ڈالا اور لپک لپک کر انسانی خون سے اپنی پیاس بجھانے لگیں۔ اس دوران پہلی سیاہ پوش چڑیل نے لڑکی کے جسم پر خنجر گھونپنے شروع کر دیے۔ لڑکی کا جسم خون میں نہا گیا تھا۔ ہر طرف خون ہی خون تھا۔ سیاہ پوش چڑیلوں کے ہاتھ، منہ اور چہرے خون میں لتھڑ گئے تھے۔ یہ ہیبت ناک منظر دیکھ کر دہشت کے مارے میرا خون خشک ہو گیا تھا۔ دل ایسے زور زور سے دھڑکنے لگا تھا جیسے ابھی سینہ چیر کر باہر آجائے گا۔ اذیت ناک موت کی ہیبت میرے سارے جسم پر طاری ہو چکی تھی۔ میرے ساتھ بھی یہی آدم خور درندوں کا سلوک ہونے والا تھا۔

میرے ہونٹ پہلے ہی پتھر ہو چکے تھے۔ اب میرا جسم بھی مارے دہشت کے

جیسے بے حس ہو گیا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جیسے مفلوج ہو چکی تھیں۔ میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ اگر کچھ یاد تھا تو یہی کہ دو چار منٹ کے بعد میرے جکڑے ہوئے بدن پر بھی آدم خور وحشیوں کی طرح خنجر چلنے والے تھے۔ سیاہ پوش چڑیلیں وحشیوں کی طرح گردنیں ہلا ہلا کر رقص کر رہی تھیں۔ وہ رقص کرتی ہوئی میرے سٹریچر کے پاس آگئیں۔ انہوں نے وہی کچھ کیا جو انہوں نے بد قسمت لڑکی کو ہلاک کرنے کے بعد اس کا خون پیتے وقت کیا تھا۔ تین سیاہ پوش چڑیلیں میرے سٹریچر سے ذرا ہٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ پہلے والی سیاہ پوش چڑیل خنجر ہاتھ میں لئے میری طرف بڑھی۔ اس کا خون آلود وحشی چہرہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ خنجر والا ہاتھ اوپر کئے میرے بالکل قریب آگئی۔ اس نے سب سے پہلے میرے لباس کو خنجر سے کاٹ کر میرے جسم کو برہنہ کرنا تھا تاکہ وہ آسانی سے میرا پیٹ چاک کر سکے۔

اُس چڑیل نے خوفناک انداز میں میری طرف جھک کر دیکھا۔ میرے سینے سے اٹھی ہوئی چیخ حلق میں آکر پھنس گئی تھی۔ سیاہ پوش چڑیل نے خنجر کی نوک میری قمیض کے گریبان کے اندر ڈال دی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کہانی ختم ہونے والی تھی۔ بلکہ ختم ہو گئی تھی۔ موت نے اپنا بے رحم ہاتھ میرے سینے پر رکھ دیا تھا۔ اب خنجر نے میرا گریبان چاک کر کے میرا پیٹ ننگا کرنا تھا اور پھر تیز دھار والے خنجر نے میرے پیٹ میں اتر کر مجھے میرے خون میں ہی نہلا دینا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میری بند آنکھوں کے اندر جیسے بجلی سی چمک گئی اور میرے دل نے کلمہ پاک کا ورد شروع کر دیا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور میرا دل کلمہ پاک پڑھ رہا تھا۔ اس سے پہلے مجھے گریبان کے اندر خنجر کی نوک کی ہلکی سی چھین محسوس ہوئی تھی کیونکہ سیاہ پوش چڑیل نے میرا گریبان چاک کرنے کے لئے خنجر میرے گریبان میں ڈالا تھا لیکن کلمہ پاک کے ورد کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے جیسے میرے سینے پر سے خنجر ہٹا لیا ہے۔ خنجر کی نوک کا احساس غائب ہو گیا تھا۔

میں یہی سمجھا کہ موت کے خوف کی وجہ سے میرا جسم سن ہو گیا ہے اسی لئے خنجر کی نوک کا احساس نہیں ہو رہا۔ لیکن یہ اللہ کے پاک کلام کا دل کی گہرائیوں سے ورد کرنے کا اثر تھا کہ میرے سینے پر خنجر کی نوک کی چھین ختم ہو گئی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولنے کے بعد میں نے جو کچھ دیکھا اور مجھے جو کچھ نظر آیا اس پر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسے خواب یا موت کے بعد کا منظر سمجھا۔ شاید دہشت کی وجہ سے میری روح پرواز کر گئی تھی اور میں جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ مرنے کے بعد کا منظر تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اس گھڑی کا انتظار کرنے لگا جب فرشتے آکر میری روح کو جہاں بھی لے جانا ہو گا لے جائیں گے۔ جسم کا مادی احساس بالکل ختم ہو چکا تھا۔ میں اپنے آپ کو ایک روح ہی سمجھ رہا تھا کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں ایک لمحے کے بعد سیاہ پوش چڑیلوں کی قتل گاہ سے نکل کر دریا کنارے سنگ مرمر کی کسی بارہ دری میں لیٹا ہوا تھا۔ آنکھیں بند کئے کئے میں نے آہستہ سے اپنے دونوں ہاتھوں اور پاؤں کو حرکت دی۔ میرے دونوں پاؤں اور ہاتھ اب رسیوں میں جکڑے ہوئے نہیں تھے۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ اٹھایا اور اسے اپنے سینے پر رکھ کر ذرا سا اندر کو دبا دیا۔

مجھ پر یہ حیرت انگیز حقیقت واضح ہو گئی کہ میری روح جسم سے الگ نہیں ہوئی تھی اور میں اپنے مادی جسم کے ساتھ زندہ سلامت تھا۔ میں اپنے ہونٹ بھی ہلا سکتا تھا۔ میں نے ہونٹوں کے زندہ ہو جانے کے بعد سب سے پہلا فقرہ جو ادا کیا وہ یہ تھا۔
”یا اللہ پاک! تیرا شکر ہے۔“

میں آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ارد گرد نگاہ ڈالی۔ میں نے دیکھا کہ دریا کا کنارہ ہے۔ رات کا وقت ہے۔ آسمان پر مشرق کی جانب زرد چاند نکلا ہوا ہے جس کا عکس دریا کی لہروں میں نظر آ رہا ہے۔ ہر طرف دھندلی زرد چاندنی پھیلی ہوئی ہے اور میں سنگ مرمر کی ایک پرانی بارہ دری میں ہوں۔ میں نے دریا کو اور بارہ دری کو فوراً

پہچان لیا۔ یہ لاہور کا راوی دریا تھا اور بارہ دری کا مران کی بارہ دری تھی جو اس زمانے میں دریا کے اندر آگئی ہوئی تھی اور لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر بارہ دری میں جایا کرتے تھے۔

میرے ساتھ ایک معجزہ ہی ہوا تھا۔ اللہ کے فضل اور اللہ کے حکم سے کسی غیبی طاقت نے مجھے سیاہ پوش چڑیلوں کی قتل گاہ سے نکال کر کا مران کی بارہ دری میں ڈال دیا تھا۔ میں کوئی صوفی اور پرہیزگار آدمی نہیں تھا۔ دنیا کی آلائشوں میں پھنسا ہوا گناہ گار انسان تھا۔ لیکن دو باتیں میرے اندر نو جوانی کے زمانے ہی سے موجود تھیں اور میں نے ان پر ہمیشہ اور ہر قسم کے حالات میں عمل کیا تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ میں نے کبھی کسی عورت پر بری نگاہ نہیں ڈالی تھی اور بدکاری سے میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو بچایا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر میرا ایمان سیدہ پلائی چٹان سے بھی زیادہ مضبوط اور راسخ تھا۔ میں آپ کو اپنی کہانی سنارہا ہوں تو ہو سکتا ہے کہ آپ کہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی جو رسیوں اور چمڑے کی بیلٹ میں جکڑا ہوا ہو وہ ایک دم سے اپنے آپ آزاد ہو کر کہیں کا کہیں پہنچ جائے۔ آپ کو ایسا سوچنے کا پورا حق حاصل ہے۔ میں آپ سے ہر گز بحث نہیں کروں گا۔ یہ معاملات بحث مباحثے کی دنیا سے بہت آگے کے معاملات ہیں۔ میں آپ سے صرف اتنا ہی کہوں گا کہ دنیا میں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے اور میرے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیسے ہوتا ہے؟ ہم نہیں سمجھ سکتے۔ عین ممکن ہے کہ اس کی بھی کوئی وجہ ہو اور وہ وجہ انسانی عقل و دانش کی سمجھ سے باہر ہو۔

تھا۔ جب وہ سیاہ چیز بارہ دری کے ذرا قریب آئی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک کشتی ہے۔ میں بڑا خوش ہوا کہ کسی ملاح کو رات کے وقت کوئی کام پڑ گیا ہے اور وہ دریا کے دوسرے کنارے پر جا رہا ہے وہ بارہ دری کے قریب سے ہو کر ضرور گزرے گا۔ اس وقت میں اسے آواز دے کر اپنی طرف بلا لوں گا اور اس کی کشتی میں بیٹھ کر دریا کے دوسرے کنارے یعنی شاہدرہ پہنچ جاؤں گا۔ کشتی چھوٹی تھی اور زرد چاندنی کے غبار میں سے نکل کر آہستہ آہستہ واضح طور پر نظر آنے لگی تھی۔

اچانک مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ کشتی خالی تھی۔ اسے کوئی ملاح نہیں چلا رہا تھا بلکہ اپنے آپ چل رہی تھی۔ زیادہ حیرانی مجھے اس بات کی ہو رہی تھی کہ اگر کشتی کو کوئی ملاح چلا نہیں رہا تو وہ سیدھی بارہ دری کی طرف کیوں چلی آرہی ہے۔ اس کی سمت کس نے برقرار رکھی ہوئی ہے۔ لیکن بہت جلد یہ معمہ حل ہو گیا۔

میں کشتی کو دیکھتا جا رہا تھا۔ اس پر برابر نگاہ رکھتے ہوئے تھا۔ خالی کشتی بارہ دری کی سیڑھیوں کے پاس آ کر رک گئی۔ پھر ایسے لگا جیسے کسی نے اسے سیڑھیوں کے ساتھ کسی چیز سے باندھ دیا ہے۔ اس کے بعد کچھ دیر تک سناٹا چھایا رہا۔

میرے دل میں اچانک خیال آیا کہ ایک کشتی خدا نے میری مدد کے لئے بھیج دی ہے مجھے اس پر بیٹھ کر دریا پار کر جانا چاہئے آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا کم از کم یہاں سے تو نکلوں گا۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ مجھے اپنی دائیں جانب جس طرف بارہ دری کے چوتھے کازینہ تھا کسی کے لباس کی سرسراہٹ سی سنائی دی۔ ساتھ ہی وہی طلسمی خوشبو محسوس ہوئی جس سے میں کافی حد تک مانوس ہو چکا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کون ہے۔ آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کون ہو سکتی تھی۔ جی ہاں وہ پرانی قلعے کی

ویران حویلی کی پراسرار حسین و جمیل بدروح روہنی عرف سلطانہ ہی تھی۔ وہ میرے سامنے آ کر ظاہر ہو گئی۔ اس نے وہی گلابی بلکہ زعفرانی رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں سفید موتیوں کی مالا تھی اور سر پر ہیرے جواہرات والا چھوٹا سا

میں کامران کی بارہ دری میں اٹھ کر بیٹھا ہوا تھا۔

میرا ذہن بالکل تازہ دم تھا۔ مجھے بادامی باغ کے قبرستان سے لے کر پراسرار عورت کی گاڑی میں بیٹھ کر ماڈل ٹاؤن جانے اور پھر چائے پینے کے بعد بے ہوش ہو جانے اور ہوش میں آنے کے بعد سیاہ پوش چڑیلوں کی قتل گاہ میں پہنچ جانے کے تمام واقعات یاد تھے۔ میں نے دھندلی چاندنی میں اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ایک بات طے شدہ تھی کہ میں دریا کے وسط میں واقع بارہ دری میں بیٹھا تھا اور صبح ہونے سے پہلے وہاں کوئی کشتی نہیں آتی تھی اور مجھے باقی کی رات بارہ دری میں ہی گزارنی تھی۔ رات ٹھٹھر رہی تھی۔ پہلے تو مجھے سردی کا زیادہ احساس نہیں ہوا لیکن اب مجھے بھی سردی لگ رہی تھی۔ میرا لمبا گرم کوٹ جو میں نے رات کے وقت پراسرار عورت کے ساتھ ماڈل ٹاؤن جاتے ہوئے پہن رکھا تھا خدا جانے کہاں مجھ سے الگ ہو گیا تھا۔ میں اس وقت بند گلے والے سویٹر میں تھا جس نے بہت حد تک مجھے سردی سے بچا رکھا تھا۔

دریا کے درمیان ویسے بھی سردی زیادہ ہوتی ہے۔ میں بے خیالی میں دریا کے قلعے والے کنارے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ مجھے زرد چاندنی میں دریا پر کوئی سیاہ چیز دکھائی دی جو آہستہ آہستہ بارہ دری کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں اسے مسلسل دیکھ رہا

تاج تھا۔

میں اسے اب روہنی نہیں کہوں گا، سلطانہ ہی کہوں گا کیونکہ اس عورت نے مغل صوبیدار شہزادے سے شادی کر لی تھی اور اس کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنا نام روہنی سے بدل کر سلطانہ رکھ لیا تھا۔ لیکن میں اسے روح نہیں کہوں گا بدروح ہی کہوں گا۔ کیونکہ میرے عقیدے اور میرے نظریے کے مطابق پاکیزہ اور نیک روحیں اتنے بلند مقامات پر ہوتی ہیں کہ دنیا کے مادی ماحول میں آنے سے گریز کرتی ہیں صرف ایسی روحیں ہی زمین پر کبھی کبھی آجاتی ہیں جو اپنے خراب اعمال کی وجہ سے بوجھل ہوتی ہیں، بھاری ہوتی ہیں۔ مادی احساسات و ملال اور پچھتاووں میں مبتلا ہوتی ہیں اور اس وقت تک ارض و سما کے درمیان بھٹکتی رہتی ہیں جب تک ان کے گناہوں کی بخشش نہیں ہو جاتی۔ یہ میں نے کسی جگہ پڑھا تھا۔ ہو سکتا ہے اس میں سچائی کم اور مبالغہ زیادہ ہو لیکن میں اپنے عقیدے کے مطابق سلطانہ کو بدروح ہی کہوں گا۔

سلطانہ اپنی زعفرانی ساڑھی کو بڑی نزاکت کے ساتھ سمیٹ کر میرے سامنے بارہ دری کے فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کے لباس میں سے اس کی خاص طلسمی خوشبو کی لہریں میری طرف آرہی تھیں۔ مجھے اس بدروح پر جو میری ہمدردی تھی سخت غصہ آرہا تھا۔ میں نے اس سے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”اب تمہارے آنے کا کیا فائدہ ہے۔ تم اس وقت کہاں تھیں جب سیاہ پوش چڑیلیں میرے جسم کے ٹکڑے کرنے والی تھیں۔ اگر خدا میری مدد نہ کرتا تو اس وقت تک سیاہ پوش چڑیلیں میرا خون پینے کے بعد میری لاش کے ٹکڑے بھی ہڑپ کر چکی ہوتیں۔“

بدروح سلطانہ میری طرف گہری اور مسلسل نگاہوں سے تنک رہی تھی۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو اس نے اپنی مخصوص سرگوشی نما آواز میں کہا۔ ”اس میں کوئی شک نہیں اگر خدا کی مدد تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو اس وقت تم اس دنیا میں نہ

ہوتے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خدا نے جس وسیلے سے تمہاری مدد کی وہ وسیلہ میں ہی تھی۔“

میں نے فوراً کہا۔ ”مگر میں نے تو تمہیں وہاں کہیں نہیں دیکھا تھا۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو تم نے اس وقت آکر مجھے کیوں نہیں روکا جب وہ چڑیل عورت مجھے بادی باغ کے قبرستان سے اپنے ساتھ ماڈل ٹاؤن لے جا رہی تھی۔ تم نے اس وقت آکر میرے ہاتھ سے چائے کی پیالی کیوں نہ غائب کر دی جس میں وہ عورت بے ہوشی کی دواملا کر مجھے پلا رہی تھی؟ اگر تم اس وقت آکر میری مدد کرتیں تو میں کم از کم اس ہولناک اذیت سے تونج جاتا جو میں نے سیاہ پوش چڑیلوں کی قید میں سڑپچر پر جکڑے ہوئے برداشت کی تھی۔“

سلطانہ کی بدروح بڑی توجہ سے میری بات سن رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”تمہاری روح ابھی مادی جسم میں قید ہے۔ بہت سی باتیں، بہت سی حقیقتیں ایسی ہیں جن کا احساس تم اس مادی جسم میں رہتے ہوئے نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقتیں تمہارے شعور سے ابھی پوشیدہ ہیں اور جب تک تم اپنے مادی جسم میں قید ہو تم سے پوشیدہ ہی رہیں گی۔ مجھے یہ حقائق تم پر ظاہر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں تمہیں صرف اتنا ہی بتا سکتی ہوں کہ جو اذیتیں تم نے سیاہ پوش چڑیلوں کے درمیان رہ کر اٹھائی ہیں وہ تمہارے مقدر کا حصہ تھیں اور یہ حصہ تمہیں مل کر ہی رہنا تھا۔ اس کے بعد میں قدرت خداوندی کے حکم سے تمہاری مدد کا وسیلہ بن کر تمہارے پاس پہنچ گئی اور تمہیں وہاں سے اٹھا کر اس بارہ دری میں لے آئی۔۔۔۔۔“

میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”خدا کے لئے تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھ پر جو مصیبت آتی ہے اور میرے ساتھ یہ جو کچھ ہو رہا ہے صرف تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔ اگر میں تمہیں پرانے قلعے کی حویلی میں مرتبان سے نکال کر آزاد نہ کرتا تو کبھی اس مصیبت میں نہ پھنستا۔“

سلطانہ کی بدروح نے کہا۔ ”میں سمجھتی ہوں کہ ایسا ہونا تھا اور ہو کر رہا۔“
میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”خدا کے لئے مجھے یہ بتاؤ کہ اب اس بک بک سے
میرا پیچھا کیسے چھوٹے گا۔ مجھے ان بدروحوں سے کیسے نجات ملے گی؟“
سلطانہ بدروح کہنے لگی۔ ”میں تمہیں اصل حقیقت نہیں بتا سکتی۔ دنیا میں بعض
اوقات انسان سے نادانی میں یا اس کے بعض اعمال کے نتیجے میں ایسی حرکت ہو جاتی
ہے جس کے نتائج بہت دور تک پہنچ جاتے ہیں یہاں تک کہ خود وہ انسان بھی ان
نتائج سے بے خبر ہوتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ تم نے مجھے دشمن پجاری رگھو کی قید
سے آزاد کر کے میرے ساتھ بھلائی کی یا اپنے ساتھ دشمنی کی یا ایسا تم نے صرف
اپنے جذبہ تجسس کی تسکین کے لئے کیا۔ لیکن میں تمہیں یہ ضرور بتا دینا چاہتی ہوں
کہ تم ایک خوفناک چکر میں پھنس چکے ہو اور یہ بھی یاد رکھنا کہ اس دنیا میں اگر تمہیں
کوئی اس چکر سے نکال سکتا ہے تو وہ صرف میں ہوں۔“

مجھے اس بدروح کی باتوں پر کچھ یقین آ بھی رہا تھا اور نہیں بھی آ رہا تھا۔ البتہ مجھے
اس بدروح رو بہنی عرف سلطانہ پر غصہ ضرور آ رہا تھا کہ میں نے اس بدروح کو اس
کے دشمن رگھو کی قید سے کیوں آزاد کرایا۔ مجھے مرتبان کا ڈھکن نہیں کھولنا چاہئے تھا
لیکن ہر کام کا سراغ لگانے اور اپنے ذوق تجسس کو تسکین دینے کی جوا بھی یا بری عادت
مجھ میں تھی اس کا نتیجہ میں بھگت رہا تھا۔ میں نے اس سے یہی سبق حاصل کیا تھا کہ
انسان کو ایسی چیزوں میں کبھی دخل نہیں دینا چاہئے جن کا اس کے ساتھ کوئی تعلق
واسطہ نہ ہو۔ میرے سبق حاصل کرنے سے اب مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا
کیونکہ میں نادانی میں یا نا سمجھی میں ایسی حرکت کر بیٹھا تھا جو مجھے نہیں کرنی چاہئے تھی۔
جن، بھوتوں، بدروحوں اور چڑیلوں کی اپنی ایک الگ دنیا ہوتی ہے جس کا انسانوں کی
دنیا سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن اگر کبھی بالواسطہ طور پر یا اتفاق سے
انسان کا اس مخلوق سے آمنا سامنا ہو جائے تو آدمی کو چاہئے کہ وہ خاموشی سے آگے

نکل جائے اور ان لوگوں کے معاملات میں ہرگز دخل اندازی نہ کرے۔

بدروح سلطانہ کی گفتگو سننے کے بعد میں اب غصہ کھانے یا جھنجھالنے کی بجائے
بڑی سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ مجھے بدروح سلطانہ کی باتوں پر غور کرنا
چاہئے اور جس مصیبت میں میں پھنس چکا ہوں اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے
سلطانہ سے مدد حاصل کرنی چاہئے کیونکہ سلطانہ کی بدروح کو مرتبان سے آزاد کرنے
کے بعد پجاری رگھو میری جان کا دشمن بن چکا تھا اور وہ تین چار مرتبہ مجھے موت کے
گھاٹ اتارنے کی کوشش بھی کر چکا تھا مگر عین وقت پر سلطانہ کی بدروح نے مجھے بچا
لیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں اپنی زندگی کی خاطر سلطانہ کے آگے اپنی ہار تسلیم کر لی
تھی۔

میں نے سلطانہ کی بدروح سے کہا۔ ”سلطانہ! تم نے جو کچھ کہا ہے میں اُسے تسلیم
کر تا ہوں۔ آج سے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم جو کہو گی میں وہی کروں گا۔“
سلطانہ کی بدروح نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ میں نے اس کے حسین چہرے پر
مسرت کی ایک لہری نمودار ہوتے دیکھی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا
اور کہنے لگی۔ ”تم نے یہ بات کہہ کر میرے سینے پر پڑے ہوئے ایک ایسے پتھر کو ہٹا دیا
ہے جسے میں اکیلی کبھی نہیں ہٹا سکتی تھی۔ تم نے اپنی اور میری ہم دونوں کی مشکل
آسان بنا دی ہے۔ مجھے مرتبان کی قید سے آزاد کرنے اور میرے آزاد ہو جانے کے
بعد ہم دونوں تقدیر کے جس چکر میں پھنس گئے تھے اب ہم دونوں مل کر اس کا مقابلہ
کر کے اس میں سے نکل سکیں گے۔“

میں نے سلطانہ کی بدروح سے کہا۔ ”تمہارا تعلق روحوں کی دنیا سے ہے۔ میں
زندہ انسانوں کی دنیا میں رہتا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ کیسے چل سکیں
گے؟“

اس کے جواب میں بدروح سلطانہ نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ ”ہو سکتا

ہے تمہیں بھی میرے ساتھ میری دنیا میں جانا پڑ جائے۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟“ میں نے سوچا کہ روز روز کی مصیبت سے یہی بہتر ہے کہ ایک ہی بار اس مصیبت سے چھکارا حاصل کر لیا جائے۔ کم از کم ان بدروحوں سے ہمیشہ کے لئے نجات تو مل جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے معاملے کی سنگینی کا احساس نہیں تھا۔ اگر اس وقت مجھے علم ہو جاتا کہ میں کس جہنم میں کودنے والا ہوں اور میرے ساتھ کیا گزرنے والی ہے تو میں بدروح سے تعاون کرنے کی کبھی حامی نہ بھرتا اور ملک چھوڑ کر ہی بھاگ جاتا لیکن میرے ساتھ جو کچھ ہونے والا تھا اسے تو ہو کر ہی رہنا تھا۔ میں نے سلطانہ کی بدروح سے کہہ دیا۔ ”جب میں نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ تم جو کہو گی میں وہی کروں گا تو مجھے تمہارے ساتھ تمہاری بدروحوں کی دنیا میں جانے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

بدروح سلطانہ یہ سن کر بڑی خوش ہو گئی۔ اس نے میرا ہاتھ چوم لیا۔ اس کے ہونٹ برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔ میرے بدن میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ کہنے لگی۔ ”کیا تم ابھی میرے ساتھ چل سکتے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کالی مندر والے سونے کے بت کاراز کیا ہے۔ کیا اسی بت نے میرے دوست انور کا خون کیا تھا؟“

بدروح سلطانہ نے کہا۔ ”جب میں نے اس سے پہلے تمہیں پجاری رگھو کے بھیجے ہوئے دشمنوں سے بچایا تھا تو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ جب سے تم نے مجھے مرتبان سے باہر نکال کر اس کی قید سے آزاد کیا ہے پجاری رگھو کی بری آتما یعنی بدروح تمہاری اور میری جان کی دشمن بن گئی ہے۔ پجاری رگھو ایک تو مجھے دوبارہ اپنے قبضے میں کرنا چاہتا ہے، دوسرے وہ تمہیں بھی قتل کرنا چاہتا ہے۔ میں اس کے قابو اس لئے نہیں آرہی کہ مجھے اس کی سازش کا پہلے سے علم ہو جاتا ہے اور میں اپنا بچاؤ کر لیتی ہوں۔ تمہاری جان کو وہ اس لئے کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو تا کہ عین

وقت پر میں تمہاری مدد کو پہنچ جاتی ہوں۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ چوہے بلی کا یہ کھیل زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ میں پجاری رگھو کے قابو آؤں چاہے نہ آؤں لیکن ایک نہ ایک دن وہ تمہیں قتل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا اور ایسا میں کبھی نہیں چاہتی کہ ہو، اس لئے کہ مجھے رگھو کی قید سے آزاد کر کے تم نے مجھ پر وہ احسان کیا ہے جس کا تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے اور تمہاری جان کی حفاظت کرنا میرا فرض بن گیا ہے۔ میں چاہتی تھی کہ کسی طرح تمہیں اپنے ساتھ چلنے پر راضی کر کے اس خونی کھیل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں مگر میں جانتی تھی کہ انسانوں کی دنیا میں رہنے والا کوئی بھی انسان بدروحوں اور چڑیلوں کی دنیا میں جانے پر راضی نہیں ہو گا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ تمہیں اٹھا کر لے جاؤں میں ایسا بڑی آسانی سے کر سکتی تھی لیکن میں چاہتی تھی کہ تم اپنی مرضی سے میرے ساتھ چلو۔ تمہارا اپنی مرضی سے میرے ساتھ بدروحوں کی دنیا میں جانا بڑا ضروری تھا بلکہ بدروحوں کی دنیا میں جانے کے لئے یہ ایک لازمی شرط تھی..... اب جبکہ تم نے اس کی حامی بھر لی ہے اور میرے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے ہو تو میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ اب تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ تمہارے دوست انور کو کالی مندر کے سونے کی مورتی نے ہی قتل کیا تھا اور وہ تمہیں قتل کرنے والی تھی کہ میں نے عین وقت پر پہنچ کر تمہیں بچا لیا۔ وہ کالی مندر کی مورتی اصل میں ہمارے دشمن پجاری رگھو کی بھیجی ہوئی ایک انتہائی خطرناک قاتل کی بدروح تھی جو ہزاروں انسانوں کو قتل کر چکا تھا اور مرنے کے بعد اس کی بھکتی ہوئی گناہگار روح کو پجاری رگھو نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔

میں بدروح سلطانہ سے ایک اور سوال کرنا چاہتا تھا کہ اس نے مجھے ٹوک دیا اور بولی۔ ”تم اپنے دل میں مجھے بدروح سلطانہ نہ کہا کرو۔ میں نے زندگی میں اسلام قبول کر لیا تھا اور یاد رکھو ایک مسلمان کی روح گناہ گار ہو سکتی ہے مگر بدروح نہیں ہو سکتی

اس لئے تم آئندہ سے مجھے یا تو سلطانہ کہہ کر مخاطب کیا کرو اور اگر مجھے بدروح کہنا ہو تو روہنی کی بدروح کہہ دیا کرو۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ صوبیدار شہزادہ شیروان سے شادی کرنے کے بعد میں مسلمان ہو گئی تھی اور اپنا ہندو نام روہنی ترک کر کے سلطانہ رکھ لیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں آئندہ ایسا ہی کروں گا۔ اب یہ بتاؤ کہ وہ پراسرار عورت کون تھی جو مجھے بادامی باغ قبرستان کے پاس ملی تھی اور جس نے مجھے اپنی اکلوتی بیٹی کی موت کی جھوٹی کہانی سنا کر بے ہوش کر کے خون پینے والی اور مردوں کو کھانے والی سیاہ پوش چڑیلوں کے حوالے کر دیا تھا۔“

میں اپنی داستان سناتے ہوئے سلطانہ کو بدروح روہنی ہی کہوں گا لیکن اس کو مخاطب کرتے ہوئے اگر کبھی مجھے اس کا نام لینا پڑ جاتا تھا تو میں اسے سلطانہ کے نام سے بلاتا تھا۔ چنانچہ میرے سوال کے جواب میں بدروح روہنی نے کہا۔ ”وہ عورت بھی ہمارے دشمن رگھو کی بھیجی ہوئی ایک بدروح تھی جو ایک عورت کا روپ لے کر تمہیں سیاہ پوش چڑیلوں کے جال میں پھنسانے کے لئے بھیجی گئی تھی اور وہ سیاہ پوش چڑیلیں بھی پاتال کی اپسراؤں کی بدروحیں تھیں جو بھوپال اور جھانسی کے جنگلوں میں رات کے وقت بھولے بھٹکے مسافروں کو اٹھا کر لے جاتی ہیں اور ان کا خون چوس لیتی ہیں اور گوشت کھا جاتی ہیں۔ میں تمہیں بدروحوں کی جس دنیا میں لے کر جا رہی ہوں وہ تمام کی تمام بتوں کی پوجا کرنے والے مردوں اور عورتوں کی بدروحیں ہیں۔ ان میں دو قسم کی بدروحیں ہیں۔ ایک گناہگار بدروحیں اور دوسری سراپ یعنی بدعابائی ہوئی روہنی یعنی ایسے مردوں اور عورتوں کی بدروحیں جنہیں کسی کی بدعالگ گئی اور مرنے کے بعد اس کی روح بدروح بن کر زمین پر بھٹکتی پھرتی ہے۔ ان میں ایسے بت پرستوں کی روہنی آسیب اور چڑیلیں بن جاتی ہیں جنہوں نے دنیا میں بہت بڑے گناہ کئے ہوتے ہیں۔ ایسے گناہ کرنے والے مردوں کی روہنی بھوت

بن جاتی ہیں اور لوگوں کو چٹ جاتی ہیں اور اکثر انہیں موت کی گود میں پہنچا دیتی ہیں مگر میری ایک بات یاد رکھو کوئی بدروح، کوئی آسیب، کوئی جن بھوت اور چڑیل کبھی ایسے شخص کا کچھ بگاڑنا تو کیا اس کے قریب بھی نہیں جاتی جس کو اپنے خدا پر مکمل یقین ہو اور جس کا سینہ ایمان کی شمع سے روشن ہو۔ اللہ کے نور کی روشنی میں چلنے والے انسان کو دور ہی سے دیکھ کر بدروحیں اس کا راستہ چھوڑ کر بھاگ جاتی ہیں۔ یہ چڑیلیں اور بھوت عام طور پر بت پرستوں یعنی کافروں کو چمٹتے ہیں یا پھر کسی ایسے مسلمان کو بھی چٹ جاتے ہیں جس کا خدا اور اس کے رسول صلعم پر ایمان پختہ نہ ہو۔ بہر حال یہ ساری باتیں تمہیں آہستہ آہستہ اپنے آپ معلوم ہو جائیں گے۔“

میں نے بدروح روہنی سے ایک سوال کیا جس کی اسے شاید مجھ سے امید نہیں تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”سلطانہ! تم تو اسلام قبول کر کے مسلمان ہو گئی تھیں۔ پھر تمہاری روح بدروح بن کر کیوں بھٹک رہی ہے۔“

میرے اس سوال پر بدروح روہنی نے پلکیں جھپکاتے ہوئے مجھے کچھ دیر تک بڑے غور سے دیکھا۔ پھر کہنے لگی۔ ”میں جب ہندو تھی تو مندروں میں جا کر اور گھر میں بھی مختلف دیوی دیوتاؤں کے بتوں کی پوجا کرتی تھی انہیں خدامانتی تھی۔ یاد رکھو شرک خدا کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ خدا اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ ہم جب مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں تو انہیں بھگوان مان کر نعوذ باللہ انہیں خدا کا شریک بنادیتے ہیں جو گناہ کبیرہ ہے۔ میں نے بھی مورتیوں کی پوجا کر کے بہت بڑا گناہ کیا تھا اور جوان ہونے تک یہ گناہ کرتی رہی تھی۔ چنانچہ میرے مرنے کے بعد میں اس بڑے گناہ کی سزا اس طرح بھگت رہی ہوں کہ بدروح بن کر زمین پر بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ شادی کے بعد اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے میری اتنی بخشش ضرور ہو گئی ہے کہ میں کوئی چڑیل نہیں بنی اور دوسری بدروحیں سوائے ان بدروحوں کے بڑے پجاریوں اور منتری کی بدروح کے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔۔۔۔۔ اب جو

باتیں میں تمہیں بتانے چلی ہوں ان کو بڑے غور سے سننا۔ بدروحوں کی دنیا میں لے جانے سے پہلے میں تمہیں کچھ ہدایات دینا چاہوں گی جن پر تمہیں سختی سے عمل کرنا ہو گا ورنہ تمہیں نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو گا۔ کیا تم سن رہے ہو؟“

میں بدروح روہنی یعنی سلطانہ کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”میں سن رہا ہوں سلطانہ!“

سلطانہ نے بے اختیار سی ہو کر میرا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگی۔ ”جب تم میرا نام لے کر مجھے بلا تے ہو یا مخاطب کرتے ہو تو مجھے بہت سی باتیں یاد آ جاتی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تمہارا میرا ساتھ تو بہت ہی تھوڑا ہے بلکہ تم مجھے تین چار مرتبہ ہی ملی ہو پھر تمہیں میری باتیں کہاں سے یاد آنے لگی ہیں؟“

بدروح روہنی نے آہ بھر کر کہا۔ ”میں تمہیں یہی بتانا چاہتی ہوں کہ تمہاری کون سی باتیں مجھے یاد آتی ہیں اور کیوں یاد آتی ہیں اور تمہارے میرے درمیان کیا رشتہ تھا؟“

میں نے تعجب کے ساتھ پوچھا۔ ”کیا تمہارے اور میرے درمیان کوئی رشتہ بھی تھا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

بدروح روہنی نے اپنے لمبے بالوں کو آہستہ سے پیچھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”سب سے پہلے میں اسی راز پر سے پردہ اٹھاؤں گی کہ تمہارا میرا رشتہ کیا تھا۔ اب میں تمہیں وہ دو ایک باتیں بتانا ضروری سمجھتی ہوں جن کا تمہیں بدروحوں کی دنیا میں داخل ہونے کے بعد خیال رکھنا ہو گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم میرے ساتھ غیبی حالت میں ہو گے۔ یعنی تم سب کو دیکھ سکو گے تمہیں سوائے بڑے پجاریوں اور بڑے منتریوں کی بدروحوں کے دوسرا کوئی نہیں دیکھ سکے گا لیکن میں تمہیں بڑے پجاریوں اور بڑے منتریوں کی بدروحوں سے دور رکھوں گی کیونکہ اگر ان کی تم پر نظر پڑ گئی تو وہ تمہیں اپنے قبضے میں کر کے تمہیں مار ڈالیں گے اور تمہیں بھی ایک بدروح بنا کر اپنے ناپاک

گروہ میں شامل کر لیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میری اجازت کے بغیر تمہیں کوئی لفظ زبان سے نہیں بولنا ہو گا۔“

میں نے بدروح روہنی سے سوال کیا۔ ”یہ بدروحوں کی دنیا کس جگہ پر ہے؟ کیا زمین کے اندر ہے یا زمین کے اوپر کسی دیران جگہ پر ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”اس سوال کا پورا جواب دینے کی مجھے اجازت نہیں ہے۔ تم یوں سمجھ لو کہ جہاں میں تمہیں لے جا رہی ہوں وہ جگہ نہ زمین کے اندر ہے نہ زمین کے اوپر ہے، نہ دنیا کے کسی جنگل میں ہے نہ ہی دنیا کے کسی دیرانے میں ہے۔ وہ ایک ایسا جنگل ہے، ایسا دیرانہ ہے، زندہ انسانوں کی نگاہوں سے چھپا ہوا ہے جہاں نہ کبھی کوئی زندہ انسان گیا ہے اور نہ کوئی زندہ انسان کبھی جاسکتا ہے۔ وہاں صرف بدروحیں رہتی ہیں لیکن سب سے پہلے میں تمہیں جھانسی اور بھوپال کے درمیان واقع جنگل کے اس پرانے قلعے کی دیران حویلی میں لے جا رہی ہوں جہاں تم نے مجھے میرے پجاری رگھو کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا تھا اور پھر تم نے میری روح کو مرتبان میں سے آزاد کر دیا تھا۔“

میں نے پوچھا۔ ”جھانسی بھوپال تو یہاں سے بہت دور ہے اور اب تو دونوں ملکوں بھارت اور پاکستان میں ویزے پاسپورٹ کے بغیر کوئی بھی سفر نہیں کر سکتا۔“

حسین و جمیل روہنی کی بدروح نے کہا۔ ”تم یہ کیوں بھول گئے ہو کہ میں تمہاری طرح زندہ انسان نہیں ہوں۔ میرے لئے وقت اور فاصلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ آؤ اپنے نئے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔“

ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمیں باتیں کرتے کرتے کافی وقت گزر گیا تھا اور رات ڈھلنا شروع ہو گئی تھی۔ روہنی بدروح نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگی۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تم گھبراؤ گے نہیں کیونکہ ایک بار پہلے بھی میں تمہیں اپنے ساتھ ہوا میں اٹھا کر لے جا چکی ہوں۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے ہوا میں پرواز کرتے ہوئے لاہور سے جھانسی کے پرانے قلعے میں لے جائے گی۔ میں نے کہا۔ ”میرا گرم کوٹ میرے پاس نہیں ہے صرف سویٹر میں نے پہن رکھا ہے۔ ہوا میں اڑتے ہوئے مجھے سردی لگے گی۔“
روہنی بدروح نے کہا۔ ”جب تک تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہے گا تمہیں سردی نہیں لگے گی۔ تیار ہو جاؤ۔“

روہنی بدروح نے میرے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا مجھے ایک ہلکا سا جھکا لگا اور میرے پاؤں اپنے آپ کا مران کی بارہ دری کے فرش سے دو تین فٹ اونچے اٹھ گئے۔ روہنی بھی اتنا ہی بلند ہو گئی تھی۔ پھر کسی غیبی طاقت نے ہمیں آگے دھکیل دیا۔

O

اب ہم غروب ہوتے چاند کی پھیکڑی روشنی میں دریائے راوی کی سطح پر سات آٹھ فٹ کی بلندی پر اڑنے لگے تھے۔ ہمارا رخ لاہور ریلوے اسٹیشن کی طرف تھا۔ دریائے راوی کے اوپر سے گزر جانے کے بعد ہم آہستہ آہستہ اور بلند ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ ہم سامنے سے آنے والے درختوں سے بھی دس بارہ فٹ کی بلندی پر آگئے۔ ہماری رفتار ابھی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ ہم ریلوے لائن کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔ ہمارے دائیں بائیں لاہور شہر کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔

میں بغیر کسی حرکت اور کوشش کے اپنے آپ روہنی بدروح کے ساتھ پرواز کر رہا تھا۔ ہم لاہور ریلوے اسٹیشن کے اوپر سے نکل گئے۔ جب اسٹیشن کی روشنیاں کافی پیچھے رہ گئیں تو میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”اگر ہم اسی رفتار سے اڑتے رہے تو دو دن میں جھانسی بھوپال کے جنگل میں پہنچیں گے۔“

روہنی نے کہا۔ ”ہم سورج نکلنے سے پہلے پہلے اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔“
اس کے نور اُبعد مجھے ایک ہلکا سا دھچکا لگا اور فضا میں ایک دم سے ہماری رفتار اتنی تیز ہو گئی کہ لاہور شہر کی روشنیاں دیکھتے دیکھتے ہمارے نیچے سے گزر گئیں۔ ہماری بلندی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اب ہمیں نیچے اگر کوئی روشنی دکھائی دیتی تو وہ ایک نقطے کی طرح جھلملاتی نظر آتی اور کچھ ہی دیر بعد پیچھے رہ جاتی۔

تیز ہوا میں روہنی کے لمبے سیاہ بال اڑ رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا میرے سارے جسم سے ٹکرا رہی تھی مگر مجھے ایک لمحے کے لئے بھی سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

روہنی بدروح نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ پھر مجھے نہیں معلوم کہ کب پاکستان اور انڈیا کے بارڈر آئے اور کب گزر گئے اور کب ہم ہندوستان کے ملک میں داخل ہو گئے۔ اب ہم اتنی بلندی پر فضا میں پرواز کر رہے تھے کہ مجھے نیچے رات کے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اپنے پاؤں کے نیچے اندھیرے کا ایک خلا ہی نظر آرہا تھا۔

پھر کسی شہر کی روشنیاں جو ایک چھوٹی سی روشنی کی ڈھیری کی طرح تھی بڑی تیزی سے پیچھے کی طرف نکل گئیں۔ اس کے کچھ دیر بعد کچھ اور جھلملاتی روشنیوں کے نقطے نیچے سے گزر گئے۔ اب آسمان پر سحر کا نور جھلکنا شروع ہو گیا تھا اور ستاروں کے فانوس آہستہ آہستہ بجھنے لگے تھے۔ ہم ایک دوسرے سے کوئی بات کئے بغیر بڑی تیز رفتاری سے فضا میں پرواز کر رہے تھے۔ ایک بار ہمارے نیچے جھلملاتی روشنیوں کے کئی چھوٹے چھوٹے ڈھیر ادھر ادھر بکھرے ہوئے دکھائی دیئے تو روہنی بدروح نے پرواز کے دوران پہلی بار زبان کھولی اور کہا۔ ”ہم بھارت کی راجدھانی دلی اور نئی دلی کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔“

میں نے اونچی آواز میں روہنی سے پوچھا۔ ”سلطانہ! ہم بھارت کی فضائی حدود میں پرواز کر رہے ہیں اور ابھی تک انڈین ایئر فورس کے کسی جیٹ فائٹر طیارے نے ہمارا پیچھا نہیں کیا۔ کیا ہم انہیں کسی راڈار پر نظر نہیں آ رہے؟“

مجھے روہنی بدروح کی آواز سنائی دی۔ اُس نے کہا۔ ”دنیا کے کسی راڈار میں اتنی شکتی اور طاقت نہیں کہ وہ ہمیں دیکھ سکے۔“

ہم چونکہ سطح زمین سے کافی بلندی پر پرواز کر رہے تھے اس لئے ہمیں مشرقی آسمان کے افقی کناروں پر سب سے پہلے طلوع ہوتے سورج کی گلابی روشنی نظر آنے لگی تھی۔ آسمان پر سحر کا اجالا نمودار ہو چکا تھا۔ مجھے ایک بار پھر روہنی کی آواز سنائی دی۔ ”ہم جھانسی کے اوپر سے گزر چکے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم قلعہ روہت گڑھ

کے اوپر اترنے والے ہیں۔“ میں نے نیچے زمین کی طرف دیکھا۔ دن کے ہلکے ہلکے اجالے میں مجھے سوائے اونچی نیچی پہاڑیوں اور درختوں کے سیاہ دھبوں کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ اچانک میرا جسم ہلکا ہو کر نیچے کی طرف جیسے گرتا ہی چلا گیا۔ روہنی نے کہا۔ ”گھبرانا مت۔ جب تک تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم روہت گڑھ کے قلعے کی چھت پر اتر رہے ہیں۔“

پھر ہماری رفتار اپنے آپ مدھم ہو گئی۔ اب نیچے جنگل کے درخت صاف نظر آ رہے تھے۔ ہم نیچے جا رہے تھے اور درخت اوپر ہماری طرف آ رہے تھے۔ پھر ان درختوں کے جھنڈوں کے درمیان ایک شکستہ پرانے قلعے کی چھت نمودار ہو گئی۔ یہ روہت گڑھ کا قلعہ ہی ہو سکتا تھا۔ ہم قلعے کی چھت پر اتر گئے۔ چھت کی تین منڈیریں مسمار ہو چکی تھیں صرف ایک منڈیر کا آدھا حصہ باقی رہ گیا تھا۔ یہ وہی منحوس قلعہ تھا جس کی ایک دیران حویلی کا آسیب مجھ پر سوار ہو گیا تھا۔

اس قلعے میں واپس آنے پر میرا دل خوف سے ایک لمحے کے لئے بوجھل ضرور ہو گیا تھا مگر یہ سوچ کر میں نے اپنے آپ کو حوصلہ دیا کہ ایک بار جو کچھ ہونا ہے ہو جائے اس کے بعد تو مجھے ہمیشہ کے لئے اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔

روہنی کی بدروح مجھے قلعے کی تاریک سیڑھیوں میں سے لے کر نیچے ایک ایسے کمرے میں لے آئی جس پر ویرانی برس رہی تھی۔ دیواروں کا پلستر اکھڑ چکا تھا۔ اس کمرے میں سے ایک تاریک راستہ دوسرے کمرے میں جاتا تھا۔ روہنی کی بدروح میرے آگے چل رہی تھی۔ تاریک راہداری میں آکر وہ رک گئی۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”اس وقت قلعے میں ہم دونوں اکیلے ہیں۔ پجاری رگھو کی بدروحیں اور راکھشس ہمارے آس پاس کہیں نہیں ہیں۔ پھر بھی تمہیں بڑی احتیاط کرنی ہوگی۔ میرے ساتھ ہی رہنا اور کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔“

ہم تاریک راہ داری میں سے گزر گئے۔ دوسری طرف ایک اور کمرہ تھا جو نہ چھوٹا تھا نہ زیادہ بڑا تھا۔ اس کی دیواروں کا پلستر بھی اکھڑ چکا تھا۔ کمرے کے درمیان میں ایک چبوترہ تھا جس میں سے ایک زینہ نیچے کسی تہہ خانے میں اترتا تھا۔ روہنی کی بدروح تہہ خانے کا زینہ اترنے لگی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ دس بارہ میٹر حیاں اترنے کے بعد ہی مجھے نیچے سے ایک خوشبو سی آنا شروع ہو گئی۔ یہ خوشبو بڑی پراسرار تھی مگر اس میں ایک عجیب قسم کی اداسی کا احساس تھا۔ ہم ایک تہہ خانے میں آ گئے۔

تہہ خانے کی ایک لمبی محرابی کھڑکی کی جالیوں میں سے گلابی رنگ کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ اس روشنی میں میں نے تہہ خانے کا جائزہ لیا۔ میں نے دیکھا کہ تہہ خانے کے وسط میں ایک تخت بچھا ہوا تھا جس کے اوپر ایک چھتری بنی ہوئی تھی۔ اس چھتری پر ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے جو کھڑکی سے آتی گلابی روشنی میں چمک رہے تھے۔ تخت پر سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا اور سبز رنگ کے گاؤتیکے لگے ہوئے تھے۔ کمرے کے کونے میں بھی ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا جس کی تین سنگ مرمر کی میز حیاں تھیں۔ اس چبوترے کے اوپر ایک تابوت پڑا تھا جس کے اوپر بھی ایک ہیرے جواہرات سے جڑی ہوئی چھتری نے سایہ کر رکھا تھا۔ اس چبوترے کے عقب میں دیوار پر سرخ رنگ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ اس پراسرار کمرے کی فضا اداس کر دینے والی خوشبو سے بوجھل ہو رہی تھی۔

روہنی کی بدروح آہستہ آہستہ چل کر تابوت والے چبوترے کے پیچھے دیوار پر گرے ہوئے سرخ پردے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ میں چبوترے کے پاس ہی کھڑا رہا۔ روہنی کی بدروح نے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ میں اس کے پاس چلا گیا اس آسپاسی قسم کے تہہ خانے کی فضا میں میرے اعصاب پر ایک عجیب سا دباؤ محسوس ہونے لگا تھا۔ روہنی کی بدروح نے سرگوشی ایسی آواز میں کہا۔ ”اب میں تمہیں ایسی

شے دکھانے والی ہوں جسے دیکھ کر تمہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے دیوار پر گرے ہوئے پردے کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹا دیا۔ کھڑکی کی جالیوں میں سے آتی روشنی سیدھی دیوار پر آکر پڑی۔ میں نے اس کی روشنی میں دیوار پر سنہری فریم والی روغنی رنگوں سے بنائی ہوئی ایک تصویر لگی دیکھی جس پر پھولوں کے ہار پڑے تھے۔ یہ تصویر مغل زمانے کے کسی شہزادے کی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے سر پر کلنگی دار سنہری پگڑی تھی۔ پگڑی کی ایک پٹی جواہرات اور ہیروں سے مرصع تھی۔ شہزادے کے ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا جس طرح کہ عام طور پر مغل بادشاہوں کی تصویروں میں ہوا کرتا ہے۔ اس تصویر پر نظر پڑتے ہی مجھے جو پہلا احساس ہوا وہ یہ تھا کہ جس شخص کی یہ تصویر ہے میں نے اسے پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔

روہنی بدروح بھی میرے بائیں جانب کھڑی تصویر کو بڑی محویت کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ”یہ میرے خاوند مغل صوبیدار شہزادہ شیردان کی تصویر ہے۔ آج سے تین سو برس پہلے اس قلعے میں ہماری بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی تھی۔ کیا تم اس تصویر کو دیکھ رہے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”ہاں دیکھ رہا ہوں۔“

روہنی نے کہا۔ ”اسے اور قریب ہو کر غور سے دیکھو۔“

میں تصویر کے اور قریب ہو گیا اور تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ جیسے جیسے میں تصویر کو دیکھ رہا تھا ایک عجیب سا احساس میری رگ و پے پر مسلط ہو رہا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس تصویر نے مجھے کس قدر حیرت زدہ کر دیا تھا۔ روہنی نے شکستہ سی آواز میں کہا۔ ”کیا تم نے ابھی تک اپنی تصویر کو نہیں پہچانا؟ میں نے تو پہلی نظر میں ہی تمہیں پہچان لیا تھا کہ یہی میرا شہزادہ شیردان ہے۔“

وہ تصویر ہو بہو میری شکل تھی۔ میری ہی آنکھیں، میری ہی ناک اور میرے ہی

ہوٹ اور میری ہی پیشانی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے مغل بادشاہوں کے زمانے کا لباس پہن رکھا تھا۔ میں بت بنا اپنی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ ذرا سی بھی گنجائش نہیں تھی کہ میں روہنی سے کہتا کہ یہ میری تصویر نہیں ہے۔ روہنی کی بدروح نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔ ”اس طرف آؤ۔ میں تمہیں ایک اور تصویر دکھاتی ہوں۔“

وہ چند قدم چلا کر ساتھ والی دیوار کے پاس لے گئی۔ اس دیوار کے پاس سنگ مرمر کی میز پر ایک شمع دان پڑا تھا۔ روہنی کی بدروح نے اس شمع کو ایک انگلی سے چھوا۔ انگلی کے چھوتے ہی شمع دان ایک دم سے روشن ہو گیا۔ میں نے بائیں ہاتھ میں شمع دان اٹھالیا اور آگے بڑھ کر دائیں ہاتھ سے دیوار پر گرے ہوئے سرخ مغل کے پردے کو ایک طرف ہٹا دیا۔ پردے کے پیچھے دیوار پر فرش سے اوپر تک ہوئی ایک قد آدم تصویر لگی تھی۔ یہ بھی روغنی رنگوں سے بنی ہوئی تصویر یعنی آکل پینٹنگ تھی۔ اس تصویر میں ایک خوبصورت عورت شاہانہ لباس میں مرصع کرسی پر بیٹھی تھی اور ایک شاہانہ لباس والا نوجوان اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس نوجوان کے بھی سر پر ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے۔

روہنی کی آواز آئی۔ ”اس تصویر کو دیکھ رہے ہو شیروان! یہ تمہاری اور میری..... ہم دونوں کی اکٹھی تصویر ہے۔“

میں چونک اٹھا۔ روہنی کی بدروح نے پہلی بار مجھے اپنے مردہ خاوند شیروان کے نام سے بلایا تھا۔ اس میں کوئی شک شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ اس تصویر میں جو عورت کرسی پر بیٹھی تھی وہ روہنی ہی تھی اور جو نوجوان اس کے پہلو میں شاہانہ لباس میں کھڑا تھا وہ میں تھا۔

لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آج سے تین سو سال پہلے بھی میں اس دنیا میں ایک مغل شہزادے کے روپ میں موجود تھا اور اس عورت کا خاوند

رہ چکا تھا۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے میری شکل اس آدمی سے جو تمہارا خاوند تھا ملتی جلتی ہو۔ یہ میں نہیں ہوں میری شکل و صورت کا آدمی ہے.....“

روہنی کی بدروح نے ایک آہ بھری اور کہنے لگی۔ ”ایسا تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ تم نے ایک مسلمان گھرانے میں جنم لیا تھا۔ تمہارے مذہب میں انسان کا کوئی دوسرا جنم نہیں ہو تا بلکہ مرنے کے بعد وہ صرف حشر کے دن ہی اللہ کے حکم سے اٹھایا جائے گا۔ میں نے اگرچہ اسلام قبول کر لیا تھا مگر میری پیدائش ایک ہندو گھرانے میں ہوئی تھی اور یہ عقیدہ میرے خون میں رچ بس چکا تھا کہ ایک ہندو عورت یا مرد مرنے کے بعد اپنے کرموں کے مطابق دوسرا جنم لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمہیں اپنی شکل دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا کہ یہ حقیقت میں تم ہی ہو..... لیکن اب میں تمہیں ایک اور چیز دکھاتی ہوں۔ ہو سکتا ہے اسے دیکھ کر تمہیں یقین آ جائے کہ تم آج سے تین سو سال پہلے میرے خاوند تھے۔“

اب وہ مجھے اُس تابوت کے پاس لے گئی جو کمرے کے وسط میں چبوترے پر رکھا ہوا تھا اور جس پر ایک زرنگار چھتری نے سایہ ڈالا ہوا تھا۔ اس نے مجھے تابوت کے پاس اپنے ساتھ کھڑا کر لیا اور تابوت کے ڈھکن کو دونوں ہاتھوں سے ایک طرف سرکا دیا۔ ایک عجیب ڈراؤنی آواز کے ساتھ ڈھکن ایک طرف کو ہٹ گیا۔ روہنی کی بدروح نے شمع دان اٹھا کر آگے کر دیا۔ شمع کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ تابوت کے اندر کسی شہزادے کی لاش پڑی تھی۔ یہ شہزادہ میں ہی تھا۔ یہ میری ہی لاش تھی۔ میری ہی شکل تھی۔ میری شکل کے ہی نقش و نگار تھے۔ کوئی بھی دیکھ کر کہہ سکتا تھا کہ یہ میری ہی لاش ہے۔ مجھ پر دہشت طاری ہو گئی۔ کبھی کسی انسان نے اپنی لاش سامنے پڑی ہوئی نہیں دیکھی ہوگی۔ میں پہلا انسان تھا کہ تابوت میں پڑی ہوئی اپنی ہی لاش کو دیکھ رہا تھا پھر بھی مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ بات میرے عقیدے اور عقل کے خلاف تھی۔ بالکل خلاف تھی۔

روہنی کہنے لگی۔ ”شیروان! کیا تم اپنی لاش کو بھی پہچاننے سے انکار کرو گے؟“
خوف کے مارے میرا گلا خشک ہو گیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ ”میں اب
بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ ایک اتفاق کی بات ہو گئی ہے کہ اس آدمی کی شکل میری شکل
سے ملتی جلتی ہے۔“

روہنی نے آہ بھر کر کہا۔ ”میں تمہیں ایک ایسی نشانی دکھاتی ہوں جسے دیکھ کر
تمہیں یقین آجائے گا کہ یہ تمہاری ہی لاش ہے۔“
اس نے شمع دان تابوت کے کنارے پر رکھ دیا اور جھک کر شہزادے کی لاش کی
گردن کے گرد لپٹا ہوا کفن ایک طرف ہٹا دیا اور کہا۔ ”یہ دیکھو۔“

میرے داہنے کان کی لو کے نیچے گردن پر سورج گرہن کا ایک سیاہ نشان تھا۔
انسانی انگوٹھے کے نشان کے برابر سورج گرہن کا یہ نشان پیدائشی تھا۔ روہنی نے
مغل شہزادے کی لاش کا کفن ایک طرف ہٹا کر مجھے اس کی گردن پر کان کے نیچے
دیکھنے کے لئے کہا تو یہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کہ میرے ہم شکل شہزادے کی لاش کے
کان کے نیچے بھی سورج گرہن کا وہی نشان موجود تھا۔ روہنی نے کہا۔ ”اسے ہاتھ لگا
کر اپنی تسلی کر لو۔ یہ تمہارا ہی نشان ہے اور اصلی ہے۔ اسے کسی نے اپنے ہاتھ سے
نہیں بنایا۔ ایسا ہی نشان تمہارے کان کی لو کے نیچے بھی گردن پر موجود ہے جو تم نے
ضرور آئینے میں کئی بار دیکھا ہو گا۔ کیا اب بھی تم یقین نہیں کرو گے کہ تم ہی میرے
خاوند شہزادہ شیروان ہو...؟“

میں نے کہا۔ ”میں اسے نہیں مانتا۔ یہ سب کچھ طلسم، جادوگری اور نظر کا فریب
ہے۔ ورنہ یہ لاش اب تک گل سڑ چکی ہوتی۔ کوئی انسانی لاش تین سو سال تک صحیح
حالت میں نہیں رہ سکتی۔“

روہنی کی بدروح نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ کوئی انسانی لاش اتنے برس صحیح
حالت میں نہیں رہ سکتی۔ یہ بھی اب تک گل سڑ چکی ہوتی لیکن میں نے اسے اپنی طلسمی

طاقت سے صحیح حالت میں رکھا ہوا ہے صرف اس لئے کہ اگر کبھی کسی جنم میں تم مجھے
مل گئے اور تمہیں میری باتوں کا یقین نہ آیا تو میں تمہیں تمہاری لاش دکھا کر یقین
دلانے کی کوشش کروں گی کہ تم ہی میرے خاوند مغل شہزادہ شیروان ہو جس نے
میری خاطر تین سو برس بعد ایک بار پھر شہزادے شیروان کے روپ میں جنم
لیا ہے۔“

”یہ سب بکواس ہے۔“ میں نے غصے میں آکر کہا۔ ”میں ایسی باتوں کو تسلیم نہیں
کر تا بلکہ میں حیران ہوں کہ تم جو مسلمان ہو چکی ہو کس طرح ان خرافات پر یقین
کرتی ہو؟“

روہنی نے ایک گہرا سانس لیا اور بولی۔ ”میں کیسے یقین نہ کروں جبکہ میں یہ سب
کچھ حقیقت کے روپ میں اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں اور اس حقیقت کو تم بھی دیکھ
رہے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”یہ حقیقت نہیں ہے۔ یہ طلسم ہے۔ کالا جادو ہے۔ نظر کا فریب
ہے۔ تم نے مجھے نظر کے فریب میں مبتلا کر دیا ہوا ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”تمہارے لئے ہو سکتا ہے کہ یہ نظر کا فریب ہو مگر میرے لئے
یہ میری گزری ہوئی زندگی اور آنے والے جنموں کی بہت بڑی حقیقت ہے اور اب
جبکہ تم کو اس بات کا خود تجربہ ہو چکا ہے کہ تم اس جال میں پھنس چکے ہو اور تمہاری
جان کو ہر لمحے خطرہ ہے اس وجہ سے بھی تم اس کو محض نظر کا فریب کہہ کر اس سے
الگ نہیں ہو سکتے۔“

روہنی نے بالکل صحیح کہا تھا۔ اگر وہ سب کچھ خرافات اور توہمات کا کھیل ہی تھا
تب بھی میں اس کھیل کا ایک اہم کردار بن چکا تھا اور روہنی کی مدد کے بغیر میں اس
دلدل سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ ”اگر تم یہی چاہتی ہو کہ میں یہی
سمجھوں کہ تمہارے پچھلے جنم میں میں تمہارا خاوند رہ چکا ہوں اور میرا نام شیروان تھا

تو ٹھیک ہے میں اسے مان لیتا ہوں۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہو گا؟“

روہنی نے تابوت میں پڑی ہوئی اپنے خاوند مغل شہزادے شیردان کی لاش کو ایک نظر دیکھا اور تابوت کے اوپر ڈھکن ڈال دیا۔ شمع دان اس نے پہلے ہی اٹھا کر تابوت کے سرہانے کی جانب چبوترے پر رکھ دیا تھا۔ پھر اس نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگی۔ ”میں تمہیں یہاں صرف یہ یقین دلانے کے لئے لائی تھی کہ تم میرے خاوند کی آتما ہو جو تمہارا روپ دھار کر اس زندہ انسانوں کی دنیا میں صرف میری تلاش میں واپس آگئی ہے۔ اب میں تمہیں یہ بتاؤں گی کہ ہم اور تم..... ہم دونوں اپنے دشمن پجاری رگھو کی بدروح کے انتقام سے کیسے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ میرے ساتھ اوپر آ جاؤ۔“

ہم تابوت والے تہہ خانے سے نکل کر قلعے کی دوسری منزل پر آ گئے۔ روہنی کہنے لگی۔ ”یہ کبھی ہمارا اعلایشان محل ہوا کرتا تھا۔ تمہیں یاد نہیں رہا۔ مجھے سب یاد ہے کہ ہمیں ایک دوسرے سے کتنا پیار تھا۔ ہم صبح شام محل کے باغ میں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ٹہلا کرتے تھے۔ اب وہ باغ بھی اجڑ چکا ہے، یہ محل بھی کھنڈر بن چکا ہے۔ آؤ اس بالکنی میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر میں تمہیں بتاؤں گی کہ وہ کون سا راستہ ہے جس پر چل کر ہم دونوں اپنے قاتل دشمن پجاری رگھو کی دشمنی سے نجات حاصل کر کے ہمیشہ کے لئے پھر سے ایک ہو سکتے ہیں۔“

یہ ہمیشہ کے لئے ایک ہو جانے والی بات پر میرا یقین بھی نہیں تھا اور میں چاہتا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو۔ مجھے تو صرف اس غیبی دشمن سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کرنا تھا جو مجھ پر تین چار مرتبہ قاتلانہ حملہ کر چکا تھا۔

اس کھنڈر محل کی بالکونی کبھی سنگ مرمر کی ہو ا کرتی تھی اب اس کا رنگ کالا پڑ چکا تھا اور جنگلی بیلوں نے اسے آدھے سے زیادہ ڈھانپا ہوا تھا۔ یہ بالکونی قلعے یا اس کھنڈر محل کی دوسری منزل پر جنگل کے رخ پر تھی اور قلعے کی پرانی دیوار سے باہر کو نکلی

ہوئی تھی۔ بالکونی کی پتھر کی دو جالیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ صرف سامنے کے رخ کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ فرش سلامت تھا۔ وہاں بیٹھنے کے لئے سوائے فرش کے اور کوئی جگہ نہیں تھی۔

جب ہم بالکونی میں آئے تو میں نے دیکھا کہ اس دوران آسمان بادلوں میں چھپ چکا تھا اور بارش شروع ہو گئی تھی۔ جنگل کی طرف سے بارش میں بھیگی ہوئی بڑی خوشگوار ہوا آرہی تھی۔ ہم بالکونی کے فرش پر ہی بیٹھ گئے۔ ابھی روہنی بدروح نے اپنی داستان شروع نہیں کی تھی کہ بارش تیز ہو گئی اور اس کی بوچھاڑ بالکونی میں ہم پر آنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ بارش کی بوچھاڑ روہنی بدروح پر پڑ رہی تھی مگر نہ اس کا چہرہ گھبرا رہا تھا، نہ اس کی زعفرانی ساڑھی ہی بھیگ رہی تھی۔ اس کے برعکس میرے کپڑے بارش کی بوچھاڑوں میں بھیگنے لگے تھے۔

روہنی نے یہ دیکھ کر کہا۔ ”شیردان! تم بارش میں بھیگ جاؤ گے۔ مجھ پر تو بارش کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ چلو ہم کسی اور جگہ چل کر بیٹھتے ہیں۔“

ہم بالکونی سے اٹھ گئے۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”روہنی.....“
اس نے مجھے ٹوکے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے روہنی مت کہا کرو۔ مجھے سلطانہ کہہ کر بلایا کرو۔ یاد نہیں یہ نام تم نے خود رکھا تھا اور تمہیں بے حد پسند تھا۔“

میں نے اپنے دل میں کہا جانے میری بلا میں نے تمہارا یہ نام کب رکھا تھا۔ اوپر سے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں سلطانہ کہہ کر ہی بلایا کروں گا۔“

”اب کہو تم کیا کہنے والے تھے؟“ روہنی نے پوچھا۔
میں نے کہا۔ ”یہاں اس قلعے میں تو بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔“

روہنی نے پوچھا۔ ”تم کہاں بیٹھنا پسند کرو گے۔ مجھے بتاؤ میں تمہیں وہیں لے چلتی ہوں۔“

مجھے یاد آ گیا کہ روہنی تو ایک بدروح ہے وہ تو جہاں چاہے مجھے لے جاسکتی ہے۔

میں نے کہا۔ ”کسی ایسی جگہ چلتے ہیں جہاں ہم سکون کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کر سکیں اور میں کچھ ناشتہ وغیرہ بھی کر لوں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

روہنی ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔ ”شیروان! جب میں زندہ تھی تم میرے خاوند اور میں تمہاری پتی ہو کرتی تھی تب بھی تمہیں صبح کے وقت بڑی بھوک لگا کرتی تھی اور میں نے شاہی بارچی کو حکم دے رکھا تھا کہ تمہارا ناشتہ دن کے پہلے وقت میں تیار کروا کر محل میں بھجوایا کرے۔۔۔۔۔ کاش! تمہیں وہ سب کچھ یاد ہوتا لیکن مجھے یقین ہے کہ آہستہ آہستہ تمہیں وہ سب کچھ یاد آجائے گا اور تم مجھے پہچان لو گے۔ میں مایوس نہیں ہوں۔“

روہنی نے پھر وہی باتیں شروع کر دی تھیں جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے اسے کہا۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ ہم کہاں جائیں؟“

روہنی نے کہا۔ ”ہم جھانسی چلتے ہیں۔ وہ بڑا شہر ہے اور وہاں ایسے کئی ہوٹل ہیں جہاں تمہیں کھانے کو بھی بہت کچھ مل جائے گا اور تم بیٹھنا بھی وہاں پسند کرو گے۔“

میں نے اسے کہا کہ ہمارے پاس تو انڈین کرنسی کا ایک روپیہ بھی نہیں ہے ہم ناشتے وغیرہ کا بل کہاں سے ادا کریں گے۔ اس پر روہنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بل میں ادا کر دوں گی۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔۔۔۔۔ آؤ میرے ساتھ۔“

”تم تو واپس بالکونی میں جا رہی ہو۔“

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ”ہم بالکونی کے راستے ہی باہر جائیں گے۔“ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ ہم بالکونی میں آ گئے۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ بارش کی بو چھاڑیں ہم دونوں پر پڑ رہی تھیں مگر میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ میں بارش میں بالکل نہیں بھیگ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”میں بارش میں کیوں نہیں بھیگ رہا سلطانہ؟“

وہ کہنے لگی۔ ”جب تک تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہے گا تم بارش میں نہیں

بھیگے۔ تیار ہو جاؤ۔ ہم جھانسی جا رہے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے میرے ہاتھ کو ذرا سا کھینچا اور ہم بالکونی سے پرواز کر گئے۔ ہم موسلا دھار بارش میں جنگل کے درختوں کے اوپر سے ہو کر اڑ رہے تھے۔ یہ میری زندگی کا ایک ایسا تجربہ تھا کہ جسے میں مرتے دم تک فراموش نہ کر سکوں گا۔ میں نے پرندوں کو بارش میں اڑتے دیکھا تھا۔ میں نے ہوائی جہازوں کو بارش میں پرواز کرتے دیکھا تھا لیکن کبھی کسی انسان کو بارش میں پرواز کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اور یہاں میں خود بارش میں زمین سے نہ جانے کتنے فٹ کی بلندی پر درختوں کے اوپر پرواز کر رہا تھا اور دوسری حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بارش کی بو چھاڑیں مجھ پر پڑ رہی تھیں مگر میں بالکل نہیں بھیگ رہا تھا۔ خدا جانے ہماری رفتار کتنی تھی۔ ہم بہت جلد جنگل کے اوپر سے گزر کر کھیتوں پر آ گئے۔

میں نے نیچے دیکھا۔ نیچے مجھے ایک ریلوے لائن نظر آئی جو بارش میں بھیگ رہی تھی۔ اس وقت ہم زمین سے زیادہ سے زیادہ پچاس فٹ کی بلندی پر اڑ رہے تھے۔ روہنی نے کہا۔ ”یہ بہے بروڑہ ریلوے لائن ہے اور بھوپال سے جھانسی کی طرف جا رہی ہے۔“

ہماری رفتار کافی تیز ہو گئی تھی۔ کیونکہ ہمارے نیچے سے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کھڑے درخت اور ریلوے لائن کے سنگل بڑی تیزی سے پیچھے کی طرف جا رہے تھے۔ اتنی تیز رفتار کے ساتھ پرواز کرنے کی وجہ سے ہوا کے طوفانی تھپڑے ہمیں لگنے چاہئیں تھے مگر ہمیں صرف اتنی ہی ہوا لگ رہی تھی کہ روہنی کے لمبے بال پیچھے کی جانب اڑ رہے تھے اور ہوا صرف مجھے چھو کر گزر رہی تھی۔

ہم جھانسی شہر کی فضائی حدود میں داخل ہو گئے۔ جھانسی شہر ابھی اپنی اصلی وضع طبع میں ہی تھا اور شہر کے باہر ماڈرن کالونیاں آباد نہیں ہوئی تھیں، آبادی بھی نہیں بڑھی تھی۔ شہر کے ارد گرد ایک خوبصورت باغ تھا۔ وہاں انگریزوں کے زمانے کا

ایک ہوٹل تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ اس ہوٹل میں امیر لوگ آکر ٹھہر کر تے تھے یا پھر یورپ سے آئے ہوئے انگریز لوگ آکر ٹھہرتے تھے۔ بارش کی وجہ سے سڑکوں پر رش بالکل نہیں تھا۔ باغ تو خالی پڑا تھا۔ ہم باغ کے ایک کونے میں اتر گئے۔ میں نے سلطانہ سے کہا۔ ”تم میرے ساتھ انسانوں کے درمیان جا رہی ہو جو میری طرح زندہ ہیں۔ کیا تم انہیں نظر آؤ گی یا ان کی نظروں سے غائب ہو گی؟“

روہنی کہنے لگی۔ ”میں انہیں اسی طرح نظر آؤں گی جس طرح تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ مجھے ان کے سامنے غائب ہونے کی کیا ضرورت ہے اور پھر ناشتہ کرنے کے بعد ہم وہاں سے اٹھ کر کسی دوسری جگہ جنگل میں چلے جائیں گے۔“

انگریزوں کے زمانے کا بنا ہوا عالی شان ہوٹل وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر تھا اور اس کی لابی پر پڑا ہوا رنگ برنگ سا بان دور سے نظر آ رہا تھا۔ روہنی کہنے لگی۔ ”ہم اس ہوٹل میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ تم یہاں ناشتہ بھی کر لینا۔“

ہم بارش میں ہی ہوٹل کی جانب چل پڑے۔ روہنی نے ابھی تک میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا جس کی وجہ سے میں بارش میں بھیگ نہیں رہا تھا۔ میں نے قمیض پتلون پہن رکھی تھی مگر روہنی بڑے خوبصورت لباس میں تھی۔ اپنے گلے کا قیمتی ہار اور سر پر رکھا ہوا جواہرات کا تاج اس نے قلعے میں غائب کر دیا تھا اس لئے کہ اسے اس شاہانہ تاج میں دیکھ کر خواہ مخواہ وہ لوگوں کی نظروں میں آسکتی تھی جو وہ نہیں چاہتی تھی۔

پرانی طرز کا ہوٹل تھا۔ کھلے کمرے میں جگہ جگہ گول میزیں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہر میز پر پھولوں والا گلہ ان پڑا تھا۔ کچھ خوش لباس لوگ بڑی خاموشی سے کہیں کہیں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔

ہم بھی ایک میز کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ سرخ وردی والا بیر آیا تو میں نے اسے ناشتہ لانے کو کہا۔ وہ چلا گیا تو میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں کبھی بھوک نہیں لگتی؟“

روہنی مسکرانے لگی۔ ”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم نے تین سو سال سے کچھ نہیں کھایا؟“ وہ بولی۔ ”نہیں ایسی بات بھی نہیں ہے۔ اگر کہیں کچھ کھانا پڑ جائے تو کھا بھی لیتی ہوں لیکن میں کھانے پینے کی محتاج نہیں ہوں۔ میں صرف تمہارے لئے انسانی جسم میں ظاہر ہوئی ہوں ورنہ میں ایک روح ہوں، آتما ہوں جو اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرتے ہوئے زمین اور آسمان کے درمیان بھٹک رہی ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئی۔ عورت کا دوسرا جنم اسی انسانی روپ میں ہوا ہے اور مجھے اس جنم میں اپنا خاوند شیردان مل گیا ہے۔“

میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھے تو تم بھول جاؤ۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب پجاری رگھو کی بدروح میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی تو میں فوراً تم سے الگ ہو جاؤں گا۔

بیرا خاموش قدموں سے ناشتہ کاڑے لے کر آگیا۔ میں ناشتہ کرنے لگا۔ روہنی نے اپنے لئے کافی کی ایک پیالی خود ہی بنالی اور خاموشی سے پینے لگی۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”شیروان! تمہارے کپڑے بہت پرانے ہو چکے ہیں میں چاہتی ہوں تم یہاں کسی دکان سے نئے ریڈی میڈ کپڑے خرید لو۔“

میں نے کہا۔ ”اس کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے؟“

وہ بولی۔ ”اس کی تم فکر کیوں کرتے ہو۔ میرے پاس بہت پیسے ہیں۔“

میں زیر لب مسکراتے ہوئے اپنے لئے کافی بنانے لگا۔

ہم جس میز پر بیٹھے تھے وہ ہال کمرے کے کونے میں تھی۔ ہمارے ارد گرد کی میزیں خالی تھیں۔ میں نے کافی پیتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”سلطانہ! تمہاری زندگی کی تقریباً ساری کہانی تمہاری زبانی مجھے معلوم ہو چکی ہے۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہارے دشمن پجاری رگھو نے تمہیں قتل کیوں کیا تھا؟“

اس نے بڑی خاموشی سے میری بات سنی۔ پھر کافی کی پیالی آہستہ سے میز پر رکھ دی اور ایک ہاتھ سے اپنی زعفرانی ساڑھی کا پلو سینے پر درست کرتے ہوئے بولی۔ ”پجاری رگھو ہماری چھوٹی سی ریاست کا شاہی پجاری تھا۔ میری ماما جی مجھے گیتا اور دیدوں کی تعلیم دلانے کے لئے پجاری رگھو کے پاس شاہی مندر میں بھیج دیا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں میری عمر دس بارہ سال کی تھی اور میں بڑی خوبصورت ہوا کرتی تھی۔ پجاری رگھو مجھ سے محبت کرنے لگا تھا۔ پھر جب میں جوان ہوئی تو مجھے صوبیدار اور ریاست کے حکمران کے بیٹے شہزادے شیروان سے محبت ہو گئی۔ ہم دونوں چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے۔ پجاری رگھو کو یہ بات سخت ناگوار تھی مگر وہ شہزادہ شیروان کے باپ کا ملازم تھا۔ میرے خلاف سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے ماما جی سے میری شکایت کر دی کہ میں ایک ہندو برہمن لڑکی ہوں اور مسلمان شہزادے سے چھپ چھپ کر ملاقاتیں کرتی ہوں۔ ماما جی نے مجھے منع کیا مگر میں شہزادے شیروان کی محبت میں سب کچھ بھلا چکی تھی۔ میرے پتا جی سورگیشاں ہو چکے تھے جو مغل صوبیدار کے وزیر تھے۔ میں شہزادے شیروان سے چھپ چھپ کر

ملتی رہی۔ پھر ایسا ہوا کہ شیروان کے والد کا انتقال ہو گیا اور شیروان ریاست کا حکمران ہو گیا۔ صوبیدار بنتے ہی اس نے مجھ سے شادی کر لی۔ میں شادی کے بعد مسلمان ہو گئی۔ ایک تو میں نے شیروان سے شادی کر لی تھی دوسرے میں نے ہندو دھرم چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ پجاری رگھو میرا جانی دشمن بن گیا اور در پردہ مجھے قتل کرنے کی سازشیں کرنے لگا۔ مگر شہزادہ شیروان کے ہوتے ہوئے وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر مقدر میں جو لکھا ہوتا ہے اسے کون ٹال سکتا ہے۔ میرا خاوند اور میرا محبوب شہزادہ شیروان کچھ روز بیمار رہنے کے بعد چل بسا۔ میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ ماما جی پہلے ہی سورگیشاں ہو چکی تھیں۔ اگرچہ میں نے ریاست کا تخت سنبھال لیا تھا مگر میں آخر ایک کمزور عورت تھی اور اپنے دشمن پجاری رگھو کی سازشوں کا اکیلی مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک رات میں اپنی خواب گاہ میں سو رہی تھی کہ چار حبشی غلام خواب گاہ میں داخل ہوئے اور مجھے زبردستی اٹھا کر قلعے کے اس تہہ خانے میں لے گئے جہاں تم نے مجھے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ وہاں مجھے چوتھے پر باندھ کر لٹا دیا گیا اور پجاری رگھو کے حکم سے مجھے قتل کر دیا گیا۔ مجھے قتل کرنے کے بعد اس نے اپنی طلسمی طاقت سے میری آتما کو ایک مرتبان میں بند کر کے مرتبان چوتھے کے شکاف میں دفن کر دیا تاکہ میں مرنے کے بعد کسی جہنم میں بھی دنیا میں واپس نہ آ سکوں اور یوں میری آتما کو کبھی نروان نصیب نہ ہو۔ میرے قتل کے منظر کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔“

میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔ ”اس منظر کی حقیقت کیا تھی؟“
روہنی بدروح نے کہا۔ ”میرے قتل کے پندرہ بیس سال بعد پجاری رگھو بھی مر گیا۔ مرنے کے بعد اس کی روح نے ایک بدروح کی شکل اختیار کر لی کیونکہ اس نے ایک زندہ انسان کو قتل کیا تھا جو بہت بڑا پاپ ہے۔ اب ایسا ہوتا کہ ہر سال ٹھیک اسی دن اور اسی وقت آدھی رات کو جب مجھے رگھو کے حبشی غلاموں نے قتل کیا تھا رگھو

کی بدروح ان غلاموں کی بدروح کے ساتھ قلعے کے محل میں ظاہر ہوتی۔ پجاری رگھو کی بدروح اپنے زبردست جادو کے اثر سے میری آتما کو واپس لا کر میرے جسم میں داخل کرتا اور میرے قتل کا بھیانک منظر ایک بار پھر دہرایا جاتا۔ یہ یا تو پجاری رگھو کے ضمیر کو اس کے گناہ کی سزا مل رہی تھی یا پجاری رگھو کی بدروح مجھے ایک بار پھر قتل کر کے تسکین حاصل کرتی تھی۔ بہر حال یہ منظر دیران قلعے کے اندر ہر سال ایک خاص رات کو دہرایا جاتا تھا۔ مجھے اسی طرح حبشی غلام قتل کرتے اور پھر پجاری رگھو کی بدروح میری آتما کو مرتبان میں بند کر کے چبوترے کے شکاف میں دفن کر دیتی۔ اس کے طلسمی منتروں کے اثر سے میری آتما کا آواگون کا چکر رک گیا تھا۔ اگر آواگون کا چکر چلتا رہتا اور میں اپنے ہندو عقیدے کے مطابق اپنے اچھے برے کرموں کے مطابق ایک جنم سے دوسرا جنم لیتی رہتی تو میں امید کر سکتی تھی کہ کبھی نہ کبھی میرے برے اعمال کی سزا ختم ہو جائے گی اور مجھے جنم جنم کے چکر سے نجات مل جائے گی۔ لیکن میرے دشمن اور میرے قاتل پجاری رگھو نے میری آتما کو مرتبان میں بند کر کے میری آتما کی ترقی کا راستہ بند کر دیا تھا اور میری آتما مرتبان میں ہمیشہ کے لئے قید ہو کر رہ گئی تھی..... لیکن آخر میرے محبوب شہزادے کی روح کو مجھ پر رحم آگیا اور اس نے میری نجات کے لئے تمہیں اپنے روپ میں بدل کر قلعے میں بھیج دیا۔ یہ وہی منحوس رات تھی جس رات کو آج سے تین سو برس پہلے مجھے قتل کیا گیا تھا۔ تم نے قلعے کی گیلری میں چھپ کر مجھے قتل ہوتے اور پھر قاتل رگھو کو مرتبان میں میری آتما کو بند کر کے چبوترے کے اندر دفن کرتے دیکھا۔ چونکہ میرے محبوب شہزادے شیروان کی روح نے تمہیں میری نجات کے لئے بھیجا تھا اس لئے تمہارے دل میں خیال آیا کہ دیکھا جائے قاتل پجاری رگھو نے مرتبان میں کیا چیز بند کر کے مرتبان کو دفن کیا ہے۔ جب مجھے قتل کرنے کا خونیں منظر ختم ہو گیا اور پجاری رگھو اور حبشی غلاموں کی بدروحیں غائب ہو گئیں تو تم گیلری سے اتر کر چبوترے کے

پاس آئے۔ تم نے چبوترے کی اینٹیں اکھاڑ کر مرتبان باہر نکالا۔ میری آتما مرتبان کے اندر قید اپنی محبت کی طاقت کے زیر اثر یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ پھر تم نے مرتبان کھول دیا۔ مرتبان کے کھلتے ہی میری آتما قاتل پجاری رگھو کے منحوس طلسم کی قید سے آزاد ہو گئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں۔ میں نے تمہیں دیکھتے ہی تمہارے روپ میں اپنے محبوب شہزادے شیروان کو پہچان لیا تھا لیکن تم نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ اس کے بعد میرے سامنے جو سب سے بڑا مسئلہ تھا وہ یہ نہیں تھا کہ تم مجھے پہچانو کہ میں کون ہوں۔ یہ سب کچھ بعد میں بھی ہو سکتا تھا۔ اس وقت میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ قاتل پجاری رگھو تمہاری جان کیسے بچائی جائے۔ تم نے میری آتما کو آزاد کر دیا تھا اور پجاری رگھو میرے ساتھ اب تمہارا بھی دشمن ہو گیا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے تو اتنی آسانی سے دوبارہ اپنے طلسم کے چکر میں قید نہیں کر سکے گا لیکن تمہیں بڑی آسانی سے ہلاک کر دے گا۔ پس اس کے بعد میرے فرض اور میری محبت کا تقاضا یہی تھا کہ تمہیں پجاری رگھو کے ہر قاتلانہ حملے سے بچایا جائے۔ چنانچہ جب بھی پجاری قاتل نے تمہاری جان لینے کی کوشش کی میں نے عین وقت پر پہنچ کر اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا اور یہ سلسلہ اس وقت سے لے کر جب تم نے میری آتما کو رگھو کی قید سے آزاد کیا تھا اس وقت تک جاری ہے.....“

میں نے پوچھا۔ ”اور یہ منحوس سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟“
روہنی نے کہا۔ ”میں تمہیں یہی بتانے کے لئے اپنے ساتھ لائی ہوں کہ تمہیں کیسے اس خوبی چکر سے نکالا جاسکتا ہے۔“

میں نے بے چینی سے کہا۔ ”میں نے تمہاری رام کہانی سن لی ہے۔ اب خدا کے لئے جلدی سے یہ بتاؤ کہ میں اس منحوس چکر سے کیسے آزاد ہو سکتا ہوں؟“
روہنی کافی بنا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”یہاں سے میں تمہیں اپنے ساتھ بدروحوں

کی دنیا میں لے جا رہی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”تم ایک بدروح ہی نے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ بدروحوں کی دنیا میں جا کر خدا جانے میرا کیا حال ہوگا۔“

روحانی نے ٹھنڈی آہ بھری اور بولی۔ ”میں بری آتما نہیں ہوں۔ یہ تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ تم نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔ تم میرے محبوب شہزادے کے روپ میں ضرور ہو مگر چونکہ میرا محبوب شیروان مسلمان تھا اس لئے یہ اس کا دوسرا جنم نہیں ہے۔ مسلمانوں میں کوئی آداگون نہیں ہوتا۔ اگر میں نے کسی مسلمان گھرانے میں لیا ہوتا تو میں بھی آداگون کے چکر سے آزاد ہوتی۔ لیکن یہ میری بد قسمتی ہی ہے اگرچہ میں مسلمان ہو گئی تھی لیکن میرا جنم ہندو ماتا پتا کے ملاپ سے ہوا تھا اور آداگون میرے ساتھ ہی میری روح میں داخل ہو گیا تھا۔ لیکن شہزادہ شیروان کا جنم ایک مسلمان ماتا پتا سے ہوا تھا اس کا کوئی دوسرا جنم نہیں تھا۔ لیکن وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور موت کے بعد بھی اسے میرا احساس تھا چنانچہ اس نے تمہیں اپنا روپ دے کر میری مدد کے لئے بھیج دیا۔ وہ میرے لئے یہی کر سکتا تھا اور اس کا اتنا کرتا ہی میرے لئے بہت تھا۔ اب میں تمہارے سامنے اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ حقیقت میں تم میرے محبوب شہزادے شیروان نہیں ہو اور یہ شیروان کا دوسرا جنم نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو جس طرح میں نے تمہیں پہچانا تھا تم بھی مجھے دیکھتے ہی پہچان لیتے۔ تم نے ٹھیک کہا تھا کہ تمہاری شکل شہزادے شیروان سے ملتی جلتی ہے لیکن بھی حقیقت ہے کہ تمہارے دل میں مرتبان کھول کر میری آتما کو آزاد کرنے کا خیال میرے محبوب شیروان کی روح نے ہی تمہارے دل میں ڈالا تھا۔“

میں روحانی کی کافی داستان سن چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ”سلطانہ! تم مختصر لفظوں میں مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھے اپنے ساتھ بدروحوں کی دنیا میں لے جا رہی ہو۔ کیا بدروحوں کی دنیا سے میں زندہ واپس آ جاؤں گا؟“

روحانی نے اس کے جواب میں کہا۔ ”تیم وہاں تیرے ساتھ جاؤ گے۔ کسی بدروح کو یہ ہمت نہیں ہوگی کہ وہ تمہیں ہاتھ بھی لگا سکے۔“

میں نے اس سے ایک بڑا اہم سوال پوچھا۔ میں نے کہا۔ ”لیکن قاتل پجاری رگھو کی بدروح بھی تو وہیں ہوگی اور وہ میری دشمن بدروح ہے۔ کیا وہ مجھے بدروحوں کی دنیا سے زندہ واپس جانے دے گی؟“

روحانی نے کہا۔ ”بدروحوں کی جس دنیا میں، میں تمہیں لے کر جا رہی ہوں پجاری رگھو کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی بدروحوں کی دنیا دوسری ہے۔ وہ کسی اور بدروحوں کی دنیا کا سردار ہے۔ اور پھر میں تمہیں غائب کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔“

اتنے میں ہوٹل کا باوردی بیرا قریب سے گزرا تو روحانی نے اسے بلا کر کہا۔ ”ناشتے کا بل لے آؤ۔“

میں روحانی کا منہ تکنے لگا کہ یہ بل کہاں سے ادا کرے گی۔ جب بیرا چلا گیا تو روحانی میرے دل کی بات سمجھتے ہوئے بولی۔ ”اس وقت جھانسی شہر کے اوپر اور زمین کے اندر دولت کے جتنے خزانے ہیں ان سب کو میں دیکھ رہی ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں حاصل کرنے کے لئے ہم بدروحوں کو بھی ایک اخلاقی ضابطے کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔“

روحانی نے زعفرانی ساڑھی کے نیچے اسی رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی پرس وغیرہ نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ اپنے بلاؤز کے اندر سے کچھ روپے نکالے گی۔ لیکن اس نے ایک لمحے کے لئے اپنے ہاتھ کے اوپر اپنی ساڑھی کا پلو ڈال دیا۔ دوسرے لمحے اس نے پلو ہٹا کر اپنا ہاتھ کھولا تو اس کے ہاتھ میں انڈین کرنسی کے سو سو روپے کے نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔ ہندوستان کو آزاد ہوئے زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی اور ابھی سو روپے کے نوٹ کی بڑی قیمت ہو کر تھی۔

بیر ابل لے کر آگیا۔ بڑا مہنگا ہوٹل تھا مگر ناشتے کا بل ساٹھ روپے ہی بنا تھا۔ روہنی نے اس کی پلیٹ میں سو روپے کا نوٹ رکھ دیا۔ بیر اچلا گیا تو وہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ ”یہاں سے چل کر تمہیں اپنے لئے نئے کپڑے خریدنے ہوں گے۔ یہ کپڑے بڑے گندے ہو چکے ہیں۔“

اس کے پاس بہت روپے تھے میں جو چاہے خرید سکتا تھا۔ بیر اب باقی پیسے لے کر آیا تو روہنی نے کہا۔ ”یہ تمہارا انعام ہے۔ تم رکھ لو۔“

بیر نے خوش ہو کر سلام کیا اور چلا گیا۔ ہم اٹھنے ہی والے تھے کہ میں نے دیکھا ایک آدمی تین پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ ہماری طرف آ رہا ہے۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ وہ کسی دوسری خالی میز کی طرف جا رہا ہے۔ لیکن جب وہ ہمارے پاس آ کر رک گیا تو میں نے اور روہنی نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔ گہرے سانولے رنگ کا وہ آدمی قمیض پتلون میں تھا۔ چہرے پر کڑی جنگلی تھی۔ تیوں سپاہی رانفلز لئے ہوئے تھے۔ سپاہی ہمارے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے تھے جیسے انہوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا ہو۔ میں نے اس آدمی سے پوچھا۔ ”کیوں جناب کیا بات ہے؟“

اس آدمی نے میری اور روہنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں پاکستانی جاسوس ہو اور غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل ہوئے ہو۔ میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں۔“

پھر اس نے سپاہیوں سے کہا۔ ”انہیں ہتھکڑیاں لگا کر تھانے لے چلو۔“

میں نے کہا۔ ”ہم پاکستانی جاسوس نہیں ہیں بھائی۔“

”تو پھر کون ہو؟“

میں نے کہا۔ ”ہم ہندوستان کے ہی رہنے والے ہیں اور عزت دار لوگ ہیں۔“

آپ کو ہمارے ساتھ اس طرح بات نہیں کرنی چاہئے۔“

وہ آدمی بولا۔ ”مجھے کس طرح بات کرنی چاہئے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ بہتر

یہی ہے کہ تم دونوں خاموشی سے میرے ساتھ تھانے چلے چلو ورنہ مجھے دوسری طرح لے جانا بھی آتا ہے۔

میں کچھ کہنے لگا تو روہنی نے مجھے روک دیا اور اس پولیس کے آدمی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے بھائی صاحب! ہمیں گرفتار کر لیجئے۔“

میں نے روہنی سے کہا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے سلطانہ!“

پولیس کے آدمی نے کہا۔ ”میں جانتا تھا کہ تم مسلمان ہو اور پاکستان سے یہاں جاسوسی کرنے آئے ہو اور تمہارے پاس کوئی ویزا پاسپورٹ نہیں ہے۔“

اس نے سپاہیوں سے کہا۔ ”گرفتار کر لو انہیں اور تھانے لے چلو۔“

اور سپاہیوں نے ہمیں یعنی مجھے اور روہنی کو ہتھکڑیاں لگا دیں۔ میں حیران تھا کہ روہنی نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی تھی۔ ہال میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ ہمیں حیرانی اور تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ ہم سپاہیوں کے ساتھ چل پڑے۔ ایک سپاہی نے ہماری ہتھکڑیوں کی لوہے کی زنجیر تھام رکی تھی اور دوسرے دونوں سپاہی ہمیں گھیرے میں لے کر ساتھ چل رہے تھے۔ رانفلز انہیں نے اس طرح پکڑ رکھی تھیں کہ جیسے ہمیں ابھی شوٹ کر دیں گے۔

مجھے روہنی بدروح پر غصہ آ رہا تھا کہ ہمیں سب لوگوں کے سامنے ہتھکڑیاں لگ گئی ہیں اور وہ اپنی غیبی طاقت کے باوجود یہ سب کچھ برداشت کر رہی ہے۔ لیکن بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ جس بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہم اپنی مہم پر روانہ ہونے والے تھے اس کی خاطر ہمیں اپنی عزت کی تھوڑی سی قربانی دینی ضروری تھی۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو پہلے قدم پر ہی ہم ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے تھے۔ اس کی یہ بات بعد میں بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بہر حال وہ ایک خاص وقت کے گزر جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ جب وہ وقت گزر گیا تو روہنی بدروح کی غیبی طاقت حرکت میں آ گئی۔

اس وقت ہم پولیس کی گاڑی میں بیٹھے پولیس اسٹیشن جارہے تھے۔ ہمیں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں اور مسلح سپاہی ہماری نگرانی کر رہے تھے۔ سولین کپڑوں والا سانولے رنگ کا پولیس افسر اگلی سیٹ پر بیٹھا تھوڑی تھوڑی دیر بعد گردن موڑ کر ہمیں دیکھ لیتا تھا۔ اتنے میں روہنی نے پولیس افسر سے کہا۔ ”گاڑی روک دو۔“

پولیس افسر نے گردن موڑ کر ایسے روہنی کی طرف دیکھا جیسے اس نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ روہنی نے دوبارہ کہا۔ ”اگر تمہیں اپنی جان پیاری ہے تو جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔ گاڑی روک دو۔“

پولیس افسر نے اپنی جیب سے پستول نکال کر اس کا رخ روہنی کی طرف کر دیا اور بولا۔ ”خاموشی سے بیٹھی رہو۔ میں جانتا ہوں تم کون ہو؟“

روہنی نے کہا۔ ”یہی تو مصیبت ہے کہ تم نہیں جانتے میں کون ہوں۔ اگر جانتے ہوتے تو کبھی ہمارے پاس نہ آتے۔ اب بھی میں تمہیں مہلت دیتی ہوں گاڑی روک دو۔ ہم تمہیں کچھ کہے بغیر یہاں سے اتر جائیں گے۔“

گاڑی جھانسی کی کسی سڑک پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ سپاہی ایک دم چوکس ہو گئے تھے اور انہوں نے رانفلوں کا رخ ہماری طرف کر دیا تھا۔ پولیس آفیسر نے سپاہیوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”نہ کیا دیکھ رہے ہو۔ اس عورت کا منہ نوج لو۔“

روہنی نے پہلا کام یہ کیا کہ فوراً میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے بعد جیسے ہی ایک سپاہی نے روہنی کو کمارنے کے لئے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اس کا ہاتھ وہیں رہ گیا اور سپاہی پتھر کے بت کی طرح اسی حالت میں ساکت ہو گیا۔ پولیس آفیسر نے چلا کر دوسرے سپاہیوں سے کہا۔ ”مار مار کر اس عورت کی چمڑی ادھیڑ دو۔“

دوسرے سپاہیوں نے روہنی کو پینے کے لئے ہاتھ اٹھائے تو وہ بھی اپنی اپنی جگہوں پر پتھر کے بت بن گئے اور گاڑی کے دھچکوں کے ساتھ آگے کو گر گئے۔ پولیس آفیسر نے یہ حماقت کی کہ پستول سے روہنی پر فائر کر دیا۔ روہنی کو تو کچھ نہیں

ہونا تھا لیکن پولیس آفیسر کے کپڑوں میں اسی وقت آگ بھڑک اٹھی۔ اس کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ ڈرائیور نے فوراً گاڑی کھڑی کر دی۔

اس کے ساتھ ہی میں بھی روہنی کے ساتھ ہی غائب ہو گیا۔ غائب ہونے کے بعد ہم گاڑی سے سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر دوبارہ انسانی جسم میں ظاہر ہو گئے۔ ہماری ہتھکڑیاں غائب ہو چکی تھیں۔ ہم پولیس کی گاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے جس میں ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک زوردار دھماکہ ہوا اور گاڑی کی جگہ شعلے ہی شعلے نظر آ رہے تھے۔ مجھے ان لوگوں پر ترس آنے لگا۔ اگر انہیں ہم پر کسی قسم کا کوئی شک ہو گیا تھا تو اس میں ان کا اتنا قصور نہیں تھا کہ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ میں نے روہنی سے گلہ آمیز لہجے میں کہا۔ ”سلطانہ! تمہیں انہیں ہلاک نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

روہنی بدروح نے پہلی بار میری طرف غضب ناک نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ”تم ان باتوں میں آئندہ دخل مت دینا۔“ اور وہ پولیس گاڑی کے شعلوں کو دیکھنے لگی۔ وہاں کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے جو سڑک کی مٹی اٹھا اٹھا کر شعلوں پر ڈال کر انہیں بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ روہنی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ کہنے لگی۔ ”چلو ایک دکان پر چل کر تمہارے لئے کپڑے خریدتے ہیں۔“ روہنی آج سے تین سو سال پہلے جھانسی کے صوبے کی ملکہ کی حیثیت سے رہا کرتی تھی۔ مگر وہ آج کے جھانسی شہر سے بھی اچھی طرح واقف تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کون سی چیز کہاں سے مل سکتی ہے۔ وہ مجھے شہر کے گنجان علاقے کی ایک بہت بڑی دکان میں لے گئی جہاں عورتوں، مردوں اور بچوں کے ریڈی میڈ کپڑے فروخت ہوتے تھے۔ میں نے اپنے لئے ایک ہلکے رنگ کی نئی پتلون اور جیکٹ خرید کر وہیں پہن لی۔ میرے پرانے کپڑے واقعی اب اس قابل نہیں رہے تھے کہ میں انہیں پہنتا۔

بارش بہت دیر پہلے کی رک چکی تھی۔ جھانسی شہر کا موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ خنک ہوا چلنے لگی تھی۔ ہم شہر کے گنجان بازاروں سے نکل کر ایک کھلی سڑک پر آ

گئے۔ روہنی میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی چال میں مہارانیوں والا وقار تھا۔ اس کے گلے کا ہار اور سر کا چھوٹا تاج ابھی تک غائب تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”میں سب سے پہلے اپنے محل میں جاؤں گی۔ وہاں میں تمہیں ایک نئی چیز دکھانا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد ہم وہیں سے بدروحوں کی دنیا کی طرف پرواز کر جائیں گے۔“

”ہم کتنی دیر میں بدروحوں کی دنیا میں پہنچیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ میرے ساتھ چلتی ہوئی ایک ایسی جگہ پر آگئی جہاں آس پاس کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ کہنے لگی۔ ”تم ہماری دنیا کے فاصلوں کا انسانوں کے بنائے ہوئے پیمانوں سے اندازہ نہیں لگا سکتے۔ تم یوں سمجھ لو کہ اگر فضا میں پانچ ہزار میل فی گھنٹے کے حساب سے ایک ہزار سال تک سفر کرتے رہو تو تم بدروحوں کی دنیا میں پہنچو گے۔“ میں نے حیران ہو کر کہا۔ ”اور ہم کتنی مدت میں پہنچیں گے؟“

”میرے ساتھ پرواز کرتے ہوئے جب تم بدروحوں کی دنیا میں پہنچو گے تو تمہیں ایسا محسوس ہو گا جیسے تم نے ابھی سفر شروع کیا تھا اور ابھی پہنچ گئے ہو۔“

روہنی بدروح کی یہ باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں لیکن اپنی نجات کے لئے مجھے اس کے ساتھ جانا ہی پڑا تھا۔ اندر سے میں یہ سوچ کر ضرور ڈر گیا تھا کہ اگر یہ حسین و جمیل بدروح واقعی مجھے اتنی دور لے جا رہی ہے تو کیا میں وہاں سے واپس آسکوں گا؟ اگر کسی وجہ سے میں وہیں رہ گیا تو میرا کیا حشر ہو گا؟ یہ سوچ کر ہی میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔ اگر مجھے منھوس بیماری رگھو کی بدروح کے اپنے اوپر پے درپے قاتلانہ حملوں کا تلخ تجربہ نہ ہو چکا ہو تا تو میں روہنی بدروح کے ساتھ ایک قدم بھی نہ چلتا۔ لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم فضا میں بلند ہو گئے۔

○

روہنی کا ویران قلعے والا محل وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم بڑی جلدی قلعے کی چھت پر اتر گئے۔ وہ مجھے نیچے قلعے کے اس آسب زدہ کمرے میں لے آئی جہاں اس کے مرحوم خاوند اور میرے ہم شکل مغل شہزادے شیروان کی لاش تابوت میں بند پڑی تھی۔ شمع دان کی موم بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ روہنی نے بھیجی ہوئی موم بتیوں کو باری باری اپنی انگلی سے چھوا اور وہ روشن ہو گئیں۔ اس نے شمع دان اٹھا کر تابوت کے سرہانے ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے تابوت کے ڈھکنے کو ایک طرف سرکا دیا۔

موم بتیوں کی روشنی تابوت میں پڑی تو میں نے دیکھا کہ جہاں رات کے وقت میں نے روہنی کے مرحوم خاوند شیروان کی لاش دیکھی تھی وہاں اب چند ایک انسانی ہڈیوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”شہزادے شیروان کی لاش تو رات کو بالکل صحیح حالت میں تھی۔ پھر یہ اتنی جلدی ہڈیوں کا ڈھانچہ کیسے بن گئی؟“

روہنی کی بدروح نے اداس آواز میں کہا۔ ”رات جب تم نے میرے محبوب شہزادے شیروان کی لاش دیکھی تھی تو اس وقت میں تمہیں تین سو سال پیچھے لے گئی تھی۔ جب تم لاش کو دیکھ رہے تھے تو اسے تابوت میں بند کئے صرف دو دن ہی گزرے تھے۔ یہ میں نے اس لئے کیا تھا کہ میں تمہیں تمہارے ہم شکل شہزادے شیروان کا چہرہ اور اس کی گردن کا سورج گرہن کا نشان دکھانا چاہتی تھی تاکہ تمہیں

میری اس بات کا یقین آجائے کہ میرے مرحوم شہزادے نے تمہیں اپنا روپ دے کر میری مدد کے لئے قلعے میں بھیجا تھا ورنہ میری اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں مردہ ہڈیوں میں جان ڈال کر اسے پھر سے انسانی شکل دے سکوں۔“

پھر وہ تابوت پر جھک گئی۔ اس نے شہزادے شیروان کی کھوپڑی کو اٹھا لیا۔ اس وقت روہنی یعنی سلطانہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کھوپڑی کے ماتھے کو چوم لیا۔ اس کے بعد اس نے کھوپڑی کے اندر ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی جس پر سیاہ نگ جزا ہوا تھا۔ روہنی نے بڑے ادب و احترام کے ساتھ شہزادے کی کھوپڑی کو اسی جگہ تابوت کے اندر رکھ دیا جہاں سے اسے اٹھایا تھا۔ پھر تابوت کو بند کر کے شمع دان کے قریب ہو کر اس نے انگوٹھی پر ایک نظر ڈالی اور پھر میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”اپنا ہاتھ آگے کرو۔“

میں نے اپنا پایاں ہاتھ آگے کر دیا۔ اس نے سیاہ گینے والی انگوٹھی میری انگلی میں ڈال دی اور کہنے لگی۔ ”یہ انگوٹھی تمہیں بدروحوں کی دنیا میں وہاں کے آسیب سے محفوظ رکھے گی اور انسانوں کی دنیا میں تم پر دشمن پجاری رگھو کے بڑے سے بڑے طلسمی منتر کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اس انگوٹھی کو اس وقت تک اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا جب تک کہ ہم اپنے دشمن پجاری رگھو سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل نہیں کر لیتے اور میری بدروح کو دنیا میں در بدر بھٹکتے رہنے سے نجات نہیں مل جاتی۔“

میں نے کہا۔ ”میں تو اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ یہ انگوٹھی میرے پاس ہی رہے لیکن اگر کسی وجہ سے یہ مجھ سے گم ہو گئی یا پجاری رگھو اپنی جادو کی طاقت کے زور سے یہ مجھ سے چھین کر لے گیا تو پھر کیا ہوگا؟“

روہنی نے کہا۔ ”پھر تم بہت بڑی مصیبت میں پھنس سکتے ہو کیونکہ میں انسانوں کی دنیا میں کسی وقت تمہاری مدد کو نہیں بھیج سکتی۔ جب دشمن پجاری رگھو سے انسانوں کی دنیا میں ہماری کھلی جنگ شروع ہو جائے گی تو وہ اپنے طلسمی منتروں کا وار

مجھ پر بھی کرے گا۔ اس کی بدی کی طاقت کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ اگر میں ذرا سی دیر بلکہ پلک جھپکنے کے وقفے جتنی دیر کے لئے بھی غائب ہو جاؤں تو پجاری رگھو اپنے طلسم کی طاقت سے فوراً مجھے اپنے قبضے میں کر سکتا ہے۔ اس لئے تمہیں کوشش کرنی ہو گی بلکہ ہر حالت میں اس انگوٹھی کو اپنی انگلی میں یا کسی جیب میں ہر وقت اپنے پاس رکھنا ہوگا۔ بس تم پر میری طرف سے یہی سب سے بڑی شرط اور سب سے بڑی پابندی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہو گا ہم اکٹھے مل کر دشمن پجاری کا اس وقت تک مقابلہ کریں گے جب تک کہ میں اسے اس کے آسیبی منتروں کے ساتھ جہنم کی آگ میں بھسم نہیں کر دیتی۔۔۔۔۔“

حالات نے مجھے ایک بہت بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس آزمائش میں ضرور کامیاب کرے گا اور میں اپنی ایمان کی طاقت کے ساتھ بت پرست پجاری رگھو کی بدروح کو جہنم کی آگ کے سپرد کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا تاکہ اس کے بعد اس کی بدروح بنی نوع انسان کو کبھی کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔

روہنی کہنے لگی۔ ”بدروحوں کی دنیا میں، میں تمہیں بدروحوں کے جس قبیلے میں لے جا رہی ہوں اس پر کالی بدروح کی حکومت ہے۔ کالی بدروح بڑی خونخوار بدروح ہے اور انسانوں کی دشمن ہے۔ اس کے گلے میں انسانی ہڈیوں کی مالا میں ہر وقت پڑی رہتی ہیں۔ ان ہڈیوں میں اتنی شکتی ہے کہ اگر ان میں سے مجھے ایک چھوٹی سی ہڈی بھی مل جائے تو مجھے میرے دشمن پجاری رگھو جتنی طاقت حاصل ہو سکتی ہے۔ میں اس لئے بدروحوں کی دنیا میں جا رہی ہوں کہ کال بدروح کی مالا میں پروٹی ہوئی انسانی ہڈیوں کا کوئی مہرہ حاصل کر سکوں۔ تمہیں اپنے ساتھ اس لئے لے جا رہی ہوں کہ تمہیں اپنی سہیلی مالینی کی بدروح سے ملوادوں تاکہ اگر زندگی کے کسی لمحے کسی حادثے کی وجہ سے میں ہمیشہ کے لئے تم سے بچھڑ جاؤں تو مالینی کی بدروح تمہیں پجاری رگھو

کے قاتلانہ حملے اور اس کے خطرناک جادو سے بچا سکے گی۔“
میں نے اس سے مالینی کے بارے میں سوال کیا۔ ”مالینی بدروح کیوں بن گئی ہے؟“

روہنی کہنے لگی۔ ”مالینی سے ایک بہت بڑا گناہ، ایک بہت بڑا پاپ ہو گیا تھا جس کی وہ سزا بھگت رہی ہے۔ جب تک اس کی سزا کی مدت پوری نہیں ہو جاتی وہ بدروح ہی رہے گی۔ وہ میری بڑی پیاری سہیلی تھی۔ جب ہم دونوں زندہ تھیں تو وہ میرے محل میں میرے ساتھ ہی رہا کرتی تھی۔“

ہم محل کی چھت پر کھڑے تھے۔ آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش کی ہوئی تھی۔ روہنی نے کہا۔ ”اپنا ہاتھ مجھے دے دو۔ ہم بدروحوں کی دنیا میں جا رہے ہیں۔ گھبرانا بالکل نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نے تمہارے ہاتھ میں تابوت کی انگوٹھی ڈال دی ہے جو تمہیں بدروحوں کے برے اثرات سے محفوظ رکھے گی۔ تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟“

”بالکل نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ لیکن دل میں ڈر ضرور رہا تھا۔ بدروحوں کی دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر میرا روہنی کے ساتھ جانا بہت ضروری تھا۔ یہ ایک طرح سے میری زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ روہنی ہوا میں پرواز کرنے کے لئے بالکل تیار تھی۔ میرا ہاتھ اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ کی ٹھنڈی گرفت میرے دل میں مزید خوف پیدا کر رہی تھی۔

اس کے بعد مجھے ایک ہلکا سا دھچکا لگا اور جیسے کسی نے مجھے اوپر اٹھا دیا۔ میرے پاؤں دیران قلعے کی چھت سے دس پندرہ فٹ بلند ہو گئے تھے اور پھر میں روہنی کے ساتھ اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا گیا یہاں تک کہ ہم سیاہ بادلوں میں داخل ہو گئے۔ سیاہ بادلوں میں مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف یہ احساس تھا کہ روہنی میرے ساتھ ہے اور میرا ہاتھ اس نے پکڑ رکھا ہے۔ میں دل میں دعا مانگنے لگا کہ یا اللہ پاک مجھے

خیریت سے واپس لے آنا۔ میں کبھی ان خرافات میں نہ پڑتا مگر تو جانتا ہے کہ میں مجبور کر دیا گیا ہوں اور محض میری حماقت نے مجھے اس انجام تک پہنچا دیا ہے۔ نہ میں قلعے کا مرتبان کھول کر روہنی کی بدروح کو آزاد کرتا اور نہ اس مصیبت میں پھنستا۔ مگر جو ہو چکا تھا اسے میں واپس نہیں موڑ سکتا تھا۔ مجھے اب اس کا توڑ کرنا تھا تاکہ میری جان محفوظ رہے اور میں ناحق نہ مارا جاؤں۔

ہم سیاہ کالی گھٹاؤں میں سے نکل کر سفید دھند کے بادلوں میں داخل ہو چکے تھے۔

مجھے رفتار کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ کبھی محسوس ہوتا کہ میں ہوا میں ایک جگہ پر معلق ہو گیا ہوں اور کبھی لگتا کہ میں اس قدر تیز سپیڈ کے ساتھ فضا میں پرواز کر رہا ہوں کہ جیسے بجلی کی چمک سفر کر رہی ہو۔ پہلے بھی میں روہنی کے ساتھ فضا میں اڑتا رہا تھا۔ اس اڑان میں مجھے اپنے جسم کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا مگر اب میرے جسم کا وزن غائب ہو گیا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے میں ہوا سے بھی زیادہ ہلکا ہو گیا ہوں۔ کچھ پتہ نہیں یہ کیفیت کتنی دیر تک قائم رہی۔ پھر میرے جسم کا وزن واپس آنا شروع ہو گیا اور میں روہنی کے ساتھ بالکل سیدھ میں اڑنے کی بجائے نیچے آنے لگا۔

میں نے نیچے نظر ڈالی۔ میرے پاؤں کے نیچے مجھے جگہ جگہ سیاہ بادلوں کے پہاڑ سے نظر آرہے تھے۔ یہ بادل حرکت کرنے کی بجائے اپنی جگہوں پر ساکت تھے۔ مجھے روہنی کی آواز سنائی دی۔ ”ہم بدروحوں کی دنیا کی حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔ میں تمہیں غائب کرنے لگی ہوں۔ مگر غائب ہونے کے بعد بھی تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہی رہے گا جب تک کہ میں تمہیں لے کر اپنی سہیلی مالینی کے غار میں نہیں پہنچ جاتی۔“

اچانک مجھے ایک بہت خفیف سا جھٹکا لگا اور میرا جسم میری نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ مجھے نہ تو اپنے بازو دکھائی دے رہے تھے اور نہ جسم کا کوئی دوسرا حصہ نظر آ رہا

تھا۔ میں غائب ہو چکا تھا لیکن مجھے روہنی کے ہاتھ کی گرفت باقاعدہ محسوس ہو رہی تھی۔ میرا جسم ضرور غائب ہو گیا تھا مگر جسم کا احساس زندہ تھا۔ یہ میرے لئے میری زندگی کا ایک انوکھا اور دہشت ناک تجربہ تھا۔ کیسی عجیب اور ڈرا دینے والی بات لگتی ہے کہ آپ سڑک پر چل رہے ہیں اور آپ کو سب کچھ دکھائی دے رہا ہے مگر اپنا جسم دکھائی نہیں دے رہا۔

جیسے جیسے ہم نیچے آرہے تھے سیاہ بادلوں کے پہاڑ واضح ہوتے جا رہے تھے۔ یہ بادل نہیں تھے بلکہ کالے سیاہ پہاڑ تھے جن پر کسی جگہ بھی کوئی درخت نہیں تھا۔ ہم ایک پہاڑ کے پاس اتر گئے۔ روہنی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کہنے لگی۔ ”ہم بدروحوں کی دنیا میں آگئے ہیں۔ اس ٹیلے میں میری سہیلی مالدینی کا غار ہے۔“

روہنی ٹیلے کی ڈھلان کے ساتھ چل رہی تھی۔ اچانک مجھے ایسے لگا جیسے کوئی بہت بڑا پرندہ اپنے پر زور زور سے پھڑپھڑاتا میرے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ میں ڈر کر ایک طرف ہو گیا۔

روہنی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں اسے دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے آسمان کی طرف دیکھ کر روہنی نے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ یہاں بدروحوں کی طرح دن رات اضطراب کے عالم میں فضا میں بھٹکتی رہتی ہیں۔ میرے شہزادے کے تابوت کی انگوٹھی کی وجہ سے بدروحوں کو تمہاری موجودگی کا احساس نہیں ہو رہا اور وہ تمہیں دیکھ بھی نہیں سکتیں۔ اگر تمہاری انگلی میں میری دی ہوئی تابوت کی انگوٹھی نہ ہوتی تو اب تک بدروحوں نے تمہاری تنکا بوٹی کر دی ہوتی۔“

اس وقت میرے دل میں صرف ایک ہی خیال آیا کہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں اور انسانوں کی دنیا سے نکل کر کہاں آگیا ہوں۔ ٹیلے کی ڈھلان میں ساتھ ساتھ غاروں کے دہانے نظر آرہے تھے۔ ہم ان غاروں کے قریب سے گزرنے لگے تو روہنی نے سرگوشی میں مجھے کہا۔ ”کسی غار میں سے کوئی بھی آواز آئے تم ہرگز

ہر گز اس کا جواب مت دینا۔ بالکل خاموش رہنا۔“

میں نے سرگوشی میں جواب دیا۔ ”میں نہیں بولوں گا۔“

ہم پہلے غار کے سامنے سے گزرے تو غار کے اندر سے کسی عورت کی آواز آئی۔ وہ بین کر رہی تھی اور بڑی دردناک آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”مجھے آگ لگی ہوئی ہے۔ کوئی میری آگ بجھا دے۔“

ہم غار کے آگے سے گزر گئے۔ دوسرے غار کے پاس آئے تو اندر سے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ بچہ بلک بلک کر رو رہا تھا اور کہے جا رہا تھا۔ ”امی جان! یہ لوگ مجھے مار رہے ہیں۔ مجھے ان سے بچالو۔ میرے سر سے خون بہہ رہا ہے۔ امی جان! مجھے ان سے بچالو۔ امی جان! تم کہاں ہو.....؟“

ہم اس غار کے آگے سے بھی گزر گئے۔ تیسرے غار کے سامنے سے گزرے تو اندر سے کسی مرد کی بھیانک چیخ کی آواز آئی۔ یہ چیخ اتنی ڈراؤنی تھی کہ میرا دل لرز اٹھا۔ چیخوں کی مسلسل آوازیں آنے لگیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی کسی کو دہکتے ہوئے انگاروں سے داغ رہا ہے۔ چوتھے غار میں سے صرف رونے کی درد انگیز آواز آ رہی تھی۔ کوئی انسان ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا اور کہے جا رہا تھا۔ ”مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔“

پانچویں غار کے قریب پہنچتے ہی روہنی نے مجھے ہاتھ سے ایک طرف کھینچ لیا۔ ہم ٹیلے کے ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں ہو گئے۔ اس غار کے اندر سے کسی خوشخوار دردے کی دھاڑ سنائی دی پھر خاموشی چھا گئی۔ اس کے فوراً بعد غار میں سے ایک بڑے ریچھ کے سائز کا ایک عجیب قسم کا ڈراؤنا درندہ باہر نکلا۔ اس کے منہ میں ایک آدمی کا دھڑ تھا جس کو اس نے اپنے نوکیلے دانتوں میں جکڑ رکھا تھا۔ یہ سیاہ رنگ کا خوفناک درندہ بد نصیب انسان کی آدھی خون آلود لاش کو اپنے دانتوں میں دبائے

جائے گی۔ اس میں اتنی شکتی ہے کہ وہ تمہیں غیبی حالت میں بھی دیکھ لے گی۔ یاد رکھنا جب تک وہ تم سے کچھ نہ پوچھے تم ہرگز نہیں بولو گے۔“

ابھی ہم دالان میں ایک ستون کے پاس کھڑے ہی تھے کہ کسی پرندے کے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز سنائی دی۔ روہنی نے کہا۔ ”مالینی! میری سیٹیلی آگئی ہے۔“

پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور بلند ہو گئی۔ اتنے میں ایک بڑے سائز کی چگادڑ نمودار ہوئی۔ اس نے اپنے پر پھیلا رکھے تھے اور اس کے حلق سے سیٹی کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ چگادڑ نے دالان میں ایک چکر لگایا اور پھر روہنی جہاں کھڑی تھی وہاں زمین پر اتر گئی۔ زمین پر اترتے ہی وہ ایک نوجوان عورت کے روپ میں ظاہر ہو گئی۔ روہنی کو سامنے دیکھ کر وہ بڑی خوش ہوئی اور اسے اپنے گلے سے لگالیا۔ کہنے لگی۔ ”روہنی! بڑے دنوں بعد تم سے ملاقات ہوئی ہے۔ میں جانتی ہوں ہماری بدروحوں کی دنیا سے تمہارا زیادہ تعلق نہیں ہے۔ ہم تو یہاں بدروحیں بن کر اپنے برے کرموں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ لیکن تمہارے کرم دنیا میں اچھے تھے۔ تم اپنے دشمن پجاری رگھو کی وجہ سے ایک اچھی بدروح کی شکل میں بھٹک رہی ہو۔“

پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ میں غائب تھا مگر روہنی کی سیٹیلی مالینی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے روہنی سے پوچھا۔ ”یہ انسان کون ہے۔ اسے تم اپنے ساتھ ہماری دنیا میں کیوں لائی ہو؟ یہ تو ابھی زندہ ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”مالینی! میں یہی سب کچھ بتانے کے لئے تمہارے پاس آئی ہوں۔“

مالینی کی بدروح اینٹوں کے تھڑے پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے والے تھڑوں پر میں اور روہنی بیٹھ گئے۔ اس کے بعد روہنی نے اپنی سیٹیلی مالینی کو شروع سے لے کر آخر تک وہ ساری کہانی بیان کر دی جو میں آپ کو بیان کر چکا ہوں۔ بدروح مالینی

چھلانگ لگا کر نیلے کی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں روہنی سے پوچھوں کہ یہ کیا کچھ ہو رہا تھا اور یہ کون لوگ ہیں، کون سی بدروحیں ہیں جن پر خدا کا عذاب نازل ہو رہا ہے۔ روہنی بدروح بھی خاموش تھی۔ جب خوفناک درندہ جھاڑیوں کے عقب میں غائب ہو گیا تو روہنی مجھے لے کر آگے چل پڑی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ آگے نیلے کی سیاہ دیوار آگئی اس کے بعد پھر تاریک غار آگیا۔ اس غار کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے اندر ایک نگاہ ڈالی تو میری روح کانپ اٹھی۔ غار کے دہانے کے پاس ہی ایک عورت غار کی چھت کے ساتھ الٹی لٹکی ہوئی تھی اور اس کے جسم کے ساتھ سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ روہنی میرا ہاتھ کھینچ کر جلدی سے آگے لے گئی۔ ایک غار میں سے سیاہ کالا دھواں نکل رہا تھا اور اندر سے ایک گھٹی ہوئی آواز آ رہی تھی۔ ”میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے باہر نکالو۔ مجھے باہر نکالو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

ہم وہاں سے بھی آگے نکل گئے۔ آگے ایک چھوٹا سا زینہ تھا۔ ہم اس پر سے ہو کر اوپر گئے تو وہاں بھی ایک غار تھا۔ اس غار میں سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ روہنی نے میرے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔ ”یہ میری سیٹیلی مالینی کا غار ہے۔ ڈرنا نہیں ہم اندر جا رہے ہیں۔“

غار میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ جیسے جیسے ہم غار میں آگے جا رہے تھے اندھیرا اپنے آپ کم ہوتا جا رہا تھا حالانکہ وہاں کوئی موم ہی نہ تھا روشن نہیں تھی۔ ہم غار کے وسط میں آگئے جہاں ایک چھوٹا سا دالان تھا۔ دالان میں تین سیاہ پتھر کے ستون تھے۔ ایک ستون کے پاس چھوٹا سا چوڑا بنا ہوا تھا۔ چوڑے پر اینٹوں کے چار تھڑے تھے جیسے کسی کے بیٹھنے کے لئے بنائے گئے ہوں۔

غار خالی تھا۔ روہنی دھیمی آواز میں کہنے لگی۔ ”مالینی باہر گئی ہوئی ہے۔ ابھی ا

بڑے غور سے روہنی کی باتیں سن رہی تھی۔ جب روہنی نے اپنی داستان ختم کی تو مالینی نے کہا۔ ”روہنی! اس انسان نے تمہیں راکھشش پجاری رگھو کی قید سے آزاد کر کے تمہارے ساتھ بھلائی کی ہے۔ ہم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچنے دیں گی۔ میں ہر طرح سے تمہاری اور اس نیک دل انسان کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن تم بھی جانتی ہو کہ یہ کام بڑا خطرناک بھی ہے۔ پجاری رگھو کی بدروح اپنے بدروحوں کے قبیلے کی سردار ہے اور ہمارے قبیلے کی سردار کالی بدروح سے رگھو کے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ ان دونوں میں کسی کو بھی اگر یہ معلوم ہو گیا کہ تم لوگ انسانوں کی دنیا سے پجاری رگھو کو ہمیشہ کے لئے بھسم کرنے کے سلسلے میں میرے پاس آئے ہو اور تمہیں اس کے طلسم کے توڑ کی تلاش ہے تو اس انسان کی جان خطرے میں ہوگی۔ ہم دونوں بدروحیں ہیں۔ ہم پہلے ہی سے مرجھ چکی ہیں لیکن بدروحوں کی بھی موت ہوتی ہے اور یہ بڑی اذیت کی موت ہوتی ہے۔ انسان تو مر کر جسمانی تکلیف سے نجات پا جاتا ہے لیکن بدروحوں کی موت کے بعد ان کا ایذاذیت ناک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا.....“

روہنی نے کہا۔ ”مالینی! مجھے ان ساری باتوں کا احساس ہے۔ میں بڑی احتیاط سے کام لے رہی ہوں اور ایک ایسے راستے سے اڑ کر آئی ہوں جہاں سوائے خلا کے اور کچھ نہیں تھا صرف اس لئے کہ کہیں پجاری رگھو یا تمہاری خونخوار سردارنی کالی کو ہمارے یہاں آنے کا پتہ نہ چل جائے۔“

بدروح مالینی کہنے لگی۔ ”قبیلے کی سردارنی کالی بدروح کی طاقت کا تمہیں علم نہیں ہے۔ دوسری دنیا اور خاص طور پر انسانوں کی دنیا کا ایک ذرہ بھی اڑ کر یہاں آجائے تو اسے خبر ہو جاتی ہے۔ یہ تمہاری عقل مندی ہے کہ تم اپنے ساتھی کو جو تمہارے مرے ہوئے محبوب کا ہم شکل ہے آسمان کے ایسے راستوں سے لے کر آئی ہو کہ کالی بدروح کو ابھی تک تمہارے اور تمہارے ساتھی کے بدروحوں کی دنیا میں داخل

ہونے کی خبر نہیں ہوئی۔“

روہنی نے کہا۔ ”مالینی! تم میری سب سے پیاری بلکہ زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی ایک ہی سہیلی ہو اور میری ہم راز ہو۔ میں نے یہ راز تمہیں کھول کر بتا دیا ہے کہ میری نجات اور میرے مردہ محبوب کی روح کی تسکین صرف اسی ایک بات میں ہے کہ کسی طرح میں اپنے دشمن پجاری رگھو سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کر لوں۔ وہ میری تلاش میں ہے اور مجھے ہر قیمت پر ایک بار پھر اپنے قبضے میں کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس کی مکتی اور اس کی نجات بھی اسی میں ہے کہ میں ہمیشہ کے لئے اس کے قبضے میں چلی جاؤں تاکہ وہ مجھے ایک سو برس تک کسی مرتبان میں دفن رکھنے کے بعد میری آتما کو اپنے میں جذب کر کے پھر سے اس دنیا میں زندہ انسان کا جنم لے کر ظاہر ہو جائے۔ میری آتما کو اپنے اندر جذب کر لینے کے بعد اس میں اتنی شکتی، اتنی طاقت آجائے گی کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طلسمی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ وہ جسے چاہے گا اپنی مرضی سے یا قتل کر سکے گا اور یا اسے اپنا غلام بنا سکے گا۔“

بدروح مالینی نے کہا۔ ”ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ انسانوں کی دنیا امن و راحت اور محبت و پیار کی دنیا ہے۔ یہ راکھشش پجاری رگھو اگر تمہاری آتما کو اپنے اندر جذب کر کے دوبارہ دنیا میں واپس آ گیا تو دنیا کے امن پسند بے گناہ لوگوں کی زندگیاں تباہ و برباد ہو جائیں گی۔“

روہنی نے کہا۔ ”اس لئے میں تمہاری مدد لینے تمہارے پاس آئی ہوں۔“

مالینی نے کہا۔ ”مجھے بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔ میں تمہاری نجات اور انسانوں کی دنیا کی شانتی اور امن کے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں۔“

تب روہنی نے مالینی سے کہا۔ ”اس کے لئے مجھے ایک ایسی شے کی ضرورت ہے جو مجھے صرف تمہاری بدروحوں کی دنیا اور خاص طور پر تمہارے قبیلے میں سے ہی مل سکتی ہے۔“

”مجھے بتاؤ وہ کون سی شے ہے؟“ مالینی نے پوچھا۔

روہنی نے کہا۔ ”تمہیں معلوم ہی ہے کہ تمہارے قبیلے کی سردارنی بدروح کالی کے گلے میں انسانی ہڈیوں کے مہروں کی مالا لائیں ہوتی ہیں اور تم یہ بھی اچھی طرح سے جانتی ہو کہ اس مالا کی ہڈیوں کے مہروں میں کتنی طاقت چھپی ہوئی ہے۔ مالینی! اگر مجھے سردارنی کالی بدروح کی اس مالا میں سے کسی بھی انسانی ہڈی کا ایک مہرہ مل جائے تو میرے پاس اتنی طاقت آجائے گی کہ میں نہ صرف یہ کہ انسانوں کا اور اپنے دشمن پجاری رگھو کا مقابلہ کر سکوں گی بلکہ اسے اگنی دیوی کی چتا کی آگ میں جلا کر ہمیشہ کے لئے بھسم کر سکوں گی۔“

مالینی یہ سن کر جیسے ایک بار سہم سی گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر پریشانی کے اثرات ظاہر ہو رہے تھے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے خاموش دیکھ کر روہنی نے کہا۔ ”مجھے احساس ہے کہ میں تمہیں ایک ایسے کام کے لئے کہہ رہی ہوں جس میں تمہاری جان کو بھی خطرہ ہے اور یہ مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔ مگر مالینی یہ انسانیت کی بھلائی کا کام بھی ہے۔ ہو سکتا ہے نیکی کے اس کام کے بدلے تمہارے برے کرموں کی سزا بھی بھگوان معاف کر دے اور تمہاری روح کو بھی نجات مل جائے اور تم بدروحوں کی دنیا سے نکل کر آکاش کی بلندیوں میں دیوتاؤں کی دنیا میں پہنچ جاؤ۔ کیونکہ جب تک میرے اندر پجاری رگھو جتنی یا اس سے بڑھ کر شکتی نہیں پیدا ہوتی تب تک میری روح جس کو آکاش کی بلندیوں پر جانا تھا آسمانوں اور زمین کے درمیان ہمیشہ بھٹکتی پھرتی رہے گی اور میرے محبوب شہزادے کی روح بھی سورگ میں بے چین رہے گی۔“

مالینی بدروح نے آخر اپنی زبان کھولی اور کہنے لگی۔ ”روہنی! یہ کام کتنا مشکل بلکہ ایک طرح سے ناممکن ہے۔ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔ کالی بدروح کے گلے کی مالا میں سے انسانی ہڈی کا مہرہ اتارنا تو بعد کی بات ہے اس کی مالا کو کوئی ہاتھ بھی

نہیں لگا سکتا۔ کالی بدروح سو بھی رہی ہوتی ہے تو چار خونخوار بدروحوں ننگی تلواریں ہاتھوں میں لئے اس کے ارد گرد پہرہ دے رہی ہوتی ہیں اور جہاں وہ سو رہی ہوتی ہے وہاں کوئی مکھی بھی داخل ہونے کی جرات نہیں کر سکتی۔“

روہنی نے کہا۔ ”لیکن مالینی! ہمیں یہ کام ہر حالت میں کرنا ہے۔ اگر کالی بدروح کا مہرہ مجھے مل گیا تو سمجھ لو کہ میری تو نجات ہوگی ہی لیکن اس کے ساتھ ہی انسانوں کی دنیا کے کروڑوں بے گناہ انسان پجاری رگھو کی لائی ہوئی تباہی سے محفوظ ہو جائیں گے۔“

بدروح مالینی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔ وہ روہنی کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ وہ انسانوں کی دنیا کو تباہی سے بچانا چاہتی تھی مگر اسے کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی تھی جس پر چل کر وہ اپنے قبیلے کی خونخوار سردارنی کالی بدروح کی مالا کا مہرہ حاصل کر سکے۔

اچانک بدروح مالینی نے میری طرف دیکھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں مجھے بڑی خوفناک سی چمک دکھائی دی تھی۔ پھر اس نے روہنی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”روہنی! ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔“

”وہ کیا؟“ روہنی نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

بدروح مالینی نے کہا۔ ”تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ ایک مرے ہوئے آدمی کے مقابلے میں ایک زندہ انسان زیادہ طاقت اور قابلیت رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس زندہ انسان کو اپنی چھپی ہوئی طاقت کا احساس نہ ہو۔“

روہنی نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں۔ مگر وہ طریقہ کون سا ہے جس پر عمل کر کے میں کالی بدروح کا مہرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہوں۔“

بدروح مالینی کہنے لگی۔ ”تمہارا ساتھی انسان.... اور تمہارے محبوب اور سورگباز شہزادے شیردان کے ہم شکل سے یہ کام لیا جاسکتا ہے۔“

یہ سنتے ہی میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے روہنی نے بلائے بغیر کچھ بولنے سے منع کیا ہوا تھا۔ لیکن میں نے گھبرا کر کہہ دیا۔ ”نہیں نہیں! میں یہ کام کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ میں آپ لوگوں کے لئے اپنی جان کی بازی نہیں لگا سکتا۔ میری زندگی پہلے ہی ہر وقت خطرے میں رہتی ہے۔ ذلیل پجاری رگھو مجھ پر کئی بار قاتلانہ حملے کر چکا ہے۔“

بدروح مالینی نے کہا۔ ”کیا تم نہیں چاہتے کہ تمہاری جان کو جو ہر وقت موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے وہ ختم ہو جائے؟ کیا تم نہیں چاہتے کہ تمہارا وہ دشمن جو ہر وقت تمہیں جان سے مار ڈالنے کے منصوبے بناتا رہتا ہے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائے؟“

میری زبان سے اپنے آپ نکل گیا۔ ”میں یہی چاہتا ہوں کیونکہ اپنی حماقت کی وجہ سے میں جس عذاب میں مبتلا ہو چکا ہوں اس سے چھٹکارا پانے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ میرا دشمن پجاری رگھو ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔“

بدروح مالینی نے کہا۔ ”تو پھر اس کی ایک ہی صورت ہے کہ جو میں تمہیں کہوں اس پر عمل کرو۔ اگر تم نے میری ہدایت کے مطابق سب کچھ کیا تو تمہیں کوئی نقصان ہی نہیں پہنچے گا اور تم کالی بدروح کا مہرہ بھی لانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔“

میری ساتھی روہنی نے بھی مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ”شیروان! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم میرے محبوب بھی ہو اور میرے شوہر بھی رہ چکے ہو۔ میں یہ کیسے گوارا کر سکتی ہوں کہ تمہیں کوئی گزند پہنچے۔ مجھے یقین ہے اور تم بھی میری سہیلی مالینی کی بات کا یقین کرو۔ وہ تمہیں جیسے کہے ویسے ہی کرو۔ اللہ کے فضل سے تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ اور پھر ذرا سوچو تمہارے اس عمل سے نہ صرف یہ کہ مجھے نجات مل جائے گی اور تمہاری جان کو جو خطرہ لگا ہوا ہے وہ دور ہو جائے گا بلکہ دنیا میں رہنے والے انسانوں کا کس قدر بھلا ہو گا کہ وہ ایک شیطان کے ظالمانہ ہتھکنڈوں سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائیں گے۔“

میں پہلے ہی اس دلدل میں کمر تک دھنسن چکا تھا۔ جب یہ صورت حال سامنے آئی تو میں نے سوچا کہ اگر میری نجات خدا نے ایسے ہی لکھی ہے تو چلو اس دلدل میں تھوڑا اور نیچے اتر جاتا ہوں۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں یونہی اپنی جان کی بازی لگانے کو تیار نہیں تھا۔ میں روہنی اور مالینی کی زبانی سن چکا تھا کہ بدروحوں کے قبیلے کی سردار کالی بدروح کس قدر خونخوار بدروح ہے۔ میں اس کام کے لئے حامی بھرنے سے پہلے ہر قسم کی تسلی کر لینا چاہتا تھا۔ میں نے براہ راست روہنی کی بدروح سہیلی مالینی سے پوچھا۔ ”تم مجھے پوری تفصیل کے ساتھ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہو گا؟“

مالینی کہنے لگی۔ ”سب سے پہلے میں تمہاری تسلی کرنا چاہتی ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم غیبی حالت میں ہو اور زندہ انسان ہو مرے ہوئے نہیں ہو۔ یعنی تم اپنی روح یا بدروح نہیں ہو۔ اور کالی بدروح پر تمہیں یہی سب سے بڑی فوقیت حاصل ہے کہ تم زندہ انسان ہو اور غیبی حالت میں ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے پاس میری سہیلی روہنی کی دی ہوئی طلسمی انگوٹھی بھی ہے جو تمہیں بدروحوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہو گا۔۔۔۔۔ یہاں ہمارے بدروحوں کے قبیلے میں ایک رسم چلی آرہی ہے کہ سیاہ چاند کی رات میں ایک زبردست جشن ہوتا ہے۔ یہ رات ہر چھ ماہ کے بعد آتی ہے۔ اس رات آدھی رات کے بعد آسمان پر سیاہ چاند طلوع ہوتا ہے۔ یہ چاند کالا سیاہ ہوتا ہے لیکن اس کے گول کنارے روشن ہوتے ہیں جس کی وجہ سے چاند سیاہ آسمان پر نظر آتا ہے۔ اس جشن میں کالی بدروح بھی شامل ہوتی ہے۔ اسے ایک تخت پر بیٹھا دیا جاتا ہے۔ قبیلے کی تمام بدروحیں کالی بدروح کے سامنے رقص کرتی ہیں اور اس کی تعریف کے گیت گاتی ہیں۔ اس رات کالی بدروح سوم رس بھی پیتی ہے۔ سوم رس تم جانتے ہی ہو گے انسانوں کی دنیا میں اسے شراب کہتے ہیں۔۔۔۔۔ کالی بدروح کافی سوم رس پی

جاتی ہے کیونکہ اس کے بعد چھ ماہ تک اسے سوم رس کو ہاتھ بھی نہیں لگانا ہوتا۔ یہ جشن سیاہ چاند رات بھر جاری رہتا ہے۔ جب جشن ختم ہوتا ہے تو میں نے دیکھا ہے کہ کالی بدروح نشے میں مدہوش ہوتی ہے اور اسے اس کی چار باڑی گارڈ بدروحیں پاکی میں ڈال کر اس کے غار میں لے جاتی ہیں۔ اس کے بعد کالی بدروح اگلے روز سارا دن غار میں مدہوش پڑی رہتی ہے۔ بس یہی وہ رات ہے جب تم ہمت کر کے اس کی مالا میں سے ہڈیوں کا ایک مہرہ لاسکتے ہو۔ یہی ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی تھی اور اس کے علاوہ اور کوئی ایسی ترکیب نہیں ہے جس کی مدد سے تم کالی بدروح کا مہرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکو۔“

میں نے کہا۔ ”کالی بدروح تو ضرور نشے میں مدہوش ہوگی لیکن جو چار بدروحیں تلواریں اٹھائے غار کے باہر پہرہ دے رہی ہوں گی تو وہ پوری طرح سے چوکس ہوں گی وہ مجھے کیسے غار میں داخل ہونے دیں گی۔ وہ تو وہیں میرا کام تمام کر دیں گی۔“

میرا یہ اعتراض سن کر میری ساتھی روہنی بھی سوچ میں پڑ گئی۔ مالینی بدروح بڑے پرسکون انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔

O

میری ساتھی اور دوست روہنی نے مالینی سے کہا۔ ”شیروان ٹھیک کہتا ہے مالینی.... شیروان غیبی حالت میں بھی ان کے قریب سے جب گزرے گا تو میرا خیال ہے کہ انہیں اپنے کالے جادو کی طاقت سے اتنا ضرور محسوس ہو جائے گا کہ کوئی چیز غار میں داخل ہوئی ہے۔“

بدروح مالینی بڑے اطمینان سے روہنی کو سنتی رہی۔ جب اس نے اپنی بات ختم کی تو وہ کہنے لگی۔ ”تم کیا سمجھتی ہو کہ میں ان پہرے دار بدروحوں کی جادوئی طاقت سے بے خبر ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ جب شیروان غیبی حالت میں بھی ان کے قریب سے ہو کر غار میں داخل ہوگا تو انہیں یہ احساس ضرور ہو جائے گا کہ کوئی نظر نہ آنے والی شے غار میں گئی ہے۔“

”تو پھر تمہارے پاس اس کا کیا توڑ ہے؟“ روہنی نے پوچھا۔

مالینی نے کہا۔ ”اس کا توڑ میرے پاس ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ روہنی نے پوچھا۔

مالینی نے کہا۔ ”میں شیروان کو ایسا چمگادڑ بنا کر غار میں بھیجوں گی جو نظر نہیں آئے گا۔ جب شیروان چمگادڑ کے روپ میں غار میں داخل ہوگا تو بدروحوں کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ کوئی چمگادڑ غار میں گیا ہے۔ کالی بدروح کے غار میں دس بارہ چمگادڑ بھی رہتے ہیں جو سارا دن کالی بدروح کے تخت کے اوپر چھت کے ساتھ الٹے لٹکے رہتے ہیں اور رات کو باہر نکل کر سزا یافتہ بدروحوں کے غاروں میں جا کر اُن کا

خون چوستے ہیں۔ ان میں سے وہ چمگادڑ جس کا پیٹ بھر جاتا ہے کالی بدروح کے غار میں واپس آ جاتا ہے۔ چمگادڑ عام طور پر رات کی تاریکی میں نظر نہیں آتے۔ جب شیروان چمگادڑ کے روپ میں غار میں داخل ہو گا تو پہرے دار بدروحیں یہی سمجھیں گی کہ یہ کالی بدروح کے غار کا چمگادڑ ہے جو کسی بدروح کے خون سے اپنا پیٹ بھر کر واپس آ گیا ہے۔“

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”کیا میں چمگادڑ سے اپنے انسانی روپ میں واپس آ جاؤں گا؟“

”کیوں نہیں؟“ مالینی نے کہا۔ ”اگر میں تمہیں جادو کے زور سے چمگادڑ بنا سکتی ہوں تو تمہیں اسی جادو کے زور سے انسانی شکل میں واپس بھی لاسکتی ہوں۔“

میں چپ ہو گیا۔ میرے سر پر جو ایک نادانی کی وجہ سے ایک ناگہانی مصیبت آن پڑی تھی اسے کسی نہ کسی صورت مجھے کاٹنا ہی تھا۔

روہنی نے کہا۔ ”لیکن شیروان چمگادڑ کے روپ میں کالی بدروح کی مالا سے ہڈی کا مہرہ کیسے الگ کر سکے گا؟“

مالینی کہنے لگی۔ ”چمگادڑ کے روپ میں بھی شیروان کا دماغ ایک انسان کا دماغ ہو گا اور وہ اسی طرح کام کر رہا ہو گا جس طرح دوسرے انسانوں کا دماغ کام کرتا ہے۔ میں شیروان کو ایک چھوٹا سا منتر بتا دوں گی۔ غار میں داخل ہونے کے بعد وہ کالی بدروح کے تخت کے ایک طرف بیٹھ جائے گا اور یہ دیکھے گا کہ کالی بدروح کہیں ہوش میں تو نہیں ہے۔ اگر وہ سو مرس کے نشے میں مدہوش ہو گی جس کا مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور ہو گی تو شیروان میرا بتایا ہوا منتر دل میں دہرائے گا اس کے ساتھ ہی وہ اپنی انسانی شکل میں واپس آ جائے گا مگر وہ نیبی حالت میں ہی ہو گا۔ اس کے بعد شیروان کو اپنی عقل اور بڑی ہوشیاری سے کام لینا ہو گا اور بڑی احتیاط کے ساتھ کالی بدروح کی مالا میں سے ہڈی کا ایک مہرہ الگ کر کے اپنے قبضے میں کرنا ہو گا۔ مہرہ جب شیروان

کے قبضے میں آ جائے گا تو وہ پھر میرا بتایا ہوا منتر دل میں ایک بار پڑھے گا اور اس کے فوراً بعد وہ ایک بار پھر چمگادڑ کا روپ اختیار کر لے گا اور اڑتا ہوا ہمارے غار میں واپس آ جائے گا۔ یہ ہے وہ طریقہ جس پر عمل کرنے سے تم کالی بدروح کا مہرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہو۔ اس کے علاوہ کوئی ترکیب نہیں ہے۔“

میں نے سبھی ہوئی آواز میں مالینی سے پوچھا۔ ”اور اگر کالی بدروح کو اچانک ہوش آ گیا تو پھر کیا ہو گا؟“

مالینی نے کہا۔ ”پھر یہ ہو گا کہ کالی بدروح تمہیں پکڑنے لے گی۔ سب سے پہلے وہ تمہاری گردن مروڑ کر تمہارا سر تمہارے دھڑ سے الگ کر دے گی۔ اس کے بعد تمہاری کئی ہوئی گردن پر منہ رکھ کر تمہارا سارا خون پی جائے گی۔ پھر وہ تمہارے جسم کا سارا گوشت کھا جائے گی اور تمہاری ہڈیوں کو توڑ توڑ کر ان کے مہرے اور چھلے بنا کر ان کی مالا اپنے گلے میں ڈال لے گی۔“

میں سن رہا تھا اور میری روح فنا ہوئی جا رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے ساتھ ایسا ہی ہو گا۔ کالی بدروح کی مالا کو جیسے ہی میں ہاتھ لگاؤں گا اسے ہوش آ جائے گا اور میرا وہی ہولناک انجام ہو گا جس کی تفصیل بدروح مالینی نے بیان کی تھی۔ میں مالینی سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر دہشت کے مارے میرا گلہ خشک ہو گیا تھا اور کوشش کے باوجود میرے حلق سے آواز نہ نکل سکی تھی۔ میری ساتھی روہنی نے میرے جذبات کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے میرے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے مالینی سے پوچھا۔ ”مالینی! کیا اس بات کا امکان ہے کہ شیروان کے قریب جانے یا کالی بدروح کی مالا کو ہاتھ لگانے سے اسے ہوش آ جائے؟“

مالینی کہنے لگی۔ ”ایسا ہونا نہیں چاہئے۔ کیونکہ جشن کی رات کالی بدروح سوم رس کے نشے میں ساری رات بے سدھ پڑی رہتی ہے لیکن اگر اسے ہوش آ بھی گیا تو شیروان کو چاہئے کہ فوراً میرا منتر پڑھ لے وہ اسی لمحے چمگادڑ کا روپ اختیار کر لے گا

اور اڑ جائے گا۔“

بدروح مالینی نے مجھے بھی تسلی دی اور کہا کہ مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کالی بدروح سوم رس اتنا پی چکی ہوتی ہے کہ دوسرے دن سے پہلے اس کے ہوش میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آخر یہی فیصلہ ہوا کہ کالی بدروح کا مہرہ لینے کے لئے مجھے ہی چگاڈڑ کے روپ میں اس کے غار میں جانا ہوگا۔ یہ موت کے منہ میں جانے والی بات تھی لیکن پجاری رگھو کی ہلاکت آمیز دشمنی کے خوف سے روز روز مرنے کی بجائے بہتر تھا کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے یہ کوشش کر کے دیکھ لی جائے۔

ہو سکتا ہے ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔

سیاہ چاند کے جشن کی رات کو ابھی سات دن باقی تھے۔ مالینی نے کہا۔ ”اتنے دن تم دونوں میرے غار میں ہی رہو گے۔ تمہارا غار سے باہر نکلنا ہم سب کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”ہم تمہاری ہدایت پر عمل کریں گے اور تمہارے غار سے باہر قدم نہیں رکھیں گے۔“

میں بیان نہیں کر سکتا کہ یہ سات دن میں نے مالینی بدروح کے غار میں کس ذہنی اذیت کے ساتھ گزارے۔ کہاں مجھے لاہور، کراچی کی کشادہ سڑکوں اور جنگلوں میں پھر کر شکار کھیلنے کی عادت تھی اور کہاں میں بدروحوں کی دنیا کے ایک تاریک غار میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن یہ اذیت مجھے ہر حال میں برداشت کرنی ہی تھی۔ آخر جشن کی رات آگئی۔

شام ہوئی تو بدروح مالینی نے مجھے اپنے سامنے بٹھا کر وہ خفیہ جادوئی منتر بتایا جس کو پڑھ کر مجھے چگاڈڑ سے انسان کا روپ اختیار کرنا تھا اور دوسری بار پڑھ کر انسان سے واپس چگاڈڑ کی شکل اختیار کر کے کالی بدروح کے غار سے باہر نکلنا تھا۔ یہ چار لفظوں

کا منتر تھا جو آج بھی مجھے یاد ہے لیکن میں آپ کو بتاؤں گا نہیں کیونکہ یہ سب کفر ہے اور کافروں کی خرافات ہے۔

مالینی نے مجھے کہا تھا کہ شیر وان! میں نے تمہیں بڑا قیمتی منتر بتا دیا ہے۔ ہمیں اس کی اجازت نہیں ہوتی کہ ہم یہ منتر کسی انسان کو بتائیں۔ لیکن جب کسی کی جان کو خطرہ ہو تو اس منتر سے کام لیا جاسکتا ہے۔ مالینی نے مجھے ہدایت کی تھی اور کہا تھا۔ ”شیر وان! میں نے جو خفیہ منتر تمہارے دماغ میں ڈال دیا ہے اب میں اسے تمہارے دماغ سے نکال نہیں سکتی۔ میں جانتی ہوں یہ منتر تمہیں اس وقت بھی یاد رہے گا جب تم میری سہیلی روہنی کے ساتھ انسانوں کی دنیا میں واپس جاؤ گے۔ لیکن میری ایک بات یاد رکھنا اس منتر کو صرف اپنی جان بچانے اور کسی بے گناہ کی جان بچانے اور کسی بڑے مشکل وقت میں استعمال کرنا۔۔۔۔۔“

یہ منتر مجھے آج بھی یاد ہے۔ اور میں اس وقت بھی اگر چاہوں تو وہ خفیہ منتر پڑھ کر انسان سے کوئی دوسرا روپ اختیار کر سکتا ہوں مگر میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ مالینی بدروح نے مجھے بلا ضرورت یہ منتر پڑھنے سے سختی سے منع کیا ہوا ہے۔

بہر حال میں اپنی داستان آگے شروع کرتا ہوں۔

بدروحوں کی دنیا میں وہ سیاہ چاند کے جشن کی رات تھی۔ اس رات مجھے چگاڈڑ کے روپ میں خونخوار کالی بدروح کے غار میں داخل ہو کر اس کی مالا میں سے ہڈی کا ایک مہرہ نکال کر لانا تھا۔ یہ موت کا کھیل تھا۔ اس میں میری جان بھی جاسکتی تھی۔ اگرچہ بقول مالینی کے میں ہنگامی حالت میں منتر پڑھ کر انسان سے چگاڈڑ بن کر وہاں سے بھاگ سکتا تھا لیکن کوئی پتہ نہیں تھا کہ اس دوران خونخوار کالی بدروح مجھ پر وار کر دے۔ آخر وہ ان سب بدروحوں کی سرداری تھی اور بڑی زبردست آسیبی طاقت تھی۔ ہم نے کالی بدروح کا غار دیکھا ہوا تھا۔ مالینی نے بھی مجھے اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا کہ اس کا غار کس جگہ پر ہے۔

رات ذرا گہری ہوئی تو مالینی نے اپنی سہیلی روہنی سے کہا۔ ”میں سیاہ چاند کے جشن میں شریک ہونے جا رہی ہوں۔ آدھی رات کو جب سیاہ چاند نکلے گا اور جشن کا ہنگامہ گرم ہو جائے گا تو میں تھوڑی دیر کے لئے تمہارے پاس غار میں واپس آ جاؤں گی تاکہ اپنے سامنے شیروان کو کالی کے غار کی طرف بھیج سکوں۔ تم دونوں اس دوران غار میں ہی رہنا، غار سے باہر ہر گز قدم نہ رکھنا۔“

یہ کہہ کر مالینی چلی گئی۔

میں اور روہنی غار میں اکیلے رہ گئے۔ روہنی نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بڑے پیار اور کئی قدر تشویش کے لہجے میں کہا۔ ”میرے شہزادے شیروان! میں جانتی ہوں تم ایک بڑی ہی خطرناک مہم پر جا رہے ہو اور یہ خطرہ تم اپنے لئے ہی نہیں میرے لئے بھی مول رہے ہو۔ لیکن میرے شہزادے تم بھی جانتے ہو کہ ہمیں کالی بدروح کے مہرے کی کس قدر شدید ضرورت ہے اس کے بغیر ہم انسانوں کی دنیا میں واپس جا کر اپنے جانی دشمن پجاری رگھو کی خون خوار دشمنی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

میں نے کہا۔ ”تم میری فکر نہ کرو۔ میرا خدا میری حفاظت کرے گا۔ میں جس ہلاکت خیز دلدل میں پھنس چکا ہوں اب اس میں سے میرا خدا ہی مجھے باہر نکالے گا۔ تم مسلمان ہو چکی ہو۔ بس میرے لئے دعا کرنا۔“

روہنی یعنی سلطانہ کہنے لگی۔ ”میں تو تمہارے جانے کے فوراً بعد خدا کے حضور سجدے میں گر کر اس سے تمہاری حفاظت کی بھیک مانگوں گی۔ خدا میرے گناہ بھی بخش دے۔ شہزادے شیروان سے شادی کرنے اور اسلام قبول کرنے سے پہلے میں بتوں کو خدا سمجھ کر ان کی پوجا کرتی رہی ہوں جو بہت بڑا گناہ تھا۔ شاید مجھے میرے اسی گناہ کی سزا مل رہی ہے۔“

روہنی کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اتنی دیر سے ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے مجھے بھی اس سے ایک قسم کا تعلق

خاطر پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور کہا۔ ”سلطانہ! اگر انسان سچے دل سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دیتا ہے۔ مجھ سے اور تم سے نادانی اور ناتجہبی میں جو برے عمل ہوئے ہیں ہم نے ان سے توبہ کر لی ہے اور آئندہ سے ایسے برے عمل نہ کرنے کا دل سے فیصلہ کر لیا ہے اس لئے سمجھ لو کہ خدا نے ہمیں معاف کر دیا ہے۔ باقی ہمارے برے عمل کی وجہ سے جو نتیجہ ہمارے سامنے آ گیا ہے اسے تو ہمیں بھگتنا ہی ہو گا۔ مگر یقین کرو اللہ میاں اس آزمائش سے بھی ہمیں خیریت سے نکال دے گا۔“

میری باتوں سے روہنی یعنی سلطانہ کو بڑا حوصلہ ہوا۔ کہنے لگی۔ ”شیروان! پہلے کبھی تم نے مجھ سے اتنی اچھی باتیں نہیں کی تھیں۔ تمہاری باتوں نے مجھے بڑا حوصلہ دیا ہے۔“

ہم غار میں ایک دوسرے کے پاس بیٹھے ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں دور سے بدروحوں کے شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ روہنی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے سیاہ چاند نکل آیا ہے اور بدروحوں کا جشن شروع ہو گیا ہے۔“

میرا دل چاہتا تھا کہ میں غار سے نکل کر آسمان پر دیکھوں کہ سیاہ چاند کیسا ہوتا ہے مگر مالینی نے ہمیں غار سے باہر قدم رکھنے کو سختی سے منع کیا ہوا تھا۔ بدروحوں کے شور و غل کی آوازیں دور سے آرہی تھیں۔ ان کی آوازیں چیخ و پکار کی بھیانک آوازیں تھیں۔ بدروحوں کے تو قہقہے بھی بھیانک ہوتے ہیں۔

آدھی رات کے بعد بدروح مالینی غار میں آ گئی۔ آتے ہی مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”میرا خیال تھا کہ کالی سردارنی سوم رس میں مدہوش ہو کر اپنے غار میں چلی جائے گی مگر آدھی رات گزرنے کے بعد بھی وہ ابھی تک جشن میں دوسری بدروحوں کے ساتھ سوم رس پی رہی ہے۔ میں تمہیں صرف یہی بتانے کے لئے آئی تھی۔“

پھر اس نے روہنی سے کہا۔ ”روہنی! تم اپنے شہزادے کی فکر نہ کرنا۔ آج کالی سردارنی بہت سوم رس پی رہی ہے۔ جب وہ غار میں جائے گی تو اسے کوئی ہوش نہیں ہوگا اور شیروان کا کام آسان ہو جائے گا۔ میں جاتی ہوں اور جس وقت کالی سردارنی اپنے غار میں چلی گئی تو اس وقت آؤں گی۔“

مالینی چلی گئی۔

میں اور روہنی سلطانہ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میری نیند بالکل اڑ چکی تھی۔ ان حالات میں نیند کیسے آسکتی تھی۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ بدروحوں کے شور و غل کی آوازیں آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگی تھیں۔ پھر بالکل خاموشی چھا گئی۔ اب ہمیں مالینی کا انتظار تھا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ مالینی آگئی۔

کہنے لگی۔ ”خونخوار کالی نے آج بہت پی ہے۔ شیروان! تمہارا کام آسان ہو گیا ہے۔“

روہنی سلطانہ نے پوچھا۔ ”کیا وہ اپنے غار میں چلی گئی ہے؟“

مالینی نے کہا۔ ”اسے گئے ایک گھنٹہ ہو گیا ہے۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ ذرا اور انتظار کر لیا جائے تاکہ کالی بدروح نشے میں پوری طرح بے سدھ ہو جائے۔“

جب غار میں بیٹھے بیٹھے مزید ایک گھنٹہ گزر گیا تو مالینی نے مجھے کہا۔ ”شیروان! تیار ہو جاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”میں تیار ہی ہوں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ چگادڑ کی شکل اختیار کرنے کے بعد میں انسانوں کی طرح سوچوں گا یا میری سوچ بھی چگادڑ کی طرح ہو جائے گی؟“

مالینی کہنے لگی۔ ”میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ چگادڑ بننے کے بعد بھی تمہارا انسانی دماغ اسی طرح کام کرتا رہے گا۔ چگادڑ کے روپ کا تمہارے دماغ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ تم اسی طرح سوچو گے جس طرح اب سوچ رہے ہو۔ اس طرح محسوس کرو گے جس طرح اب محسوس کر رہے ہو۔ صرف اتنا فرق پڑے گا کہ

تمہارے جسم کا وزن بہت ہلکا ہو جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”میرے جسم کا وزن اس وقت بھی جبکہ میں غائب ہوں بہت ہلکا ہے۔“

مالینی بولی۔ ”بس چگادڑ کے روپ بدلنے کے بعد تم بالکل ایسے ہی محسوس کرو گے۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میرے سامنے چبوترے پر آکر بیٹھ جاؤ۔“

میں نے روہنی سلطانہ کی طرف دیکھا۔ روہنی سلطانہ کی آنکھوں میں اس وقت محبت کے جذبات جھلک رہے تھے۔ اس نے میرا غیبی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا کیونکہ روہنی اور مالینی مجھے غیبی حالت میں بھی دیکھ رہی تھیں۔ مالینی نے مجھے ایک بار پھر کہا۔ ”تمہیں کالی بدروح کا غار یاد ہے نا؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے روہنی نے یہاں آتے وقت دور سے دکھایا تھا۔“

پھر میں نے مالینی کو کالی بدروح کے غار کا نقشہ بتایا تو مالینی نے کہا۔ ”تم نے بالکل صحیح نقشہ بتایا ہے۔ بس وہی خونخوار کالی کا غار ہے۔ ویسے بھی جب تم چگادڑ بن کر جاؤ گے تو تمہیں ایک غار میں سے دوسرے چگادڑوں کی بو آئے گی۔ جس غار میں سے چگادڑوں کی بو آئے سمجھ لینا کہ وہی خونخوار کالی کا غار ہے کیونکہ صرف کالی کے غار میں چگادڑوں کا بوسہ اور وہ کسی غار میں نہیں جاتے۔ اب اپنی آنکھیں بند کر لو۔“

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مالینی نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ خدا جانے وہ دل میں کیا پڑھ رہی تھی۔ میری آنکھیں اگرچہ بند تھیں مگر مجھے اس کی دھیمی دھیمی بڑبڑانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد مالینی نے اونچی آواز میں وہ منتر پڑھا جو اس نے مجھے پہلے ہی یاد کرایا تھا۔ یہ چار لفظوں کا منتر تھا۔ لمبے لمبے چار لفظ تھے جو چڑیلوں کی زبان کے الفاظ لگتے تھے۔ جیسے ہی اس نے منتر ختم کیا اور میرا ہاتھ چھوڑ دیا مجھے ایک خفیف سا جھٹکا لگا اور میں چبوترے سے فضا میں بلند ہو گیا۔ اب میں نے دیکھا کہ میں انسان سے چگادڑ بن چکا ہوں۔ میرے چھتر یوں ایسے

چھوٹے چھوٹے پر تھے اور میں غار کے اندر چکر لگا رہا تھا۔

روہنی حیرت زدہ سی ہو کر مجھے غار میں ادھر ادھر اڑتے دیکھ رہی تھی۔ مالینی نے بلند آواز میں کہا۔ ”شیروان! اس وقت تمہاری انگلی میں روہنی کی دی ہوئی انگوٹھی نہیں ہے لیکن یاد رکھو اس کا سارا اثر اور اس کی ساری طاقت تمہارے جسم میں موجود ہے جو تمہیں خونخوار کالی کے آسیب سے محفوظ رکھے گی۔ اب جاؤ۔ تم جانے ہو تمہیں کیا کرنا ہے۔“

روہنی سلطانہ نے ہاتھ ہلا کر مجھے الوداع کیا۔ میں چمگادڑ کے روپ میں غوطہ لگا کر غار سے باہر آگیا۔

O

رات تاریک تھی۔ ہر طرف آہنی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ غار سے باہر آتے ہی میں اڑان بھر کر اوپر کواٹھ گیا۔ میری نگاہ آسمان پر پڑی۔ آسمان کے مشرقی افق پر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک گول سیاہ چاند آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔ وہ بالکل سیاہ تھا اور اس کے کناروں پر سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ انسانوں کی دنیا میں ایسا عام طور پر چاند گرہن کے وقت ہوتا ہے۔ مالینی نے ٹھیک کہا تھا میرا جسم اگرچہ چمگادڑ کا تھا مگر میرا دماغ میرا اپنا تھا اور میں چمگادڑ کی طرح نہیں بلکہ انسانوں کی طرح سوچ رہا تھا۔

اتنا فرق ضرور پڑا تھا کہ میری سماعت کی حس زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ میں اس طرف آگیا جہاں مجھے روہنی نے خونخوار کالی سردارنی کا غار دکھایا تھا۔ غار کے باہر دونوں طرف دو مشعلیں روشن تھیں۔ چار بدروح باڈی گارڈ ہاتھوں میں ننگی تلواریں لئے پہرہ دے رہے تھے۔ یہ کالے سیاہ حبشیوں کی طرح کی بدروحیں تھیں اور ان کی آنکھیں لال انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ چمگادڑوں کے بارے میں یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ وہ سارا دن درختوں کی شاخوں میں الٹی لٹکی رہتی ہیں اور رات کو اپنے شکار کی تلاش میں نکلتی ہیں کیونکہ انہیں دن کی روشنی میں کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ رات کے اندھیرے میں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ وہ رات کے وقت گھروں کے باہر بندھی ہوئی گائے بھینسوں یا گھوڑوں وغیرہ کی گردن سے چمٹ کر ان کے ٹون سے اپنا پیٹ بھرتی ہیں۔ جب وہ رات کو ہوا میں پرواز کرتی ہیں تو وہ انسانی آنکھ کو

دکھائی نہیں دیتیں۔ ان کی رفتار بڑی تیز ہوتی ہے اور وہ پلک جھپکنے میں اڑان بھر کر ادھر سے ادھر نکل جاتی ہیں۔

میں نے یہ دیکھنے کے لئے کہ پہرے دار بدروحوں کو دکھائی دیتا ہوں یا نہیں غار کے باہر فضا میں بڑی تیزی سے دو تین غوطے لگائے تو میں نے دیکھا کہ دو بدروحوں نے اوپر نگاہیں اٹھائیں اور پھر خاموشی سے پہرہ دینے لگیں۔ انہوں نے مجھے بھی کالی بدروح کے غار کی چگادڑ سمجھا جو اپنا پیٹ بھرنے جا رہی تھی یا پیٹ بھر کر غار کی طرف واپس آگئی تھی۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ بدروحیں میرے وجود سے بے نیاز ہیں تو میں نے غوطہ لگایا اور ایک زنانے کے ساتھ کالی بدروح کے غار میں گھس گیا۔

غار میں پہلے تو اندھیرا ہی اندھیرا تھا پھر دیکھا کہ آگے جا کر ایک چوہہ تھا جس پر تخت بچھا تھا اس تخت پر ایک ڈراؤنی شکل والی بدروح بے سدھ پڑی تھی۔ یہ خونخوار کالی بدروح ہی ہو سکتی تھی۔ اس کی تصدیق یوں ہوئی کہ تخت کے سرہانے کی جانب جلتی ہوئی مشعل کی روشنی میں مجھے اس ڈراؤنی شکل والی سیاہ فام بدروح کے گلے میں ہڈیوں کی مالا میں نظر آگئیں۔ اس خیال سے کہ میرے بار بار پرواز کرنے سے خونخوار کالی کی آنکھ نہ کھل جائے میں دیوار کے ساتھ چٹ گیا اور چگادڑوں والا چھوٹا سا سر گھما کر کالی بدروح کو دیکھنے لگا۔ خونخوار کالی بھینس کی طرح سانس لے رہی تھی۔ اس کے سانس کی ناگوار بو غار میں پھیلی ہوئی تھی۔ سانس لینے سے خونخوار کالی کا بھدا پیٹ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میری نظریں اس کی گردن کی مالاؤں پر جمی ہوئی تھیں۔

میں نے دیوار کے ساتھ چپے ہوئے اپنے آپ کو چھوڑ دیا اور نیچے زمین پر آکر چگادڑوں کی طرح پر پھیلا کر بیٹھ گیا۔ میں بھی چگادڑوں کی طرح ہانپ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ چگادڑ کو بڑی جلدی سانس چڑھ جاتا ہے۔ پھر میں اچھل کر خونخوار کالی بدروح کے تخت پر جا بیٹھا اور غور سے اسے سوتے میں دیکھنے لگا۔ یہ چڑیل واقعی بے سدھ

کر پڑی تھی اور اسے کوئی ہوش نہیں تھا۔ اب مجھے وہاں اپنے اصلی انسانی روپ میں ظاہر ہو کر کالی کی مالا سے انسانی ہڈی کا کوئی مہرہ نکالنا تھا۔ خونخوار کالی کے گلے میں ہڈیوں کی چھ سات مالا میں تھیں۔ میں نے غار کے دھانے کی طرف دیکھا۔ اس طرف کوئی نہیں تھا۔ پہرے دار روحمیں باہر ہی پہرہ دے رہی تھیں۔

میں نے مالینی کا بتایا ہوا منتر دل میں پڑھا اور اس کے فوراً بعد مجھے جیسے ایک دھچکا سا لگا اور دوسرے لمحے میں خونخوار کالی کے تخت پر اس کے بالکل قریب اپنی انسانی شکل میں ظاہر ہو گیا۔ میں انسانی شکل میں آتے ہی بالکل سمٹ کر جتنا نیچے ہو سکتا تھا ہو گیا۔ مشعل کی روشنی ہڈیوں کی مالاؤں پر پڑ رہی تھی۔ ایک جگہ ہڈیوں کی ایک مالا کے مہرے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ میں جھٹکے سے مہرے توڑتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ کہیں کالی بدروح کو ہوش نہ آجائے۔ مجھے کسی ایسے مہرے کی تلاش تھی جو ذرا سی کوشش کے بعد میرے ہاتھ میں آجائے۔

جہاں سے چھ سات ہڈیوں کے مہرے باہر کو نکلے ہوئے تھے میں نے ان کی طرف اپنا ہاتھ پڑھایا۔ اس وقت مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ایک ہزار وولٹ کی بجلی کی نیکی تار کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھ کی انگلیاں دو تین بار کانپی تھیں مگر میں نے ہمت سے کام لیا اور خدا کا نام لے کر اپنی انگلیوں سے خونخوار کالی کی گردن کی مالاؤں کو اس جگہ سے چھوا جہاں سے کچھ ہڈیوں کے مہرے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ ایک مہرہ میری انگلیوں کی گرفت میں آگیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اسے آہستہ سے اپنی طرف کھینچا۔ وہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔ میں نے مہرے پر اپنی گرفت کو مزید مضبوط کرتے ہوئے انگوٹھے سے اسے ذرا زور سے دبایا تو مہرہ مالا سے الگ ہو کر میرے ہاتھ میں آگیا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی جو مجھے نصیب ہوئی تھی۔

کالی بدروح کا مہرہ ہاتھ میں دبائے میں ایک دو سیکنڈ کے لئے وہیں پتھر کا بت بنا

رہا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کہیں خونخوار کالی کو پتہ تو نہیں چل گیا۔ لیکن اسے کوئی ہوش نہیں تھا۔ وہ سوم رس میں دھت ہو کر بے ہوش پڑی تھی۔ قدرت میری مدد کر رہی تھی۔ اب وہاں ایک سینکڑ بھی رکنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ میں نے دل میں مالینی کا بتایا ہوا منتر دوبارہ پڑھا اور اسی لمحے میں اپنی انسانی شکل کو چھوڑ کر ایک بار پھر چگاڈ بن گیا۔ چگاڈ بنتے ہی میں نے محسوس کیا کہ خونخوار کالی کا مہرہ میرے ایک ہاتھ کے چھوٹے سے پنجے میں تھا۔ میں فوراً اڑان بھر کر اوپر کواٹھا اور غوطہ لگا کر تیزی سے غار میں سے باہر نکل گیا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میں موت کے منہ سے زندہ سلامت ہی نہیں بلکہ اپنا مقصد حاصل کر کے نکل آیا ہوں۔

غار سے نکلنے کے فوراً بعد میں اوپر کی طرف بلند ہو گیا اور کافی اوپر جا کر میں اس ٹیلے کے عقب میں اترنے لگا جہاں روہنی اور مالینی بے چینی سے میری راہ دیکھ رہی تھیں۔ جب میں مالینی بدروح کے غار میں چگاڈ کے روپ میں غوطہ لگا کر داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ روہنی اور مالینی کے چہروں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی اور وہ نگاہیں اوپر اٹھائے مجھے غار میں چکر لگاتے دیکھ رہی تھیں۔ میں مٹی کے اس چبوترے پر اتر گیا جہاں سے مجھے مالینی نے چگاڈ بنا کر اس خطرناک مہم پر روانہ کیا تھا۔ چبوترے پر بیٹھنے کے فوراً بعد میں نے خفیہ منتر پڑھا اور اپنی انسانی شکل میں ظاہر ہو گیا۔

مالینی اور روہنی جلدی سے میرے پاس آگئیں۔ روہنی کو تو میرے زندہ واپس آ جانے کی بے حد خوشی ہوئی تھی۔ مالینی نے مجھ سے پوچھا۔ ”جس کام کے لئے تم گئے تھے کیا وہ ہو گیا؟“

میں نے اپنی بند مٹھی کھول کر اس کے آگے کر دی۔ میری مٹھی میں کالی بدروح کی مالا کی ہڈیوں کا مہرہ تھا۔ مالینی نے اسے اٹھا کر غور سے دیکھا۔ پھر سو گھا اور بولی۔ ”شیروان! یہ کالی سردارنی کی مالا کا مہرہ ہی ہے۔ تم نے وہ کام کر دکھایا ہے جس کی مجھے بہت کم امید تھی بلکہ مجھے تو تمہاری جان کی بھی فکر لگ گئی تھی۔“

روہنی نے آگے بڑھ کر میری پیشانی کو چوم لیا اور کہنے لگی۔ ”خدا نے میری دعائیں قبول کر لیں۔“

پھر اس نے مالینی سے کہا۔ ”مالینی بہن! اب ہم جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے واپس انسانوں کی دنیا میں جانا چاہتے ہیں۔ ہمیں اجازت دو کیونکہ اگر کالی بدروح کو ہوش آگیا تو ممکن ہے اسے پتہ چل جائے کہ اس کی مالا میں سے انسانی ہڈیوں کا ایک مہرہ کم ہو گیا ہے اور پھر ہمارے لئے یہاں سے فرار ہونا ناممکن ہو جائے۔“

مالینی کہنے لگی۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ مہرہ تمہارا ہے۔ اب اسے سنبھال کر اپنے پاس رکھنا بلکہ اس کو کسی مضبوط تاری میں پرو کر اپنے بازو سے باندھ لینا اور ہر گز ہر گز کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔“

پھر مالینی نے مجھے بھی ہدایت کرتے ہوئے کہا۔ ”شیروان! روہنی تو ایک روح یا بھٹی ہوئی بدروح ہے۔ تم زندہ انسان ہو۔ تم دوسرے انسانوں سے اکثر ملتے جلتے رہو گے۔ یاد رکھو۔ کالی کے مہرے کا ذکر تم بھی کسی کے آگے نہ کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ راز بتا دینے سے تم دونوں اس سے بھی بھاری مشکل میں پھنس جاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”میں تم سے اور روہنی تم دونوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں خونخوار کالی کے مہرے کا ذکر بھول کر بھی کسی سے نہیں کروں گا۔“

یہ بات میں بتانا بھول گیا ہوں کہ جس وقت مالینی نے مجھے چگاڈ کا روپ دیا تھا تو وہ پہلے مجھے غیبی حالت سے واپس میری انسانی حالت میں لے آئی تھی اور جس وقت میں مہرہ لے کر اس کے پاس آ کر اپنی انسانی شکل میں واپس آیا تھا تو غیبی حالت میں نہیں تھا بلکہ ظاہری حالت میں تھا۔ روہنی نے کالی کا مہرہ لے کر اسے اپنی ساڑھی میں چھپا کر رکھ لیا تھا۔

اس کے بعد روہنی اور مالینی دونوں بدروح سہیلیاں ایک دوسری کے گلے لگ کر ملیں۔ مالینی نے کہا۔ ”روہنی! اپنا خیال رکھنا۔ پجاری رگھو تمہیں اپنے قبضے میں کرنے

کے لئے تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے اور وہ بڑا مکروہ اور طاقتور دشمن ہے۔ اس کے پاس ایسے ایسے ویدک منتر ہیں کہ اگر وہ کسی چٹان پر پھونک دے تو چٹان دو ٹکڑے ہو جائے۔“

روہنی نے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو مالینی! مجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے۔ میں اس کے ہر وار کا ڈٹ کا مقابلہ کروں گی اور پھر ایک دن اس شیطان کی مکروہ بدروح کو اگنی کی چتا میں جلا کر بھسم کر دوں گی اور اپنے آپ کو اور شہزادے شیروان کو اور دنیا کے سارے انسانوں کو پجاری رگھو کے چنگل سے ملک (آزاد) کرادوں گی۔“

مالینی کہنے لگی۔ ”میری پیاری سہیلی! تمہیں اور شیروان کو اب قدم قدم پر چوکس ہو کر رہنا پڑے گا کیونکہ بہت جلد پجاری رگھو کو معلوم ہو جائے گا کہ تم کالی بدروح کی مالا کا مہرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہو۔ پجاری رگھو اس مہرے کی آسبی طاقت کو جانتا ہے۔ وہ ہر قیمت پر تم سے یہ مہرہ چھین لینے کی کوشش کرے گا۔“

روہنی نے اس کے جواب میں کہا۔ ”میں پجاری رگھو کے تمام ہتھکنڈوں کو جانتی ہوں۔ وہ مجھ سے کالی کا مہرہ کیا چھینے گا بلکہ میں خدا کی مدد سے اور اس مہرے کی آسبی شکتی کے ذریعے رگھو کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دوں گی۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔ ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہئے۔“

روہنی نے اتنا کہہ کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا اور مجھے ایک دھچکا لگا اور میں غائب ہو گیا۔ مجھے سوائے اپنے وہاں ہر شے نظر آرہی تھی۔ مالینی بھی نظر آرہی تھی، روہنی بھی نظر آرہی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے روہنی بھی میری نگاہوں سے غائب ہو گئی۔

مالینی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”خدا حافظ سلطانہ!“

بدروح مالینی نے پہلی بار وہاں روہنی کو اس کے مسلمان نام سے پکارا تھا۔ اس کے جواب میں مجھے روہنی کی آواز سنائی دی اس نے کہا۔ ”خدا حافظ! مالینی!“

میرے پاؤں اپنے آپ زمین سے بلند ہو گئے اور ہم مالینی کے غار سے تیرتے ہوئے باہر نیلے کی ڈھلان پر نکل آئے۔ باہر نکلتے ہی روہنی نے مجھے سرگوشی میں کہا۔ ”جب تک میں نہ کہوں زبان سے کوئی لفظ نہ نکالنا۔ بالکل خاموش رہنا۔“

نیلے کی ڈھلان پر آتے ہی ہم فضا میں اوپر کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ جب ہم کافی بلندی پر چلے گئے تو میں نے نیچے دیکھا۔ بدروحوں کی دنیا کے پہاڑ سیاہ دھبوں کی طرح نظر آنے لگے تھے۔ ایک خاص اونچائی پر پہنچنے کے بعد روہنی سلطانہ نے مجھے ساتھ لئے ہوئے دائیں جانب ایک غوطہ لگایا اور ہم تیزی سے اڑنے لگے۔ ایک مقام پر آکر ہمیں سیاہ دھوئیں کے مرغولوں نے گھیرے میں لے لیا۔ یہاں روہنی نے رفتار اور زیادہ تیز کر لی اور ہم سیاہ دھوئیں کے مرغولوں میں سے تیر کی طرح نکل گئے۔ آگے کھلی فضا تھی اور کسی قدر روشن بھی تھی۔ روہنی سلطانہ کی آواز آئی۔ ”شیروان! میں انتہائی رفتار سے پرواز کرنے والی ہوں۔“

میں نے ایک لمحے کے لئے اپنا سانس روک لیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ جب آتی دفعہ روہنی نے انتہائی رفتار سے پرواز شروع کی تھی تو مجھے کچھ اس قسم کا احساس ہوا تھا جیسے کسی نے مجھے اچانک اوپر کھینچ لیا ہو۔ ایک سیکنڈ بعد مجھے بالکل ویسا ہی احساس ہوا اور اس کے بعد مجھے نیچے زمین نظر آنا بند ہو گئی۔ ایک سنسناہٹ کی سی آواز میرے کانوں میں مسلسل گونج رہی تھی اور مجھے اپنے چاروں طرف اور اوپر نیچے ایک گہرے سنائے کا احساس ہو رہا تھا۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ خلا تھا یا دنیا کی فضا تھی یا کون سا خلائی زون تھا جس میں سے روہنی ایک ایسی رفتار کے ساتھ مجھے اپنے ساتھ اڑائے لئے جارہی تھی جس کا اندازہ لگانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ کسی وقت مجھے لگتا کہ ہم خلا میں کسی جگہ معلق ہو کر رہ گئے ہیں۔ پھر اچانک مجھے گرمی کا احساس ہوا۔ کچھ دیر بعد گرمی ختم ہو گئی اور سردی شروع ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد سردی بھی ختم ہو گئی اور پھر نہ سردی تھی

اور نہ گرمی تھی۔ اچانک دور سے بادل کا ایک سیاہ ٹکڑا تیزی سے آتا ہوا ہمارے قریب سے ہو کر پیچھے نکل گیا۔ اس کی وجہ سے مجھے احساس ہوا کہ ہم کس قدر زیادہ رفتار سے پرواز کر رہے ہیں۔ بادل بہت بڑا تھا مگر وہ میرے پلک جھپکنے سے بھی پہلے ہمارے قریب سے نکل گیا۔

میں حیران ہو رہا تھا کہ اگر ہم زمین کے گرد غلاف کی طرح لپٹی فضا میں سے گزر رہے ہیں تو فضا میں بکھرے ہوئے کروڑوں ذرات کی رگڑ سے ہم آگ میں جل کر بھسم کیوں نہیں ہو جاتے جس طرح کہ آسمان سے گرے ہوئے شہاب ثاقب زمین کی فضا میں داخل ہوتے ہی فضا کے ذرات کی رگڑ سے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم خلا میں سے گزر رہے تھے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم نہ صرف زندہ تھے بلکہ سانس بھی لے رہے تھے۔ خلا میں تو آکسیجن بالکل ہی نہیں ہوتی اور کوئی انسان خلائی لباس کے بغیر خلا میں سفر نہیں کر سکتا اور پھر خلا میں آکسیجن نہ ہونے کے علاوہ اتنی سردی ہوتی ہے کہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کی رخ بستہ سردی کو ایک ساتھ ملا کر اس کی شدت کو ایک لاکھ گنا زیادہ کر دیا جائے تو بھی وہ خلا کی سردی کے مقابلے میں گرمی ہی ہوگی سردی نہیں ہوگی۔ نہ صرف یہ کہ مجھے سردی نہیں لگ رہی تھی اور دم بھی نہیں گھٹ رہا تھا بلکہ میں اتنے آرام سکون سے کھڑا تھا جیسے کسی لفٹ میں کھڑا ہوں۔ اچانک ہلکی خوشگوار ہوا مجھے چھو کر گزرنے لگی۔ میں نے روہنی کی طرف دیکھا۔ اب وہ غائب نہیں تھی بلکہ نظر آنے لگی تھی۔ کہنے لگی۔ ”ہم اپنی منزل پر پہنچنے والے ہیں۔“

میں نے نیچے دیکھا۔ سفید بادلوں کے ٹکڑے بڑی تیزی سے ہماری طرف آرہے تھے۔ ان کے نیچے کسی شہر کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ ہر طرف سنہری روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

روہنی کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”شیروان! انسانوں کی دنیا کتنی خوب

صورت ہے۔“

”ہاں! میں دیکھ رہی ہوں۔ مجھے انسانوں کی دنیا اور انسانوں سے بڑی محبت ہے لیکن کچھ لوگ دنیا کی خوبصورتی اور یہاں رہنے والے معصوم انسانوں کی خوشیاں برباد کرنا چاہتے ہیں۔ میں انسانیت کے دشمن ایسے لوگوں کو ختم کرنے کا عہد کر چکی ہوں۔“

”میں دنیا اور انسانوں کی بھلائی کی اس مہم میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ میں نے بڑے جذباتی انداز میں سلطانہ سے کہا۔

وہ بولی۔ ”تمہاری زبان سے یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ اسی لئے میں تم سے پیار کرتی ہوں۔“

روہنی سلطانہ کے منہ سے نکلے ہوئے محبت بھرے الفاظ سن کر مجھے حیرانی بھی ہوئی اور خوشی بھی بہت ہوئی۔ اس نے پہلی بار مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ مجھے اس لئے بھی خوشی ہوئی کہ وہ جانتی تھی کہ میں اس کا مرحوم خاوند یا محبوب نہیں ہوں جس نے دنیا میں دوسرا جنم لیا ہے۔ وہ مجھے بتا چکی تھی کہ میں اس کے مرحوم شوہر شیروان کا ہم شکل ہوں، اس کا دوسرا جنم نہیں ہوں۔ اگرچہ میری شکل میں اسے اپنا مرحوم محبوب یاد آ جاتا تھا اس کے باوجود اس نے میری ایک الگ شخصیت کا اعتراف کیا تھا اور میری اسی الگ شخصیت سے محبت کرنے لگی تھی۔

کسی شہر کی پہاڑیاں، جنگل اور کھیت ہمیں نیچے صاف نظر آنے لگے تھے۔ میں نے ابھی تک اس جگہ کو نہیں پہچانا تھا۔ پھر مجھے ایک دیو ہیکل قلعے کی تفصیل دکھائی دی۔

میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”سلطانہ! یہ کون سا شہر ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ہم جہاں سے چلے تھے اسی جگہ واپس آگئے ہیں یہ جھانسی کا شہر ہے اور جو قلعہ تم دیکھ رہے ہو یہ میرے محل کا کھنڈر ہے۔“

ہم دیران محل کے کھنڈر کی چھت پر اتر گئے۔ چھت پر قدم رکھتے ہی ہم دونوں

غیبی حالت سے اپنی اپنی انسانی شکل میں واپس آ گئے۔ اس وقت جھانسی شہر میں صبح ہو رہی تھی۔ محل کے نیم تاریک زینے میں سے اتر کر ہم محل کے بالکونی والے کمرے میں آ کر سنگ مرمر کے چوترے پر بنی ہوئی بارہ دری میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے روہنی سلطانہ سے کہا۔ ”تمہاری سہیلی مایلی اگر ہماری مدد نہ کرتی تو ہم خونخوار کالی کا مہرہ حاصل کرنے میں شاید کبھی کامیاب نہ ہوتے۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”ہماری مدد ہمارے خدا نے کی ہے۔ مایلی میری سہیلی ایک ذریعہ تھی۔“

میں نے کہا۔ ”تمہارے خیال میں اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ کیا اس محل کے کھنڈر میں چھپ کر اپنے دشمن پجاری رگھو کا انتظار کریں کہ وہ اپنے حبشی غلاموں کی بد روحوں کے ذریعے ہمارے خلاف کیا کارروائی کرتا ہے۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”اس سے پہلے کہ دشمن ہم پر وار کرے ہمیں اس پر وار کر دینا چاہئے۔ دشمن کو اپنی طاقت جمع کرنے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔“

میں نے اُسے کہا۔ ”لیکن ہمیں تو معلوم ہی نہیں کہ ہمارا دشمن ہمارے خلاف کہاں گھاٹ لگا کر بیٹھا ہوا ہے۔ ہم کیسے اُس پر وار کر سکتے ہیں۔ کیا تم اپنی طلسمی طاقت سے یہ پتہ نہیں کر سکتیں کہ ہمارا دشمن پجاری رگھو اس وقت کہاں ہو گا اور وہ تمہیں اپنے قبضے میں کرنے اور مجھے ہلاک کرنے کے لئے کیا منصوبہ بندی کر رہا ہے؟“

روہنی کہنے لگی۔ ”پجاری رگھو بڑی زبردست طلسمی قوت کا مالک ہے۔ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن اس کے وار کو ناکام ضرور بنا سکتی ہوں اور اس پر چھپ کر یا گھاٹ لگا کر وار بھی کر سکتی ہوں۔ میں اس کے سامنے نہیں جاسکتی۔ اگر میں اس کے سامنے آگئی تو پھر میں اپنا آپ نہیں بچا سکوں گی۔ یوں مجھے اس بے دوزخنی جنگ کرنی ہوگی۔ اس سے اپنا آپ بچانا بھی ہو گا اور اس پر وار بھی کرنا ہو گا۔ ہماری یہ جنگ پستول، بندوق کی جنگ نہیں ہوگی بلکہ طلسمی منتر کی جنگ ہوگی۔“

میں نے روہنی سے کہا۔ ”میں نے سن رکھا ہے کہ ہر جن بھوت یا چڑیل کی کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوتی ہے۔ اگر انسان کو اس کمزوری کا پتہ چل جائے تو وہ چڑیل یا بھوت انسان کے قبضے میں آ جاتا ہے۔ پجاری رگھو بھی ایک بد روح ہے، ایک بھوت ہے۔ کیا اس کی کوئی ایسی کمزوری نہیں ہے؟“

روہنی کہنے لگی۔ ”ضرور ہوگی۔ قدرت نے ان شیطانی بد روحوں کی ہلاکت کے لئے ان کا کوئی نہ کوئی کمزور پہلو ضرور رکھا ہوتا ہے۔ پجاری رگھو کی بھی کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوگی، اس کا مجھے علم نہیں۔ اس کا ہمیں سراغ لگا ہو گا۔“

”یہ سراغ کیسے لگایا جاسکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

روہنی گہری سوچ میں تھی۔ کہنے لگی۔ ”پجاری رگھو کی کمزوری کا راز مجھے مردہ برہمن لڑکی کی ادھ جلی لاش ہی بتا سکتی ہے۔ ایسی لاش جسے چتا کی آگ پر پوری طرح جلانے بغیر دریائے گنگا کی لہروں کے حوالے کر دیا گیا ہو۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تو بڑی پیچیدہ اور بھول بھلیوں والی بات ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ہر ہندو عورت اور مرد کی لاش کو جب چتا پر رکھ کر آگ لگائی جاتی ہے تو اس کے جسم کو پورے طور پر جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے اور اس کے رشتے دار صبح کے وقت اس کی ہڈیاں وغیرہ برتن میں ڈال کر لے جاتے ہیں۔ کسی برہمن عورت کی ایسی لاش ہمیں شاید کہیں سے بھی نہیں ملے گی جسے آدھا جلا کر دریا میں بہا دیا گیا ہو۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”صرف ایک جگہ سے ہمیں ایسی ادھ جلی لاش مل سکتی ہے وہ جگہ بنارس میں دریائے گنگا کے کنارے پر واقع شمشان ہیں۔ بنارس میں دریائے گنگا کے شمشانوں کو ہندو لوگ بڑا مقدس مانتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر کسی ہندو مردے کو گنگا کے کسی گھاٹ کے شمشان میں جلایا جائے تو اس کی آتما سیدھی سورگ میں چلی جاتی ہے اور اسے آداگون کے چکر سے نجات مل جاتی ہے۔ چنانچہ لوگ یہی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا اگر کوئی مر جائے تو وہ اس کی لاش گنگا کے گھاٹ پر نذر آتش

کریں۔ اس وجہ سے بنارس کے دریا کنارے والے شمشانوں میں ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ وہاں مردہ لاشوں کی قطار لگی رہتی ہے۔ بنارس اور دوسرے قریبی شہروں سے بھی لوگ اپنے مردوں کو وہاں جلانے کے لئے لاتے ہیں۔ مردے جلانے والوں کو سارا دن سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ اتنے رش میں کسی مردے کے پوری طرح سے جل کر راکھ ہونے کا انتظار نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ اپنے مردے گھاٹ پر لاشیں جلانے والوں کے حوالے کر کے انہیں پیسے دے کر چلے جاتے ہیں۔ وہ چھ چھ سات سات گھنٹے انتظار نہیں کر سکتے۔ ایسے مردوں کے ساتھ لاشیں جلانے والے یہ سلوک کرتے ہیں کہ انہیں جلدی جلدی تھوڑا بہت جلا کر ادھ جلی لاش کو دریائے گنگا میں بہا دیتے ہیں۔ ان آدھ جلی لاشوں کو مچھلیاں کھا جاتی ہیں۔ بعض لاشیں تیرتی ہوئی دور نکل جاتی ہیں۔ ہمیں صرف دریائے گنگا کے گھاٹ پر سے ہی کسی برہمن ہندو عورت کی آدھ جلی لاش مل سکتی ہے۔“

میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ کسی آدھ جلی لاش پر تم نے چلے کیا تو وہ تمہیں پجاری رگھو کی کمزوری بتا سکے گی؟“

روہنی بدروح نے کہا۔ ”یہ میں جانتی ہوں کہ اگر میرا چلہ پورا ہو گیا اور چلے کاٹنے کے دوران پجاری رگھو کو پیٹ نہ چل گیا تو عورت کی آدھ جلی لاش بول پڑے گی اور مجھے بتا دے گی کہ پجاری رگھو کی کمزوری کیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں سب سے پہلے یہی کرنا چاہئے۔ کیونکہ دشمن کی اگر کوئی کمزوری ہاتھ آجائے تو اسے آسانی سے شکست دی جاسکتی ہے۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”اس کے لئے ہمیں آج ہی بنارس جانا ہو گا اور وہاں شمشان گھاٹ پر کسی برہمن عورت کی آدھ جلی لاش کو تلاش کرنا ہو گا۔“

”اور اگر ہمیں پوری لاش نہ مل سکی تو کیا کریں گے؟“ میں نے پوچھا۔

روہنی نے کہا۔ ”پوری لاش کی مجھے ضرورت بھی نہیں ہے۔ مجھے صرف ادھ

جلی لاش کا سر چاہئے۔ مجھے ادھ جلی سر پر منتر پڑھ کر چلہ کاٹنا ہو گا۔“

میں نے کہا۔ ”بنارس یہاں سے کتنی دور ہو گا؟“

روہنی نے جواب دیا۔ ”فاصلہ میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہمیں دیر نہیں

کرنی چاہئے اور اسی وقت بنارس روانہ ہو جانا چاہئے۔“

میں نے کہا۔ ”بدروحوں کی دنیا میں تو مجھے بھوک کا احساس تک نہیں ہوا۔ شاید

اس لئے کہ وہاں میں تمہارے ساتھ غیبی حالت میں تھا مگر اب زندہ حالت میں

ہوں۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ سب سے پہلے تو میں کسی ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا

کھاؤں گا۔ اس کے بعد ہی میں تمہارے ساتھ بنارس جاسکوں گا۔“

روہنی مسکرانے لگی اور کہا۔ ”تم زندہ انسانوں کا سب سے بڑا مسئلہ بھوک کا مسئلہ

ہے۔ اسی نے دنیا میں سارا فساد ڈالا ہوا ہے۔ میرا یہ مسئلہ مرنے کے بعد اپنے آپ

حل ہو گیا ہے۔ مجھے نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس لگتی ہے۔ چلو کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”مگر جھانسی شہر کے کسی ہوٹل میں نہیں جائیں گے۔ یہاں تم

پولیس والوں کو ان کی گاڑی سمیت بھسم کر چکی ہو۔ کسی پولیس کا ٹیبیل نے ہمیں دیکھ

لیا تو خواہ مخواہ ہمارا وقت ضائع ہو گا۔ کسی دوسرے شہر میں چلتے ہیں۔“

روہنی بولی۔ ”ہم انڈیا کی راجدھانی دلی سے ہوتے ہوئے بنارس جائیں گے۔ دلی

میں مسلمانوں کے بڑے ہوٹل ہیں وہاں تمہیں اپنی مرضی کا کھانا مل جائے گا۔ کیا تم

تیار ہو؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے تیار رہنا ہی پڑتا ہے۔ کیا کروں اب یہ میری مجبوری بن گئی

ہے۔“

روہنی نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگی۔ ”میرے شیردان! یہ میری بھی

مجبوری ہے۔ یہ میری نجات اور تمہاری زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ میں یہ ہرگز

برداشت نہیں کر سکتی کہ تم شیطان پجاری رگھو کے ہاتھوں ہلاک ہو جاؤ۔ اپنی نجات

کے لئے تو مجھے یہ سب کچھ کرنا ہی پڑ رہا ہے لیکن تمہیں زندہ سلامت دیکھنے کے لئے میں اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہوں۔“

میں نے روہنی سے پوچھا کہ کالی بدروح کا مہرہ اس نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے ناں۔ اس نے کہا۔ ”کالی کا مہرہ میرے بلاؤز کے اندر بالکل محفوظ ہے۔“

میں نے اسے اپنا ہاتھ دکھا کر کہا۔ ”اور تمہاری دی ہوئی انگوٹھی بھی میرے پاس بالکل محفوظ ہے۔“

روہنی نے میری انگلی میں پڑی ہوئی شہزادے کے تابوت کی سیاہ سنگینے والی انگوٹھی پر ایک نگاہ ڈالی اور بولی۔ ”خدا کے حکم سے یہ انگوٹھی تمہاری حفاظت کرے گی۔“

ہم پرانے محل کے ویران کمرے سے نکل کر شکستہ بالکونی میں آگئے۔ روہنی نے منتر پڑھ کر مجھ پر پھونکا۔ میرا جسم فوراً غائب ہو گیا لیکن میں اسے دیکھ رہا تھا۔ دوسرے لمحے روہنی بھی میری نگاہوں سے غائب ہو گئی مگر اس نے میرا ہاتھ اسی طرح پکڑ رکھا تھا۔ اس کے بعد ہم ویران محل کی بالکونی سے پرواز کر گئے۔

ہم اڑان بھرتے ہی کافی بلندی پر چلے گئے تھے۔ روہنی کو معلوم تھا کہ اسے کس طرف جانا ہے۔ ہماری رفتار بہت تیز تھی۔ دور نیچے مجھے جنگل، آبادیاں اور دریا پھیلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر کے بعد روہنی نے کہا۔ ”ہم دلی پہنچنے والے ہیں۔“

چند لمحے گزرے ہوں گے کہ روہنی مجھے لے کر بلندی سے نیچے آنے لگی۔ کالی نیچے آنے کے بعد مجھے بھارت راجدھانی دلی کی بلند عمارتیں، ماڈرن ہائی رائل بلڈنگیں، کشادہ سڑکیں اور ان پر چلتا ٹریفک اور لوگوں کے ہجوم دکھائی دینے لگے۔ میں نے دلی شہر دیکھا ہوا تھا۔ میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”ہم کس جگہ اتریں گے؟“

روہنی نے کہا۔ ”ہم لال قلعے کی عقبی دیوار کے پاس اتریں گے۔ وہاں سے ہمارے

مقدس قریب ہی ہے۔ وہاں مسلمانوں کے بہت ہوٹل ہیں۔“

ہم لال قلعے کے پیچھے ایک چھوٹے سے پارک میں اتر آئے۔ ہم دونوں غیبی حالت میں تھے یعنی ہم سب کو دیکھ رہے تھے مگر کوئی ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ روہنی نے کہا۔ ”کیا خیال ہے۔ ہم اسی طرح غیبی حالت میں ہی کسی ہوٹل میں نہ جائیں؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں نہیں روہنی۔ غیبی حالت میں میری بھوک ختم ہو گئی ہے۔ میں زندہ حالت میں کچھ کھانا پینا چاہتا ہوں۔“

روہنی بولی۔ ”جیسے تمہاری مرضی لیکن احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ہم کسی ایسی جگہ ظاہر ہوں جہاں ہم پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ وہاں آ جاؤ۔“

روہنی نے پارک کے ایک گھنے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ اس درخت کے نیچے کوئی آدمی نہیں تھا۔ وہاں آتے ہی ہم دونوں اپنی شکل میں واپس آگئے۔ زندہ حالت میں ظاہر ہوتے ہی مجھے بھوک اور پیاس لگنے لگی۔ روہنی کا لباس تبدیل ہو گیا تھا۔ پہلے اس نے زعفرانی ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ اب وہ مسلمان عورتوں کے لباس میں تھی اور اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”سلطانہ! یہ دوسرا لباس تمہیں کہاں سے مل گیا؟“

وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ ”غیب کی دنیا میں ہر شے موجود ہوتی ہے۔ بس وہیں سے میں نے یہ لباس حاصل کر لیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”مگر یہ لباس تم نے کس وقت پہنا تھا؟ تم تو میرے ساتھ غیبی حالت میں تھیں اور تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔“

وہ بولی۔ ”یہ ہماری بدروحوں کی دنیا کی باتیں ہیں۔ یہ اتنی آسانی سے تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ بہتر یہی ہے کہ تم ان کے بارے میں کچھ نہ پوچھا کرو کیونکہ ہمیں ایک لمبا سفر اکٹھے طے کرنا ہے اور اس سفر میں تم بہت سی ایسی باتیں دیکھو گے جنہیں دیکھ کر تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“

دلی کی جامع مسجد کا علاقہ مسلمانوں کی اکثریت کا علاقہ ہے اور یہاں کئی مسلمانوں کے ہوٹل اور ریسٹوران ہیں جہاں حلال گوشت پکایا جاتا ہے۔ یہاں اس زمانے میں مسلم ہوٹل کے نام سے ایک ہوٹل بڑا مشہور تھا ہم اس ہوٹل کے ایک کیمین میں بیٹھ گئے۔ ہوٹل کا ملازم لڑکا آگیا۔ میں نے اسے ایک آدمی کا کھانا لانے کے لئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”صاحب! آپ کی بیگم صاحبہ نہیں کھائیں گی؟“

”میں نے کہا۔“ ”نہیں بھائی وہ نہیں کھائیں گی۔ میرے لئے جو پکا ہے لے آؤ۔“
روہنی زیر لب مسکارتی تھی۔ کہنے لگی۔ ”کبھی مجھے بھی بھوک لگا کرتی تھی اور میں بھی اپنے شیردان کے ساتھ محل میں بیٹھ کر کھانا کھایا کرتی تھی۔“
میں نے کہا۔ ”تمہیں کھانوں کی خوشبو تو ضرور آتی ہو گی۔“

اس نے کہا۔ ”بہت زیادہ خوشبو آتی ہے۔ شاید یہی میری سزا ہے کہ مجھے ہر قسم کے کھانوں کی خوشبو آئے گی مگر میں کچھ کھا نہیں سکوں گی۔ اس لئے کہ میں نیک روح نہیں ہوں۔ ایک گناہ گار اور بد روح ہوں۔۔۔۔۔“

اور روہنی سلطانہ دھیمی آواز میں خدا سے اپنے گناہوں کی بخشش کی دعا مانگ رہی تھی۔ مجھے اس پر بڑا رحم آیا اور مجھے عبرت بھی حاصل ہوئی کہ انسان کو جب تک وہ زندہ ہے ہمیشہ نیک عمل کرنے چاہئیں اور گناہوں سے بچنا چاہئے اور اسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ انسان کو اگر اس کے نیک اعمال کی جزا ملتی ہے تو برے اعمال کی سزا بھی ضرور مل کر رہتی ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے جسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔

کھانا کھانے کے بعد جب لڑکا بل لے کر آیا تو میں نے بل روہنی کے آگے کر دیا۔ اس نے اپنی بند مٹھی کھولی تو اس میں سو روپے کا انڈین کرنسی نوٹ تھا۔ بل مجھے روپے کا تھا۔ روہنی نے لڑکے سے کہا۔ ”باقی پیسے تم رکھ لو۔ یہ تمہارا انعام ہے۔“
لڑکا خوش ہو گیا اور سلام بیگم صاحبہ کہہ کر چلا گیا۔

روہنی نے مجھے کہا۔ ”چلو ہم ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔“

ہم ہوٹل سے نکل کر لال قلعے کے پیچھے آگئے۔ وہاں آس پاس کوئی انسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہاں روہنی نے منتر پھونک کر پہلے مجھے غائب کیا پھر خود بھی غائب ہو گئی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور ہم زمین سے بلند ہو کر دلی کے آسمان پر پرواز کرنے لگے۔ ہم ایک بار پھر کافی بلندی پر چلے گئے تھے اور نیچے زمین بھورے رنگ کی نظر آرہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق ہمیں زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ لگے ہوں گے کہ روہنی نے نیچے آتے ہوئے کہا۔ ”شیروان! اس وقت ہم ہندوؤں کے متبرک شہر بنارس کے اوپر ہیں۔“

میں نیچے دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو مجھے نیچے سوائے بھورے رنگ کے دھبوں کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر ایک دم سے شہر کے مکان دکھائی دینے لگے۔ ان کے درمیان ایک سفید لکیر نظر آرہی تھی۔ روہنی نے کہا۔ ”یہ ہندوؤں کا پوتر دریا گنگا ہے۔ یہی ہماری منزل ہے۔“

ہم دریا کنارے ایک شمشان گھاٹ کے پاس اتر آئے۔

روہنی نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ گنگا کنارے سب سے بڑا شمشان گھاٹ تھا۔ دریا کے ساتھ لمبے لمبے چبوترے بنے ہوئے تھے جن پر چھ سات چتائیں جل رہی تھیں۔ ان چتائوں کی آگ میں مردے جلانے جارہے تھے۔ ہر چتا کے قریب مردوں کے بھوپان لمبی لمبی قطاروں کی شکل میں زمین پر پڑے تھے۔ ہم مسلمان جس چارپائی پر میت کو رکھ کر قبرستان لے جاتے ہیں اسے جنازہ کہتے ہیں۔ ہندو بانس کے جس چھاپے پر اپنے مردے کو ڈال کر جلانے کے لئے لے جاتے ہیں اسے بھوپان کہتے ہیں۔ بھوپان بانس کا ایک سٹر پیچڑ ہوتا ہے جس پر مردے کو ڈال کر اوپر کپڑا ڈال دیا جاتا ہے۔ اگر کسی نئی نویلی دلہن کا مردہ ہو تو اس پر گونے والی لال پٹی ڈال دی جاتی ہے۔

میں اور روہنی غیبی حالت میں شمشان گھاٹ پر مردوں کی قطار کے پاس کھڑے تھے۔ ایک بھوپان کے مردے پر سرخ گونے والا دوپٹہ ڈالا ہوا تھا۔ روہنی نے مجھے

سرگوشی میں کہا۔ ”یہ کسی نئی نویلی دلہن کا مردہ ہے۔ مجھے اسی مردے کے ادھ جلے سر کی ضرورت ہے۔“

میں نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔ ”لیکن یہ لاش تو قطار کے سب سے آخر میں ہے۔ اس کی باری کافی دیر بعد آئے گی۔“

روہنی نے کہا۔ ”ہم اس کے جلنے کا انتظار کریں گے۔“

کچھ مرنے والوں کے لواحقین اور رشتے دار بھی وہاں سوگوار حالت میں بیٹھے اپنے مردے کی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ ایسے رشتے دار جو دور پرے کے رشتے دار تھے مردے کو لاشیں جلانے والے کے حوالے کر کے جا چکے تھے۔ ہم کسی کو دکھائی تو دیتے نہیں تھے ہم وہیں کھڑے ہو کر دلہن کے مردے کی باری کا انتظار کرنے لگے۔ یہ شمشان گھاٹ دریا کے کنارے پر تھا وہاں جلانے والے مردوں کی چار قطاریں تھیں۔ ہر قطار میں سات سات آٹھ آٹھ مردوں کے بھوپان زمین پر پڑے تھے۔ ہم جس قطار میں ایک طرف ہٹ کر کھڑے تھے اس کے آخر میں جو چتا جل رہی تھی اس پر دو آدمی کام کر رہے تھے۔ جس مردے کے عزیز واقارب وہاں موجود تھے یہ لاشیں جلانے والے بڑی احتیاط اور ادب احترام کے ساتھ مردے کے جنازے یعنی بھوپان کو اٹھا کر چتا کی آگ پر رکھتے تھے لیکن جس مردے کے بھوپان کے پاس مردے کا کوئی عزیز نہیں ہوتا تھا اس کے بھوپان کو وہ گھسیٹ کر چتا کے اوپر رکھ کر تھوڑا سا دھڑا دھڑا کرتے جیسے بھون رہے ہوں اور مردہ پورا جلتا بھی نہیں تھا کہ وہ ادھ جلے مردے کو دریا میں پھینک دیتے تھے۔

دلہن کے مردے کے پاس صرف تین آدمی بیٹھے تھے۔ جب اس کے جلانے کی باری آئی تو لاشیں جلانے والوں نے دلہن کی لاش کو بھوپان سمیت اٹھایا اور بڑے آرام سے جلتی چتا کے شعلوں پر رکھ دیا۔ دلہن کے اوپر ڈالا ہوا سرخ ریشمی دوپٹہ دیکھتے دیکھتے جل گیا۔ اس کے بعد دلہن کے مردے کا جسم جلنے لگا۔ دلہن کے رشتے

دار جو اس کے ساتھ آئے تھے کچھ دیر وہاں کھڑے چتا کی طرف نکتے رہے پھر خاموشی سے ایک طرف کو چل دیئے۔ لاشیں جلانے والوں نے انہیں جاتے دیکھ کر چتا میں سلاخیں ڈالیں اور دلہن کے ادھ جلے مردے کو نکال کر دریا میں ڈال دیا۔

روہنی نے مجھے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

روہنی ہوا میں کوئی چار فٹ بلند ہو کر دریا کے اس مقام پر آگئی جہاں دلہن کی ادھ جلی لاش کو پھینکا گیا تھا۔ دلہن کی لاش جتا کی بھڑکتی آگ میں اتنی دیر میں ہی کافی جل چکی تھی۔ اس کا جسم سیاہ پڑ چکا تھا اور آدھے سے زیادہ گوشت جھڑ گیا تھا۔ یہ ادھ جلی لاش گڑگاکی لہروں پر تیرتی ہوئی تیزی سے آگے کی طرف چلی جا رہی تھی۔ میں روہنی کے ساتھ ہی تھا۔ دن کا وقت تھا چاروں طرف دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ روہنی میرا ہاتھ پکڑے دلہن کی تیرتی ہوئی لاش کے ساتھ ساتھ آگے جا رہی تھی۔

○

صاف نظر آرہی تھیں۔ پیٹ پھٹ چکا تھا اور اندر کے تمام اعضاء انتڑیاں وغیرہ کو ملے بن چکی تھیں۔

ہم لاش کے پاس بیٹھ گئے۔ روہنی نے دونوں ہاتھوں سے دلہن کی لاش کے ادھ جلمے سر کو پکڑ کر ذرا سے اپنی طرف کھینچا تو اس کا سر دھڑ سے الگ ہو گیا اور صرف کھوپڑی روہنی کے ہاتھ میں رہ گئی۔

روہنی نے دلہن کی باقی ماندہ لاش کو وہیں چھوڑ دیا اور کھوپڑی اٹھا کر اوپر کو بلند ہو گئی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ درختوں کے اوپر جا کر اس نے شہر بنارس کی دائیں جانب رخ کر لیا۔ کہنے لگی۔ ”شیروان! بنارس کے شمال میں گنو گھاٹ کے جنگل میں سوامی جی کی دو سو سال پرانی گھاٹ ہے۔ اس گھاٹ کے اندر سوامی جی کی مڑھی ہے۔ مجھے اس مڑھی کے پاس بیٹھ کر دلہن کی کھوپڑی اپنے سامنے رکھ کر ساری رات منتروں کے جاپ کا چلہ کاٹنا ہو گا۔ رات کے پچھلے پہر دلہن کی کھوپڑی میرے سوالوں کے جواب دینے شروع کر دے گی اور پجاری رگھو کی کمزوری ہم پر ظاہر کر دے گی۔“

اس وقت سورج ڈھلنے لگا تھا۔ گنو گھاٹ کے جنگل میں سوامی جی کی پرانی گھاٹ میں پہنچتے پہنچتے شام کا اندھیرا چھا گیا۔ سوامی کی گھاٹ ایک اجاڑ ویران کھنڈر کی شکل میں ایک تالاب کے کنارے واقع تھی۔ یہ پرانی اینٹوں کی محروطی میناری عمارت تھی جس کی دیواروں کی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھیں۔ دروازے کے دونوں پٹ غائب تھے۔ ہم گھاٹ میں داخل ہو گئے۔ اندر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سیلن کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ روہنی نے کہا۔ ”شیروان! تم اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتے۔ میں دیکھ لیتی ہوں۔ اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو مجھے مڑھی کے سرہانے مٹی کا پرانا چراغ نظر آرہا ہے میں اسے روشن کرتی ہوں۔“

مجھے اندھیرے میں روہنی سائے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک جگہ سے مٹی کا چراغ اٹھایا اور اس کو انگلی سے جھوا۔ چراغ کی نور روشن ہو

میں بھی خاموشی سے اس کے ساتھ جا رہا تھا۔ جب دلہن کی لاش دریا کنارے کافی آگے نکل گئی اور شمشان گھاٹ بہت پیچھے رہ گئے اور دریا کنارے جھاڑیاں اور گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو روہنی نے دریا کی لہروں کے بہاؤ کے ساتھ تیرتی لاش کو جھک کر بازو سے پکڑ کر اٹھایا تو لاش کا بازو اس کے جسم سے الگ ہو گیا۔ روہنی نے دوسرے بازو کو پکڑ کر اٹھایا تو وہ بھی جسم سے الگ ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد ایسا ہوا کہ دریا کے اندر سے ایک بہت بڑی مچھلی منہ پھاڑے نمودار ہوئی اور اس نے دلہن کی لاش کی ایک ٹانگ کو اپنے جڑوں میں دبوچ کر جھٹکا دیا تو لاش کی ایک ٹانگ بھی اس کے جسم سے الگ ہو گئی۔ مچھلی لاش کی ٹانگ منہ میں دبائے دریا میں غوطہ لگا گئی۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”لاش کو دریا سے نکال لو نہیں تو مچھلیاں باقی بچی ہوئی لاش بھی ہڑپ کر جائیں گی۔“

روہنی اسی وقت لاش پر جھک گئی اور دلہن کی لاش کو بالوں سے پکڑ کر پانی سے باہر نکال لیا اور ایک درخت کے نیچے لا کر رکھ دیا۔ عجیب ڈراؤنی لاش تھی۔ صرف ایک ٹانگ، دھڑ اور سر باقی رہ گیا تھا وہ بھی جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔ ایک طرف کے سر کے بال سارے جل چکے تھے۔ ایک طرف کے کچھ بال نداجانے کیسے جلنے سے بچ گئے تھے۔ ناک کا گوشت جل گیا ہوا تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو سیاہ گڑھے باقی رہ گئے تھے۔ دونوں ہونٹ بھی جل چکے تھے اور اوپر نیچے کے دانت سارے کے سارے دکھائی دے رہے تھے۔ گردن آگ میں جل کر پچک کر رہ گئی تھی۔ سینے کی چھ سات پسلیاں

گئی۔ اس نے چراغ مڑھی کے سرہانے اینٹ پر رکھ دیا۔ چراغ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ ایک ٹوٹا پھوٹا اینٹوں کا چبوترہ تھا جس پر چھوٹی سی مخروطی مڑھی بنی ہوئی تھی۔ ہر طرف مکڑیوں کے جالے لٹک رہے تھے۔

روہنی نے دلہن کی ادھ جلی کھوپڑی مڑھی کے آگے ایک اینٹ پر رکھ دی اور میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”مجھے اس کھوپڑی پر منتر پھونک کر چلے کاٹنا ہے۔ مجھے ساری رات لگ جائے گی۔ تم اگر چاہو تو یہاں گھپا کے کونے میں بیٹھ جاؤ۔ اگر چاہو تو باہر کھلی ہو امیں جا کر بیٹھ جاؤ۔ جب رات ڈھلنے لگے تو آ جانا۔“

میں نے کہا۔ ”میں کچھ دیر تمہارے پاس ہی رہوں گا۔ اس کے بعد اگر جی چاہا تو باہر چلا جاؤں گا۔“

روہنی بولی۔ ”جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن جب میں منتر پڑھ کر چلے شروع کروں تو مجھے بالکل نہ بلانا نہیں تو چلے لٹا پڑ جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”میں خاموش رہوں گا۔ لیکن یہ دلہن کی کھوپڑی تم سے کیسے بات کرے گی؟“

روہنی بولی۔ ”میں اس نئی نویلی دلہن کی آتما کو حاضر کروں گی۔ وہ حاضر ہو کر مجھ سے خود ہی بات کرے گی۔“

میں نے کہا۔ ”وہ بھی تو بدروح ہی ہوگی۔ کہیں مجھے چٹ تو نہیں جائے گی؟“

روہنی نے کہا۔ ”میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی کی بدروح پریشان نہیں کر سکتی۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر میں اپنے ارد گرد ایک طلسمی دائرہ کھینچ دیتی ہوں۔“

روہنی نے وہاں پڑی ہوئی ایک لکڑی کا ٹکڑا اٹھایا اور جہاں وہ کھڑی تھی وہاں اپنے ارد گرد ایک دائرہ کھینچ دیا۔ دائرہ کھینچتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ کچھ پڑھتی جا رہی تھی۔ دائرہ کھینچنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ ”میرے چلے کاٹنے کے دوران کوئی بھی بدروح اس دائرے سے نکل کر تمہاری طرف نہیں آسکے گی۔ اب خاموش ہو کر

بیٹھے رہو۔ میں چلے شروع کرنے لگی ہوں۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ روہنی دلہن کی کھوپڑی کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور کسی عجیب و غریب منتر کا پاٹھ کرنا شروع کر دیا۔ دیئے کی روشنی میں وہ مجھے صاف نظر آرہی تھی۔ اس نے منتر پڑھنے شروع کر دیئے۔ منتر پڑھتے پڑھتے تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کھوپڑی پر پھونک مار دیتی تھی۔ کچھ دیر تک تو میں اُسے تکتا رہا پھر مجھ پر غیبی حالت میں بھی ہلکی ہلکی غنودگی طاری ہونے لگی اور میں نیند کی آغوش میں اتر گیا۔ نیند کی حالت میں بھی میرے کانوں کو روہنی کے منتروں کی بھنبھناہٹ سی سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد یہ آواز آنی بھی بند ہو گئی۔ کچھ پتہ نہیں میں کب تک سویا رہا۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب روہنی کے منتر پڑھنے کی آواز کافی بلند ہو چکی تھی۔ اب وہ منتر پڑھتے پڑھتے زمین پر سے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر کھوپڑی پر ڈال دیتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے دیئے کی روشنی میں دیکھا کہ دلہن کی ادھ جلی کھوپڑی نے حرکت کرنی شروع کر دی۔ وہ آہستہ آہستہ تھرکنے لگی تھی۔ کھوپڑی کو حرکت کرتے دیکھ کر روہنی نے زیادہ بلند آواز میں منتروں کا جاپ شروع کر دیا۔

میں دل میں خوف سا محسوس کر رہا تھا کہ خدا جانے اب یہاں کیسی کیسی بدروحیں اترنا شروع ہو جائیں گی اور روہنی کے ساتھ مجھ پر بھی کوئی ناگہانی مصیبت نازل ہو جائے گی۔ کھوپڑی تھرکتے تھرکتے ایک بار ذرا سی اچھلی اور اینٹ پر سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے سیاہ گڑھے اس طرح روشن ہو گئے جیسے اس کے اندر کسی نے بجلی کا بلب روشن کر دیا ہو۔

تب روہنی منتر پڑھتے پڑھتے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی پھر اس نے ذرا اونچی آواز میں دلہن کی کھوپڑی کو سوال کیا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

کھوپڑی میں سے ایک عورت کی آواز آئی۔ ”میرا نام چپا ہے۔“

روہنی نے پوچھا۔ ”کیا تم مجھے دیکھ رہی ہو؟“
 کھوپڑی نے جواب دیا۔ ”ہاں میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔“
 روہنی نے کہا۔ ”میں نے تمہارا چلہ کاٹا ہے۔ جو پوچھوں گی بتاؤ گی؟“
 کھوپڑی نے جواب دیا۔ ”بتاؤں گی۔“

روہنی نے پوچھا۔ ”مجھے بتاؤ پجاری رگھو کی کمزوری کیا ہے؟“
 کھوپڑی کی آنکھوں سے نکلتی روشنی یہ سوال سنتے ہی مدھم پڑ گئی۔ پھر ایک دم تیز ہو گئی۔ کھوپڑی نے کہا۔ ”پجاری رگھو کی کوئی کمزوری نہیں ہے۔ اس کی شکتی کی کوئی اتھاہ نہیں ہے۔ تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکو گی۔ یہ خیال اپنے دل سے نکال دو۔“
 روہنی نے کہا۔ ”تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ میں بھی بدروح ہوں اور بدروح جس بدروح کا چلہ کاٹی ہے اس کا ذمہ ہو جاتا ہے کہ وہ چلہ کاٹنے والی بدروح کی مدد کرے اس لئے میرا مدد کرنا تمہارا فرض بن چکا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ میں پجاری رگھو کی بدروح کو کس طریقے سے شکست دے سکتی ہوں؟“
 کھوپڑی نے کہا۔ ”تم کسی بھی طریقے سے پجاری رگھو کو شکست نہیں دے سکو گی نادان بدروح! اس خیال کو بھول جاؤ ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔“

روہنی نے اپنی آواز کو ذرا بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہارا چلہ کاٹ کر تمہارا حق ادا کر دیا ہے۔ اب تم اپنا حق ادا کرو اور مجھے بتاؤ کہ میں اپنے دشمن کو کیسے نیست و نابود کر سکتی ہوں۔ میں جانتی ہوں تمہیں کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور معلوم ہو گا۔“

کھوپڑی نے کہا۔ ”مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مجھے پریشان نہ کرو۔“

روہنی نے دلہن کی بدروح کو دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ ”چمپا کی بدروح! میری بات غور سے سن اگر تم نے مجھے کوئی طریقہ بتا دیا تو میں تمہاری کھوپڑی اگنی دیوی کے شعلوں کے حوالے کر دوں گی تاکہ جل کر راکھ ہو جانے کے بعد تمہاری بدروح کو

چین نصیب ہو۔ اگر تم نے انکار کیا تو میں تمہاری کھوپڑی کو جنگلی درندوں کے آگے ڈال دوں گی جو تمہیں چبا چبا کر کھا جائیں گے اور تمہاری بدروح تڑپتی رہ جائے گی۔“
 اچانک کھوپڑی کی آواز بلند ہوئی۔ ”بھگوان کے لئے ایسا نہ کرنا۔ مجھے جو کچھ معلوم ہے تمہیں بتائے دیتی ہوں۔“

روہنی نے کہا۔ ”میں وعدہ کرتی ہوں کہ ایسا نہیں کروں گی۔ اب بتاؤ وہ کون سا طریقہ ہے جس کے ذریعے میں اپنے دشمن پجاری رگھو کو شکست دے سکتی ہوں۔“
 کھوپڑی کہنے لگی۔ ”یہ بات تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ تم غائب ہو کر دنیا والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو سکتی ہو مگر پجاری رگھو تمہیں غیبی حالت میں بھی دیکھ سکتا ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

کھوپڑی نے کہا۔ ”میں تمہیں ایک ایسی چیز دوں گی جس کو استعمال کرنے سے تم پجاری رگھو کو بھی نظر نہیں آؤ گی۔ بس میں تمہاری اتنی ہی مدد کر سکتی ہوں۔ جب تم پجاری رگھو کی نگاہوں سے بھی غائب ہو سکو گی۔ جب وہ بھی تمہیں نہیں دیکھ سکے گا تو اس کے قریب پہنچ کر تم اسے ہلاک کرنے کا کوئی راستہ تلاش کر سکتی ہو۔“

روہنی نے پوچھا۔ ”وہ کون سی چیز ہے؟“

دلہن کی کھوپڑی نے کہا۔ ”اس کے لئے تمہیں میرے سر کو اگنی دیوی کے شعلوں کے سپرد کرنا ہو گا۔ جب میری کھوپڑی جل کر راکھ ہو جائے گی تو میری راکھ کا کچھ حصہ تم اپنے پاس رکھ لینا اور باقی دریا میں بہا دینا۔“

روہنی نے پوچھا۔ ”میں تمہاری راکھ کو لے کر کیا کروں گی؟“

کھوپڑی نے کہا۔ ”جب تم میری راکھ کی ایک ایک سلائی اپنے آنکھوں میں ڈال کر پجاری رگھو کے سامنے جاؤ گی تو وہ اپنی زبردست جادو کی طاقت کے باوجود تمہیں نہیں دیکھ سکے گا۔ اس حالت میں تم اپنے دشمن کو ختم کرنے کے لئے کوئی بھی وار کر

سکتی ہو۔ لیکن ایک بات کا تمہیں خیال کرنا پڑے گا۔“

”کس بات کا؟“ روہنی نے پوچھا۔

دلہن کی ادھ جلی کھوپڑی نے کہا۔ ”میری کھوپڑی کی راکھ کا اثر ایک دن تک بھی رہ سکتا ہے اور ایک گھنٹے میں بھی ختم ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ راکھ کی سلائی آنکھوں میں ڈالنے کے دس منٹ بعد ہی اس کا اثر ختم ہو جائے اور تم پجاری رگھو کو نظر آنے لگو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک منٹ بعد میری راکھ کا اثر دوبارہ واپس آ جائے اور تم ایک بار پھر پجاری رگھو کی نظروں سے غائب ہو جاؤ۔“

روہنی نے جھنجھلا کر کہا۔ ”اس طرح تو میں کسی مشکل میں بھی پھنس سکتی ہوں۔ میں پجاری رگھو کو ایک بار نظر آگئی تو وہ مجھے اسی وقت اپنے قبضے میں کر لے گا۔“ کھوپڑی نے کہا۔ ”اس کا کوئی توڑ تمہیں خود تلاش کرنا ہو گا۔ تمہارے لئے میں جو کچھ کر سکتی تھی وہ میں نے بتا دیا ہے اس سے زیادہ کچھ کرنے کی میری طاقت نہیں ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ جیسا تم نے کہا ہے میں ویسے ہی کروں گی۔“

جیسے ہی روہنی کی زبان سے یہ الفاظ نکلے دلہن کی کھوپڑی کی آنکھوں کی روشنی بجھ گئی اور وہ ایک طرف کو لڑھک گئی۔ میں روہنی اور دلہن کی کھوپڑی کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جب کھوپڑی جو تھوڑی دیر پہلے اینٹ پر سیدھی کھڑی تھی ایک طرف لڑھک گئی تو روہنی نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”دلہن کی بدروح چلی گئی ہے۔ تم نے ہماری گفتگو ضرور سن لی ہو گی۔“

میں نے کہا۔ ”میں نے ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا ہے۔“

روہنی کھوپڑی کو ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی۔ ”اب ہمیں اس کھوپڑی کو جلا دینا ہو گا۔“

ہم گھپا سے نکل کر باہر تالاب کے پاس آگئے۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف چھا

چکا تھا۔ ہم نے ادھر ادھر سے درختوں کے سوکھے پتے اور گری پڑی شاخیں ایک جگہ اکٹھی کر لیں۔ روہنی نے دلہن کی کھوپڑی کو اس کے اندر رکھ کر اس کے اوپر اور لکڑیاں رکھ دیں اور پھر روہنی نے سوکھی شاخوں اور پتوں کے ڈھیر کو اپنی انگلی سے چھوا اور ڈھیر کو آگ لگ گئی۔ جب ساری لکڑیاں جل گئیں تو روہنی نے درخت کی ایک ٹہنی سے کرید کر انگاروں کو ایک طرف ہٹایا تو دلہن کی کھوپڑی ویسی کی ویسی پڑی تھی۔

روہنی نے کہا۔ ”یہ جل کر راکھ ہو چکی ہے۔“

پھر روہنی نے درخت کا ایک چوڑا پتا اٹھایا اور اس کو کھوپڑی کے ساتھ لگا کر کھوپڑی کو ٹہنی سے ہلایا۔ آدھی کھوپڑی راکھ بن کر پتے میں گری۔ اس کے فوراً بعد باقی کی کھوپڑی بھی اپنے آپ راکھ بن کر بیٹھ گئی۔ روہنی نے پتے میں جو راکھ اٹھائی تھی اسے پتے سمیت اپنے آنچل کے ساتھ اچھی طرح سے باندھ کر رکھ لیا اور کہنے لگی۔ ”کھوپڑی کی بچی ہوئی راکھ کو ہمیں دریا میں بہا دینا ہو گا۔“

اور اس نے کھوپڑی کی باقی کی راکھ کو بھی اپنے آنچل کے دوسرے سرے میں ڈال کر باندھ لیا اور کہنے لگی۔ ”دریا یہاں سے دور نہیں ہے۔ ہمیں وہاں اس راکھ کو بہا دینا ہو گا۔ میرے ساتھ آ جاؤ۔“

ہم سوامی جی کی گھپا کے علاقے سے پرواز کر کے دریائے گنگا کی طرف چلے۔ دریا قریب ہی تھا۔ ہم بنارس شہر کے شمال میں ہی تھے۔ ہم نے دلہن کی کھوپڑی کی راکھ کو دریا میں بہا دیا۔

آسمان پر اس وقت سحر کا اجالا نمودار ہو رہا تھا۔ میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”مجھے یہ بتاؤ کہ اب ہمیں کس طرف جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ہمیں ابھی تک اپنی مہم میں کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ تم نے دلہن کی لاش کا چلہ ضرور کاٹا ہے مگر اس کے بدلے میں دلہن کی بدروح نے تمہاری طاقت میں تھوڑا سا اضافہ

کرنے کے قنوا تمہیں کچھ نہیں بتایا۔ اگر ہم ذرا غور کریں تو ہم بالکل نہتے ہیں اور ایک ایسے دشمن کے سامنے کھڑے ہیں جس کے پاس ہر قسم کا اسلحہ موجود ہے۔ میں مانتا ہوں کہ کھوپڑی کی راکھ کی سلائی آنکھوں میں لگانے کے بعد ہم اپنے دشمن پجاری رگھو کو نظر نہیں آئیں گے لیکن اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ جب تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ پجاری رگھو کی طاقت کا سب سے کمزور پہلو کون سا ہے تاکہ ہم اسے اپنے حملے کا نشانہ بنا سکیں۔ جب تک ہمیں اس کے کسی کمزور پہلو کا راز معلوم نہیں ہوگا ہم اپنی مہم میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ ہم پجاری رگھو پر دستی بموں کا ٹوکرا بھی پھینک دیں گے تو اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔“

روہنی بڑے غور سے میری باتیں سن رہی تھی۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو کہنے لگی۔ ”میں تمہاری باتوں سے پورا اتفاق کرتی ہوں۔ لیکن ابھی ہم جنگ کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ہمیں جہاں کہیں سے بھی کوئی جنگ میں کام آنے والا اسلحہ ملتا ہے ہم اسے اپنے پاس رکھ لیتے ہیں کہ شاید یہی وقت پر کام آجائے کیونکہ ہمارے دشمن پجاری رگھو کی طلسمی طاقت کے کئی پہلو ہیں، کئی حلقے ہیں۔ خدا نے چاہا تو ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہمیں اپنے دشمن پر کہاں وار کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“

روہنی کہنے لگی۔ ”ہمیں صبح ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔ جب دن نکل آئے گا اور بنارس شہر کے بازار کھل جائیں گے تو مجھے کسی دکان سے چاندی کا ایک خالی تعویذ اور چاندی کا ایک تار خریدنا ہوگا۔ خالی تعویذ میں، میں کھوپڑی کی راکھ بند کر کے اسے اپنے ایک بازو کے ساتھ باندھ لوں گی۔ چاندی کے تار میں کالی بدروح کا مہرہ پردر میں دوسرے بازو پر باندھ کر استعمال کروں گی یہ دونوں کام کرنے کے بعد ہی ہم دشمن تک پہنچنے کا کوئی راستہ تلاش کر سکیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے اس دوران دشمن خود بھی ہم پر حملہ کر دے کیونکہ

میرا خیال ہے پجاری رگھو کو ضرور پتہ چل گیا ہوگا کہ ہم بدروحوں کی دنیا میں کالی بدروح کے پاس چلے گئے تھے۔ پجاری رگھو ہو شاید ہو گیا ہوگا۔“

روہنی بھی شاید اسی طرح سوچ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”پجاری رگھو بدروحوں کی دوسری دنیا میں رہتا ہے جہاں ہم لوگ نہیں جاسکتے۔ وہ میری بلکہ اب ہماری تلاش میں انسانوں کی دنیا میں ضرور آتا ہے۔ ہمیں صرف یہ سراغ لگانا ہوگا کہ وہ انسانوں کی دنیا میں کب آتا ہے اور یہاں کس شمشان گھاٹ یا یران جگہ میں آکر اترتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم خود ایک بدروح بھی ہو۔ تمہارے پاس رگھو کے مقابلے میں کوئی کم طلسمی طاقت نہیں ہے۔ کیا تم یہ سراغ نہیں لگا سکتیں؟“

روہنی نے جواب دیا۔ ”میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میری طلسمی طاقت پجاری رگھو کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“

میں نے فوراً کہا۔ ”تو پھر ہم تو اسی طرح بھٹکتے رہیں گے اور تمہارے ساتھ میں بھی بھٹکتا رہوں گا اور اس دوران کوئی پتہ نہیں کب ہمارا دشمن اچانک ہم پر وار کر کے ہمیں ختم کر ڈالے۔۔۔۔۔“

روہنی کچھ سوچ رہی تھی۔ اچانک جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ کہنے لگی۔ ”میں ایک کام کر سکتی ہوں۔“

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

کہنے لگی۔ ”آج سے تین سو سال پہلے جب میں اپنے محل میں ملکہ بن کر رہ رہی تھی تو درگاہ نام کی میری ایک سہیلی تھی جو بے پور کے راجہ کی رقاہ یعنی زنتکی اور محبوبہ بھی تھی۔ لیکن زنتکی درگاہ کو محل کے ایک حبشی غلام سے محبت ہو گئی۔ راجہ کو پتہ چلا تو اس نے درگاہ زنتکی کو قتل کروادیا۔ مجھے یقین ہے کہ درگاہ زنتکی کی بدروح اسی محل میں موجود ہوگی۔ مجھے اس کے پاس جا کر اس بارے میں مشورہ کرنا چاہئے۔

بدروحوں کو دوسری بدروحوں کے بہت سے راز معلوم ہوتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تو پھر ابھی اس کے پاس چلتے ہیں۔“

روہنی نے کہا۔ ”بدر و حیں دیران جگہوں پر آدھی رات کے وقت ظاہر ہوتی ہیں۔ دن کے وقت وہ زمین کے اندر پاتال میں چھپی رہتی ہیں۔ ہم کچھ وقت بنارس میں خالی تعویذ وغیرہ خریدنے میں گزارتے ہیں۔ اس کے بعد بے پور کی طرف پروا کر جائیں گے اور وہاں رات ہونے کا انتظار کریں گے۔“

یہ فیصلہ کرنے کے بعد ہم اسی غیبی حالت میں پرواز کر کے بنارس شہر کی ایک دیران جگہ پر دریا کنارے اتر گئے۔ روہنی نے کہا۔ ”اب ہمیں عام انسانوں کی شکل صورت میں واپس آ جانا چاہئے۔“

سب سے پہلے روہنی اپنی عورت کی شکل میں واپس آئی اس کے بعد اس نے مجھ پر منتر پھونکا اور میں اپنی انسانی شکل و صورت میں واپس آ گیا۔ ہم بنارس کے ایک بازار میں آ گئے جہاں دکانیں کھلی تھیں اور لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ ہم ایک ہندو سنار کی دکان پر گئے اور اس سے خالی تعویذ طلب کیا۔ بنارس پجاریوں اور جو تھیوں کا شہر بھی مشہور تھا۔ ہندو ویسے بھی تو ہم پرست ہوتے ہیں اور جو تھی نجومی کی مرضی کے بغیر کوئی کاروبار شروع کرتے ہیں اور نہ بچوں کی شادی بیاہ کا دن مقرر کرتے ہیں۔ کسی کی بیماری لمبی ہو جائے تو وہ پجاری سے کاغذ پر لکھا اور ویدوں کا اشلوک لے کر اسے خالی تعویذ میں بند کر کے اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے۔

چنانچہ اس قسم کے چاندی کے خالی تعویذ انڈیا کے شہروں اور خاص طور پر مندروں کے شہر بندرا بن، کاشی، ہریدوار، متھرا اور بنارس میں سناروں کی دکانوں میں عام مل جاتے ہیں۔ لالہ جی نے روہنی کو چاندی کا ایک تعویذ دکھایا اور کہا۔ ”بہن جی! یہ خالص چاندی کا تعویذ ہے۔“

تعویذ چھوٹا سا تھا لیکن اس میں کھوپڑی کی راکھ ہی تو رکھنی تھی۔ روہنی نے اسے تعویذ اور چاندی کا ایک مضبوط باریک تار بھی خرید لیا۔ اس کے بعد ہم دکان سے باہر

نکلے تو میں نے روہنی سے کہا۔ ”انسانی جسم میں واپس آنے کے بعد مجھے بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔“

روہنی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ کہنے لگی۔ ”بے پور چل کر ناشتہ کر لینا۔“

بنارس سے ہم غیبی حالت میں بے پور آ گئے۔

بے پور کا پرانا شہر، شہر کے قلعے اور پرانے محلات اور پرانی بارہ دریاں سب روہنی کی دیکھی بھالی تھیں۔ ہم ایک دیران سے مقام پر اتر کر انسانی شکل میں واپس آ گئے۔ وہاں سے بے پور شہر میں داخل ہوئے یہ بڑا تاریخی شہر تھا۔ راجاؤں کے پرانے محل تھے جن میں سے بعض محل ابھی تک کافی صحیح حالت میں تھے۔ دنیا بھر کے ملکوں کے سیاح ان محلات کو دیکھنے ہر سال آتے تھے۔ میں نے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ناشتہ کیا اور وہاں سے اٹھا کر روہنی مجھے اس تین سو برس پرانے محل میں لے آئی جہاں اس کی سہیلی نرنگی درگا کا قتل ہوا تھا۔ یہ محل اپنی پرانی حالت میں نہیں تھا اور دیران ہو چکا تھا۔ لیکن بھارت کے محکمہ آثار قدیمہ والوں نے پھر بھی اسے کافی بہتر حالت میں رکھا ہوا تھا۔

جس وقت ہم محل میں داخل ہوئے اس وقت کچھ غیر ملکی سیاح بھی محل میں ادھر ادھر چل پھر کر تصویریں وغیرہ اتار رہے تھے۔ ہم دونوں اپنی عام انسانوں والی شکل میں ظاہر حالت میں تھے۔ لوگوں کی نظروں سے غائب نہیں تھے۔ اگرچہ روہنی عام شلوار قمیض میں تھی مگر اس کی شخصیت ہی بڑی پرکشش تھی۔ وہ دراز قد اور خوبصورت تھی۔ اس کی چال میں بھی مہارانیوں والا وقار تھا۔ ہم دونوں وقت گزارنے کے لئے راجہ کے پرانے محل میں گھوم پھر رہے تھے اور روہنی مجھے بتا رہی تھی کہ جب میں اپنی سہیلی نرنگی درگا سے کبھی ملنے آتی تھی تو ہم اس جھرد کے کے پاس بیٹھ کر بڑی باتیں کیا کرتی تھیں۔ وہاں ہم سیر کرتی تھیں۔ نرنگی درگا کا کمرہ محل

کی دوسری منزل پر تھا۔ اسی طرح باتیں کرتے ہم محل کے بے شمار ستونوں والے ہال کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ایک نوجوان غیر ملکی سیاح بھی وہاں چل پھر کر محل کی دیواروں پر بنے ہوئے پرانے نقش و نگار کی تصویریں اتار رہا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا تو جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا شاید وہ روہنی کی پروقار شخصیت سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس نے ہمارے قریب آکر ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔ ”شما کرنا۔ میں تمہاری ایک فوٹو لینا چاہتا ہوں۔ کیا تم کو اعتراض تو نہیں۔“

یونہی میرے منہ سے نکل گیا۔ ”نہیں کوئی اعتراض نہیں۔“

روہنی نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ تصویر اتروانا نہیں چاہتی تھی لیکن چونکہ میں نے حامی بھر لی تھی شاید اس لئے اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ اس غیر ملکی نوجوان سیاح کے ہاتھ میں ایسا کیمرہ تھا جس میں سے اسی وقت کلر فوٹو باہر آ جاتی تھی۔ اس قسم کے کیمرے اس زمانے میں یورپ کے ملکوں میں عام ہوتے تھے۔ میں تصویر اتروانے کے لئے روہنی کے پاس پوز بنا کر کھڑا ہو گیا۔ غیر ملکی سیاح نے کیمرے کا رخ ہماری طرف کیا اور بٹن دبا دیا اور تھینک یو کہا۔ اسی لمحے کیمرے کے اندر سے ہلکی سی آواز کے ساتھ ہماری رنگین فوٹو باہر نکل آئی۔ غیر ملکی سیاح نے بڑے شوق سے فوٹو کو نکال کر دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ کبھی وہ فوٹو کو دیکھتا اور کبھی ہماری طرف دیکھتا۔ میں نے آگے بڑھ کر غیر ملکی سیاح سے کہا۔ ”یہ تصویر ہمیں دو۔ یہ ہماری یادگار فوٹو ہے۔“

غیر ملکی سیاح نے فوٹو میری طرف بڑھادی اور پھر اپنے کیمرے کا شٹر کھول کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اب جو میں نے فوٹو لے کر اسے دیکھا تو میں بڑا حیران ہوا کیونکہ اس فوٹو میں، میں تو موجود تھا مگر روہنی موجود نہیں تھی وہ غائب تھی۔ اس کی تصویر نہیں اتری تھی حالانکہ تصویر اترواتے وقت وہ میرے ساتھ کھڑی تھی۔ روہنی بھی فوٹو کو دیکھ رہی تھی۔

غیر ملکی سیاح تو اس قدر حیرت زدہ تھا کہ کبھی اپنے کیمرے کو دیکھتا اور کبھی روہنی کی طرف دیکھتا تھا۔ اسی حیرت کے عالم میں وہ ہمیں فوٹو دے کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد روہنی مجھ سے کہنے لگی۔ ”میں جانتی تھی کہ میری فوٹو نہیں اترے گی۔ میں تمہیں منع بھی کرنا چاہتی تھی لیکن تم تصویر اتروانے کے لئے ہاں کر چکے تھے اس لئے خاموش رہی۔“

حیران میں بھی تھا اور کلر فوٹو کو بار بار دیکھ رہا تھا۔ فوٹو میں روہنی کی جگہ بالکل ایسے خالی تھی جیسے میں نے وہ تصویر اکیلے اتروائی ہو۔ حالانکہ وہ تصویر اترواتے وقت میرے پاس کھڑی تھی۔ میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”کیمرے نے تمہاری تصویر کیوں نہیں اتاری؟“

اس نے میرا بازو تھام کر مجھے محل کے دوسرے حصے کی طرف لے جاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”میں زندہ عورت نہیں ہوں۔ میں مر چکی ہوں اور اپنی بدروح کی شکل میں چل پھر رہی ہوں اور ہم بدروحوں کی تصویر کوئی بھی کیمرہ نہیں اتار سکتا۔“ یہ میرے لئے ایک نیا انکشاف تھا۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”اس محل میں وہ کمرہ کہاں ہے جہاں تمہاری سیمپلی ڈرگاہ کو قتل کیا گیا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”وہ کمرہ اس محل کے تہہ خانے میں ہے مگر وہاں ہم صرف رات کے وقت ہی جاتے ہیں۔“

میں خاموش رہا اور روہنی سے بالکل نہ پوچھا کہ ہم صرف رات کے وقت ہی وہاں کیوں جاتے ہیں۔ دن کے وقت کیوں نہیں جاسکتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ روہنی نے شروع دن ہی سے مجھے اس قسم کے سوالات پوچھنے سے منع کر دیا تھا۔

جے پور میں اتنے قدیم محلات، بارہ دریاں اور تاریخی مقامات تھے کہ ہمیں ان میں گھومتے ہوئے شام ہو گئی۔ مجھے پھر بھوک لگ گئی تھی چنانچہ ہم جے پور شہر کے ایک ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے۔ وہاں میں نے کھانا کھایا اس کے بعد ہم نرنگی ڈرگاہ کے

محل میں واپس آگئے۔ یہ محل بھی انڈیا کے محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں تھا۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ سیاحوں کی آمد و رفت کے لئے گیٹ بند کر دیا جا چکا تھا۔ باہر دو مسلح چوکیدار پہرہ دے رہے تھے۔ مگر ہمیں کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ روہنی مجھے ایک خفیہ راستے سے محل کے اندر لے گئی۔ ہم غائب ہو کر بھی جاسکتے تھے مگر غائب ہونے کی طاقت کو روہنی وہاں کبھی استعمال نہیں کرتی تھی جہاں اس کے بغیر بھی کام چل سکتا ہو۔ ہمیں آدھی رات گزر جانے کے بعد محل کے تہہ خانے میں جانا تھا اس لئے ہم وقت گزارنے کے لئے محل کی چھت پر بارہ دری میں بیٹھ گئے۔

رات کا منظر بڑا خوبصورت تھا۔ آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا جس کا عکس دوسری جانب ایک بہت بڑی جھیل میں پڑ رہا تھا۔ چاندنی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ محل کی چھت پر سے جے پور شہر کی روشنیاں چمکتے ہیرے موتیوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ روہنی نے اپنے بلاؤز کے اندر سے کالی بدروح کا مہرہ اور وہ تہہ کی ہوئی کاغذ کی پڑیا نکال لی جس میں دلہن کی کھوپڑی کی راکھ تھی۔ پھر اس نے چاندی کا تار اور چاندی کا تعویذ بھی نکال کر اپنے سامنے رکھ لیا۔ کہنے لگی۔ ”میں چاہتی ہوں۔ اس وقت یہ کام بھی ہو جائے۔“

سب سے پہلے اس نے چاندی کے تعویذ میں دلہن کی کھوپڑی کی راکھ ڈالی اور اسے اچھی طرح سے بند کر کے اپنی قمیض کی آستین اوپر اٹھائی اور مجھ سے کہا۔ ”شیروان! میری جان! یہ تعویذ اوپر کر کے میرے بازو پر باندھ دو۔“

میں نے تعویذ بڑی احتیاط کے ساتھ اس کے بازو کے اوپر کر کے باندھ دیا۔ اس کے بعد روہنی نے کالی بدروح کے مہرے میں چاندی کا تار پرو دیا اور مجھ سے کہا۔ ”کالی بدروح کا یہ مہرہ تعویذ کے نیچے کر کے باندھ دو۔“

میں نے اسے بھی روہنی کے بازو سے باندھ دیا۔ اس نے اپنی قمیض کی آستین

نیچے کر لی۔ ہم باتیں کرنے لگے۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”سلطانہ! شروع شروع میں تمہارے سر پر ہیرے جواہرات سے جڑا ہوا چھوٹا سا تاج ہوا کرتا تھا اور گلے میں سفید موتیوں کی مالا۔۔۔۔۔ اب تم وہ کیوں نہیں پہنتیں؟ انہیں تم نے کہاں غائب کر دیا ہے؟“

روہنی نے مسکرا کر کہا۔ ”شیروان! ابھی ان باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ جب وقت آئے گا تو میں انہیں بھی پہن لوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”تم شلوار قمیض میں بھی بڑی اچھی لگتی ہو۔“ وہ شرماسی گئی۔ کہنے لگی۔ ”شیروان! میرے محبوب! تم نے پہلی بار مجھ سے محبت پیار کی بات کی ہے۔ کبھی تم ہر وقت مجھ سے یہ باتیں کیا کرتے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”میں وہ شیروان نہیں ہوں سلطانہ! جو تمہارا خاوند اور جھانسی کے صوبے کا صوبیدار ہوا کرتا تھا۔ میں محض اس کا ہم شکل ہوں یعنی میری تھوڑی سی اس سے شکل ملتی ہے۔“

روہنی آسمان پر چمکتے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”اگر تم ایسا ہی سمجھتے ہو تو میں کوئی اعتراض نہیں کروں گی۔ میں تو اسی میں خوش ہوں کہ تین سو برس کے بعد انسانوں کی دنیا میں مجھے میرے شیروان کی شکل مل گئی ہے۔“

اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور گہرا سانس بھر کر محبت بھرے لہجے میں بولی۔ ”شیروان! وعدہ کرو کہ اس مہم میں کامیاب ہو جانے کے بعد بھی تم میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔“

میں نے کہا۔ ”پتہ نہیں تب کیا حالات ہوں گے۔ میں وعدہ نہیں کر سکتا۔“ میں اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ ایک بار مجھے اس بدروحوں کی خرافات سے نجات مل جائے تو پھر کسی بدروح سے ملنا تو درکنار میں اس کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں۔

روہنی نے کہا۔ ”کیوں! تم ایسا وعدہ کیوں نہیں کر سکتے؟ لو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ اس مہم کی کامیابی کے بعد جب میری روح کو نجات مل گئی تو اس کے بعد بھی میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔“

میں نے دل میں کہا۔ ”خدا نہ کرے کہ تم میرے ساتھ رہو۔“
 اوپر سے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ بھلا میں تمہیں ایسا کرنے سے کیسے منع کر سکتا ہوں۔
 تم جب اور جس وقت اور جہاں چاہو میرے پاس پہنچ جاؤ گی میں تمہیں روک ہی نہیں سکوں گا۔“

روہنی نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ بولی۔ ”کیا تم نہیں چاہتے کہ میں تمہیں ملنے آیا کروں؟“

میں نے جلدی سے اسے مطمئن کرنے کے انداز میں کہا۔ نہیں، نہیں سلطانہ!
 میرا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم ہر وقت میرے پاس آ سکتی ہو۔“

اس قسم کی منافقت سے صرف میرے ایسا زندہ انسان ہی کام لے سکتا تھا۔ میری منافقت کو روہنی ایک بدروح ہو کر بھی نہ سمجھ سکی اور میری جھوٹی تسلی سے مطمئن ہو گئی۔

محل کی چھت پر بیٹھے باتیں کرتے جب آدھی رات ہو گئی تو روہنی کہنے لگی۔
 ”رات آدھی گزر چکی ہے۔ اب ہمیں محل کے تہہ خانے میں جانا ہو گا۔“

یہ سن کر میرا دل ایک لمحے کے لئے دھڑکا اور پھر معمول پر آ گیا۔ بس دل میں یہی خیال آیا تھا کہ میں ایک اور تین سو سال پرانی مقتولہ کی بدروح سے ملنے جا رہا ہوں۔ خدا خیر ہی کرے۔

روہنی کو اس قدیم محل کے سارے راستوں اور خفیہ راستوں کا علم تھا۔ وہ تین سو سال پہلے اس محل میں اپنی رقاہ سیلی ڈرگا سے ملنے آیا کرتی تھی۔ ہم چھت سے

اترے اور ایک ایسی راہ داری میں سے گزرنے لگے جس کی ایک جانب سنگ مرمر کے روشن دان کی جالیوں میں سے چاندنی اندر آرہی تھی۔ وہ ایک زینے کے پاس آ کر رک گئی جو نیچے اترتا تھا۔ کہنے لگی۔ ”یہ زینہ اس تہہ خانے میں اترتا ہے جہاں آج سے تین سو برس پہلے میری سیلی زرنگی کا خون ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے وہاں پہنچنے کے بعد تمہیں کچھ ڈراؤنی آوازیں سنائی دیں۔ تم ڈرو گے تو نہیں؟“

میں نے دل میں کہا۔ ”ڈروں گا نہیں تو کیا خوش ہوں گا؟“
 مگر اوپر سے کہا۔ ”تم میرے ساتھ ہو۔ مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟“
 ”مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔“ روہنی نے خوش ہو کر کہا اور میرے آگے ہو کر زینہ اترنے لگی۔

زینے میں گھپ اندھیرا اچھایا ہوا تھا۔ زینہ نیچے کافی دور تک چلا گیا تھا۔ روہنی نے کہا۔ ”میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دو۔“
 میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

زینہ ختم ہو گیا۔ ہم تہہ خانے میں آ گئے۔ تہہ خانے میں بھی گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ ابھی تک روہنی کے کندھے پر ہی رکھا ہوا تھا کہ کہیں کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر نہ پڑوں۔ روہنی نے کہا۔ ”اپنا ہاتھ میرے کندھے پر ہی رکھنا۔ میں ایک جگہ روشنی کرتی ہوں۔“

وہ اندھیرے میں چونکہ دیکھ سکتی تھی اس لئے بے تکان چلی جا رہی تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ ایک جگہ رک گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس نے اپنا ایک بازو اونچا کیا ہے۔ پھر تہہ خانے میں مدھم سی روشنی پھیل گئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ہم ایک ستون کے پاس کھڑے تھے اور ستون کے ساتھ لگی ہوئی ایک بریکٹ پر موم بتی روشن ہو گئی تھی۔

میں نے روہنی سے حیران ہو کر پوچھا۔ ”کیا یہ موم بتی یہاں تین سو برس سے

بجھی ہوئی تھی؟“

روہنی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے اچانک خیال آگیا کہ روہنی نے مجھے اپنے سوال کرنے سے منع کر رکھا ہے جس کے جواب کا تعلق اس دنیا کی عقل و دانش کی حدود سے باہر ہو۔

میں نے تہہ خانے کی فضا کو دیکھا۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں تہہ خانے کا ماحول اور زیادہ پراسرار لگنے لگا تھا۔ تہہ خانے کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ چھت لے کر فرش تک چھ سات ستون کھڑے تھے۔ ایک جگہ دو ستونوں کے درمیان پتھر ایک کافی بڑا تخت بنا ہوا تھا۔ تخت کے پیچھے دیوار کے ساتھ لوہے کے تین چار رنگ چھلے لگے ہوئے تھے جن کے درمیان لوہے کی بڑی میخیں ٹھکی ہوئی تھیں۔ روہنی نے مجھے وہ زنجیریں دکھاتے ہوئے کہا۔ ”میری پیاری سہیلی ڈرگا زنگی کو ظالم راجہ کے حکم سے ان زنجیروں کے ساتھ باندھ کر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ ظالم راجہ ڈرگا سے اپنے ساتھ بے وفائی کرنے کا بڑی سنگ دلی سے بدلہ لے رہا تھا۔ ایک مہینے تک ڈرگا کو طرح طرح کی اذیتیں دینے کے بعد آخر راجہ کے حکم سے اسے قتل کر دیا گیا۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا اس کی لاش کو یہاں دبا دیا گیا تھا؟“

روہنی نے کہا۔ ”نہیں۔ لاش کو راجہ کے حکم سے جنگل میں جلا کر اس کی ہڈیاں راجستھان کے صحراؤں میں جگہ جگہ بکھیر دی گئی تھیں۔“

روہنی یہ بتانے کے بعد خاموش ہو گئی۔ شاید وہ اپنی پرانی سہیلی کی سوگوار یادوں میں ڈوب گئی تھی۔ میں بھی خاموش ہو گیا تھا۔ روہنی میرے بالکل قریب ایک ستون کے پاس بیٹھی تھی۔ ہمارا رخ پتھر کے تخت کی طرف تھا۔ اچانک روہنی ایسے چونک سی پڑی جیسے اسے تہہ خانے میں کسی تیسرے شخص کی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ میں کہہ کہنے لگا تو روہنی نے جلدی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ روہنی

نے اپنی گردن کو ایک جانب تھوڑا سا ایسے جھکا لیا تھا جیسے کسی آواز کو سننے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں بھی ہمہ تن گوش ہو کر کسی غیبی آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر ابھی تک وہاں مجھے کوئی آواز سنائی نہ دی تھی۔ تہہ خانہ زمین کے کافی نیچے جا کر بنایا گیا تھا اور وہاں قبر ایسا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس سناٹے میں اچانک مجھے ایسی آواز سنائی دینے لگی جیسے کوئی ٹھنڈے سانس بھر رہا ہو۔

میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ ٹھنڈی آہوں کی یہ آواز روہنی نے بھی سن لی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ کو آہستہ سے دبایا جیسے کہہ رہی ہو کہ یہ آواز تم سن رہے ہو۔ میں بھی سن رہی ہوں۔

ٹھنڈی آہوں کی آواز جیسے آہستہ آہستہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔

روہنی نے میرے بازو کو پکڑا۔ خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھے بھی اٹھالیا۔ ہم ستون کے پاس موم بتی کی روشنی میں کھڑے تھے اور ہماری نظریں سامنے پتھر کے تخت کی جانب تھیں۔ ٹھنڈے سانسوں کی آواز ہمارے اتنے قریب ہو گئی کہ مجھے لگا جیسے کوئی بالکل میرے کان کے قریب آکر ٹھنڈے سانس بھر رہا ہے۔ بڑے درد بھرے انداز میں ٹھنڈی آہیں بھر رہا ہے۔ اس وقت مجھ پر واقعی بہت زیادہ خوف طاری ہو چکا تھا۔ ٹھنڈے سانس بھرنے کی آوازیں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگیں۔

یہاں تک کہ وہ بہت مدھم ہو گئیں جیسے بہت دور سے آرہی ہوں۔ پھر اچانک ایک ہولناک چیخ سے میں لرز گیا اور روہنی کے ساتھ لگ گیا۔ یہ کسی عورت کی چیخ تھی اور ایسی اذیت ناک چیخ میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ پھر کسی عورت کے کراہنے کی آواز آنے لگی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی بد نصیب عورت کو ذبح کیا جا رہا ہے اور اس میں اتنی سکت بھی باقی نہیں رہی کہ وہ لفظ بھی منہ سے نکال سکے۔

یہ اذیت ناک ڈر آؤنی کراہیں بھی آہستہ آہستہ غائب ہو گئیں۔ اب تہہ خانے کی فضا میں ایسا سناٹا چھا گیا جس میں موت کی دہشت تھی۔ شاید میرے ساتھ کھڑی

روہنی کے یہ محسوسات نہ ہوں مگر میں ایک زندہ اور زندگی سے محبت کرنے والے انسان کی حیثیت سے ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ روہنی بالکل ساکھ کھڑی تھی اور اس کی نگاہیں تخت کے پیچھے سامنے والی دیوار پر لگی تھیں۔ میں بھی اس دیوار کو دیکھنے لگا۔ اچانک دیوار پر ایک سایہ سالہرا کر غائب ہو گیا۔ یہ سایہ روہنی نے بھی ضرور دیکھ لیا تھا۔ جیسے ہی یہ سایہ غائب ہوا روہنی نے پہلی بار زبان کھولے ہوئے کہا۔ ”ڈرگا! کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں روہنی ہوں۔ تمہاری سہیلی روہنی!“

جس زمانے میں ڈرگا روہنی کی سہیلی تھی اس زمانے میں ابھی روہنی کی شادی مغل صوبے دار سے نہیں ہوئی تھی اور وہ ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئی تھی۔ روہنی نے شادی کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا اور مغل شہزادے نے اس کا نام سلطانہ رکھا تھا۔

میں غیر شعوری طور پر سامنے والی دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک عورت کی خشک اور ویران سی آواز سنائی دی۔

”میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم یہاں کیوں آئی ہو؟“

ظاہر ہے یہ بدروح ڈرگا ہی کی آواز تھی۔ اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے اسے روہنی کا وہاں آنا ناگوار گزرا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ میں روہنی کے ساتھ تھا جس کا تعلق زندہ انسانوں کی دنیا سے تھا۔ اتنا مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ بدروحیں اپنی دنیا میں انسانوں کی مداخلت پسند نہیں کرتیں اور اگر کوئی بھولا بھٹکا انسان غلطی سے ان کی دنیا کی حدود میں داخل ہو جائے تو پھر اس سے چٹ جاتی ہیں اور اس وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں جب تک کہ اس کی جان نہیں لے لیتیں۔

روہنی بھی اس نقطے کو سمجھ گئی تھی۔ شاید روہنی کو اپنی غلطی کا احساس بھی ہو گیا تھا کہ اسے مجھے ساتھ لے کر وہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔

اس نے ڈرگا کی بدروح سے مخاطب ہو کر وضاحت کوئے کے انداز میں کہا۔ ”ڈرگا! تم دیکھ رہی ہو جو انسان میرے ساتھ آیا ہے وہ شہزادہ شیردان ہے۔“
 درگا بدروح ایک لمحے کے لئے خاموش رہی۔ پھر اس کی آواز آئی۔ ”یہ تمہارا شہزادہ شیردان نہیں ہے۔ یہ تم بھی اچھی طرح سے جانتی ہو۔ یہ اس کا ہم شکل ایک اجنبی انسان ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”ڈرگا! میں مانتی ہوں کہ یہ میرے مرے ہوئے خاوند کا ہم شکل ہے مگر اس نے میری آتما کو پجاری رگھو کی قید سے رہائی دلا کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے اسے میری مدد کرنے کی یہ سزا مل رہی ہے کہ پجاری رگھو اس کی جان کا دشمن بن گیا ہے اور مجھے دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کے ساتھ ساتھ اسے ہلاک کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرا فرض بن گیا ہے کہ میں اس کی جان کی حفاظت کروں اور اسے پجاری رگھو کے انتقام سے بچاؤں۔“

ڈرگا کی بدروح نے پہلے تو کوئی جواب نہ دیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ وہاں سے جا چکی ہے لیکن روہنی کو درگا کی بدروح کی موجودگی کا احساس تھا۔ وہ خاموش کھڑی ڈرگا کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ جب ڈرگا کی خاموشی طول پکڑ گئی تو روہنی نے کہا۔ ”ڈرگا! میری پیاری بہن! مجھے معلوم ہے کہ تم یہاں موجود ہو۔ میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ تم خاموش کیوں ہو؟“

ڈرگا بدروح کی خشک آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔ ”روہنی! تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“

روہنی نے کہا۔ ”ڈرگا! مجھے تمہاری بدد کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ کیا تم میری مدد کرو گی؟“

ایک بار پھر تہہ خانے میں خاموشی چھا گئی۔ ڈرگا بدروح کی آواز آئی۔ ”کس قسم کی مدد چاہتی ہو؟“

روہنی نے کہا۔ ”یہ بات تم سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ جب سے میں اس کی قید سے آزاد ہوئی ہوں پجاری رگھو مجھے دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کے لئے کئی خطرناک کوششیں کر چکا ہے۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ اگر اس بار میں اس کے قبضے میں چلی گئی تو میری کبھی ملکتی نہیں ہوگی اور میں قیامت تک اس کی قید میں بے بس ہو کر پڑی رہوں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ مجھے آزاد کرنے کی وجہ سے پجاری رگھو میرے ساتھی شیروان کا بھی دشمن بن گیا ہے اور وہ اس پر چار مرتبہ قاتلانہ حملے کر چکا ہے۔ اگر میں اس کے ساتھ نہ ہوتی تو یہ آج زندہ نہ ہوتا مگر میں اسے زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔“

دُرگاہ کی بدروح نے روہنی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”روہنی! تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

روہنی نے بھی بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔ ”پجاری رگھو کے آگ میں جل کر ختم ہو جانے میں ہی میری ملکتی ہے۔ میری نجات ہے۔ لیکن میں اُس کی طلسمی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہاں! اگر مجھے اُس کی کسی کمزوری کا پتہ چل جائے تو پھر میں اُس کو آسانی سے ختم کر سکتی ہوں۔ تم پجاری رگھو کو اس کی اور اپنی زندگی کے دوران بھی جانتی تھی اور موت کے بعد تمہیں اس کے بارے میں زیادہ پتہ چل گیا ہو گا۔ کیا تم مجھے اس کی کوئی کمزوری بتا سکتی ہو؟ میں یہی معلوم کرنے تمہارے پاس آئی ہوں۔“

دُرگاہ بدروح نے حسب معمول کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ”پجاری رگھو کی طاقت کا راز موت کے دیوتا یم دوت کی وہ مورتی ہے جو اس نے پجاری رگھو کو خوش ہو کر دی تھی۔ اس مورتی پر یم دوت کا منتر لکھا ہوا ہے۔ اگر کسی ذریعے سے وہ مورتی تمہارے پاس آ جاتی ہے تو تم پجاری رگھو پر اپنی کم طلسمی طاقت سے بھی فتح حاصل کر لو گی۔“

یم دوت کی یہ مورتی پجاری رگھو نے کہاں رکھی ہوئی ہے؟ کیا تم بتا سکتی ہو؟“
روہنی کے اس سوال کے جواب میں دُرگاہ بدروح بولی۔ ”اس کا کسی کو علم نہیں ہے۔ یہ تمہیں خود معلوم کرنا ہو گا۔ میرا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اب میں جاتی ہوں۔“
روہنی نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے ایک آخری بات بتا دو دُرگا۔“
”بولو۔ میں سن رہی ہوں۔“ دُرگاہ بدروح نے کہا۔

روہنی کہنے لگی۔ ”تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں بدروحوں کی اس دنیا میں داخل نہیں ہو سکتی جس کا سردار پجاری رگھو ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ پجاری رگھو اپنی بدروحوں کی دنیا سے نکل کر کب انسانوں کی دنیا میں آتا ہے اور اپنا ٹھکانہ کہاں بناتا ہے؟“

دُرگاہ بدروح نے جواب دیا۔ ”میں اتنا جانتی ہوں کہ پجاری رگھو کی بدروح مہینے میں ایک بار اُس شمشان گھاٹ کی یا ترا کرنے ضرور جاتی ہے جہاں مرنے کے بعد اس کے مردہ جسم کو چتا کی آگ میں جلایا گیا تھا۔ یہ وہ دن ہوتا ہے جس کی رات کو پجاری رگھو کے مردے کو چتا کی آگ میں جلایا گیا تھا۔“
روہنی نے جلدی سے پوچھا۔ ”اب مجھے یہ بھی بتاتی جاؤ کہ یہ شمشان گھاٹ کس شہر میں ہے۔“

دُرگاہ بدروح نے کہا۔ ”پجاری رگھو کے مردے کو آج سے تین سو سال پہلے جلایا گیا تھا۔ اُس زمانے میں مندروں کی نگری متھرا انگری بھی ایک چھوٹا سا گاؤں ہو کر تھی۔ متھرا انگری کے پورب میں ایک شمشان گھاٹ ہوا کرتا تھا۔ پجاری رگھو کو اسی شمشان گھاٹ میں اگنی دیوی کے شعلوں کے سپرد کیا گیا تھا۔ آج یہ شمشان گھاٹ کنڈر بن چکا ہے اور وہاں کوئی مردہ نہیں جلایا جاتا۔ پجاری رگھو ہر مہینے کی سولہویں تاریخ کو وہاں آتا ہے اور تین راتیں شمشان گھاٹ کے سولہ پھیرے لگاتا ہے۔ اس دیران شمشان گھاٹ سے کچھ دور جنگل میں ایک اندھا کنواں ہے۔ پجاری رگھو کی

بدروح اس کنویں کو اپنا ٹھکانا بناتی ہے۔“

روہنی نے درگا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”درگا! بس مجھے تم سے یہی کچھ پوچھنا تھا۔ اب میں بھی جاتی ہوں۔“

درگا بدروح کی آواز آئی۔ ”روہنی! ایک بات سے ہوشیار رہنا۔ بدروحوں کے دوسرے قبیلے کی سردارنی کالی بدروح پجاری رگھو کی منہ بولی بہن ہے اور پجاری رگھو کی بدروح جب شمشان گھاٹ کی یا ترا کرنے انسانوں کی دنیا میں آتی ہے تو کالی کے راکھشش اس کی حفاظت کے لئے اس کے ساتھ آتے ہیں۔“

”میں ان سے ہوشیار رہوں گی۔ تمہارا شکریہ دُرگا!“

دُرگا بدروح کی اچانک غصیلی آواز بلند ہوئی۔ ”اب اس منش جاتی (انسان) کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔“

روہنی نے میرا بازو پکڑا اور ہم جلدی سے زینہ طے کرتے تہہ خانے سے نکل آئے۔ محل کے اوپر والے کمرے میں آنے کے بعد روہنی کہنے لگی۔ ”دُرگا کو تمہارا میرے ساتھ وہاں آنا برا لگا تھا کیونکہ بدروحیں ویسے بھی زندہ انسانوں کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ تم مسلمان بھی ہو۔“

میں نے کہا۔ ”مگر تم بھی تو مسلمان ہو چکی ہو۔ پھر دُرگا کی بدروح نے تمہیں کیسے گوارا کر لیا؟“

روہنی کہنے لگی۔ ”مسلمان ہونے سے پہلے بچپن سے جوانی اور شادی کے وقت تک کا عرصہ جب میں ہندو تھی ہم دونوں نے ایک ساتھ گزارا تھا۔ بس دُرگا اسی دوستی کا لحاظ رکھے ہوئے تھی اور اسی کی پالنا کر رہی تھی۔“

رات ڈھلنے لگی تھی۔ بے پور کے اس ویران محل میں اب ہمارا کوئی کام نہیں تھا۔ ہم محل کے صدر دروازے سے باہر نکلے تو پہرے پر موجود چوکیداروں میں سے ہمیں کوئی بھی نہ دیکھ سکا کیونکہ ہم غیبی حالت میں تھے۔ صبح کے انتظار میں ہم ایک

جھیل کنارے بارہ دری میں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”میں نہانا چاہتا ہوں۔ مجھے غیبی حالت سے انسانی شکل میں واپس لے آؤ۔“

روہنی نے خاص منتر پڑھ کر پھونکا اور میں اپنی ظاہری انسانی شکل صورت میں واپس آ گیا۔ روہنی نے کہا۔ ”تم جھیل میں اتر کر نہالو۔ میں یہیں بیٹھی ہوں۔“

جھیل کنارے میٹر حیاں بنی ہوئی تھیں۔ میرے پاس وہاں تولیہ صابن تو تھا نہیں ویسے ہی جسم کو اچھی طرح سے مل کر غسل کیا اور کپڑے پہن کر بارہ دری میں آ گیا۔

روہنی کہنے لگی۔ ”آج کار تک کے مہینے کی چودہ تاریخ ہے۔ دو دن بعد رات کو پجاری رگھو کی بدروح متھرا کے شمشان گھاٹ پر آئے گی۔ ہمیں آج ہی وہاں پہنچ جانا چاہئے۔“

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اعتراض ہوتا بھی تو میرے اعتراض کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بدروحوں کے آسیب کے جس چکر میں پھنس گیا تھا اب اسے ہر حالت میں مجھے پورا کرنا ہی تھا۔ میں نے کہا۔ ”جیسے تمہاری مرضی۔“

روہنی بولی۔ ”ہم آج اور کل کا دن متھرا شہر میں گزاریں گے۔ ہم وہ اندھا کنواں بھی دیکھیں گے جس میں پجاری رگھو کی بدروح اپنا ٹھکانا بنائے گی۔“

میں نے روہنی سے کہا۔ ”میں بار بار غیب ہونے سے تنگ آچکا ہوں کیوں نہ ہم عام انسانوں کی طرح اس بار ریل گاڑی میں سفر کریں۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”تمہیں تنگ نہیں آنا چاہئے۔ ابھی تو ہماری خطرناک مہم شروع ہی ہوئی ہے۔ ابھی تو ہمیں نہ جانے کیا کیا کچھ کرنا پڑے گا۔“

میں نے کہا۔ ”وہ میں جانتا ہوں اور اس کے لئے میں نے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہے لیکن اس وقت میرا دل ٹرین میں عام لوگوں کے ساتھ سفر کرنے کو چاہ رہا ہے۔“

روہنی بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ اگر یہ تمہاری خواہش ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

یہیں سے ہم ریلوے اسٹیشن پر چلتے ہیں۔“ جے پور کے قدیم محلات والے علاقے سے نکل کر ہم ریلوے اسٹیشن پر آگئے۔ اس وقت روہنی بھی عام انسانی شکل صورت میں تھی۔ میں بھی اپنی انسانی شکل میں تھا۔ روہنی اس بار جب غیبی حالت سے زندہ عورت کے روپ میں ظاہر ہوئی تھی تو اس نے کانسی رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”تم نے شلوار قمیض کیوں تبدیل کر لی؟“

اس نے کہا۔ ”ہم مندروں کے شہر متھرا جا رہے ہیں۔ شلوار قمیض کو یہاں مسلمانوں کا لباس سمجھا جاتا ہے اس لئے میں نے ہندو عورتوں کی طرح ساڑھی پہن لی ہے۔“

معلوم ہوا ہے کہ ایک گھنٹے بعد بھوپال سے ایک ٹرین آرہی ہے جو متھرا سے ہوتی ہوئی دلی جائے گی۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”مجھے کچھ پیسے دو۔ میں ٹرین کے دو ٹکٹ لے آؤں۔“ روہنی نے اپنی مٹھی کھول کر کہا۔ ”ٹکٹ کا میں نے انتظام کر لیا ہوا ہے۔“

روہنی کی ہتھیلی پر ٹرین کے دو ٹکٹ تھے۔ میں نے ٹکٹ لے کر انہیں غور سے دیکھا۔ یہ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کے ٹکٹ تھے اور ان پر اس روز کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ مجھے کوئی تعجب نہ ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ روہنی بدروح ایسا کر سکتی ہے۔ میں نے ایک ٹکٹ روہنی کو دے دیا اور ایک ٹکٹ اپنے پاس رکھ لیا اور ہم پلیٹ فارم پر ایک طرف بیٹھ کر متھرا جانے والی ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔ دن کا وقت تھا جے پور کے اسٹیشن پر مسافروں کی کافی ریل پیل تھی۔ ہم خاموش بیٹھے مسافروں کو آتے جاتے دیکھ رہے تھے۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ٹرین آگئی۔ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں ایک ادھیڑ عمریور پین جوڑا پہلے سے بیٹھا تھا۔ میں اور روہنی بھی آکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین چل پڑی۔

ٹرین جے پور کے اسٹیشن سے نکلی تو سامنے بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمریور پین جوڑے نے بڑی تھرمس میں سے چائے نکالی اور آدمی نے انگریزی میں ہم سے پوچھا۔ ”کیا آپ چائے پیئیں گے؟“

روہنی نے مسکراتے ہوئے انگریزی میں ہی کہا۔ ”جی نہیں شکریہ۔“ یہاں میں یہ بتا دوں کہ بدروحیں دنیا کی ہر زبان بول اور سمجھ لیتی ہیں۔ روہنی جس زمانے میں زندہ تھی اور ریاست کی ملکہ تھی اس زمانے میں ابھی ہندوستان میں انگریز نہیں آئے تھے مگر روہنی انگریزی زبان سمجھ اور بول لیتی تھی۔ انگریز مرد کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ اتنی ہی عمر اس کی انگریز بیوی کی ہو گی۔ انگریز مرد نے کہا۔ ”آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ ہمیں تو دلی جانا ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”ہم متھرا تک جا رہے ہیں مندروں کی یا تہرا کرنے۔“ انگریز مرد نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام ایڈم سمتھ ہے۔ میں دلی میں ہیرے جوہرات کا بزنس کرتا ہوں۔ یہ میری بیوی ایلس ہے۔ ہم دلی جا رہے ہیں۔“

ایلس ہماری طرف مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ دونوں کے چہروں پر بڑی معصومیت تھی۔ ٹرین راجستھان کے صحرائی ٹیلوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ میل ٹرین تھی۔ اس نے ایک اسٹیشن چھوڑ دیا اور آگے نکل گئی۔ دوسرا اسٹیشن آیا تو ٹرین رک گئی۔ وہاں سے دو دیہاتی ہمارے ڈبے میں سوار ہو گئے۔ یہ دونوں دیہاتی بٹے کٹے تھے

اور ان میں سے ایک کی جود چوری سائل کی بڑی بڑی موچیں تھیں۔ آنکھیں سرخی مائل رنگت کی تھیں اور ایک دیہاتی نے پھڑے کا تھیلا اٹھا رکھا تھا۔ ہم نے اس کی طرف حیران ہو کر دیکھا کیونکہ وہ فرسٹ کلاس کے مسافر لگتے نہیں تھے۔ انگریز مرد نے ہندوستانی زبان میں اُن سے کہا۔ ”بابالوگ! یہ فرسٹ کلاس کا ڈبہ ہے۔“
 موچھوں والے دیہاتی نے ذرا غصے سے جواب دیا۔ ”ہمارے پاس فرسٹ کلاس کے ٹکٹ ہیں۔“

اس کے بعد کسی نے اُن سے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ ہو سکتا تھا کہ اُن کے پاس فرسٹ کلاس کے ہی ٹکٹ ہوں۔ ٹرین اسٹیشن سے روانہ ہو گئی۔ جب ٹرین دیران علاقے میں پہنچی تو ان پر اسرار دیہاتیوں میں سے ایک ہاتھ روم میں گھس گیا۔ تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرا دیہاتی بھی اٹھ کر ہاتھ روم کے پاس کھڑا ہو گیا جیسے اپنے ساتھی کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہا ہو۔

اتنے میں ہاتھ روم میں سے پہلے والا دیہاتی جس کی بڑی بڑی موچیں تھیں باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ باہر نکلتے ہی اس نے پستول کا رخ ہماری طرف کر دیا اور گرج دار آواز میں کہا۔ ”خبردار! اگر کسی نے گاڑی کی زنجیر کھینچنے کی کوشش کی تو اسے وہیں ڈھیر کر دوں گا۔“

اس دوران دوسرے دیہاتی نے بھی اپنی صدری کے اندر سے پستول نکال لی تھی۔ انگریز مرد اور عورت پہلے تو گھبرا گئے۔ پھر انگریز مرد نے ہندوستانی میں کہا۔ ”بابالوگ! ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔“

موچھوں والے دیہاتی نے کہا۔ ”ابھی پتہ چل جائے گا کس کے پاس کیا ہے۔“
 اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ ”ان سب کی تلاشی لو۔“
 یہ دونوں ڈاکو تھے۔ یہ بات ثابت ہو گئی تھی۔ میں نے روہنی کی طرف دیکھا۔ روہنی نے مجھے آنکھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ان ڈاکوؤں کو ان کی موت اس

ابے میں لے آئی تھی۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ ایک ایسے کپار ٹمنٹ میں ڈاکہ مارنے آگئے ہیں جہاں ایک انتہائی خطرناک بدروح پہلے سے بیٹھی ہوئی ہے۔
 ایک ڈاکو انگریز جوڑے کے سامان کو جلدی جلدی کھول کر دیکھنے لگا۔ انگریز عورت کے اٹیچی کیس میں سے جواہرات کا ایک قیمتی ہار نکل آیا۔ اسے دیکھ کر دونوں ڈاکوؤں کی آنکھیں کھل گئیں۔ موچھوں والے ڈاکو نے اب ہماری طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”تم بھی نکالو جو کچھ تمہارے پاس ہے۔“

روہنی نے بڑی پرسکون آواز میں کہا۔ ”ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔“
 ایک ڈاکو نے ہنس کر دوسرے سے کہا۔ ”بھیکو! یہ تو گن سندری ہے۔ اس کے پاس کچھ نہیں ہے تو چلو اسی کو اٹھا کر ساتھ لئے چلتے ہیں۔“
 دوسرے ڈاکو بھیکو نے کہا۔ ”ارے اس کی تلاشی تو لو۔ اس نے بھی اپنی انگلیاں ہیرے جواہرات نہ چھپا رکھے ہوں۔“

پہلا ڈاکو فوراً روہنی کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی اس نے روہنی کے بلاؤز پر ہاتھ ڈالا روہنی نے اسے پیچھے دھکیل دیا اور کہا۔ ”خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا۔ خاموشی سے انگریز عورت کا ہار اسے واپس کر دو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔“

ڈاکو قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ بولا۔ ”بھیکو رے بھیکو! یہ کیا کہتی ہے؟“
 دوسرے ڈاکو بھیکو نے کہا۔ ”یہ کہتی ہے مجھے اسی طرح اٹھا کر اپنے ساتھ لے چلو۔ میں تم سے بیاہ کروں گی۔“

دونوں ڈاکو ایک بار پھر قہقہے لگا کر ہنسے۔ تب میں نے غصہ کھا کر کہا۔ ”تم جانتے نہیں کہ ہم کون ہیں۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ انگریز عورت کا ہار اسے واپس کر دو اور ڈبے سے باہر چھلانگیں لگا دو۔“

لیکن اس قسم کی باتوں کا ان عادی جرائم پیشہ ڈاکوؤں پر اثر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بوڑھا انگریز جوڑا ہماری طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور یہی سوچ رہا ہو گا

کہ ہمیں ڈاکو ضرور مار ڈالیں گے۔ مگر ان بے چاروں کو کیا خبر تھی کہ خود ڈاکوؤں کو موت گھیر کر وہاں لے آئی ہے۔ میں نے روہنی کے چہرے پر بڑے خونخوار قسم کے تاثرات کو ابھرتے دیکھ لیا تھا۔ کم از کم مجھے روہنی کی آنکھوں میں بدروحوں والی ہیبت نظر آگئی تھی۔

جیسے ہی ایک ڈاکو روہنی کو پکڑنے کے لئے اس کی طرف بڑھا روہنی ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور فوراً غائب ہو گئی۔ ڈاکو اور انگریز میاں بیوی حیرت زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے مگر میں روہنی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ وہیں میرے پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے منتر پڑھ کر مجھ پر پھونکا اور پھر میں بھی غائب ہو گیا۔ اب ہم انگریز میاں بیوی اور ڈاکوؤں کو دیکھ رہے تھے مگر وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ڈاکوؤں پر ہم دونوں کے غائب ہونے سے دہشت طاری ہو گئی۔ دونوں ڈاکو ہندو تھے۔ دونوں ہاتھ باندھ کر گزر گئے۔ ”کالی میا! ہمیں شاکر دے۔ کالی میا! ہمیں شاکر دے۔“

مگر ان کی موت کا وقت آن پہنچا تھا۔ میں نے روہنی کی آنکھوں میں اس کے بلاؤز پر ڈاکو کے ہاتھ ڈالنے کے بعد جو بھیانک شعلے اٹھتے دیکھ لئے تھے انہیں ان دونوں ڈاکوؤں کی موت ہی بجھا سکتی تھی۔

روہنی نے ڈاکو سے کہا۔ ”عورت کا ہار اسے واپس کر دو۔“

مونچھوں والا ڈاکو بھی تھر تھر کانپ رہا تھا۔ دونوں ڈاکوؤں نے کہا۔ ”ابھی دیتا ہوں کالی میا!“

اور اس نے صدری میں سے قیمتی جواہرات کا ہار نکال کر انگریز عورت کے حوالے کر دیا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔ ”شاکر دو کالی میا! شاکر دو۔“

مگر معافی کا وقت گزر چکا تھا۔ ایک بجلی سی چمکی۔ روہنی کا ایک ہاتھ اوپر کو اٹھا اور دونوں ڈاکوؤں کی گردنیں کٹ گئیں اور ان کے سر کپار ٹمنٹ کے فرش پر گر پڑے۔ دھڑ دھڑا کی طرف گر پڑے اور خون کے چھینٹے ڈبے کی دیواروں اور سیٹوں پر پڑنے

لگے۔ انگریز مرد اور عورت دونوں ڈرے ہوئے بیٹھے تھے۔ روہنی نے ان کی طرف متوجہ ہو کر انگریزی میں کہا۔ ”پولیس تم لوگوں سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کرے گی۔ کیونکہ اس ڈبے میں کچھ نہیں ہوا۔ میں دونوں ڈاکوؤں کی لاشیں غائب کر رہی ہوں۔“

روہنی نے اپنے ہاتھ کا اشارہ فرش پر پڑے ڈاکوؤں کے خون آلود سروں اور دھڑوں کی طرف کیا اور دوسرے لمحے وہاں کچھ نہیں تھا۔ دونوں ڈاکوؤں کی لاشیں اور دیواروں اور فرش پر گرے ہوئے ان کا خون غائب ہو گیا تھا۔ روہنی نے مجھے بازو سے پکڑا اور ہم چلتی ٹرین کی کھلی کھڑکی میں سے باہر نکل گئے۔ باہر نکلتے ہی ہم ہوا میں اڑنے لگے۔

روہنی نے مجھے کہا۔ ”میں اسی لئے انسانوں کے درمیان کبھی نہیں گئی اور نہ جانا چاہتی ہوں۔ آج کا انسان دوسرے انسان کے ساتھ ظلم کرتا ہے، قتل کرتا ہے، دوسرے انسان کی محنت کی کمائی لوٹتا ہے، دوسروں کی کمائی پر ڈاکے ڈالتا ہے۔ دوسروں کی ماں، بہن کی عزتوں سے کھیلتا ہے۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ اسی لئے میں انسانوں سے دور رہتی ہوں اور کبھی ایک شہر سے دوسرے شہر جانا ہوتا ہے تو ان کے شہروں کے اوپر سے ہو کر گزر جاتی ہوں۔“

میں نے سوچا کہ روہنی اگرچہ ایک بدروح ہے مگر اس کی بات میں کس قدر سچائی ہے۔ ہم اس طرف پرواز کر رہے تھے جس طرف ٹرین جا رہی تھی۔ چلتی ٹرین کی کھڑکی سے باہر نکلتے ہی روہنی نے نیبی حالت میں اتنی تیزی سے پرواز شروع کر دی تھی کہ ٹرین ہمارے پیچھے مجھے ایک سیاہ دھبے کی طرح دکھائی دی اور دوسرے لمحے یہ سیاہ دھبہ بھی غائب ہو گیا۔

جے پور سے دلی کی طرف جائیں تو راستے میں پہلے آگرہ کا بڑا اسٹیشن آتا ہے۔ اس کے بعد متھرا آ جاتا ہے۔ ہم چند منٹ کے بعد آگرہ شہر کے اوپر سے گزر رہے تھے۔

کی بو ہے جنہیں آج سے تین سو برس پہلے جلایا گیا تھا۔“

میں بالکل حیران نہ ہوا۔ میں نے روہنی کی اتنی عقل کو حیران کر دینے والی باتیں دیکھی تھیں کہ اب مجھے کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی خوف ضرور آنے لگتا تھا۔ کیونکہ روہنی بدروح اگرچہ بری بدروح نہیں تھی لیکن اب اس کے ہاتھوں اوپر تلے دو تین بڑی خوفناک وارداتیں سرزد ہو چکی تھیں جو ایک سے بڑھ کر ایک دہشت طاری کر دینے والی تھیں۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔ ”کیا تمہیں آج سے تین سو سال پرانے جلے ہوئے مردوں کی بو آ جاتی ہے؟“

روہنی نے کہا۔ ”مجھے اُن انسانوں کے جلنے کی بھی بو آ جاتی ہے جنہیں آج سے ہزاروں برس پہلے کسی وجہ سے زندہ جلادیا گیا تھا۔“

اس کے بعد میں نے روہنی سے کوئی سوال نہ کیا۔ روہنی کئی بار مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کر چکی تھی۔ مجھے بھی اب اس سے تھوڑی تھوڑی محبت ہونے لگی تھی۔ لیکن اب مجھے اس سے تھوڑا تھوڑا ڈر بھی آنے لگا تھا۔

ہم کھیتوں کے پار درختوں کے جھنڈ کے پاس آکر زمین پر اتر گئے۔ یہاں چاروں طرف ویرانی برس رہی تھی۔ کہیں زمین پر مٹی کی چھوٹی ڈھیریاں تھیں، کہیں خشک گھاس تھی، کہیں جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ ایک طرف کیکر کے کچھ درخت اپنی سیاہ ٹہنیاں پھیلائے اس طرح زمین کی طرف جھکے ہوئے تھے جیسے کسی شے کو اپنے پنوں کی گرفت میں پکڑنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ روہنی میرے پاس ہی کھڑی اُن درختوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”ان درختوں کی طرف چلو۔“

ہم چلتے ہوئے کیکر کے بد شکل درختوں کے پاس آ گئے۔ یہاں ایک ٹوٹا پھوٹا چبوتراد کھائی دیا جس کی ایک جانب سر کندھے اُگے ہوئے تھے۔ روہنی چبوترے کے پاس آکر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ”اس چبوترے سے مجھے سینکڑوں برس پہلے جلے ہوئے مردوں کی بو آ رہی ہے۔ یہی وہ شمشان گھاٹ ہے جہاں آج سے تین سو سال

مجھے ایک جانب دریا کے کنارے تاج محل کی عالی شان عمارت دکھائی دی۔ ہم اگرچہ شہر کے اوپر سے بھی نکل گئے۔ کچھ دیر تک نیچے جنگل اور کھیت دکھائی دیتے رہے جو بڑی تیز رفتاری سے پیچھے کی طرف جا رہے تھے۔ اس کے بعد شہر کے مکان اور مندر نظر آنے لگے۔ روہنی نے کہا۔ ”ہم متھرا پہنچ گئے ہیں۔“

روہنی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ وہ نیچے کی طرف غوطہ لگا گئی۔ اس نے متھرا شہر کے اوپر چاروں طرف دائرے کی شکل میں ایک چکر لگایا اور پھر شہر کی پورب کی جانب درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس اتر گئی۔ ہمیں لوگوں کی نظروں سے چھپنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ہم کسی کو نظر نہیں آتے تھے۔ روہنی آس پاس نظر دوڑاتے ہوئے کہنے لگی۔ ”پرانا شمشان گھاٹ یہیں کہیں ہونا چاہئے۔“

یہ شہر کے باہر علاقہ تھا اور ابھی اس طرف نئی کالونیاں آباد نہیں ہوئی تھیں۔ سامنے کھیت تھے۔ اُن کے پار درختوں کا ایک جھنڈ نظر آ رہا تھا۔ روہنی نے اس طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”چلو وہاں چل کر دیکھتے ہیں۔“

ہم زمین سے پانچ سات فٹ بلند ہو کر ہوا میں تیرتے ہوئے کھیتوں کے پار آ گئے۔ یہاں پہنچ کر روہنی نے اپنی رفتار بالکل آہستہ کر دی۔ اب ہم زمین سے سات فٹ کی بلندی پر ایسے تیر رہے تھے جیسے انسان خواب میں کبھی کبھی اپنے آپ کو اڑتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اچانک روہنی میرا ہاتھ تھامے فضا میں ہی ساکت ہو گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ فاصلے پر دکھائی دینے والے درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”شیردان! مجھے ان درختوں کی طرف سے جلے ہوئے مردوں کی بو آ رہی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے وہاں کوئی نیا شمشان گھاٹ ہو جہاں کوئی مردہ جلایا جا رہا ہو۔“

روہنی بولی۔ ”نہیں، یہ تازہ جلنے والے مردوں کی بو نہیں ہے۔ یہ ان مردوں

پہلے ہمارے دشمن پجاری رگھو کی لاش کو چتا پر جلایا گیا تھا اور وہ پرسوں رات اسی جگہ کی یا تر کرنے آ رہا ہے۔“

میں اس منحوس چبوترے کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ نہ جانے یہ شمشان گھاٹ میری زندگی میں اب کیا نیا گل کھلانے والا ہے۔ روہنی نے ایک طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”شیردان! میرے ساتھ آ جاؤ۔ وہ اندھا کنواں بھی یہاں قریب ہی ہوگا جہاں پجاری رگھو کی بدروح تین راتیں، تین دن ڈیرہ جمائے گی۔“ یہ اندھا کنواں شمشان کے چبوترے کے پیچھے کچھ فاصلے پر تھا۔ مجھے تو یہ اندھا کنواں بالکل نظر نہ آیا۔ لیکن روہنی کی تیز نگاہوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ ایک جگہ اونچے اونچے سرکنڈوں نے کچھ جگہ گھیر رکھی تھی۔

اندھا کنواں ان سرکنڈوں کے درمیان میں تھا۔ کنواں واقعی اندھا تھا۔ اس میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ نیچے تہہ تک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کسی کسی وقت کنوئیں کے اندر سے باریک سی سیٹی کی آواز آ جاتی تھی۔

روہنی نے کہا۔ ”یہ سانپ کی آواز ہے۔“

میرے بدن میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ میں دل میں خدا سے دعائیں مانگنے لگا کہ روہنی کہیں مجھے لے کر کنوئیں میں نہ اتر جائے۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ روہنی کہنے لگی۔ ”ابھی رگھو کی بدروح یہاں نہیں پہنچی۔ ہمیں کنوئیں میں اتر کر اس کا جائزہ لینا ہوگا۔“

میں نے روہنی کو صاف کہہ دیا کہ میں اس آسیب زدہ کنوئیں میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گا جہاں ایک سانپ بھی رہتا ہے۔ روہنی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں پھر تم کیوں ڈرتے ہو؟ کیا پہلے کبھی تمہیں کچھ ہوا ہے جو اب ہوگا۔ اور پھر ہم تو غائب ہیں۔ ہمیں کوئی چیز کیسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔“

میں جانتا تھا کہ مجھے روہنی کے ساتھ کنوئیں میں اترنا ہی پڑے گا۔ میں خاموش

ہو گیا۔ روہنی مجھے ساتھ لے کر اندھے کنوئیں میں اتر گئی۔ ہم اس طرح کنوئیں میں نہیں اتر رہے تھے جس طرح آدمی رسی کی مدد سے کسی کنوئیں میں اترتا ہے۔ ہم کنوئیں کے بالکل درمیان میں سے ہو کر اس طرح نیچے جا رہے تھے جس طرح زوئی کا ہلکا ہلکا گالا آہستہ آہستہ نیچے جا رہا ہو۔

کنوئیں میں جیسے جیسے ہم نیچے اتر رہے تھے اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس اندھیرے میں صرف ہم غیبی حالت میں ہی تھوڑا بہت دیکھ سکتے تھے۔ کنواں اتنا گہرا تھا کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ہم کسی بڑے قطر والے پائپ کے اندر اتر رہے ہیں۔ سانپ کی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ اس قسم کے موقعوں پر مجھے روہنی نے بات کرنے سے منع کر رکھا تھا۔ اس لئے میں اس سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہم کنوئیں میں اتر رہے ہیں یا زمین کے اندر جا رہے ہیں۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ پہلے کنوئیں کے دھانے پر روشنی کا دائرہ دکھائی دیتا تھا مگر اب وہ اتنا دھندلا ہو گیا تھا کہ ہمیں بھی بڑی مشکل سے نظر آتا تھا جن کی نگاہیں غائب ہو جانے کے بعد تیز ہو جاتی تھیں۔

روہنی نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اچانک ایک جگہ پہنچنے پر ایسی آواز آنے لگی جیسے دور کسی بند کو ٹھڑی میں کوئی بچہ رو رہا ہو۔ میں ڈر کر روہنی کے ساتھ لگ گیا۔ یہ آواز غائب ہوئی تو ایک دم سے دس بارہ سانپوں کی دل ہلا دینے والی پھنکاریں سنائی دینے لگیں۔ مجھے کنوئیں کی گول زنگ آلود دیوار پر کئی سانپ ادھر ادھر ریگتے نظر آئے۔ میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

روہنی نے آہستہ سے سرگوشی میں کہا۔ ”ڈرو مت۔ یہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔“

ہم تھوڑا اور نیچے گئے تو سانپوں کی آوازیں خاموش ہو گئیں اور اس کے ساتھ ہی میرے قدم کنوئیں کی تہہ سے لگ گئے۔ کنوئیں کی تہہ لجلجی تھی۔ مجھے ایسے

محسوس ہوا جیسے میں نے کسی بہت بڑی چھپکلی کے اوپر پاؤں رکھ دیئے ہوں۔ میں اتنا کبھی نہیں ڈرتا تھا جتنا خوف مجھے اُس وقت محسوس ہوا۔ اندھیرے میں ہمیں کنوئیں کی گول دیوار دھندلی اور سرمئی رنگ کی نظر آرہی تھی۔ میں نے تہہ کی طرف دیکھا۔ یہ دیکھ کر میری جان ہوا ہو گئی کہ کنوئیں کی تہہ جہاں ہم کھڑے تھے دلدل کی طرح اوپر نیچے ہونے لگی تھی۔ میں نے روہنی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اُس کا بازو پکڑ لیا۔

اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کس قدر خوف محسوس کر رہا ہوں۔ اس نے سرگوشی میں مجھے ہلکی سی سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں شیروان؟“ میں نے لرزتی ہوئی سرگوشی میں کہا۔ ”مجھے کنوئیں کی تہہ نیچے کھینچ رہی ہے۔“ روہنی نے کہا۔ ”یہ تمہارا وہم ہے۔ اپنا دل مضبوط رکھو۔“

میں نے دل میں کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے فوراً بعد جیسے کنوئیں کی تہہ ساکت ہو گئی اور میرا ڈر خوف دور ہو گیا۔ روہنی جھک کر کنوئیں کی دیوار کی زنگ آلود اکھڑی ہوئی اینٹوں کے درمیان پڑے ہوئے چھوٹے بڑے شکافوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ یہ اندھا کنوئیں واقعی چڑیلوں کا مسکن لگتا تھا۔ ایک تو یہ تین سو سال پرانا تھا۔ دوسرے اس کی دیواروں میں گڑھے پڑے ہوئے تھے اور جگہ جگہ جنگلی بیلین اگی ہوئی تھیں۔

دیوار کے ایک شکاف کے پاس روہنی کچھ زیادہ دیر تک رکی رہی۔ وہ اُس اندھے کنوئیں میں جو بھی سراغ رسانی کر رہی تھی مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں سہمی ہوئی نظروں سے ارد گرد یہ دیکھ رہا تھا کہ کوئی سانپ تو میری طرف نہیں بڑھ رہا۔ یہ کنواں دس پندرہ فٹ گولاٹی میں تھا اور کئی جگہوں پر گلے سڑے کوڑے کرکٹ کی ڈھیریاں پڑی ہوئی تھیں۔ کنوئیں کی تہہ جہاں ہم کھڑے تھے بے حد تاریک تھی اور مجھے بھی چیزیں بڑے غور سے دیکھنے کے بعد دکھائی دے رہی تھیں حالانکہ غیبی حالت میں مجھے گہری سے گہری تاریکی میں بھی چیزیں صاف نظر آ جاتی تھیں۔ روہنی

ابھی تک گول دیوار کے شکاف سے باہر نکلی ہوئی اینٹوں کو بڑے غور سے جھک کر دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے ایک نوکیلی اینٹ پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا تو ہلکی سی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ پھر اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا جیسے اسے کسی جگہ سے بجلی کے کرنٹ کا جھٹکا لگا ہو۔

میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”روہنی.....“

روہنی نے فوراً میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ یہ وہی ہاتھ تھا جو وہ شکاف کی نوکیلی اینٹ پر پھیر رہی تھی۔ اُس ہاتھ میں سے جلے ہوئے انسانی گوشت کی بو آرہی تھی۔ میں روہنی سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر پوچھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہاتھ کو کسی چیز کا جھٹکا لگنے کے بعد روہنی بھی ڈر گئی ہے۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور ہم کنوئیں میں اوپر کواٹھنے لگے۔

کنوئیں میں اترتے وقت ہماری رفتار بہت ہی ہلکی تھی لیکن کنوئیں سے باہر جاتے وقت ہماری رفتار تیز ہو گئی تھی۔ ہمیں اپنے نیچے سانپوں کی پھنکاریں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ پھنکاریں آدھے کنوئیں تک ہمارے پیچھے آئیں پھر صرف ایک سانپ کی سیٹی کی آواز رہ گئی۔ اس آواز نے کچھ اوپر تک ہمارا پیچھا کیا پھر یہ آواز بھی خاموش ہو گئی۔ اوپر سے کنوئیں کے دہانے پر ان کی روشنی کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔ ہم کنوئیں سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ باہر آسمان بادلوں سے ڈھک چکا تھا اور کالی گھنائیں چھار ہی تھیں۔ اُن کی وجہ سے دن کی روشنی مدھم پڑ گئی تھی۔

کنوئیں سے باہر نکلنے کے بعد جب روہنی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تو میں نے اُس سے پوچھا۔ ”تمہیں دیوار کے شکاف میں کچھ نظر آیا تھا کیا؟“

روہنی نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”پھر تم نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کیوں کر لیا تھا؟“

روہنی نے کہا۔ ”تم۔۔۔ ت سوال پوچھنے لگے ہو۔ یہ عادت ٹھیک نہیں۔“

میں خاموش ہو گیا۔ اتنے میں بارش شروع ہو گئی۔ ہم چونکہ غائب تھے اس لئے ہم بارش میں بھیگ نہیں سکتے تھے۔ روہنی میرے ساتھ تھی اور ہم زمین سے کوئی تین فٹ بلند ہو کر جا رہے تھے مگر ہم چل نہیں رہے تھے بلکہ فضا میں تیر رہے تھے۔ عام زندگی میں تو شاید آپ کو کبھی اس کا تجربہ نہ ہوا ہو لیکن خواب میں آپ نے ضرور کبھی نہ کبھی اس طرح فضا میں تیرنے کا تجربہ کیا ہوگا۔

ہم واپس دیران شمشان گھاٹ پر آ گئے۔ روہنی نے مجھ سے کہا۔ ”تم یہیں ٹھہرو۔“

میں وہیں فضا میں رُک گیا۔ میرے اندر کوئی موٹرا انجن نہیں لگا ہوا تھا کہ جس کی بریک لگا کر میں رُک جاتا تھا۔ میں جب غائب ہو جاتا تھا تو صرف اپنے ارادے سے پرواز کرنے یا فضا میں تیرنے لگ جاتا تھا اور اپنے ارادے سے ہی فضا میں رُک جاتا تھا۔ میرا ارادہ ہی میرا موٹرا انجن اور اس موٹرا انجن کی بریک تھی۔

میں روہنی کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دیران شمشان گھاٹ کے شکستہ چبوترے کے ارد گرد دو تین چکر لگائے اور واپس میرے پاس آ کر ٹھہر گئی۔ اس وقت بارش تیز ہو گئی تھی اور اُس کا شور سنائی دینے لگا تھا۔ روہنی نے شمشان گھاٹ کی بائیں جانب نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”وہ سامنے ایک کوٹھڑی نظر آرہی ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔“

ہم کوٹھڑی کی طرف بڑھے۔ کوٹھڑی وہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ کوٹھڑی کے در و دیوار سے لگ رہا تھا کہ یہ تین سو برس پرانی کوٹھڑی کا کھنڈر ہے۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی چار دیواری کا رنگ دھوپ اور بارشوں سے سیاہ پڑ چکا تھا۔ دروازہ غائب تھا اس کی جگہ ایک تنگ راستہ اندر جانے کے لئے رہ گیا تھا۔ ہم کوٹھڑی کے اندر چلے گئے۔ کوٹھڑی میں کوئی کھڑکی، کوئی روشندان نہیں تھا۔ تنگ دروازے میں سے ابر آلود دن کی جو مدھم سی روشنی اندر آرہی تھی وہ کوٹھڑی کے اندھیرے میں جذب ہو رہی تھی اور سوائے دروازے کی چوکھٹ کے کوٹھڑی میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی

تھی۔ روہنی نے مجھے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”آج سے تین سو سال پہلے یہاں مردے جلانے والے رہا کرتے تھے۔“

اس کے جواب میں، میں نے کچھ نہ کہا۔ میں اس آسب کو ٹھڑی سے باہر نکل جانا چاہتا تھا مگر روہنی کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اُس پر ظاہر ہو کہ میں خوف محسوس کر رہا ہوں۔ حالانکہ پہلے میں نے کبھی اتنا خوف محسوس نہیں کیا تھا۔ پتہ نہیں اس وقت میں ایسا کیوں محسوس کرنے لگا تھا۔

روہنی کوٹھڑی کے کونے کی طرف گئی۔ اندھیرے میں مجھے وہاں کونے میں مٹی کا ایک بڑا مٹ نظر آ رہا تھا جس کے اوپر کسی نے پتھر کی سل رکھ دی تھی۔ مٹی کا یہ مٹ ایسا تھا جیسا کہ پرانے زمانے میں لوگ دیہات میں اناج رکھنے کے لئے گھروں میں استعمال کرتے تھے۔ روہنی نے مٹ کے اوپر رکھی ہوئی سل کو ایک طرف ہٹایا۔ معلوم نہیں اُس وقت اسے کیا محسوس ہوا ہو گا لیکن مجھے اپنے چہرے پر بائیں رخسار پر کسی کا گرم سانس محسوس ہوا۔ پھر مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میری گردن پر اپنے گیلے لجلجے ہوٹ رکھ دیئے ہوں۔ میں اتنا ڈر گیا کہ چیخ مار کر کوٹھڑی سے بھاگ اٹھا۔ اور شمشان گھاٹ کے چبوترے کے پاس آ کر سہمی ہوئی آنکھوں سے کوٹھڑی کی طرف دیکھنے لگا کہ کوئی آسب شے تو میرے پیچھے نہیں آرہی۔ میں نے روہنی کو فضا میں تیرتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔ بارش ہو رہی تھی۔

روہنی میرے پاس آ کر ایک لمحے کے لئے رُکی۔ اُس نے بڑی سختی سے میرا بازو پکڑا اور مجھے اپنے ساتھ اڑاتے ہوئے وہاں سے شہر کی طرف لے گئی۔ وہ بڑی تیزی سے اُڑ رہی تھی اور چند سیکنڈ میں مٹھرا شہر میں آ گئی۔ سامنے ایک پرانے مندر کی اونچی دیوار تھی جس کے اوپر ایک درخت جھکا ہوا تھا۔ درخت کے گرد مٹی کا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ روہنی مجھے لے کر وہاں بیٹھ گئی۔ اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”تم چیخ مار کر وہاں سے کیوں بھاگے تھے؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے اپنے چہرے پر کسی کا گرم سانس لگا تھا اور پھر کسی شے نے اپنے کیلے ہونٹ میری گردن پر رکھ دیئے تھے۔

روہنی کہنے لگی۔ ”شیروان! میں اُس وقت تک تم سے الگ نہیں ہونا چاہتی جب تک مجھے اس بات کا یقین نہیں ہو جاتا کہ تمہاری زندگی دشمن پجاری رگھو سے محفوظ ہو گئی ہے اور میری آتما کو، میری روح کو نجات مل گئی ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ تمہیں نہ تو اپنی جان عزیز ہے اور نہ یہ چاہتے ہو کہ میری روح کو میرے دشمن رگھو سے نجات ملے۔“

میں شرمندگی محسوس کرنے لگا کہ واقعی مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ روہنی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بڑی آزر دگی اور محبت کے ساتھ کہا۔ ”شیروان! میں نے تمہاری اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ تم میرے خاوند اور میرے محبوب شہزادے شیروان کا دوسرا جہنم نہیں ہو بلکہ اس کے ہم شکل ہو۔ لیکن مجھے تو تمہارے روپ میں اپنا محبوب ہی نظر آتا ہے۔ میں تو تم سے اسی طرح محبت کرتی ہوں اور تمہاری خیر خواہ ہوں جس طرح میں اپنے خاوند شیروان سے محبت کرتی تھی اور اس کی خیر خواہ تھی۔ اس کے علاوہ تمہیں بدروح رگھو کی دشمنی کا ثبوت بھی مل چکا ہے۔ تم دیکھ چکے ہو کہ وہ تم پر تین چار بار قاتلانہ حملہ کر چکا ہے اور تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ اگر تم مجھ سے الگ ہو گئے تو تمہارے لئے پجاری رگھو سے اپنی جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔ پھر تم کیوں مجھ سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میں نے تم سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ڈرنا ایک قدرتی بات ہے۔ کبھی کبھی بہادر سے بہادر آدمی بھی ڈر جاتا ہے۔ بس مجھ پر انسانی کمزوری غالب آگئی اور میں ڈر گیا۔ وعدہ کرتا ہوں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ مگر ایک بات میں تمہیں ضرور بتانا چاہتا ہوں۔ میں نے عین اس وقت اپنے چہرے پر کسی غیبی چیز کا سانس اور اپنی گردن پر اس کے ہونٹوں کا لمس محسوس کیا تھا جب تم نے کوٹھڑی میں

مٹی کے مٹ کے اوپر رکھی ہوئی پتھر کی سل ہٹائی تھی۔“

میری اس بات پر روہنی نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ میں نے اُس کے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھے تو اس سے پوچھا۔ ”کیا تم نے مٹی کے مٹ میں کچھ دیکھا تھا؟“

روہنی نے کہا۔ ”شیروان! اس مٹکے میں کوئی آسیب ضرور تھا جو میرے پتھر کی سل ہٹانے سے مٹکے میں سے تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔“

”آسیب؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

روہنی کہنے لگی۔ ”ہاں آسیب..... یہ وہی آسیب تھا جس کے سانس کو تم نے اپنے چہرے اور جس کے کراہٹ آمیز لہجے ہونٹوں کو تم نے اپنی گردن پر محسوس کیا تھا۔“

میں نے اپنے دل میں کہا۔ لگتا ہے ایک اور بلا میرے پیچھے لگ گئی ہے خدا ہی مجھے ان بدروحوں اور بلاؤں سے بچا سکتا ہے۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”آسیب کا تم نے نام کیوں لیا ہے۔ کیا آسیب کوئی دوسری قسم کی بدروح ہوتی ہے؟“

روہنی نے کہا۔ ”تم اسے نہیں سمجھ سکو گے۔ تم یہی سمجھ لو کہ آسیب بھی ایک بدروح ہوتی ہے مگر اس میں اور بدروح میں یہ فرق ہوتا ہے کہ بدروح کی سزا کی مدت لمبی ہو جائے تو وہ بدروح آسیب میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ آسیب سے بدروحیں بھی گھبراتی ہیں۔ آسیب کو اپنے قبضے میں کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آسیب کو قبضے میں کرنے کا ایک خاص منتر ہوتا ہے جس کو انگریزی منتر یعنی آگ کا منتر کہتے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں وہ منتر آتا ہے؟“

روہنی نے کہا۔ ”آج تک یہ منتر ہندوستان میں صرف دو چار منتروں کو ہی معلوم ہو سکا ہے اور وہ بھی اس منتر کے راز کو مرنے کے بعد اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ وہ کوئی بہت بڑا منتر تھا جس نے شمشان گھاٹ کے مٹکے میں اس آسیب کو قید کیا ہوا

تھا جو میرے پتھر کی سل سرکانے کے بعد مکے میں سے باہر نکل گیا تھا۔“
میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”کیا یہ آسیب تھا جس نے میری گردن پر اپنے گیلے
ہونٹ لگائے تھے؟“

”ہاں۔“ روہنی بولی۔ ”جب یہ آسیب بند مکے میں سے باہر نکلا تھا تو میں نے اس
کی سانس کی دھیمی پھنکار ایسی آواز سنی تھی۔ یہ آسیب مجھے نقصان پہنچا سکتا تھا لیکن
اس نے مجھے کچھ نہیں کہا تھا۔ مگر میں اس بات پر پریشان ہوں کہ آسیب تمہارے
پاس آکر کیوں رک گیا اور اس نے تمہاری گردن پر اپنے گیلے ہونٹ کیوں رکھ دیئے
تھے؟“

مجھے فکر ہوئی کہ کہیں آسیب نے مجھے اپنا نشانہ بنانے کے لئے تو نہیں چن لیا۔
جب میں نے اس کا ذکر روہنی سے کیا تو وہ کہنے لگی۔ ”میرا نہیں خیال کہ یہ آسیب
تمہیں نقصان پہنچانے کے ارادے سے تمہارے پاس آیا تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ
تمہیں نقصان پہنچا چکا ہوتا اور تم اس وقت میرے سامنے نہ ہوتے بلکہ خدا جانے زمین
کے اندر کون سی دنیا میں پہنچ گئے ہوتے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا یہ کسی مرد کا آسیب تھا یا کسی عورت کا؟“

روہنی نے کہا۔ ”یہ کسی نوجوان لڑکی کا آسیب تھا۔“

میں نے دوسرا سوال کیا۔ ”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہ کسی نوجوان لڑکی کا آسیب
تھا۔“

روہنی بولی۔ ”ہمیں پتہ چل جاتا ہے۔ کیسے پتہ چل جاتا ہے؟ تم نہیں سمجھ سکو
گے۔“

میں نے اپنا خوف دور کرنے کی غرض سے پوچھا۔ ”کیا یہ آسیب اس وقت بھی
ہمارے ساتھ ہے؟“

روہنی نے کہا۔ ”میں آسیب کو نہیں دیکھ سکتی۔ آسیب صرف اُن منتر یوں کو ہی

دکھائی دیتا ہے جن کے پاس آسیب کا منتر ہو یا پھر ان لوگوں کو نظر آ جاتا ہے جن کو
آسیب خود اپنی مرضی سے یہ پراسرار منتر بتادے۔“

میں نے روہنی سے کہا کہ تم نے تو آسیب کو کسی بڑے منتری دشمن کی قید سے
رہائی دلائی ہے اور اسے اسی طرح مکے سے آزاد کر لیا ہے جس طرح میں نے تمہیں
مرتان کھول کر پجاری رگھو کی قید سے آزاد کر لیا تھا۔ اس اعتبار سے تو آسیب کو تمہارا
شکر گزار ہونا چاہئے۔ روہنی کہنے لگی۔ ”آسیب کبھی کسی انسان کے دوست نہیں بنتے
لیکن اگر کسی کے دوست بن جائیں تو پھر اُن سے اچھا دوست اور کوئی نہیں ہو سکتا۔
اُس نوجوان لڑکی کے آسیب نے تمہاری گردن کو چوم لیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ
اُس کو تم پسند آگئے ہو اور اُس نے تمہیں اپنا دوست بنا لیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ اس لڑکی کا آسیب مجھے کسی وقت بھی چٹ
سکتا ہے اور جس آدمی کو کوئی آسیب چٹ جائے اس کا تو برا حشر ہو جاتا ہے۔“
روہنی میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ کہنے لگی۔ ”اس نوجوان لڑکی کے آسیب
نے تمہیں پسند کر لیا ہے۔ وہ تمہاری دوست بن گئی ہے۔ اس کا آسیب تمہیں کچھ
نہیں کہے گا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں نے اس نوجوان لڑکی کے آسیب میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر میں اس
لڑکی کے آسیب کو دیکھ ہی نہیں سکتا تو پھر اس کی دوستی کا مجھے کیا فائدہ؟“
روہنی بولی۔ ”شاید وہ خود کبھی تمہیں اپنا آپ دکھا دے لیکن کیا تمہیں اسے
دیکھنے کا بہت شوق ہے؟ اگر ایسی بات ہے تو یہ خیال اپنے دل سے نکال دو۔ آسیب کی
دوستی کا اگر کچھ فائدہ ہوتا ہے تو اس کا نقصان بھی بہت ہوتا ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ اب مجھے اس نوجوان لڑکی کے آسیب سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی
اور میرے دل سے اس کا خوف دور ہو گیا تھا۔ مگر روہنی کی یہ بات میں نے اپنے پلے
باندھ لی تھی کہ کسی آسیب کی دوستی اچھی نہیں ہوتی۔

متھر اشہر کے اُس قدیم مندر کے باہر درخت کے نیچے چبوترے پر بیٹھے باتیں کرتے ہمیں کافی وقت گزر گیا تھا۔ میں اور روہنی ابھی تک غیبی حالت میں ہی تھے اور کوئی ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جتنی دیر تک میں غائب رہتا تھا اتنی دیر تک نہ مجھے بھوک لگتی تھی نہ ہی پیاس لگتی تھی۔ جب غیبی حالت سے زندہ انسانی حالت میں واپس آتا تھا تو بھوک اور پیاس کا احساس بھی میرے دوسرے احساسات کے ساتھ واپس آ جاتا تھا۔

میں نے روہنی سے کہا۔ ”سلطانہ! ہم کب تک یہاں بیٹھے رہیں گے؟ ہمیں آج کا دن اور کل کا دن بھی اس شہر میں گزارنا ہے کیونکہ پجاری رگھو کی بدروح کی یا تراکل رات سے شروع ہونے والی ہے۔ میرا خیال ہے کیوں نہ ہم کسی اچھے سے ہوٹل میں یہ وقت گزاریں۔“

روہنی ہنس کر بولی۔ ”تم زندہ انسان ہو تم لوگوں کو اپنے آرام و آسائش کا ضرور خیال آ جاتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہم آرام نہ کریں تو کام بھی اچھی طرح سے نہیں کر سکتے۔“
روہنی بولی۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ چلو شہر کے کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔“
ہندوستان کو آزادی ملے ابھی دو چار سال ہی گزرے تھے اور متھر اشہر میں بھی ابھی نہ تو اتنی آبادی بڑھی تھی اور نہ فائو سٹار قسم کے ہوٹل ہی تعمیر ہوئے تھے۔ ہم نے پرواز کرتے ہوئے شہر کے اوپر ایک چکر لگایا۔ ہمیں متھر اریلوے سٹیشن کے قریب ایک ہوٹل کی عمارت دکھائی دی۔ روہنی نے کہا۔ ”یہ ہوٹل مجھے اچھا لگتا ہے۔ چلو نیچے اترتے ہیں۔“

ہم ایک خالی جگہ دیکھ کر زمین پر اتر آئے۔ زمین پر اترنے کے بعد روہنی انسانی شکل میں واپس آ گئی۔ وہ مجھے بھی انسانی شکل میں واپس لے آئی۔ ہم ہوٹل کی لابی میں آ گئے۔ اُس زمانے کے مطابق یہ کافی ماڈرن ہوٹل تھا اور خاص طور پر یہ غیر ملکی

سیاحوں کے آرام و آسائش کا خیال رکھ کر بنایا گیا تھا۔ ہم نے اس ہوٹل میں دو ساتھ ساتھ کمرے لے لئے۔ زندہ حالت میں واپس آنے کے بعد مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے نیچے ڈائننگ ہال میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ روہنی میرے ساتھ ہی تھی۔ پھر اپنے کمرے میں جا کر اچھی طرح سے نہا کر تازہ دم ہو گیا۔ روہنی کے پاس ہر وقت انڈین کرنسی کے نوٹ موجود رہتے تھے۔ خدا جانے وہ غیب میں سے کہاں سے نئے نئے نوٹ منگوا لیتی تھی۔ اس نے کچھ نوٹ مجھے بھی دے دیئے تھے کہ اپنے پاس رکھ لوں ان کی کسی وقت مجھے بھی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ میں نے وہ رات ہوٹل میں ہی بسر کی۔

دوسرے دن شہر کی سیر کرتے رہے۔ روہنی مسلمان ہو چکی تھی۔ اسے مندروں میں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ جب سے وہ میرے ساتھ تھی میں نے اسے کبھی کسی مندر میں کسی مورتی کے آگے ماتھا ٹیکتے نہیں دیکھا تھا۔ رات کو ہم ہوٹل میں واپس آ گئے۔ میں نے کھانا کھایا۔ ہم ہوٹل کے ڈائننگ ہال کے کونے میں بیٹھے تھے۔ ہم کافی پی رہے تھے۔ روہنی کے ساتھ ایس لگتا تھا کہ وہ زندہ انسان نہیں تھی بلکہ اپنی بدروح تھی اسے کھانے پینے کی حاجت نہیں تھی مگر وہ جس وقت چاہتی میرے ساتھ کھانا بھی کھا لیتی تھی اور چائے کافی بھی پی لیتی تھی۔ اس کو میں نے کبھی نہاتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر وقت تازہ دم رہتی تھی اور جس قسم کا چاہے لباس پہن لیتی تھی۔ روہنی چونکہ اپنی زندگی میں مسلمان ہو چکی تھی اور اس کے بعد اس کی زندگی نیک اعمال کے ساتھ بسر ہوئی تھی اور وہ صرف ایک سنگین گناہ کی پاداش میں مرنے کے بعد بدروح کی شکل میں سزا بھگت رہی تھی اس لئے وہ بدروحوں کی جملہ بری خصلتوں اور آلودگیوں سے محفوظ تھی اور مجھے اس کے لباس میں سے ہمیشہ ایک طلسمی خوشبو سی آیا کرتی تھی۔

روہنی نے ایک بار مجھے کہا تھا۔ ”انسان کو اپنے برے اعمال کی سزا ضرور بھگتنی

پڑتی ہے۔ کبھی کبھی یہ سزا اسے دنیا میں ہی مل جاتی ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسے مرنے کے بعد یہ سزا ملتی ہے۔ مجھے بھی میری موت کے بعد یہ سزا ملی ہے مگر خدا نے مجھے بخش دیا ہے اور میری سزا کے دن بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔ اگر میں دشمن پجاری رگھو کے قبضے میں نہ گئی تو میری روح کو جلد نجات مل جائے گی اور میں بدروح سے دوبارہ ایک نیک روح کی شکل اختیار کر لوں گی۔“

”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے سلطانہ!“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

روہنی کہنے لگی۔ ”لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ میں پجاری رگھو کی بدروح سے چھٹکارا حاصل کر لوں۔ اگر میں ایسا نہ کر سکی اور پجاری رگھو نے مجھے ایک بار پھر قید کر لیا تو پھر کوئی پتہ نہیں کہ میری کب نجات ہو۔“

میں نے اس سلسلے میں روہنی سے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ کہ آج رات کو ہمیں کیا حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔ کیا تم اکیلی شمشان گھاٹ جاؤ گی یا مجھے بھی تمہارے ساتھ جانا ہوگا۔“

روہنی نے کہا۔ ”تمہارا میرے ساتھ جانا بڑا ضروری ہے۔ اگر مجھے وہاں کوئی حادثہ پیش آ گیا تو کم از کم تم مجھے بچانے کا کوئی جتن، کوئی پائے تو کر سکو گے۔ اگر میں اکیلی وہاں گئی اور مجھے کچھ ہو گیا تو تمہیں کچھ پتہ نہیں چلے گا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ لیکن کیا ہم پہلے جا کر شمشان گھاٹ میں چھپ کر پجاری رگھو کی بدروح کا انتظار کریں گے یا آدھی رات کو اس کے آنے کے بعد وہاں جائیں گے؟“

روہنی کہنے لگی۔ ”ہم آدھی رات سے کچھ دیر پہلے وہاں جائیں گے اور کسی جگہ چھپ کر پجاری رگھو اور اس کے راکھشوں کا انتظار کریں گے۔“

میں نے کہا۔ ”پجاری رگھو تو تمہیں نظر نہیں آئے گا۔ وہ مجھے بھی نظر نہیں

آئے گا۔ پھر ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ وہ شمشان گھاٹ پہنچ گیا ہے۔“

روہنی بولی۔ ”ہم نے دلہن کی کھوپڑی کی راکھ کی دیا سلائی اپنی آنکھوں میں ڈال رکھی ہوگی۔ پجاری رگھو ہمیں نظر آ جائے گا۔“

”اور اگر ہم اُس کو نظر آ گئے تو پھر کیا ہوگا؟“ میں نے سوال کیا۔

روہنی نے کہا۔ ”پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں اس قسم کی باتیں سوچ سوچ کر ڈرتی رہی تو میں کبھی پجاری رگھو پر فتح حاصل نہیں کر سکوں گی اور کبھی مجھے ملتی نہیں ملے گی۔“

ہم رات کے دس بجے کے قریب ہوٹل کے ڈائننگ ہال سے اٹھ کر کمرے میں آ گئے۔ ہم باتیں بھی کر رہے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد دیوار پر لگے کلاک کو بھی دیکھ لیتے تھے۔ جب کلاک نے رات کے پورے گیارہ بجائے تو روہنی نے اپنے بازو کے ساتھ بندھا ہوا وہ تعویذ اتارا جس میں دلہن کی کھوپڑی کی راکھ تھی۔ اُس نے ایک سلائی اپنی آنکھوں میں لگائی اور ایک سلائی میری دونوں آنکھوں میں لگا دی۔ کمال کی بات ہو گئی سلائی کے آنکھوں میں پھرتے ہی میں غائب ہو گیا۔ میں نے دیکھا تو روہنی بھی غائب ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی تسلی کے لئے اس سے پوچھ لیا۔ ”سلطانہ! اگر اس حالت میں پجاری رگھو نے تمہیں دیکھ لیا تو مجھے پہلے ہی بتا دو کہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔ کیونکہ اگر رگھو تمہیں دیکھ سکے گا تو میں بھی اسے ضرور نظر آ جاؤں گا۔“

روہنی سوچ میں پڑ گئی۔ وہ اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ اگر پجاری رگھو نے تمہیں دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔ میں تو انسان نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کھوپڑی کی راکھ کی وجہ سے میں اسے نظر نہ آؤں لیکن تم انسان ہو۔ ہو سکتا ہے تم اسے نظر آ جاؤ۔ اگر ایسا ہو گیا تو پجاری رگھو سب سے پہلے تمہیں اسی لمحے ہلاک کر دے گا اور میں یہ کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ تمہارا میرے ساتھ جانا بھی ضرور ہی ہے تاکہ اگر مجھے کچھ ہو جائے

تو تم اگر میری مدد نہیں کر سکو گے تو کم از کم تمہیں یہ تو معلوم ہو گا کہ میرے ساتھ کیا گزری ہے۔ اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ میری سہیلی مالینی تم سے رابطہ پیدا کرے اور تم سے تمام حالات معلوم کرنے کے بعد میری مدد کر سکے۔“

”تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟“ میں نے پوچھا۔

روہنی کو جیسے ایک دم اس مسئلے کا حل سوچ گیا۔ کہنے لگی۔ ”اس کا ایک ہی حل ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ میں تمہیں چھوٹا سانپ بنا کر اپنی کلائی میں لپیٹ لوں گی۔ اگر رگھو پجاری نے مجھے دیکھ لیا اور مجھ پر اس نے وار کر دیا تو میں اسی لمحے تمہیں نیچے گرادوں گی اور تم وہاں سے نکل جانا۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے سانپ بنتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”میں تمہیں صرف سانپ ہی بنا سکتی ہوں۔ کچھ اور بنانا میری

طاقت سے باہر ہے۔“

مجھے اچانک مالینی کا بتایا ہوا منتر یاد آ گیا۔ میں نے کہا۔ ”کیوں نہ میں تمہاری سہیلی مالینی کا بتایا ہوا منتر پڑھ کر چگاڈ بن جاؤں۔ میں پہلے بھی چگاڈ بن چکا ہوں اور مجھے اس سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔“

روہنی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”مالینی کا بتایا ہوا منتر بڑا خطرناک ہے۔ میں تمہیں یہ منتر پڑھ کر اپنا روپ بدلنے کا مشورہ نہیں دوں گی کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ اس منتر کے اثر سے تم چگاڈ کے علاوہ کسی دوسرے جانور یا درندے کے روپ میں بھی ظاہر ہو سکتے ہو۔ اور تم خواہ کسی بھی درندے کے روپ میں ظاہر ہو گے تو پجاری رگھو تمہیں فوراً دیکھ لے گا اور سب سے پہلے تم پر وار کرے گا۔“

میں نے کہا۔ ”مگر وہ مجھے سانپ کے روپ میں بھی تو دیکھ سکتا ہے۔“

اس پر روہنی نے کہا۔ ”میں تمہیں اتنا چھوٹا سانپ بناؤں گی کہ تم میری کلائی کے ساتھ لپٹے ہوئے اسے دکھائی نہیں دو گے۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ میں بھی کچھ نہ بولا۔ میرے دل میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ خدا جانے میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ روہنی نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ جب بھی مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کرتی تھی تو میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتی تھی۔ کہنے لگی۔ ”شیروان! مجھے معاف کر دینا۔ میری وجہ سے تم ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہو۔ مگر یہ اب تمہاری زندگی اور موت کا مسئلہ بھی بن گیا ہے۔ اگر تم میرا ساتھ چھوڑ دیتے ہو یا میں تمہیں چھوڑ دیتی ہوں تو تم ہمارے دشمن پجاری رگھو کے لئے ایک بڑا آسان شکار بن جاؤ گے۔ وہ جب اور جہاں چاہے گا تمہیں اس طرح پکڑ کر مسل ڈالے گا جس طرح آدمی کسی مکھی کو پکڑ کر مسل ڈالتا ہے۔ اس میں تمہاری بھی موت ہو گی اور میری بھی ایک طرح سے دوسری موت ہو گی۔“

وہی بات تھی کہ میں اس کی مجبوری اور وہ میری مجبوری بن چکی تھی۔ مجھے یہ کہنا ہی پڑا کہ تم مجھے جو مشورہ دو گی میں اس پر عمل کروں گا۔“

روہنی نے کہا۔ ”میں تمہیں سانپ کے روپ میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ میں تمہیں اپنے گریبان کے اندر چھپا کر بھی لے جاسکتی ہوں مگر چھپا کر لے جانے سے وہ مقصد فوت ہو جائے گا جس کے لئے میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گی۔ کیونکہ تم میرے گریبان کے اندر چھپے ہوئے دیکھ نہیں سکو گے کہ میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے اور میں اپنے دشمن کو نظر آ جانے کی صورت میں تمہیں اتنی جلدی اپنے گریبان سے نکال کر پھینک نہیں سکوں گی جتنی جلدی اور رازداری سے میں تمہیں اپنی کلائی سے نیچے گرا سکتی ہوں۔ اس لئے یہ میری مجبوری ہے شیروان۔ میرے محبوب!“

میں نے کہا۔ ”میں اسے مانتا ہوں سلطانہ! لیکن مجھے ایک بات بتاؤ کہ مجھے سانپ سے انسانی روپ میں دوبارہ کون واپس لائے گا؟“

روہنی کہنے لگی۔ ”اگر مجھے پجاری رگھو نے اپنے قبضے میں کر لیا تو اس کی خبر میری سہیلی مالینی کو ضرور ہو جائے گی اور وہ خود تم سے رابطہ پیدا کرے گی اور پھر وہی تمہیں سانپ کی شکل سے واپس انسانی شکل میں لائے گی۔ لیکن اگر کسی وجہ سے مالینی کو پجاری رگھو کے ہاتھوں میرے پکڑے جانے کی خبر ملنے میں دیر لگ گئی تو تم ایسا کرنا کہ یہاں سے بے پور کے دیران محل میں جانا جہاں آدھی رات کو میری بچپن کی سہیلی دُرگا کی بدروح آتی ہے۔ دُرگا کو سارا واقعہ بیان کرنا۔ وہ تمہارا انسانی رُوپ واپس لے آئی گی۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن میں تو بول نہیں سکوں گا۔ میں تو سانپ ہوں گا پھر اسے اپنی کہانی کیسے سناؤں گا اور اسے کس طرح بتاؤں گا کہ میں کون ہوں۔“

روہنی نے اس کے جواب میں کہا۔ ”بے پور کے دیران محل کی بدروح دُرگا تمہیں دیکھتے ہی سمجھ جائے گی کہ تم کون ہو۔ تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔“

اس تمام لمبی بحث مباحث کا نتیجہ یہی نکلا کہ میں انسان سے سانپ بننے اور روہنی مجھے سانپ بنانے پر تیار ہو گئی۔ اس نے مجھے اپنے پلنگ پر بٹھالیا اور منتر پڑھنے لگی تو میں نے اُس کو روک کر کہا۔ ”یہ بتاؤ سلطانہ کہ کیا میں انسانی آواز سن اور سمجھ سکوں گا؟ کیا میں بھی انسانوں کی طرح بول سکوں گا؟“

روہنی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔ تم خود انسانوں کی طرح بول نہیں سکو گے لیکن انسان کو دنیا کی ہر زبان بولتے ہوئے سمجھ جاؤ گے کہ یہ کون سی زبان میں کیا کہہ رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”انسان سانپ کا دشمن ہے۔ مجھے کسی نے بھی دیکھ لیا تو وہ مجھے مارنے کے لئے پتھر اور ڈنڈالے کر مجھ پر ضرور حملہ کرے گا۔ اگر کسی کا پتھر یا ڈنڈا مجھے لگ گیا تو کیا میں مر جاؤں گا؟“

روہنی کہنے لگی۔ ”اگر تم کسی انسان کے ہاتھوں مارے گئے یا کسی کے جوتوں تلے آ کر کچلے گئے تو تم مرد گے نہیں بلکہ غائب ہو جاؤ گے اور اس کے بعد ایک گھنٹے میں یا ایک دن گزر جانے کے بعد تم کسی بھی جگہ دوبارہ نمودار ہو جاؤ گے۔“

”دوبارہ میں سانپ کے رُوپ میں ظاہر ہوں گا یا اپنی انسانی شکل میں؟“ میں نے پوچھا۔

روہنی بولی۔ ”اس بارے میں، میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ تم انسان کے رُوپ میں بھی دوبارہ ظاہر ہو سکتے ہو اور سانپ کی شکل میں بھی ظاہر ہو سکتے ہو۔“

میں دل میں اس منحوس گھڑی کو کونے لگا جب میں نے روہت گڑھ کے قلعے میں روہنی کی آتما کو مرتبان میں سے آزاد کیا تھا۔ مگر اب میرے کونے یا نہ کونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اسی لئے دانش مند لوگوں کا کہنا ہے کہ انسان کو ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہئے اور جس شے سے اس کا کوئی تعلق واسطہ نہ ہو اُس میں دخل نہیں دینا چاہئے اور خاموشی سے آگے گزر جانا چاہئے۔

روہنی نے پوچھا۔ ”کیا تم تیار ہو؟“

”تیار ہوں۔“ میں نے سخت بیزارگی کے عالم میں جواب دیا۔

روہنی اور میں دونوں غیبی حالت میں تھے مگر ایک دوسرے کو نظر آرہے تھے۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور میری جون بدلنے کا خاص منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے ڈر کے مارے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اس لئے کہ میں اپنے آپ کو سانپ کی جون بدلتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ بڑی دہشت طاری کر دینے والی بات تھی۔ تین چار منٹ تک روہنی منتر کا جاپ کرتی رہی۔ جب اُس نے منتر پڑھنا بند کیا تو مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے پیچھے سے مجھے آہستہ سے دھکا دے دیا ہو۔ پھر بھی میں نے آنکھیں بند رکھیں۔ روہنی کی آواز آئی۔ ”شیر وان! آنکھیں کھول کر دیکھو۔“

”یا اللہ خیر!“ میں نے اپنے دل میں کہا اور آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اپنا جسم

دکھائی نہ دیا۔ میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”میں کہاں ہوں؟“

روہنی نے اپنی مٹھی میرے سامنے کھول دی اور بولی۔ ”یہ دیکھو۔“
میں نے دیکھا کہ روہنی کی ہتھیلی پر کمرے کے بلب کی روشنی میں ایک بالشت بھر کا خاکستری رنگ کا سانپ گردن اٹھائے اپنا چھوٹا سا پھن کھولے بیٹھا تھا۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر روہنی سے پوچھا۔ ”کیا یہ میں ہوں؟“
روہنی نے کہا۔ ”ہاں! یہ تم ہی ہو اور تم ہی مجھ سے بات کر رہے ہو۔“
میں نے کہا۔ ”لیکن اگر میں سانپ بن چکا ہوں تو انسانوں کی زبان میں کیسے بات کر سکتا ہوں؟“

روہنی نے کہا۔ ”تم سانپوں کی زبان میں ہی بات کر رہے ہو لیکن میں اپنی بدروحوں والی شکلی کی مدد سے تمہاری سانپوں کی زبان کو یہاں کے انسانوں کی اُردو زبان میں تبدیل کر کے سن رہی ہوں اور تم بھی اسی زبان میں اپنی آواز سن رہے ہو۔“

اس نے مجھے اپنی کلائی کے گرد لپیٹ لیا اور کہا۔ ”میری کلائی سے ہی چپے رہنا شیروان! اگر شمشان گھاٹ پر میں آنکھوں میں ڈالی دہن کی کھوپڑی کی راکھ کی وجہ سے پجاری رگھو کو نظر نہ آئی تو میں موقع پا کر اپنے ایک آتش ناک منتر سے اسے جلا کر بھسم کرنے کی کوشش کروں گی۔ لیکن اگر میں اُسے نظر آگئی اور اس نے مجھ پر وار کر دیا تو میں سب سے پہلا کام یہ کروں گی کہ وہیں اپنی کلائی سے تمہیں نیچے لڑھکا دوں گی اور تم زمین پر گرتے ہی فوراً وہاں سے جتنی دور بھاگ سکو بھاگ جانا میرے ساتھ جو ہو گا میں اسے خود ہی سنبھال لوں گی۔“

میرے اوپر ہدایات و شرائط کا ٹوکرا پھینک دیا گیا تھا مگر میں نے بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ ان ساری شرطوں اور ہدایات کو سنا تھا اور انہیں اپنے دل پر نقش کر لیا تھا۔ کیونکہ ان پر عمل کرنے میں ہی میری زندگی تھی اور ان سے غفلت برتنے

میں میری موت تھی۔

روہنی پلنگ پر سے اٹھ کر ہوٹل کی کھلی کھڑکی کے پاس آگئی۔ یہ اماوس کی رات تھی۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق اماوس کی رات سب سے تاریک اور اندھیری رات ہوتی ہے۔ آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے چاند نہیں نکلا ہوا تھا۔ میں روہنی کی کلائی سے پلٹا ہوا تھا اور وہیں اس کا سارا جسم دیکھ رہا تھا۔ میں گردن گھما کر اپنا سانپ والا جسم بھی دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں آدمی سے چھوٹا سا خاکستری رنگ کا سانپ بن گیا ہوں۔ اسے سنسکرت زبان میں کایا کلپ کہتے ہیں۔ میرا واقعی کایا کلپ ہو گیا ہوا تھا۔

روہنی کھڑکی پر چڑھ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ اس ہوٹل کی دوسری منزل تھی۔ روہنی نے کھڑکی میں سے چھلانگ لگا دی اور وہ نیچے گرنے کی بجائے ہوا میں اڑنے لگی۔ کھڑکی سے باہر آتے ہی وہ دو تین منزلیں اور بلند ہو گئی اور مقہر اشہر کی پورب کی جانب رخ کر لیا۔ میں نے نیچے دیکھا۔ نیچے رات کی تاریکی میں شہر کی روشنیاں ستاروں کی طرح جھللا رہی تھیں۔ روہنی اندھیرے میں شہر کی جھللاتی روشنیوں کے اوپر اڑتی ہوئی شہر کے پورب کی طرف آگئی۔ یہاں نیچے روشنیاں نہیں تھیں بلکہ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ روہنی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”شیروان! ہم پرانے شمشان گھاٹ کے اوپر آگئے ہیں۔ میں نیچے آنے لگی ہوں۔ تم ٹھیک ہونا؟“
میں نے کہا۔ ”ابھی تک بالکل ٹھیک ہوں۔“

روہنی نے بلندی کم کرنی شروع کر دی اور وہ شمشان گھاٹ سے کچھ فاصلے پر درختوں کے جھنڈ کے پاس اتر گئی۔ کہنے لگی۔ ”پجاری رگھو کی بدروح اگر آدمی رات کو شمشان گھاٹ کی یا تر کو آئے گی تو اس کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔“

میں نے اسے کہا۔ ”کسی جگہ چھپ کر اس کا انتظار کرتے ہیں۔“

وہ بولی۔ ”میں شمشان گھاٹ کے چبوترے کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ اب تم

خاموش رہنا۔“

میں نے اسی لمحے خاموشی اختیار کر لی اور کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے ہر حالت میں اپنی جان عزیز تھی۔ رات واقعی بہت اندھیری، تاریک اور ڈراؤنی تھی۔ مگر اس اندھیرے میں بھی میں روہنی کو دیکھ رہا تھا اور وہاں پر موجود ہر شے بھی دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔ روہنی سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی شمشان گھاٹ کے چبوترے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ارد گرد سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چتا کے چبوترے اور شمشان گھاٹ کی پرانی کوٹھڑی کے درمیان ذرا ہٹ کر گھٹا درخت تھا۔ روہنی کہنے لگی۔ ”میں اس درخت میں چھپ کر پجاری رگھو کی بدروح کا انتظار کروں گی۔“

اور وہ زمین سے بلند ہوتے ہوئے درخت کی گھنی شاخوں میں آکر درخت کے ایک دو شاخے پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ وہاں سے شمشان کا چبوترہ اور پرانی کوٹھڑی دونوں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ وہی پرانی کوٹھڑی تھی جس کے اندر وہ پرانا منکا تھا جس کی پتھر کی سل ہٹا کر روہنی نے نوجوان لڑکی کے آسیب کو آزاد کر دیا تھا اور جس کے سانس کو میں نے اپنے چہرے پر محسوس کیا تھا اور جس نے میری گردن کو اپنے گیلے ہونٹوں سے چوم کر میرے بدن پر کچکی طاری کر دی تھی۔

میں روہنی کی کلائی سے پلٹا بالکل خاموش تھا۔ میرا ذہن انسانی ذہن ہی کی طرح سوچ رہا تھا اور اس طرح محسوس کر رہا تھا جس طرح میں انسانی شکل و صورت میں محسوس کیا کرتا تھا۔۔۔۔۔ درخت کی جس شاخ پر روہنی بیٹھی تھی وہاں سے نیچے چٹاکا چبوترہ اور پرانی کوٹھڑی صاف نظر آرہی تھی۔ روہنی نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ ”دُرگانے بتایا تھا کہ پجاری رگھو کی بدروح کے آنے سے پہلے اس کے محافظ چار راکھشش شمشان گھاٹ پر آتے ہیں۔“

میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”کیا ہم انہیں دیکھ سکیں گے؟“

روہنی نے کہا۔ ”ہم نے اپنی آنکھوں میں جس راکھ کی سلائی ڈالی ہوئی ہے وہ

ہمیں ان راکھششوں کو دکھا دے گی۔“

روہنی نے جملہ پورا ہی کیا تھا کہ اچانک جس درخت پر ہم بیٹھے تھے وہ آہستہ آہستہ لرزنا شروع ہو گیا۔ روہنی نے خاموش سرگوشی میں کہا۔ ”خاموش! راکھشش آرہے ہیں۔“

درخت تھوڑی دیر لرزتے رہنے کے بعد ساکت ہو گیا۔ اس کے بعد ایسا گہرا سناٹا چھا گیا کہ مجھے روہنی کے سانس لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس سناٹے میں دور سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے بہت سی بلیاں رو رہی ہوں۔ قریب آتے آتے یہ آوازیں عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازوں میں تبدیل ہو گئیں۔ پھر یہ آوازیں بھی دور ہوتے ہوتے خاموش ہو گئیں۔ اچانک چتا کے چبوترے کے چاروں کونوں پر آگ کے چار شعلے بلند ہوئے۔ پھر یہ شعلے دھوئیں کے ستونوں میں بدل گئے اور غائب ہو گئے۔ روہنی نے مجھے اپنے منہ کے قریب کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ”چاروں راکھشش آگئے ہیں۔ اب وہ منحوس پجاری رگھو آنے والا ہے۔“

O

روہنی کی ہدایت کے مطابق میں چپ تھا۔

میری نگاہیں نیچے کچھ فاصلے پر چتا کے دیران چبوترے پر جمی ہوئی تھیں۔ اتنے میں ایسی آواز سنائی دی جیسے دور کہیں بڑی زور کی آندھی چل رہی ہو۔ یہ آواز قریب آتے آتے مکھیوں کی جھنجھٹ بن گئی اور جیسے ہمارے درخت کے گرد چکر لگانے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ منحوس پجاری رگھو کو ہماری موجودگی کا علم ہو گیا ہے اور اب ہماری خیر نہیں ہے۔ روہنی کو اس نے دوبارہ اپنے قابو میں کرنا ہے لیکن مجھے وہ زندہ نہیں چھوڑے گا لیکن کچھ ہی دیر بعد مکھیوں کی جھنجھٹ کی آوازیں بھی غائب ہو گئیں۔ دوسرے لمحے ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔

چیخ کی آواز ایسی تھی جیسے کسی کو زخ کرتے وقت اس کی آخری چیخ ہو۔ روہنی نے فوراً مجھے کلائی پر سے اتار کر اپنی منٹھی میں بند کر لیا اور پہلے سے بھی زیادہ دھیمی سرگوشی میں کہا۔ ”جب میں تمہیں نیچے گراؤں، فوراً فرار ہو جانا۔“

میں اپنا چھوٹا سا سانپ کا سر روہنی کی انگلیوں میں سے باہر نکال کر دیکھ رہا تھا۔ رات کی تاریکی اور سناٹا اور زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ چیخ کی آواز نے مجھ پر بھی ایک لمحے کے لئے لرزہ طاری کر دیا تھا۔ اتنے میں چار لمبے بالوں والی سیاہ فام عورتیں چتا کے چبوترے کے چاروں کونوں میں نمودار ہوئیں۔ ان عورتوں کے سیاہ جسموں پر بھی بال اگے ہوئے تھے۔ وہ بن مانس لگتی تھیں اور زور زور سے سر ہلارہی تھیں۔ پھر وہ ایک دم بت بن کر ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔

اب تاریکی میں ایک طرف سے ایسی دہشت ناک آواز سنائی دی جیسے کسی مگر مچھ نے پھنکار ماری ہو اور اس کے ساتھ ہی ہمارا دشمن منحوس پجاری رگھو کا تخت نمودار ہوا۔ تخت کو چار سیاہ فام حبشیوں نے اٹھایا ہوا تھا۔ تخت پر ایک کرسی رکھی تھی۔ کرسی پر پجاری رگھو ایک ہاتھ میں عصا لئے زرد لباس میں بیٹھا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے انگارے دہک رہے ہوں۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ سیاہ فام حبشیوں نے تخت چتا کے چبوترے پر رکھ دیا۔ پجاری رگھو تخت پر سے اتر کر چبوترے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی دہکتی ہوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے بالکل ساکت ہو کر کھڑا رہا پھر چبوترے سے اتر اور پرانی کوٹھڑی کی طرف چلنے لگا۔ سیاہ فام حبشی عورتیں دوڑ کر اس کے دائیں بائیں ہو گئیں۔ پھر دو حبشی عورتیں کوٹھڑی کے دروازے کے دونوں جانب ادب سے کھڑی ہو گئیں۔

پجاری رگھو کوٹھڑی میں چلا گیا۔

روہنی نے آہستہ سے مجھے کہا۔ ”اسے ہماری موجودگی کا علم نہیں ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس کے سامنے گئی تو وہ مجھے دیکھ بھی نہیں سکے گا۔“

میں نے بھی سرگوشی میں کہا۔ ”روہنی! سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا۔“

روہنی نے مجھے سختی سے کہا۔ ”تم مت بولو.....“

میں خاموش ہو گیا۔ روہنی نے شاید پجاری رگھو پر وار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا شاید کہ اس نے دلہن کی کھوپڑی کی جوراکھ آنکھوں میں ڈالی ہوئی ہے وہ کام کر گئی ہے اور وہ پجاری رگھو کو نظر نہیں آئے گی۔ کچھ کچھ مجھے بھی ایسا ہی یقین ہو رہا تھا۔ کیونکہ پجاری رگھو کے پاس بے پناہ جادوئی طاقت تھی اور وہ اپنی طاقت کی وجہ سے ہماری موجودگی محسوس کر سکتا تھا مگر وہ ایسے نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اسے ہماری موجودگی کا ذرا سا بھی احساس ہو جاتا تو وہ فوراً ہم پر حملہ کر دیتا۔

روہنی درخت سے آہستہ آہستہ نیچے آگئی۔

میں اس کی مٹھی میں تھا اور اس کی انگلیوں کے درمیان سے اپنی سری باہر نکالے دیکھ رہا تھا۔ روہنی آہستہ آہستہ اس کو ٹھڑی کی طرف چلنے لگی جس میں تھوڑی دیر پہلے پجاری رگھو داخل ہوا تھا۔ دونوں جہتی عورتیں کو ٹھڑی کے باہر دونوں جانب سر جھکائے کھڑی تھیں۔ روہنی ان کے قریب سے ہو کر گزر گئی مگر ان میں سے کوئی بھی روہنی کو نہ دیکھ سکی تھی۔ روہنی نے منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کو ٹھڑی میں داخل ہو گئی۔ کو ٹھڑی میں ایک طاق تھا جس میں کھوپڑی کے پیالے میں دیا جل رہا تھا۔ میں نے خوف کے مارے اپنا سر روہنی کی انگلیوں میں ذرا نیچے کر لیا تھا اور سمٹ گیا تھا۔

میں نے بھی دیکھا اور روہنی نے بھی دیکھا کہ کو ٹھڑی بالکل خالی پڑی تھی۔ ہمارے سامنے تھوڑی دیر پہلے پجاری رگھو اس کو ٹھڑی میں داخل ہوا تھا مگر اب وہ اندر نہیں تھا۔ کو ٹھڑی میں نہ کوئی روشن دان تھا نہ کوئی کھڑکی تھی پھر خدا جانے وہ منحوس پجاری کہاں غائب ہو گیا تھا۔ کو ٹھڑی خالی دیکھ کر روہنی بھی کچھ گھبرا گئی تھی۔ وہ جلدی سے مڑی اور کو ٹھڑی سے باہر نکل آئی۔

جیسے ہی وہ باہر آئی ایک بجلی سی چمکی اور سامنے پجاری رگھو کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ اُس نے گرج کر کہا۔ ”روہنی! میں تیری تلاش میں تھا۔ تو خود ہی میرے جال میں آگئی۔ اب تونج کب نہیں جائے گی۔“

روہنی نے منتر پڑھ کر پجاری کی طرف زور سے پھونک ماری مگر عیار پجاری ہوشیار ہو چکا تھا وہ پلک جھپکتے میں غائب ہو گیا۔ پھر ایسی خوفناک آوازیں آنے لگیں جیسے ہاتھی چنگھاڑ رہے ہوں، شیر دھاڑ رہے ہوں، سانپ پھنکار رہے ہوں۔ روہنی اونچی آواز میں منتر پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھی مگر لگتا تھا کہ پجاری رگھو اُس کی زد سے نکل چکا تھا۔ اس قیامت کی دل دہلا دینے والی چیخوں کی آوازوں میں بجلی کڑکی اور

اچانک جہاں روہنی کھڑی تھی اس کے ارد گرد آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ پجاری رگھو کی گرج دار آواز ایک بار پھر بلند ہوئی۔ ”روہنی! اب تو میری قید میں ہے۔ تجھے اب کوئی نہیں بچا سکتا۔ تیرے منتر مجھ پر کوئی اثر نہیں کریں گے۔“

ہمارے ارد گرد آگ کی چار دیواری کھڑی ہو گئی تھی۔ روہنی نے گھبراہٹ میں مجھ سے کہا۔ ”شیروان بھاگ کر جان بچاؤ۔“

اور اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے آگ کی دیوار کے اوپر سے پیچھے کی جانب اچھال دیا۔ میں روہنی کی مٹھی سے نکل کر شعلوں کی دیوار سے دوڑ کر جھاڑیوں میں آ کر گرا۔ جھاڑیوں میں گرتے ہی میں جتنی تیز ریگ سکتا تھا ریگ کر دوڑنے لگا۔ میرا رخ متھرا شہر کی طرف تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ پجاری رگھو کو میں نظر نہیں آیا تھا ورنہ میں وہاں سے جان بچا کر نہیں نکل سکتا تھا۔ پجاری رگھو مجھے آسانی سے ہلاک کر سکتا تھا۔ دلہن کی کھوپڑی کی راکھ نے مجھے اس کی نگاہوں سے چھپا لیا تھا مگر روہنی کو نہ چھپا سکی تھی۔ اس کی شاید یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ روہنی ایک بدروح تھی اور ایک بدروح اگر دوسری بدروح سے طاقتور ہو تو وہ دوسری کو غیبی حالت میں بھی دیکھ لیتی ہے اور پجاری رگھو کی بدروح بدی کے معاملے میں بہت طاقتور تھی۔ اس نے شاید روہنی کو اسی وقت دیکھ لیا تھا جب وہ چتا کے چبوترے پر اپنے تخت سے اتر کر ایک پل کے لئے ساکت ہو گیا تھا۔ وہ کو ٹھڑی میں اس لئے داخل ہوا تھا کہ روہنی اس کے پیچھے ضرور آئے گی۔ کو ٹھڑی میں جا کر وہ غائب ہو گیا۔ جب میں اور روہنی کو ٹھڑی میں گئے تو کو ٹھڑی خالی تھی۔ ہم پجاری رگھو کی تلاش میں باہر آگئے۔ باہر پجاری رگھو روہنی کو پکڑنے کے لئے اپنا طلسمی جال بچھا چکا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد روہنی اس کے جال میں پھنس گئی۔ لیکن اس نے مجھے آگ کی دیوار کے اوپر سے اچھال کر بچا لیا تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ اگر میں روہنی کی ہدایت پر عمل نہ کرتا اور مالینی بدروح کا چار لفظی آتش منتر پڑھ کر غائب ہوتا تو خدا جانے میں کسی ہاتھی یا لومڑ کے

روپ میں ظاہر ہو جاتا اور دونوں صورتوں میں میرا آگ کی چار دیواری میں سے جان بچا کر نکلنا مشکل بلکہ ناممکن تھا کیونکہ آگ کی یہ دیوار دس فٹ چوری تھی اور اس کی تپش اتنی تھی کہ دور ہی سے آدمی جل جائے۔ مجھے روہنی کے پکڑے جانے کا افسوس تھا۔ مگر اس وقت مجھے اپنی جان کی فکر پڑی ہوئی تھی۔ روہنی نے کہا تھا اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو تم میری فکر نہ کرنا اور جان بچا کر سیدھا جے پور کے ویران قلعے میں پہنچنا وہاں آدھی رات کے بعد ڈرگا کی بدروح آئے گی اسے بتانا کہ پجاری رگھو نے روہنی کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے اور اس سے گن گن کر بدلے لے گا اور ایسی جگہ دفن کر دے گا جہاں سے شاید وہ قیامت تک باہر نہ نکل سکے گی۔

اب مجھے متھرا شہر سے جے پور جانا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک چھوٹے سے سانپ کی حیثیت سے میں یہ طویل سفر کیسے طے کروں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں انسانوں کی طرح دیکھ سکتا تھا، انسانوں کی طرح سوچ سکتا تھا، مجھے سردی گرمی کا احساس نہیں تھا۔ مگر میں غیبی حالت میں نہیں تھا۔ لوگ مجھے دیکھ سکتے تھے اور سانپ اور انسان کی دشمنی شاید ازل سے چلی آ رہی ہے۔ آدمی جہاں کسی سانپ کو دیکھتا ہے اسے مارنے دوڑتا ہے۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ میں صرف رینگ سکتا تھا انسانوں کی طرح چل نہیں سکتا تھا اور انسانوں کی طرح ٹرین میں سوار ہو کر جے پور نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مجھے سانپ کی طرح رینگ کر متھرا شہر سے جے پور پہنچنا تھا جو اس حالت میں مجھے ایک ناممکن بات دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ جے پور کی طرف کون سی سڑک جاتی ہے۔

اگر مجھے سڑک کا علم بھی ہو جاتا تو ایک چھوٹے سے سانپ کے لئے اتنے لمبے سفر میں قدم قدم پر موت کا خوف موجود تھا۔ اس علاقے میں بندر عام تھے۔ راستے میں جنگل بھی پڑتے تھے۔ اگر جنگل میں کسی بندر کی مجھ پر نظر پڑ گئی تو وہ میری تکا بونی کر سکتا تھا۔ راستے میں گاؤں بھی آتے تھے۔ کسی آدمی کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو وہ سانپ

سانپ کا شور مچا دے گا۔ لوگ لائیں پکڑ کر میرے پیچھے دوڑیں گے اور مجھے مار کر ہی دم لیں گے۔ میرے لئے متھرا سے جے پور تک قدم قدم پر موت منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ میں شمشان گھاٹ کے علاقے سے نکل آیا تھا اور اب ایک کھیت کی مینڈھ پر متھرا شہر کی دور سے دکھائی دینے والی روشنیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں۔ میرے لئے ریلوے اسٹیشن کا راستہ معلوم کرنا ہی مشکل تھا۔ میں انسانوں کی آواز میں بول کر کسی کو اپنا ڈکھڑا نہیں سنا سکتا تھا۔ میں صرف پھنکار سکتا تھا اور سیٹی بجا کر بات کر سکتا تھا۔ روہنی اس لئے میری زبان سمجھ لیتی تھی کہ وہ ایک بدروح تھی اور بدروحیں دنیا کے تمام کیڑے مکوڑوں کی بھی بولی سمجھ لیتی ہیں۔ میرے ساتھ یہی ایک سہولت تھی کہ میں اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ سانپ اندھیرے میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن مجھے اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ کون سا راستہ ریلوے اسٹیشن کو جاتا ہے۔ مجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ اگر میں ریلوے اسٹیشن پہنچ بھی گیا تو ٹرین میں کیسے سوار ہوں گا۔ اسٹیشن پر تو روشنیاں ہوں گی وہاں تو لوگ مجھے آسانی سے دیکھ لیں گے اور مجھے ایک سیکنڈ میں کچل دیں گے۔ روہنی نے ایک اور بڑی خوفناک بات کہی تھی۔ اُس نے کہا تھا اگر تمہیں کسی نے کچل دیا، مار دیا تو تم مرو گے نہیں بلکہ غائب ہو جاؤ گے اور غائب ہونے کے ایک گھنٹے یا ایک دن بعد یا تو اپنی اصلی شکل میں ظاہر ہو جاؤ گے یا پھر دوبارہ سانپ کی شکل میں ظاہر ہو جاؤ گے۔

میں ان پریشان خیالات میں الجھا کھیتوں میں سے رینگتا ہوا ایک میدان میں نکل آیا۔ میں نے گردن اٹھا کر ایک جانب دیکھا۔ مجھے کچھ فاصلے پر ریلوے سگنل کی سرخ بتی نظر آئی۔ میں نے سوچا اگر میں ریلوے لائن پر پہنچ کر ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ اپنا سفر شروع کر دوں تو ایک نہ ایک دن جے پور پہنچ جاؤں گا۔ مگر سوال یہ تھا کہ مجھے یہ کیسے پتہ چلے گا کہ یہ ریل کی پٹری جے پور کی طرف ہی جاتی ہے۔ متھرا سے

جے پور جاتے ہوئے راستے میں آگرہ کا بڑا شہر آتا ہے اور وہاں سے جے پور کے لئے ریلوے لائن بدلتی پڑتی ہے۔ اگر بالفرض محال میں آگرہ تک پہنچ بھی جاتا ہوں تو مجھے کون بتائے گا کہ فلاں ریلوے لائن جے پور کی طرف جاتی ہے۔ میں سخت مشکل میں پھنس گیا تھا۔ میری عقل جواب دے گئی تھی۔ صرف ایک خدا کا سہارا ہی تھا اور میں دل میں اسی سے مدد کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ جھاڑیوں، سرکنڈوں اور سوکھی گھاس میں ریگتے ریگتے آخر میں سنگتل کی سرخ بتی کے قریب پہنچ گیا۔

ریلوے لائن زمین سے اونچی تھی۔ میں اوپر آگیا۔ میں نے دیکھا کہ میری بائیں جانب دور مٹھرا ریلوے سٹیشن کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ دائیں جانب ریل کی پٹری دور تک چلی گئی تھی۔ میں نے آسمان پر نگاہ ڈالی اور تاروں کی مدد سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ پچھتم یعنی جنوب کس طرف ہے۔ کیونکہ مٹھرا سے شمال کی جانب دلی تھا اور جنوب کی طرف آگرہ تھا جہاں سے مشرق کی جانب جے پور کے لئے ریلوے لائن بدلتی تھی۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو مجھے سورج سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ شمال جنوب کس طرف ہے مگر رات کے وقت کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔

آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ کسی جگہ چھپ کر مجھے سورج نکلنے کا انتظار کرنا چاہئے۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جنگلی جھاڑیاں دور تک چلی گئی تھیں۔ میں ایک جھاڑی میں گھس کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ میں کہاں سے چلا تھا اور کہاں آگیا ہوں۔ کیا تھا اور کیا ہو گیا ہوں۔ میرے آباؤ اجداد میں سے بھی کسی نے تصور تک نہیں کیا ہو گا وہ انسان سے سانپ بن جائے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا ذہن انسانوں کی طرح کام کر رہا تھا۔ مجھے اپنے بچپن کے بھئی والے دوست جمشید کا خیال آگیا۔ اگر وہ مجھے اس عالم میں دیکھ بھی لے تو اسے کبھی یقین تو کیا خیال بھی نہیں آ سکتا کہ یہ جو چھوٹا سا سانپ جھاڑیوں میں سمٹ کر بیٹھا ہوا ہے یہ اس کا دوست فیروز ہے۔ لیکن میں اس چکر میں پھنس چکا تھا۔ میں نے اپنی حماقت سے بدروحوں کے چھتے کو چھیڑ دیا تھا اور اب

بدروہیں میرے پیچھے پڑ چکی تھیں۔

اگر میرا ذہن بھی سانپ کا ذہن ہو گیا ہوتا تو مجھے صبح کے انتظار کی کوفت نہ اٹھانی پڑتی کیونکہ سانپوں کو قدرت نے وقت کے احساس کی صلاحیت نہ ہونے کے برابر دی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سانپ سردیوں کے موسم اپنے بل میں پڑے پڑے بڑے سکون سے گزار دیتے ہیں۔ انہیں وقت کے گزرنے کا زیادہ احساس نہیں ہوتا مگر میرا ذہن انسان کا ذہن تھا مجھے وقت کے ایک ایک پل کے گزرنے کا احساس ہو رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں جھاڑیوں میں سے نکل کر آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں کو دیکھ لیتا تھا کہ صبح ہوئی ہے یا نہیں.....

ایک بار میں آسمان کو دیکھنے جھاڑی سے باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ سنگتل کی بتی جو پہلے سرخ تھی اب سبز ہو گئی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ سٹیشن کی طرف سے کوئی ٹرین آنے والی تھی۔ میں یونہی ٹرین دیکھنے کے لئے وہیں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دور سے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ میں نے سٹیشن کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا انجن کی ہیڈ لائٹ کی روشنی نظر آئی جو آہستہ آہستہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ پھر انجن کی چمک چمک کی آواز بھی آنے لگی۔ ابھی انڈیا میں ڈیزل ٹرینوں کا رواج نہیں ہوا تھا اور کونلوں سے چلنے والے انجن چلتے تھے۔ مجھے زمین کی تھر تھراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ ٹرین قریب آگئی تھی۔ میں جلدی سے جھاڑیوں میں گھس گیا اور انجن شور مچاتا، دھڑ دھڑاتا زمین کو ہلاتا تیزی سے گزر گیا اور پھر ٹرین گزرنے لگی۔ زمین کی اتنی تھر تھراہٹ میں نے انسان کے روپ میں ٹرین گزرتے وقت کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ٹرین گزر گئی۔ شور اور تھر تھراہٹ آہستہ آہستہ ختم ہو گئی اور ایک بار پھر رات کا سناٹا چھا گیا۔

آخر خدا خدا کر کے آسمان پر دن کا اُجالا نمودار ہونا شروع ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد سورج طلوع ہو گیا۔ سورج کے طلوع ہونے کے بعد میں ریلوے پٹری پر آگیا۔

اور سورج کی طرف دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ جنوب کا رخ کس جانب ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ رات کو جوڑین گزری تھی وہ جنوب کی طرف ہی جارہی تھی اور اگرہ شہر بھی اسی طرف تھا۔ چنانچہ میں ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ جنوب کے رخ پر چل پڑا۔ مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میں کتنی دیر تک رینگتا رہا۔ اتنا ضرور دیکھ لیا تھا کہ میں متھرا شہر سے کافی دور نکل آیا تھا۔ پہلے میری دونوں جانب کھیت تھیں اب جنگلاتی علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ آخر میں رینگتے رینگتے تھک گیا۔ سورج آسمان پر کافی اوپر آچکا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں ذرا دم لینے کے لئے ایک جھاڑی میں گھس کر بیٹھ گیا۔ کنڈلی مار کر بیٹھا تھا۔ اپنا چھوٹا سا سر نیچے کئے ہوئے تھا۔ پتہ نہیں پند رہ منٹ گزرے تھے کہ ایک گھنٹہ گزر گیا تھا، مجھے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ آواز قریب آرہی تھی۔ شاید یہ آدمی ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے۔ جب وہ قریب آئے تو مجھے ان کی گفتگو سنائی دینے لگی۔ ایک آدمی دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ ”یہاں کچھ ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”مجھے بھی ایسے لگ رہا ہے۔“

پہلے کی آواز آئی۔ ”بڑا انمول کیڑا لگتا ہے۔“

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں اور کس انمول کیڑے کی بات کر رہے ہیں کہ اچانک مجھے بین کی آواز آنے لگی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ سپیرے ہیں اور انہوں نے میری بوسو گھ لی ہے اور اب مجھے پکڑنا چاہتے ہیں۔ میں نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو مجھے محسوس ہوا کہ میں خواہش کے باوجود بھاگ نہیں سکتا تھا بھاگنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ بین کی آواز نے مجھ پر ایک جنون کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ میرا ذہن ضرور انسان کا تھا لیکن میرا جسم سانپ کا تھا اور سانپ کے کان نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے جسم کے مساموں سے سنتا ہے۔ میرے جسم کے مساموں پر بین کی آواز کا اثر ہونے لگا تھا۔ میرا جی بے اختیار جھومنے کو چاہ رہا تھا۔

بین کی لے تیز ہوتی جارہی تھی۔ میرا سر اپنے آپ اوپر کواٹھ گیا اور پھوٹا سا پھن بھی خود بخود کھل گیا اور میں بین کی آواز پر جھومنے لگا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد مجھے ایسے لگا جیسے کوئی چھڑی سے جھاڑی کی شاخوں کو ادھر ادھر ہٹا رہا ہے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ سپیرا ہے اور مجھے پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں اس کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانا چاہتا تھا مگر میرے جسم نے میرا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بین کی آواز پر اسی طرح جھوم رہا تھا۔ بین کی آواز نے مجھ پر جادو سا کر دیا تھا۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ بین کی آواز پر مست ہو کر میں جھاڑی سے باہر نکل آیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک سپیرا بیٹھا بین بجا رہا ہے اور دوسرا اس کے پاس بیٹھا ہے۔ اس نے پٹاری کھول کر سامنے رکھی ہوئی ہے اس کے ہاتھ میں کپڑا ہے جیسے ہی میں جھومتا ہوا جھاڑی سے باہر نکلا دوسرے آدمی نے مجھ پر کپڑا پھینکا اور ہاتھ سے پکڑ کر اٹھالیا اور پٹاری میں ڈال کر پٹاری کا منہ بند کر دیا۔

یہ ایک مصیبت پر دوسری مصیبت نازل ہو گئی تھی مگر میں مجبور تھا سوائے صبر کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پٹاری کے اندر گرتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ پٹاری میں پہلے سے ایک سانپ موجود ہے۔ پٹاری میں گھپ اندھیرا تھا مگر میں اس اندھیرے میں ایک سواری رنگ کے سانپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر آہستہ سے پھنکار ماری اور سانپوں کی زبان میں پہلا سوال ہی یہی کیا۔ ”تم کون ہو؟“ میں نے سانپوں کی زبان میں ہی کہا۔ ”تم دیکھ رہے ہو۔ میں بھی ایک سانپ ہوں۔“

سواری سانپ نے کہا۔ ”تم سانپ نہیں ہو۔“

میں نے پوچھا۔ ”اگر سانپ نہیں ہوں تو پھر میں کیا ہوں؟“

سواری سانپ نے کہا۔ ”تم انسان ہو۔ تمہیں کسی نے جادو کے زور سے سانپ

بنادیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اگر تمہیں پتہ چل ہی گیا ہے تو میرے بھائی میں واقعی سانپ نہیں ہوں انسان ہوں اور ایک جادوگر نے مجھ پر جادو کر کے مجھے سانپ بنا دیا ہے۔“

نسواری سانپ نے پوچھا۔ ”تم ریل کی پٹری کے پاس کیا کر رہے تھے؟“

میں نے کہا۔ ”جے پور اپنے مرشد کے پاس جانا چاہتا تھا کیونکہ وہی جادو کا اثر ختم کر کے مجھے پھر سے سانپ کی جون سے انسان کی شکل میں واپس لا سکتے ہیں۔“

نسواری سانپ بولا۔ ”جے پور تو یہاں سے بہت دور ہے تم تو وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”بس میں اسی پریشانی میں جھاڑی میں چھپ کر بیٹھا تھا کہ جے پور کیسے پہنچوں گا کہ سپیرے نے اپنی بین سے مجھے مست کر کے پکڑ لیا۔“

نسواری سانپ کہنے لگا۔ ”تمہارا پکڑا جانا تمہارے حق میں اچھا ثابت ہوا ہے۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

نسواری سانپ بولا۔ ”یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہ سپیرے جے پور ہی جا رہے ہیں۔“

نسواری سانپ کی زبان سے یہ سن کر میں خوش ہو گیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں ویران محل میں دُرگاکا بدروح سے ملاقات کر سکوں گا اور وہ اپنے جادو کے زور سے مجھے سانپ سے دوبارہ انسانی شکل میں واپس لے آئے گی۔ امید کی جو شمع میرے دل میں بجھ چکی تھی وہ پھر سے روشن ہو گئی تھی۔

میں نے نسواری سانپ سے کہا۔ ”لیکن دوست..... جے پور پہنچ کر میں اس پٹاری سے کیسے باہر نکلوں گا؟ یہ سپیرے تو مجھے کبھی آزاد نہیں کریں گے۔ یہ تو کہہ رہا ہے کہ ہمیں بڑا انمول سانپ مل گیا ہے۔“

نسواری سانپ کہنے لگا۔ ”اس کی تم فکر نہ کرو۔ ایک انسان دوسرے انسان کے کام آئے چاہے نہ آئے لیکن ایک سانپ دوسرے سانپ کی ضرورت مدد کرتا ہے۔ میں

تمہاری مدد کروں گا اور تمہیں جے پور پہنچنے کے بعد کسی نہ کسی طرح پٹاری سے باہر نکال دوں گا۔“

سپیرے نے مجھے پٹاری میں بند کرنے کے بعد پٹاری تھیلے میں ڈال کر تھیلیا کندھے سے لٹکالیا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ سپیرا پیدل چلا جا رہا ہے۔ نسواری سانپ نے ان دونوں کو باتیں کرتے کہیں سن لیا تھا کہ وہ جے پور جا رہے ہیں جہاں کوئی میلہ تھا اور ان سپیروں نے وہاں سانپ کا تماشہ دکھانا تھا۔

کانی دیر تک چلتے رہنے کے بعد سپیرے شاید کسی سٹیشن پر آگئے تھے کیونکہ مجھے وہاں کسی صفٹ کرتے انجن کی آواز سنائی دی تھی۔ یہاں سے دونوں سپیرے ٹرین میں سوار ہو گئے اور ٹرین کا سفر شروع ہو گیا۔ راستے میں انہوں نے کہیں سے گاڑی بدلی ہو گی مجھے اس کا علم نہیں کیونکہ میں پٹاری میں بند تھا۔ نسواری سانپ سارا راستہ مجھ سے پوچھتا رہا کہ وہ جادوگر کون تھا اور کہاں رہتا تھا جس نے مجھے انسان سے سانپ بنا دیا تھا۔ میں نے اسے اس سے زیادہ کچھ نہ بتایا کہ وہ کوئی سپیرا ہی لگتا تھا۔ میں نے اس کے ایک سانپ کو مار ڈالا تھا اس نے غصے میں آکر مجھے انسان سے سانپ بنا کر چھوڑ دیا کہ جاب ساری زندگی تو سانپ بنا رہے گا۔

آخر ہم لوگ جے پور پہنچ گئے۔ دونوں سپیرے ایک جگہ آگئے جہاں میلہ لگا ہوا تھا۔ میلے کے شور و غل اور بچوں اور غبارے بیچنے والوں کی آوازیں مجھے پٹاری میں سنائی دے رہی تھیں۔ نسواری سانپ نے مجھے کہا۔ ”یہاں یہ سپیرے تماشا دکھائیں گے۔ تم موقع پا کر بھاگ جانا اور یہ لوگ ہزار بین بجائیں تم ہر گز ہرگز نہ رکنے۔“

میں نے کہا۔ ”مگر میں کیا کروں۔ مجھ پر بین کا بہت زیادہ اور بڑی جلدی اثر ہو جاتا ہے۔“

نسواری سانپ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”پھر تمہیں رات کے وقت جب سپیرے سو رہے ہوں گے فرار ہونا چاہئے۔“

دن بھر سپیرے میلے میں گھوم پھر کر سانپ کا تماشہ دکھاتے رہے۔ انہوں نے مجھے پٹاری سے صرف ایک دو بار ہی باہر نکالا اور سپیرے نے مجھے پکڑے ہی رکھا زمین پر نہ چھوڑا خدا جانے کیوں میں اُسے انمول سانپ لگا تھا اور اسے خطرہ تھا کہ کہیں میں بھاگ نہ جاؤں۔

رات ہو گئی۔ سپیرے ایک جگہ سو گئے۔ باہر کی آوازیں خاموش ہو گئیں۔ میں نے نسواری سانپ سے کہا۔ ”میرا خیال ہے رات ہو گئی ہے۔“
نسواری سانپ نے کہا۔ ”سپیروں کی نیند ذرا اور گہری ہو جائے پھر تمہیں باہر نکالوں گا۔“

جب نسواری سانپ کو یقین ہو گیا کہ سپیرے اب گہری نیند سو رہے ہیں تو اس نے کہا۔ ”میرے ساتھ مل کر زور لگاؤ۔“
ہم نے اپنے سر پٹاری کے ڈھکن کے اندر کی جانب لگائے اور اسے اوپر کی طرف دھکیلتا شروع کر دیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد پٹاری کا ڈھکن ایک طرف سے تھوڑا سا اٹھ گیا۔ نسواری سانپ مجھ سے بڑا تھا۔ اس نے اپنا سر اندر ڈال کر ڈھکنے کو اور زیادہ اٹھا دیا اور بولا۔ ”جاؤ۔ باہر نکل جاؤ۔“

میں میڑھے ڈھکنے میں سے ریگ کر نکل گیا۔ پٹاری کپڑے کے تھیلے میں بند تھی۔ پٹاری سے نکل کر میں کپڑے کے تھیلے میں سے ریگ کر باہر آ گیا۔ باہر آ کر میں نے دیکھا کہ آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے۔ سپیرے ایک جھیل کے کنارے درخت کے نیچے سو رہے تھے۔ میں چھوٹے سائز کا تھا بڑی تیزی کے ساتھ ان کے قریب سے نکل کر جھیل کے کنارے کنارے ریگٹنے لگا۔ مجھے بے پور کے ویران محل میں پہنچنا تھا۔ اگرچہ میرا ذہن انسان کا تھا مگر میرے اندر سانپ کی تمام خصوصیات پیدا ہو چکی تھیں مثلاً میں اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا اور بہت دور سے کسی بو کو یا نمی کو محسوس کر لیتا تھا۔ سانپ میں ایک اور خاص بات بھی ہوتی ہے کہ قدیم تاریخی

عمار توں کے کھنڈروں کی بو بہت پسند کرتا ہے اور ان کھنڈروں اور پرانے قلعوں کی بو اسے کئی میل سے آ جاتی ہے۔ میں جھیل کے ساتھ ساتھ ریگٹتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک مجھے ہوا کے جھونکے کے ساتھ کسی ویران قلعے کے کھنڈر کی نم دار بو محسوس ہوئی۔

مجھے یقین نہیں تھا کہ دُرگابدر روح والے ویران محل کی ہی بو ہے لیکن میں نے بو کا تعاقب شروع کر دیا کہ وہاں چل کر معلوم ہو جائے گا کہ یہ وہی ویران محل ہے یا کوئی اور ہے۔ رات کا وقت تھا اور یہ شہر کے باہر کا علاقہ تھا۔ ہر طرف خاموشی اور اندھیرا تھا۔ شہر کی روشنیاں بائیں جانب کافی فاصلے پر تھیں پرانے محل کے کھنڈر کی بو مجھے ایک ویران محل کے پاس لے آئی۔ میں نے دیکھا کہ محل کے باہر چوکیدار پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے فوراً اسے پہچان لیا یہ دُرگابدر روح کا آسبی محل ہی تھا جو بھارت کے محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں تھا۔ میں محل میں داخل ہو گیا۔ میں راستے سے واقف تھا۔ روہنی بدر روح مجھے جس راہ داری سے لے کر دُرگابدر روح کے تہہ خانے میں لے گئی تھی میں اس راہ داری میں آ گیا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد..... ویران قلعے کے اندر اس ویران محل کی خاموشی سے ویسے ہی خوف سا محسوس ہوتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دُرگابدر روح آدھی رات کو وہاں آیا کرتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ابھی آدھی رات نہیں ہوئی تھی لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر رات آدھی سے زیادہ گزر چکی اور دُرگابدر روح وہاں آ کر جا بھی چکی ہوگی تو میں وہیں چھپ کر دوسری رات کا انتظار کروں گا۔

اب میری نجات دُرگابدر روح کے پاس ہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے بدر روح مالینی کا بتایا ہوا چار لفظوں کا منتر یاد تھا جس کو پڑھ کر میں سانپ سے انسان کے روپ میں آ سکتا تھا۔ مگر اس میں خطرہ صرف اس بات کا تھا کہ انسان کی بجائے میں کسی دوسرے جانور، درندے یا دوبارہ کسی بڑے سانپ کے روپ میں بھی ظاہر ہو

سکتا تھا۔ مالینی کے سامنے جب میں منتر پڑھ کر چگاڑ کے روپ میں آیا تھا تو مالینی بدروح میرے سامنے بیٹھی تھی اور میری نگرانی کر رہی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ میں چگاڑ کے روپ میں ظاہر ہوں۔ لیکن اب میں اکیلا تھا اور روہنی نے بھی مجھے اس منتر کے خطرناک نتائج سے آگاہ کر دیا تھا۔ یہ منتر تو میں صرف اس وقت ہی پڑھ سکتا تھا جب میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہ ہو۔

میں راستہ تلاش کرتے کرتے آخر دیران محل کے اس تہہ خانے میں آ گیا جہاں دُرگاکا بدروح اُس روز ظاہر ہوئی تھی۔ تہہ خانے میں موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گھپ اندھیرا تھا مگر سانپ ہونے کی وجہ سے مجھے اندھیرے میں بھی دکھائی دے رہا تھا۔ محرابی ستونوں کے درمیان جہاں اُس روز دُرگاکا بدروح ظاہر ہوئی تھی اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں تہہ خانے کے ایک کونے میں کنڈلی مار کر بیٹھا بڑے غور سے محرابی ستونوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ شاید وہاں دُرگاکا بدروح نمودار ہو جائے۔ کچھ ہی دیر کے بعد مجھے عجیب سی ڈراؤنی آواز سنائی دی۔ میں چونکا ہوا گیا۔ ڈراؤنی آواز دُور سے قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی اور ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی اس عورت کو آگ میں زندہ جلا رہا ہے۔ پھر ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کانپ گیا۔

چیخ کی آواز خاموش ہو گئی لیکن اس کی بازگشت دیر تک سنائی دیتی رہی۔ ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ اچانک محرابی ستونوں کے درمیان دھوئیں کا ایک ستون نمودار ہوا۔ میں اسے دیکھنے لگا۔ دھوئیں کے ستون نے ایک عورت کی شکل اختیار کر لی۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ دُرگاکا بدروح تھی۔ اس نے اپنی بیٹھی ہوئی ڈراؤنی آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میں جانتی ہوں تم یہاں کس لئے آئے ہو۔ مگر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔“

میں نے سانپ کی آواز میں کہا۔ ”دُرگا! اپنے بھگوان کے لئے میری مدد کرو۔ میں عجیب مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ روہنی کو پجاری رگھوپکڑ کر لے گیا ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں وہ کہاں ہے۔“

دُرگاکا بدروح نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں وہ کہاں ہے مگر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔“

میں نے اس کی منت کرتے ہوئے کہا۔ ”دُرگا! تم روہنی کی بچپن کی سہیلی ہو۔ روہنی نے مجھے خاص طور پر کہا تھا کہ اگر اس کو پجاری رگھوپکڑ اپنے قبضے میں کر لے تو میں تمہارے پاس آ کر تمہیں سارے واقعات بیان کروں۔ اُس نے کہا تھا کہ تم ہی میری اور اس کی مدد کر سکتی ہو۔“

دُرگاکا بدروح بولی۔ ”روہنی پوری بدروح نہیں ہے۔ اگر وہ پوری بدروح ہوتی تو اُسے پجاری رگھوپکڑ کی طلسمی طاقت کا ضرور اندازہ ہوتا مگر وہ پجاری رگھوپکڑ کی طاقت سے واقف نہیں تھی۔ میں روہنی کی بھی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔“

میں نے کہا۔ ”اگر تم روہنی کی مدد نہیں کر سکتیں تو کم از کم مجھے اس عذاب سے نجات دلاؤ اور مجھے سانپ سے دوبارہ انسانی شکل میں لے آؤ اس کے بعد میں خود روہنی کی تلاش کا کوئی راستہ نکال لوں گا۔“

دُرگاکا بدروح نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم بار بار یہ بات نہ دہراؤ۔ میں نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ تمہاری مدد کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔“

میں پریشان ہو گیا کیونکہ اگر دُرگاکا بدروح میری مدد نہیں کر سکتی تھی تو پھر کوئی میری مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ ”دُرگا! پھر میں کیا کروں؟ میں ساری زندگی سانپ بن کر نہیں گزار سکتا۔“

دُرگاکا بولی۔ ”تمہارے پاس مالینی کا دیا ہوا چار لفٹوں کا منتر ہے۔ وہ پڑھو تم سانپ نہیں رہو گے۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن اس میں یہ خطرہ بھی ہے کہ میں نہ جانے کس روپ میں ظاہر ہو جاؤں گا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میں بالکل ہی غائب ہو جاؤں اور دوبارہ کبھی اپنی انسانی شکل میں واپس نہ آسکوں۔“

دُرگاہِ بدروح نے جواب دیا۔ ”یہ خطرہ بہت زیادہ ہے۔“
دُرگاہ کی بدروح خاموش ہو گئی۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور کس سے مدد طلب کروں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دُرگاہ کی بدروح نے کہا۔ ”میں تمہیں آخری بات کہتی ہوں۔“
”وہ کیا؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

دُرگاہ نے کہا۔ ”میرے محل کی چھت پر ایک بارہ دری ہے۔ اس بارہ دری میں بیٹھ کر اپنا پھن کھولو اور مالینی کے بتائے ہوئے آگنی منتر کو دل میں دوبار پڑھو اور اپنے آپ کو قسمت کے حوالے کر دو۔ جو تمہاری قسمت میں ہے تمہیں مل جائے گا۔ جاؤ تمہارے لئے دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔“

اتنا کہہ کر دُرگاہ کی بدروح ایک بھیانک چیخ کی آواز کے ساتھ دھوئیں کے ستون میں تبدیل ہو گئی اور پھر یہ ستون بھی غائب ہو گیا۔ یہ بدروح مجھے ایک زبردست کشمکش میں چھوڑ گئی تھی۔ اگر میں مالینی بدروح کا آگنی منتر پڑھتا ہوں اور اپنی شکل میں ظاہر نہ ہوا تو خدا جانے کس روپ میں ظاہر ہو جاتا ہوں۔ اگر آگنی منتر پڑھنے کا خطرہ مول نہیں لیتا ہوں تو پھر ساری زندگی مجھے سانپ بن کر ہی رہنا ہو گا۔ ویران محل کے تہہ خانے میں کنڈلی مار کر بیٹھا دیر تک سوچتا رہا کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں دنیا میں اکیلا اور بے یار و مددگار رہ گیا ہوں۔ روہنی جو میری ہمدرد تھی اور ہر مشکل وقت میں میرے کام آتی تھی وہ بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ مالینی بدروح کا مجھے ایک جملہ یاد آ رہا تھا۔ اُس نے کہا تھا۔ ”میرا چار لفظی آگنی منتر پڑھنے کے بعد تمہارے چچا گڈ سے انسان کی شکل میں واپس آنے کا صرف ایک

امداد ممکن ہو گا۔“

مجھے اس خرافاتی آگنی منتر سے خوف آنے لگا تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ مجھے یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ سوچ سوچ کر جب میں کسی نتیجے پر نہ پہنچا تو میں نے تنگ آ کر آگنی منتر پڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ میری حالت اس شخص کی سی تھی جسے رات کی تاریکی میں پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گر آیا جا رہا ہو۔ اگر دریا میں گرا تو بچ گیا، اگر پتھروں پر گرا تو چکنا چور ہو گیا۔ میں نے دل میں خدا کو یاد کیا اور تہہ خانے میں سے نکل کر بڑے کمرے میں آ گیا۔ یہاں سے ایک زینہ ویران محل کی چھت کو جاتا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے زینہ طے کیا اور محل کی چھت پر آ گیا۔ محل کی چھت سنان پڑی تھی۔ رات تاریک تھی۔ آسمان پر ستارے ایسے ٹٹمارہے تھے جیسے بجھنے ہی والے ہوں۔ میں نے چھت پر ایک نگاہ ڈالی۔ چھت کے وسط میں مجھے ایک چھوٹی سی بارہ دری نظر آئی یہی وہ بارہ دری تھی جہاں بیٹھ کر مجھے دُرگاہ بدروح کی ہدایت کے مطابق آگنی منتر پڑھنا تھا۔

در چلی جا رہی ہے۔ میرے چاروں طرف اندھیرا اور تاریکی ہی تاریکی تھی۔ میرے کانوں میں شاں شاں کی آوازیں گونج رہی تھیں جیسے میرے آس پاس طوفانی اندھیاں چل رہی ہوں۔ مجھے باقاعدہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں ابھی تک سانپ کی طرح و صورت میں ہی ہوں۔ ابھی میری کایا کلپ نہیں ہوئی اور ابھی مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لیکن میری چھٹی حس مجھے آگاہ کر رہی تھی کہ میرے ساتھ کچھ ہونے والا ہے، کچھ ہو رہا ہے۔ میرے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ میں اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا مگر یہ اندھیروں کا اندھیرا تھا۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ مجھے سنائی دینا بھی بند ہو گیا۔ اب مجھے نہ کچھ نظر آ رہا تھا، نہ سنائی دے رہا تھا جیسے اندھیروں اور سنائوں کے خلا میں معلق ہو گیا تھا۔ میری صرف اپنے کی قوت ابھی باقی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے ساتھ یہ سب کیا کچھ ہو رہا ہے۔ پھر میری سوچنے کی طاقت بھی جواب دینے لگی۔ میرے ذہن پر بے ہوشی سی ڈالی ہو گئی۔ میں نے بڑی کوشش کی، بڑی مدافعت کی، بڑی مزاحمت کی، اپنی ساری طاقت ارادی صرف کر دی مگر میرے ذہن نے میری سوچنے کی اہلیت نے میرا ساتھ ہو کر شروع کر دیا تھا۔ مجھ پر پہلے ایک غنودگی سی طاری ہوئی پھر غنودگی کا احساس ہی ختم ہو گیا۔ شاید میری موت واقع ہو گئی تھی لیکن موت کو محسوس کرنے کے لئے ابھی ایک احساس کی ضرورت ہوتی ہے اور میرا یہ احساس بھی ختم ہو چکا تھا۔ شاید یہ موت سے بھی کچھ آگے کی کیفیت تھی۔ شاید میں موت سے بھی آگے نکل گیا تھا۔

یہ کیفیت مجھ پر کب تک طاری رہی؟ میں اس حالت میں کب تک رہا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ جب میں اپنے ہوش و حواس میں آیا تو سب سے پہلے جو تبدیلی میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ میں اپنے انسانی جسم میں واپس آ چکا تھا۔ یہ میرے لئے خوشی کا نئی مقام تھا۔ میں پوری طرح سے ہوش میں تھا۔ میں کسی سخت چیز پر بالکل سیدھا ہوا تھا۔ میرے چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ اب چونکہ میں سانپ نہیں رہا تھا

اس بارہ درمی میں میری زندگی بھی تھی اور میری موت بھی تھی۔ میں بارہ درمی کی طرف ریٹکنے لگا۔ بارہ درمی کے پاس آکر رُک گیا۔ ایک بار سوچنے لگا کہ واپس جاؤں پھر خیال آیا کہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں اپنی اصلی انسانی شکل میں واپس آ جاؤں۔ میرے دل کو تھوڑا سا حوصلہ ہوا اور میں بارہ درمی پر چڑھ گیا۔ بارہ درمی فرس اکھڑا ہوا تھا۔ میں فرش کے درمیان کنڈلی مار کر بیٹھ گیا لیکن ابھی میں نے اگلی منتر پڑھنے کے لئے اپنا پھن نہیں کھولا تھا۔ میرے اندر سے کوئی چیز مجھے اگلی منتر پڑھنے سے بار بار روک رہی تھی۔ میرا دماغ مجھے بار بار کہہ رہا تھا فیروز تمہارا سامنے یہی ایک دروازہ کھلا ہے باقی تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ تمہیں آج نہیں کل، کل نہیں تو ایک سال بعد، دس سال بعد ادھر ادھر سے گھوم پھر کر پھر اسی دروازے کے پاس آنا ہے۔ زندگی میں تم نے بڑے بڑے داؤ لگائے ہیں۔ یہ داؤ بھی لگا کر دیکھ لو۔ ہو سکتا ہے تم جیت جاؤ۔ مجھے یقین ہو گیا کہ سوچنے کا وقت گزر چکا ہے۔ میں نے فوراً اپنا سانپ والا پھن کھول دیا اور دل میں اگلی منتر کو دو دفعہ پڑھ ڈالا۔

اس لمحے میری جو حالت ہوئی اُسے بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میری آنکھیں کھلی تھیں۔ سانپ کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں کیونکہ اس کے پوٹے نہیں ہوتے۔ وہ اپنی آنکھیں نہ جھپک سکتا ہے نہ بند کر سکتا ہے۔ میری آنکھیں کھلی تھیں مگر مجھے نظر آنا آہستہ آہستہ بند ہو رہا تھا۔ پھر اچانک میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا جیسے میری آنکھوں کے آگے سیاہ پردہ گر دیا گیا ہو۔ مجھے ایسے جیسے میرے ارد گرد تیز آندھیاں چل رہی ہیں۔ شور و غل اور چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میرا دل کانپ رہا تھا۔ میں نے بارہ درمی سے بھاگنا چاہا مگر مجھ پر ہولناک انکشاف ہوا کہ میں ایک دم پتھر کا ہو گیا ہوں۔ میرا جسم اتنا بھاری ہو گیا کہ کوشش کے باوجود میں اپنی جگہ سے ذرا سی بھی حرکت نہ کر سکا۔

پھر ایسے لگا جیسے دیران محل کی بارہ درمی مجھے ساتھ لے کر نیچے ہی نیچے زمین کے

اس لئے اندھیرے میں دیکھ نہیں سکتا تھا اور یہ معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ میں کیوں ہوں۔ اگنی منتر پڑھنے کے بعد میں خوش قسمتی سے اپنی انسانی شکل میں واپس آ گیا۔ مگر میں کس جگہ نمودار ہوا تھا؟ یہ مجھے علم نہیں تھا۔ میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ میرا جسم ٹھنڈا تھا۔ جسم پر ہاتھ پھیرنے پر یہ انکشاف ہوا کہ میں اپنے کپڑوں یعنی پتلون قمیض میں نہیں ہوں بلکہ میرا کسی چادر میں لپٹا ہوا ہے۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ میں نے لیٹے لیٹے گھٹنے اوپر اٹھانے کا تو میرے گھٹنے پوری طرح سے اٹھنے سے پہلے ہی اوپر چھت سے نکلے۔ میں گھبرا کر ہاتھوں کو اوپر اٹھا کر چھت کو ٹولا۔ مجھ پر گویا بجلی سی گری۔ میں لکڑی کے تابوت میں بند تھا اور جس کپڑے میں میرا جسم لپٹا ہوا تھا وہ چادر نہیں تھی بلکہ کفن تھا۔ دہشت سے میرا گلا خشک ہو گیا۔

تو کیا میں مر چکا ہوں؟ مگر نہیں۔ میں زندہ تھا۔ تو پھر مجھے کفن میں لپیٹنا تابوت میں کیوں بند کیا گیا تھا؟ میرے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ میں نے زور سے تابوت کی دیواروں اور چھت کو ہاتھوں سے پھینا شروع کر دیا۔ بہت جلد معلوم ہو گیا کہ میرا تابوت کسی قبر میں دفن ہے اور اسے پھینے اور چیخنے چلانے کا فائدہ نہیں۔ یا خدا! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اس سے تو بہتر تھا کہ میں اگنی پڑھنے کے بعد چمگاڈ بن جاتا، سانپ ہی بن جاتا کم از کم آزاد تو ہوتا۔ زندہ درگم نہ ہوتا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ باہر سے کوئی میری مدد کو نہیں آئے گا اور میں اگر کچھ دیر تابوت میں بند پڑا رہا تو دم گھٹنے سے مر جاؤں گا تو میں نے اپنے ہوش و حواس قابو میں کیا اور اُس زندہ قبر سے بچ نکلنے کا کوئی طریقہ سوچنے لگا۔ کوئی طریقہ سمجھ نہیں آ رہا تھا سوائے اس کے کہ میں ناخنوں سے تابوت کی چھت کو ایک جگہ کریدنے لگا لیکن بہت جلد میرے ہاتھ تھک گئے اور تابوت کی چھت پر کوئی

ہوا۔ بادلوں کی دھیمی گرج سنائی دی جیسے دور کسی پہاڑی وادی میں سے آئی ہو۔ پھر مجھے اپنے اوپر زمین پر بارش کے قطروں کی آواز آنے لگی۔ اوپر زمین پر بارش شروع ہو گئی تھی۔ اپنی بے بسی دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے خدا کے حضور دعا مانگی کہ یا اللہ پاک مجھے اس مصیبت سے نکال لے آئندہ میں ایسی کوئی حماقت نہیں کروں گا جس کی وجہ سے میں کسی عذاب میں پھنس جاؤں۔“

تابوت کے اندر اب میرا دم گھٹنا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے پوری طرح سے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی مگر میں نے حوصلہ نہ ہارا اور ایک بار پھر تابوت کی چھت کو زور زور سے پھینے لگا کہ شاید میری آواز سن کر باہر سے کوئی میری مدد کو آ جائے۔ مگر بہت جلد میرا سانس پھول گیا اور میں بے دم ہو گیا۔ زمین کے اوپر سے بارش کی ہلکی ہلکی آواز مسلسل آرہی تھی۔ خدا جانے مجھے میری قبر میں کتنی گہرائی میں دفن کیا گیا تھا۔ مگر یہ لوگ کون تھے جنہوں نے مجھے زندہ دفن کر دیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں مر گیا تھا اور قبر میں دفن ہونے کے بعد زندہ ہو گیا تھا یا پھر میں مرا نہیں تھا مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا تھا اور مجھے مرا ہوا سمجھ کر قبر میں دفن کر دیا گیا تھا اور قبر میں دفن ہونے کے بعد میرا سکتہ دور ہو گیا اور میں ہوش میں آ گیا تھا۔

اب یہ سب کچھ سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں قبر میں زندہ دفن تھا یا مردہ حالت میں دفن ہونے کے بعد زندہ ہو گیا تھا اور اگر پہلے نہیں مرا تھا تو اب کچھ دیر کے بعد میرا دم گھٹنے سے مرجانا یقینی تھا۔ جیسے بھی ہو مجھے باہر نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ اچانک مجھے خیال آ گیا کہ کیوں نہ میں ایک بار پھر بدروح مالینی کا اگنی منتر دہراؤں؟ ہو سکتا ہے میں منتر پڑھنے کے بعد خواہ جانور کی شکل میں ہی سہی لیکن قبر سے باہر ظاہر ہو جاؤں گا اور اگر سانپ کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہوں تو سانپ بن کر میں تابوت کے کسی سوراخ میں سے نکل کر قبر کی مٹی میں راستہ بنا کر باہر

نکل سکتا ہوں۔ میں نے فوراً آنکھیں بند کیں اور اگنی منتر کو دل میں دوبار دہرایا۔ میرے تابوت کو جیسے ایک دھچکا سالگا اور میں نے جلدی سی آنکھیں کھول دیں۔ میں نے دیکھا کہ میں اسی طرح انسانی شکل میں تابوت میں پڑا تھا۔ میں نے سوچا شاید میں نے گھبراہٹ میں منتر ٹھیک سے نہیں دہرایا۔ میں نے فوراً آنکھیں بند کر لیں اور اس دفعہ اگنی منتر کے ایک ایک لفظ کو دو دو بار دہرایا۔ جیسے ہی میں نے منتر ختم کیا میرے تابوت کو پھر ایک دھچکا لگا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور دیکھا کہ میں اسی طرح تابوت میں پڑا تھا۔

میں نے چھ سات مرتبہ آنکھیں بند کر کے اگنی منتر پڑھا مگر ہر بار تابوت کو دھچکا لگتا اور میں دیکھتا کہ تابوت میں ہی لیٹا ہوا ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ قبر کے اندر اگنی منتر کا اثر ختم ہو چکا ہے اور مجھے اپنے طور پر ہی قبر سے نکلنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ اتنے میں میرے کفن پر تابوت کی چھت پر سے پانی کے قطرے گرنا شروع ہو گئے۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور یہ بارش کا پانی تھا جو قبر کے اندر داخل ہو کر تابوت کی درزوں میں سے میرے اوپر گر رہا تھا۔ کچھ قطرے میرے منہ پر بھی گرے۔ میں نے ہاتھ سے اپنا چہرہ صاف کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ پانی میں مٹی ملی ہوئی تھی۔ اب میں نے یہ کیا کہ دونوں ہتھیلیوں کو تابوت کی چھت کے ساتھ لگا اپنے جسم کا پورا زور لگا کر چھت کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی لیکن تابوت پر سینکڑوں من مٹی پڑی ہوئی تھی۔ تابوت کی چھت تو سینٹ کے لینٹر کی طرح سخت ہو چکی تھی۔ شاید آپ میری بے بسی کا اندازہ نہیں لگا سکتے کیونکہ آپ کبھی اس ہولناک تجربے سے نہیں گزرے۔ خدا کسی کو ایسی آزمائش میں نہ ڈالے۔ یہ وہ حالت ہوتی ہے کہ آدمی زندہ بھی نہیں ہوتا اور مرتا بھی نہیں۔ کاش میں دُرگابدر روح کے کہنے میں آ کر اگنی منتر نہ پڑھتا اس سے تو ہزار درجے بہتر تھا کہ میں سانپ بن کر ہی ساری زندگی گزار دیتا کم از کم زندہ انسانوں کی دنیا میں زندہ تو رہتا۔

قبر کی مٹی میں ملے ہوئے بارش کے پانی کے قطرے تابوت میں سے میرے اوپر مسلسل گر رہے تھے۔ تابوت کے اندر میں نے اچانک یہ تبدیلی محسوس کی کہ میرا دم گھٹنا بند ہو گیا تھا مگر میں زیادہ گہرا سانس نہیں لے سکتا تھا۔ میں ایسے سانس لے رہا تھا جیسے آدمی لمبی دوڑ لگانے کے بعد ہانپ رہا ہو۔

یہ بڑی تکلیف دہ حالت تھی۔ پھر باہر سے بارش اور بادلوں کے گرجنے کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ ایک بار پھر وہی ہولناک سناٹا دوبارہ چھا گیا۔ اس موت کے سناٹے میں تابوت کی درزوں میں سے رکے ہوئے پانی کے قطروں کے گرنے کی ٹپ ٹپ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد یہ آواز بھی خاموش ہو گئی۔ میں اسی طرح چھوٹے چھوٹے سانس لے رہا تھا۔ تابوت میں سخت مایوسی اور کسمپرسی کی حالت میں لیٹا خدا سے اپنے گناہوں کی معافیاں مانگ رہا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ مجھے تابوت میں اپنے پاؤں کی طرف سے ہلکی ہلکی ٹھک ٹھک کی آواز سنائی دی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ شاید یہ کوئی مردار خور جانور تھا جو میرے پاؤں کی طرف سے قبر کھود کر اندر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خوف سے میرے جسم کا رُداں رُداں کھڑا ہو گیا۔ کیا یہ مردار خور مجھے مردہ سمجھ کر کھانے کی کوشش کرے گا؟ مگر میں تو زندہ ہوں۔ لیکن مردار خور جانور کو کیسے پتہ چلے گا کہ میں مردہ نہیں ہوں۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر اس نے اپنے نوکیلے دانتوں سے تابوت کی لکڑی توڑ کر میرے پاؤں کو چبانے کی کوشش کی تو میں زور زور سے جتنی ٹانگیں چلا سکتا ہوں چلا کر اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کروں گا۔ ہو سکتا ہے وہ ڈر کر بھاگ جائے۔ میرے دل میں اُمید کی شمع روشن ہو گئی۔

جس سوراخ میں سے مردار خور لکڑ بگڑ یعنی مردار خور جانور میرے تابوت تک پہنچا ہو گا میں اسے بھگا کر اس سوراخ میں سے باہر نکلنے کی جدوجہد کر سکتا ہوں لیکن قبر کا سوراخ میرے پاؤں کی جانب ہو گا۔ پاؤں کی جانب میں کیسے رینگ سکوں گا؟ اگر یہ

سورخ تابوت میں میرے سر کی جانب ہوتا تو میں الٹا ہو کر کہنیوں کے بل ریگ کر قبر سے باہر نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ لیکن ٹھک ٹھک کی آواز میرے پاؤں کی طرف سے آرہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد یہ آواز آنی بند ہو گئی۔ میں نے کان اس آواز پر لگائے ہوئے تھے۔ آواز کے خاموش ہونے کے بعد پھر وہی سکوت چھا گیا۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ آواز کیسی تھی اور اب خاموش کیوں ہو گئی ہے۔

اچانک میرے پاؤں پر کوئی چیز آکر گری۔ میں نے گھبرا کر پاؤں سمیٹنے چاہے لیکن میرے دونوں پاؤں کسی شکنجے میں بڑی سختی سے جکڑے گئے تھے۔ میں نے اپنے پاؤں کھینچنے کی سر توڑ کوشش کی مگر میرے پاؤں تابوت کے اندر ایک انچ بھی نہ ہلے۔ میں یہی سمجھا کہ مردار خور جانور نے تابوت کی لکڑی توڑ کر میرے دونوں پاؤں اپنے جڑوں میں دبوج لئے ہیں۔

لیکن مجھے مردار خور درندے کے نوکیلے دانت بالکل محسوس نہیں ہو رہے تھے بلکہ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے دونوں پاؤں ٹخنوں تک لوہے کے کسی شکنجے میں جکڑ دیئے گئے ہیں۔ میں نے پاؤں کو پیچھے کھینچنے کی کوشش کی تو مجھے سخت تکلیف محسوس ہوئی۔ میں نے اپنا آپ چھوڑ دیا اور خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا۔۔۔۔۔ پھر ایسا ہوا کہ میرا جسم تابوت کے اندر پاؤں کی جانب سے کسی نے باہر کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ مارے دہشت کے میرے حلق سے چیخ نکل گئی لیکن قبر میں بند تابوت کے اندر میری چیخ میرے ہی کانوں سے ٹکرا کر رہ گئی۔ میرا کفن پوش جسم تابوت میں آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف کھسک رہا تھا۔ اگر یہ کوئی مردار خور درندہ نہیں تھا تو پھر یہ کون تھا جو میرے پاؤں کو شکنجے میں جکڑ کر مجھے تابوت سے باہر کھینچ رہا تھا۔ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا تھا اسے ہونے دوں اور یہ دیکھوں کہ اس کے بعد میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ میرا جسم تابوت میں سے کھسکتے ہوئے باہر نکل گیا تھا اور اب قبر کے کسی گول

سورخ میں سے باہر لے جایا جا رہا تھا۔

میرے اوپر مٹی گرنے لگی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اوپر کئے تو میرے ہاتھ ایک فٹ کی اونچائی پر قبر کے سورخ کی چھت سے ٹکرائے۔ یہ سورخ اتنا ہی چوڑا تھا کہ کسی مردے کی لاش اس میں سے کھینچ کر نکالی جاسکتی تھی۔ اب مجھے اوپر کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ میرے پاؤں اوپر اور سر نیچے ہو گیا تھا۔ تابوت قبر کے اندر کافی گہرائی میں دفن کیا گیا تھا۔ مجھے باہر سے آتی تازہ ہوا محسوس ہونے لگی تھی اور میرا سانس معمول پر آ گیا تھا۔ پھر میں قبر سے باہر آ گیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر سب سے پہلے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا کہ مجھے قبر میں سے کس نے کھینچ کر نکالا ہے۔ عجیب قسم کی سیاہی مائل دھندلی دھندلی روشنی میں مجھے نہ تو کوئی مردار خور جانور نظر آیا نہ کوئی انسان ہی دکھائی دیا۔ میرے پاؤں کا شکنجہ بھی غائب ہو چکا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ مجھے تاریک قبر میں سے کون گھسیٹ کر لایا ہے اور یہ جگہ کون سی ہے۔ میں زمین پر پڑا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنا جائزہ لیا۔ میرا جسم واقعی کفن میں لپٹا ہوا تھا۔ مجھے اپنے جسم میں سے خشک کافور کی بو آرہی تھی۔ یہ بوجھے تابوت کے اندر بھی آئی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ میں مر گیا تھا اور مجھے مردوں کی طرح غسل دے کر کفن پہنا کر تابوت میں بند کر کے قبر میں دفن کر دیا گیا تھا۔

مگر یہ سب کچھ کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ یہ معمہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان کا رنگ سیاہ تھا اور تارے کہیں کہیں لال لال انگاروں کی طرح دکھ رہے تھے۔ ایسے ستارے میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ انہیں دیکھ کر دل پر ہیبت طاری ہو رہی تھی۔ آس پاس کوئی انسان یا جانور تک نظر نہیں آتا تھا۔ کسی چیز یا تک کے بولنے کی آواز نہیں آرہی تھی۔ یا اللہ! یہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ یہ کون سی دنیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اپنی ٹانگوں اور بازوؤں کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ میرا جسم بالکل صحیح حالت میں تھا مگر ٹھنڈا تھا جیسے

مردے کا جسم ہوتا ہے۔ میں نے دونوں ہتھیلیوں کو زور سے رگڑا مگر میرے ہاتھ پھر بھی برف کی طرح ٹھنڈے ہی رہے۔ سیاہی مائل دھندلی روشنی میں مجھے ارد گرد کچھ قبریں نظر آئیں۔ ہر قبر کے پاؤں کی جانب گہرے شکاف تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ ان شکافوں میں سے قبروں کے مردے کھینچ کر باہر نکالے گئے تھے۔

اچانک مجھے اپنی بائیں جانب سے واویلے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ ایک آدمی دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کا چہرہ اور سارا جسم خون میں لت پت تھا۔ وہ بڑی دردناک آواز میں رو رہا تھا اور کہے جا رہا تھا۔ ”مجھے بچالو۔ مجھے بچالو۔ میں نے اپنے آپ کو مار ڈالا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو مار ڈالا ہے۔ مجھے بچالو۔“

جب خون میں لہو لہان دوڑتا ہوا میرے قریب سے گزرا تو یہ دیکھ کر میرا دل کانپ اٹھا کہ اس آدمی کی کھوپڑی کا ایک حصہ غائب تھا۔ شاید اس نے کپٹنی پر پستول کی نالی رکھ کر اپنے آپ کو گولی مار دی تھی۔ میں حیران تھا کہ اس کی آدھی کھوپڑی اڑ چکی ہے پھر بھی وہ زندہ ہے اور بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ کچھ دور جا کر وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

اس کے بعد پھر واویلے کی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے گردن موڑ کر دیکھا کہ ایک عورت جس کے بال کھلے ہیں اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چٹیتی بھاگی چلی آ رہی ہے اور رو رو کر کہے جا رہی ہے۔ ”میں نے زہر کھا لیا ہے۔ مجھے بچالو۔ میرے بیٹے مجھے بچالو۔ میں نے زہر کھا لیا ہے۔ ہائے۔ مجھے بچالو۔“

جب وہ میرے قریب سے گزری تو میں نے دیکھا کہ اس کے منہ، ناک اور کانوں سے نیلے رنگ کا خون بہہ رہا تھا اور اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ میں سرخ انگاروں ایسے ستاروں والے سیاہ آسمان کے نیچے پھٹی ہوئی قبروں کے

پاس حیران پریشان بیٹھا تھا اور یہ سوچ سوچ کر مزید پریشان ہو رہا تھا کہ میں یہاں سے کیسے بھاگوں اور کس طرف کو جاؤں۔ کبھی لگتا کہ میں ڈراؤنے خوابوں کی دنیا میں آ گیا ہوں۔ کبھی لگتا کہ نہیں میں خواب نہیں دیکھ رہا۔ خواب اور حقیقت کی دنیا میں جو فرق ہوتا ہے میں اسے واضح طور پر محسوس کر رہا تھا۔ یہ خواب کی دنیا نہیں تھی لیکن کوئی ایسی دنیا تھی کہ جس کا زندہ انسانوں کی دنیا سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا تھا اور یہ حقیقت کی دنیا ڈراؤنے خوابوں کی دنیا سے بھی زیادہ ہولناک اور دہشت خیز دنیا تھی۔ مجھے کچھ سرگوشیوں کی آوازیں سنائی دیں۔

میں نے دیکھا کہ سفید لباس والے انسانوں کا ایک گروہ دور سے میری طرف آ رہا تھا۔ وہ مجھ سے کافی دور تھے مگر ان کی سرگوشیوں کی آوازیں مجھے بالکل قریب سے سنائی دے رہی تھیں۔ میں ٹمکنی باندھے ان کو دیکھ رہا تھا۔ جب وہ قریب آئے تو میں نے دیکھا کہ ان سب نے کفن پہن رکھے تھے اور ہر ایک کے کفن پر خون کے بڑے بڑے سرخ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ اُن کے سر بھکے ہوئے تھے اور وہ سرد آہیں بھر رہے تھے۔ وہ بڑی آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور ایسے چل رہے تھے جیسے کوئی انہیں دھکیل رہا ہو۔۔۔۔۔ یہ آدمی مجھ سے چار قدم کے فاصلے پر آ کر رک گئے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اپنے بھکے ہوئے سر اس انداز سے ہلاتے تھے جیسے پچھتا رہے ہوں کہ ایسا انہوں نے کیوں کیا۔

ان میں سے ایک آدمی نے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر تک مجھے ٹمکنی باندھ کر دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر اُس نے ایک سسکی بھری اور خشک آواز میں کہا۔ ”تم بھی چلو۔ دروازہ کھلنے والا ہے۔“

اس کے زرد چہرے پر ویرانی برس رہی تھی۔ اس کے بعد سسکیاں بھرتے، آہیں بھرتے، افسوس کے ساتھ اپنے سروں کو بار بار ہلاتے وہاں سے گزر گئے اور کچھ دور جانے کے بعد رات کی سیاہی مائل دھند میں روپوش ہو گئے۔

میں سوچنے لگا کہ یہ لوگ کون تھے اور مجھے کہاں چلنے کے لئے کہہ رہے تھے اور کون سا دروازہ کھلنے والا تھا۔ میں اسی الجھن میں تھا کہ جیسے کسی نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا اور آگے کو دھکیلا۔ میں اپنے آپ جس طرف روتے ہوئے انسانوں کا گروہ گیا تھا اس طرف چلنے لگا۔ مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنی مرضی سے نہیں چل رہا اور کوئی غیبی طاقت مجھے زبردستی آگے کو دھکیل رہی ہے۔ ایک دو بار میں نے رکنے کی کوشش کی مگر میرے قدم نہ رکے اور میں آہستہ آہستہ چلتا گیا جیسے آدمی خواب میں چلتا ہے۔ آگے سرمئی دھند کا بہت بڑا غبار آگیا۔ میں اس غبار میں داخل ہو گیا۔ ایک دم سے عورتوں کی چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہوئیں۔ میں نے ڈر کر پیچھے کی طرف بھاگنا چاہا مگر میں ایسا نہ کر سکا اور میرے قدم آہستہ آہستہ آگے کو ہی اٹھتے رہے۔

عورتوں کی چیخ و پکار اتنی ڈراؤنی ہو گئی کہ میرا ٹھنڈا جسم کانپنے لگا۔ میں آگے ہی آگے چلتا چلا گیا۔ چیخ و پکار کی آوازیں آہستہ آہستہ غائب ہو گئیں، خاموش ہو گئیں۔ سرمئی دھند کا غبار ختم ہوا تو گہرے سیاہ رنگ کا غبار شروع ہو گیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کالی سیاہ گھٹا زمین پر اتر آئی ہے۔ میں اپنے آپ اس گہرے سیاہ غبار میں داخل ہو گیا۔ سیاہ غبار میں داخل ہوتے ہی میرا دم گھٹنے لگا۔ میں منہ کھول کر تیز تیز سانس لینے لگا۔ میں نے بیٹھنا چاہا مگر بیٹھ نہ سکا۔ میں نے بھاگنا چاہا مگر بھاگ نہ سکا۔ میں نے چیخنا چاہا مگر میرے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ میں جیسے زہریلے دھوئیں کے غبار میں سے گزر رہا تھا۔ سانس رکنے کی وجہ سے میرے جسم کو جھٹکے لگنے لگے۔ مجھے لگا میرا سینہ پھٹنے والا ہے۔ پھر اچانک زہریلے دھوئیں کا غبار ختم ہو گیا اور میں پورا سانس لینے لگا۔ اب مجھے اپنے ارد گرد کچھ اور لوگ بھی نظر آئے۔ دھند میں یہ لوگ سایوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے اور سر جھکائے ایک ہی طرف کو آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔

چلتے چلتے وہ مجھ سے آگے نکل گئے اور میں ان کے پیچھے رہ گیا۔

ہم ایک پہاڑی کی طرف جا رہے تھے جس کی چوٹی پر آگ کے شعلے بلند ہو رہے

تھے۔ میں خوف اور دہشت کی حدود سے بھی آگے نکل چکا تھا۔ میرے ٹھنڈے جسم کے بعد میرا دماغ بھی سن ہو کر جیسے ساکت ہو گیا تھا۔ اب نہ مجھ پر خوف کا اثر ہوتا تھا نہ دہشت کا اثر ہوتا تھا۔ میں خود خوف اور دہشت کی علامت بن گیا تھا۔ اس وقت مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ میں واقعی ایک مردہ لاش ہوں اور کوئی اپنی مرضی سے مجھے ایک طرف لئے جا رہا ہے۔

میرے آگے آگے جو لوگ سروں کو جھکائے بوجھل قدم اٹھاتے چلے جا رہے تھے وہ اندھیرے میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اندھیرا انہیں نکل رہا ہے۔ میں نے ایک بار پھر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی مگر میرے جسم پر میرا کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ میرا جسم ایک لاش کی طرح اپنے آپ چل رہا تھا۔ میں اس تاریک غبار کے قریب پہنچ گیا جہاں لوگ اندھیرے میں غائب ہوتے نظر آ رہے تھے۔ یہ پہاڑی کے اندر کسی غار کا دہانہ تھا۔ لوگ اس غار میں داخل ہو رہے تھے۔ مجھے بھی کسی غیبی طاقت نے غار کے اندر دھکیل دیا۔ غار میں ہر طرف سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان میں عورتوں کے رونے کی آوازیں بھی تھیں، مردوں کے رونے کی آوازیں بھی تھیں۔ دہشت کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ میں ایسے لرز رہا تھا جیسے تیز ہوا میں ٹہنی کے ساتھ لگا ہوا خشک پتلا لرز رہا ہوتا ہے۔

چیخوں کی آوازیں ہمارے دائیں بائیں غار میں سے آرہی تھیں۔ ایک بار پھر میرا دم گھٹنے لگا۔ میرے آگے جو لوگ جا رہے تھے ان کے بھی دم گھٹنے لگے تھے۔ مجھے ان کے تیز تیز سانسوں کے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میرا سانس بھی دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی غار میں آگے کسی مقام پر ایک دروازہ کھل گیا۔ مجھے اس دروازے میں سے آگ کے شعلے لپکتے دکھائی دیے۔ لوگوں کے گرد وہ سسکیاں بھرتے، ہچکیاں لیتے آگ کے شعلوں میں گرنا شروع ہو گئے۔ مجھے بھی کوئی نظر نہ آنے والی طاقت آگ کے شعلوں کی طرف دھکیلنے لگے جا رہی تھی۔ لپکتے ہوئے شعلے

میرے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ موت مجھے ایک قدم کے فاصلے پر نظر آنے لگی تھی۔ موت کی دہشت نے میرے ہوش و حواس معطل کر دیئے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا۔۔۔۔۔ اسی وقت اچانک مجھے اپنے چہرے پر کسی کا گرم سانس محسوس ہوا۔ پہلے میں اسے شعلوں کی تپش سمجھا لیکن فوراً بعد مجھے اپنی گردن پر کسی کے گیلے ہونٹوں کا لمس محسوس ہوا اور پھر کسی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مجھے غار کی دیوار کی طرف کھینچ لیا۔

ساری فضا جیسے ایک دم بدل گئی تھی۔ قیامت خیز آگ کے شعلوں کی تپش دور ہو گئی تھی۔ میرے چہرے کو تازہ ہوا چھو رہی تھی۔ اندھیرے میں کوئی مجھے کھینچنے لے جا رہا تھا۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ شاید روہنی میری مدد کو آگئی ہے اور اسی نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا ہے لیکن مجھے اپنے چہرے پر کسی کا گرم سانس محسوس ہوا تھا اور پھر کسی نے میری گردن پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے تھے۔ مجھے یاد آگیا کہ جب متھرا کے دیران شمشان گھاٹ کی کوٹھڑی میں روہنی مجھے ساتھ لے کر داخل ہوئی تھی تو کوٹھڑی کے کونے میں مٹی کا ایک بھاری مٹکا پڑا تھا جس کا منہ پتھر کی بھاری سل سے ڈھکا ہوا تھا۔ روہنی نے جب مٹکے پر رکھی پتھر کی سل کو ایک طرف ہٹایا تھا تو کوٹھڑی میں ایک ہلکی سی پھنکار کی آواز گونجی تھی اور اس کے بعد مجھے اپنے چہرے پر کسی کا گرم سانس محسوس ہوا تھا اور پھر کسی نے میری گردن کو چوم لیا تھا میں خوف زدہ ہو گیا تھا بعد میں جب میں نے روہنی کو یہ واقعہ سنایا تھا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا اور کہا تھا۔

”شیروان! یہ ایک نوجوان لڑکی کا آسیب تھا جو کوٹھڑی کے مٹکے میں بند تھا اور جو مٹکے کی سل سرکانے کی وجہ سے آزاد ہو گیا تھا۔“

مجھے یہ سب کچھ یاد آرہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ اسی نوجوان لڑکی کا آسیب تھا جس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے موت کے غار سے باہر نکال لیا تھا اور اب مجھے سیاہ

آسمان کے نیچے تاریک فضاؤں میں اپنے ساتھ اڑائے لئے جا رہی تھی۔ وہ مجھے کہاں لئے جا رہی تھی؟
مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔

تھا۔ آسیبی لڑکی نے مجھے قبروں کے مُردوں سے تو بچا لیا تھا لیکن کنوئیں سے نکال کر یہ خود مجھے کس گڑھے میں پھینکنے والی تھی؟ اس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا۔

خدا جانے یہ کس دنیا کا آسمان تھا۔ تار کول کی طرح کا لاسیاء تھا اور ستارے سرخ انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ ہر طرف سیاہ غبار پھیلا ہوا تھا لیکن میں سانس آسانی سے لے سکتا تھا۔ فضا ایسی تھی کہ کبھی سرد ہو جاتی تھی اور کبھی گرم ہو جاتی تھی۔ اس ڈراؤنی تاریک رات میں آسیبی لڑکی کے ساتھ پرواز کرتے ہوئے دو تین بار مجھے ایسے لگا جیسے کوئی شے شوں کی آواز کے ساتھ میرے قریب سے گزر گئی ہو۔

اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ میری اُننگی میں روہنی کی دی ہوئی انگوٹھی موجود تھی جس کے بارے میں روہنی نے کہا تھا کہ جب تک یہ انگوٹھی تمہارے ہاتھ میں ہے تمہیں کوئی چڑیل یا بدروح نقصان نہیں پہنچا سکے گی لیکن یہ لڑکی کوئی چڑیل تو نہیں تھی لیکن چڑیل سے زیادہ خطرناک تھی۔

میں اس خوفناک بلکہ دہشت ناک آسیبی لڑکی کے ساتھ سیاہ آسمان کی تاریک فضاؤں میں اڑا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ فیروز شاہ تم کہاں سے چلے تھے اور کہاں سے کہاں آگئے ہو۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس قسم کے توہمات میں پھنس جاؤں گا مگر اب بری طرح پھنس چکا تھا اور خدا کی ذات ہی مجھے اس عذاب سے باہر نکال سکتی تھی۔

آہستہ۔ آہستہ تاریک فضا چھٹنے لگی تھی اور پھر کچھ دور جا کر تاریکی پھیلنے لگی۔ رنگ کی دھند میں بدل گئی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ آسیبی لڑکی مجھے نیچے لے جا رہی ہے۔ آخر ہم اس سواری دھند سے بھی باہر نکل آئے۔ اب میں نے دیکھا کہ رات کا وقت ہے۔ نیلے آسمان پر ستارے چمک رہے ہیں۔ یہ مجھے اپنی دنیا کا آسمان لگتا تھا۔ نیچے نگاہ ڈالی تو مجھے ایک ریل گاڑی جاتی دکھائی دی۔ کم از کم اس بات کی مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ میں بدروحوں اور چڑیلوں کی دنیا سے نکل کر انسانوں کی دنیا میں

آسیبی لڑکی نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اور میں اس کے ساتھ سیاہ آسمان کی تاریک فضا میں اڑا چلا جا رہا تھا۔ اتنا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ وہی آسیبی لڑکی ہے جس نے بھارت کے مٹھرا شہر کے دیران شمشان گھاٹ کی تاریک کوٹھڑی میں مٹی کے مٹکے میں سے آزاد ہونے کے بعد میری گردن کو اپنے گیلے ہونٹوں سے چوما تھا اور جس کا گرم سانس میں نے اپنے چہرے پر محسوس کیا تھا اور جس کے بارے میں میری ساتھی روہنی کی بدروح نے مجھے بتایا تھا کہ یہ کسی لڑکی کا آسیب ہے اور اگر اُس نے تمہاری گردن کو چوم لیا ہے تو تم خوش قسمت ہو کہ اس نے تمہیں پسند کر لیا ہے ورنہ یہ آسیب اتنی خطرناک مخلوق ہے کہ اگر کوئی انسان اس کے قریب چلا جائے تو وہ زندہ نہیں بچتا۔

یہ سن کر میں مزید خوف زدہ ہو گیا تھا کیونکہ اگر کوئی چڑیل کسی انسان سے محبت کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ وہ آدمی تو زندہ درگور ہو گیا۔ چڑیل آخر چڑیل ہوتی ہے۔ چڑیل سے کسی خیر کی توقع رکھنی ایسی ہی ہے جیسے کوئی آدمی آتش فشاں کے دھانے سے کھولنے لاوے میں چھلانگ لگا دے اور یہ امید رکھے کہ وہ زندہ بچ جائے گا۔

لیکن اس آسیبی لڑکی نے مجھے پسند کر لیا تھا اور بقول روہنی کے آسیب چڑیل سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ آسیبی لڑکی مجھے کس عذاب میں ڈالنے والی تھی۔ میں پہلے ہی اپنی ایک حماقت کی وجہ سے بدروحوں اور چڑیلوں کے چکر میں اس بری طرح سے پھنس چکا تھا کہ اس چکر سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا

واپس آگیا تھا۔

اچانک ایک خیال بجلی کی چمک کی طرح میرے ذہن میں لہر اگیا۔

میں نے سوچا کہ اس وقت روہنی کی بدروح میرے ساتھ نہیں ہے وہی مجھے فرار ہونے سے روکا کرتی تھی۔ اب موقع ہے میں آسبی لڑکی کو کسی نہ کسی جگہ دھوکا دے کر فرار ہو سکتا تھا یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا کوئی بہانہ بنا کر میں ایک منٹ کے لئے اس سے الگ ہو جاتا ہوں اور پھر کسی طرح بمبئی اپنے بچپن کے دوست جمشید کے پاس پہنچ جاؤں گا۔

اس وقت آسبی لڑکی جو مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی مجھے ساتھ لئے نیچے گزرتی ریلوے لائن کے اوپر اڑ رہی تھی۔ اس دوران آسبی لڑکی نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں اسے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ غیبی حالت میں تھی۔ مجھے صرف اس کے ہاتھ کی گرفت محسوس ہو رہی تھی۔ اس گرفت میں سختی تھی۔ یہ کسی لڑکی کے ہاتھ کی گرفت نہیں لگتی تھی۔

میں اس انتظار میں تھا کہ دیکھتا ہوں یہ نئی مصیبت مجھے کہاں لے کر جاتی ہے اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ بلا اتنی آسانی سے مجھے چھوڑنے والی نہیں ہے جس وقت آسبی لڑکی مجھے لے کر اڑی تھی تو میں بھی اس کے ساتھ ہی غائب ہو گیا تھا اور مجھے اپنا جسم نظر نہیں آ رہا تھا اپنی دنیا کے چمکیلے ستاروں والے آسمان کی فضا میں آکر میں نے دوبارہ اپنا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ میرا جسم غائب ہے۔ یہ ایک عجیب تجربہ تھا۔

مجھے اپنے جسم کا پورا شعور تھا۔ مجھے اپنے جسم کے سارے اعضاء محسوس ہو رہے تھے۔ میں سن رہا تھا، میں دیکھ رہا تھا۔ فرق صرف اس بات کا تھا کہ مجھے اپنے جسم کا بوجھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اب ہمارے نیچے سے کسی شہر کی روشنیاں گزرنے لگیں۔ ٹرین نے دو تین بار دسل دیا۔ شاید سٹیشن قریب آ رہا تھا۔ مجھ سے رہانہ گیا۔ میں نے

آسبی لڑکی سے پوچھ ہی لیا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور یہ کون سا شہر ہے؟ آسبی لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک جگہ بہت سی روشنیاں تھیں۔ یہ اسی شہر کاریلوے سٹیشن تھا۔ ٹرین سٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ ہم سٹیشن کے اوپر سے گزر گئے۔

مجھے روہنی کا خیال آنے لگا۔ یہ تو آپ پڑھ چکے ہیں کہ روہنی کو بھارت کے شہر متھرا کے ویران شمشان گھاٹ میں اُس کے اور میری جان کے دشمن پجاری رگھو کی بدروح نے اس وقت اپنے طلسم کی طاقت سے اغوا کر لیا تھا جب روہنی نے رگھو کو ہلاک کرنے کے لئے اس پر اپنے سب سے طاقتور منتر کے ذریعے حملہ کیا تھا۔ وہ پجاری رگھو کی طلسمی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکی تھی اور رگھو نے اسے اپنے قبضے میں کر کے غائب کر دیا تھا اور اسے اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ پجاری رگھو کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ شہزادی روہنی جس کا نام اسلام قبول کرنے کے بعد اس کے خاوند نے سلطانہ رکھ دیا تھا اسے دوبارہ اپنے قبضے میں کر لے۔ پجاری رگھو، روہنی کو ہلاک کر چکا تھا اور یہ روہنی کی بدروح تھی جس کو میں نے رانی بانی کے قلعے میں اس مرتبان کو کھول کر آزاد کر دیا تھا جس میں رگھو نے اسے سا لہا سال سے بند کر رکھا تھا۔

پجاری رگھو اس لئے میرا دشمن ہو گیا تھا کہ میں نے روہنی کی بدروح کو آزاد کر دیا تھا۔ پجاری رگھو کی بدروح مجھ سے اس کا بدلہ لینے کے لئے مجھے ہلاک کر کے میری روح کو بھی کسی جگہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دینا چاہتی تھی۔ مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ روہنی کس حال میں ہے اور پجاری رگھو اسے کہاں لے گیا ہے۔

روہنی نے پجاری رگھو کو ہلاک کرنے کی کوشش سے پہلے مجھے سمجھا دیا تھا کہ اگر میں رگھو کو ہلاک کرنے میں ناکام ہو گئی اور اس نے مجھے اپنے قبضے میں کر لیا تو تم بے پور شہر کے پرانے محل کی حویلی میں جا کر میری پرانی سہیلی درگا کی بدروح سے ملنا اور اسے بتانا کہ رگھو مجھے پکڑ کر لے گیا ہے۔ روہنی نے یہ بھی کہا تھا کہ۔ ”اس حالت میں صرف میری سہیلی درگا ہی میری مدد کر سکے گی۔“

چنانچہ میں اس کے شہر جے پور کے پرانے محل کی حویلی میں آدھی رات کو گیا تھا کیونکہ دُرگا کی بدروح وہاں آدھی رات کے بعد نمودار ہوتی ہے۔ میں نے دُرگا کی بدروح سے ملاقات بھی کی تھی مگر دُرگا بدروح نے کہا تھا۔ ”پجاری رگھو، روہنی کو جہاں لے گیا ہے وہاں میں نہیں جاسکتی۔“

دُرگا کی بدروح نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ تم اپنی خیر مناد کیونکہ اب پجاری رگھو تمہیں ہلاک کرنے کی کوشش کرے گا۔ پہلے روہنی تمہاری حفاظت کرتی تھی اور اس نے تمہیں پجاری رگھو کے قاتلانہ حملوں سے بچایا ہوا تھا۔ اب تم اکیلے رہ گئے ہو۔ پجاری رگھو بڑی آسانی سے تمہیں قتل کر کے تمہاری روح اپنے قبضے میں کر لے گا اس لئے یہاں سے جان بچا کر بھاگ جاؤ۔“

میں نے دُرگا سے یہی کہا تھا کہ اچھا میں چلا جاتا ہوں لیکن میں نے اپنے دل میں کہا تھا کہ پہلے بھی مجھے میرے خدا نے رگھو کی ناپاک سازشوں سے بچایا تھا اور اب بھی میرا خدا ہی میری حفاظت کرے گا کیونکہ زندگی اور موت خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

اس کے بعد میرے ساتھ جو بہت ناک واقعات پیش آئے وہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ میں کس طرح ایسے مردہ لوگوں کی دنیا میں پہنچ گیا جو نہ مرے ہوئے تھے نہ زندہ تھے۔ یہ وہ بد قسمت لوگ تھے جنہوں نے خودکشی کی تھی جو ہمارے دین میں حرام ہے گویا وہ حرام موت مرے تھے اس لئے ایک عبرت ناک ماحول میں اپنے کئے کی سزا بھگت رہے تھے۔ پھر کس طرح وہ مجھے بھی ساتھ لے کر آگ اُگلنے غار کی طرف بڑھے لیکن آسیبی لڑکی نے مجھے عین موقع پر وہاں سے اٹھالیا۔ شاید اس لئے کہ میں نے کوئی خودکشی نہیں کی تھی اور میں زندہ تھا۔ آسیبی لڑکی کو میں نے اپنے چہرے پر محسوس ہوتے اس کے گرم سانس اور اپنی گردن پر اس کے گیلے ہونٹوں کو محسوس کر کے پہچان لیا تھا کیونکہ جب دیران شمشان گھاٹ کی اندھیری کوٹھڑی میں میری اس

سے پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اسی طرح پہلے میں نے اپنے چہرے پر اس کے گرم سانس کو اور پھر اپنی گردن پر اس کے گیلے ہونٹوں کو محسوس کیا تھا۔

آسیبی لڑکی مجھے اس قبرستان کے زندہ مردوں کی دنیا سے نکال کر میری اپنی انسانوں کی دنیا میں لے آئی تھی اور ابھی ہم فضا میں پرواز کرتے ہوئے کسی شہر کے اوپر سے گزرے تھے۔ شہر کی روشنیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ آسیبی لڑکی فضا میں بائیں طرف کو مڑی اور اس کے بعد وہ ایک دم سے بلند ہونے لگی۔ ہم رات کے اندھیرے میں اتنی بلندی پر آ گئے کہ مجھے نیچے زمین پر صرف اندھیرا ہی نظر آ رہا تھا۔ کہیں کہیں دور دور روشنی کا کوئی نقطہ ٹٹماتا ہوا نظر آ جاتا تھا۔ مجھے نہ تو یہ پتہ تھا کہ کون سا شہر ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور نہ یہ علم تھا کہ آسیبی لڑکی مجھے کہاں لئے جا رہی ہے۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ میں بھارت کی سر زمین میں ہوں یا پاکستان کے ملک میں ہوں۔ میں آسیبی لڑکی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ میرے پوچھنے پر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا اور میں نے دل میں یہی فیصلہ کیا تھا کہ روہنی کی بدروح سے تو میرا پیچھا چھوٹ گیا ہے اب کوشش کر کے اس آسیبی لڑکی سے بھی پیچھا چھڑا کر کسی جگہ سے فرار ہو جاؤں گا اور سیدھا اپنے ملک پاکستان پہنچ جاؤں گا اور پھر کبھی انڈیا کا رخ نہیں کروں گا۔

اس وقت آسیبی لڑکی مجھے لے کر ایک پہاڑی علاقے کے اوپر سے گزر رہی تھی۔ نیچے اندھیرے میں پہاڑی ڈھلانوں پر کہیں کہیں روشنیاں جھلما رہی تھیں۔ پہاڑی علاقے میں داخل ہوئے ہمیں پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ہم نیچے کی طرف اترنے لگے پھر آسیبی لڑکی نے غوطہ لگایا اور ہم ایک پہاڑی پگڈنڈی پر اتر پڑے۔ زمین پر میرے پاؤں لگتے ہی مجھے جسم کا بوجھ محسوس ہونا شروع ہو گیا لیکن میں ابھی تک غائب ہی تھا۔ آسیبی لڑکی بھی غائب تھی۔ میرا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”یہ کون سے شہر کا ہل ٹیشن ہے؟“

آسیبی لڑکی اس دفعہ بھی خاموش رہی اور اُس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ آخر میں نے تنگ آکر کہا۔ ”کیا تم میری زبان نہیں سمجھتی ہو؟“

آسیبی لڑکی کے ہاتھ نے مجھے آہستہ سے جھٹکا دیا۔ میں ڈر گیا تب مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ کوئی عام دنیاوی مخلوق نہیں ہے بلکہ ایک آسیبی لڑکی ہے۔ ایک لڑکی کا آسیب ہے جو چڑیل سے ایک سو گنا زیادہ خطرناک اور ہلاکت خیز ہوتا ہے۔ روہنی نے مجھے یہی بتایا تھا۔ اس کے بعد میں نے کوئی سوال نہ کیا۔ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اگر آسیبی لڑکی کا دماغ پلٹ گیا تو کہیں وہ میری تکابوئی نہ کر دے۔

آسمان پر صبح کاذب کی پہلی نیلی نیلی روشنی سی نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اس دھندلی روشنی میں میں نے دیکھا کہ ہم ایک پہاڑی قبرستان میں سے گزر رہے تھے۔ ہمارے ارد گرد ٹوٹی پھوٹی قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔ قبروں کے صلیب نمائکتے دیکھ کر مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ کریمین قبرستان ہے۔ تمام قبروں کی حالت خستہ ہو رہی تھی۔ کئی کے تو پتھر اکھڑ کر پرے گرے ہوئے تھے۔ پہاڑی ڈھلان پر نیچے دور تک قبریں چلی گئی تھیں۔ اوپر ایک جانب درختوں کے پیچھے ایک ڈھلوان چھت والی عمارت ابھری ہوئی تھی۔ آسیبی لڑکی اسی عمارت کی طرف جا رہی تھی۔ اس عمارت کی ساخت قدیم زمانے کی کریمین خانقاہوں جیسی تھی مگر یہ خانقاہ آباد نہیں تھی، انتہائی شکستہ اور دیران حالت میں تھی۔ اس کی دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا اور نیچے سے پرانی اینٹیں دکھائی دے رہی تھیں۔

خانقاہ کی چمنی والی مخروطی دیوار اوپر تک چلی گئی تھی اور اس پر ایک سوکھے ہوئے ٹنڈ منڈ درخت کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہاں خاموشی اتنی گہری تھی کہ لگتا تھا کہ ابھی ابھی یہاں سے کوئی چڑیل گزر کر گئی ہے۔ خانقاہ کے محراب دار دروازے کے دونوں کواڑوں میں سے صرف ایک کواڑ بچا ہوا تھا جو پوری طرح سے بند نہیں تھا۔ اندر لحد ہیرا تھا۔ آسیبی لڑکی نے خانقاہ میں داخل ہونے کے بعد میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

اس کے ہاتھ چھوڑتے ہی میں غیبی حالت سے ظاہری حالت میں واپس آ گیا اور مجھے اپنا جسم نظر آنے لگا۔ مگر آسیبی لڑکی ابھی تک غائب تھی وہ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے گردن موڑ کر خانقاہ کے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ ابھی وقت ہے یہیں سے بھاگ جاؤں۔ خدا جانے آسیبی عورت نے کیسے میرے دل کا حال معلوم کر لیا اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا مگر اب میں غائب نہیں ہوا تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور میں خانقاہ کی راہ داری میں سے گزرتے ہوئے اپنے جسم کو دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف نیم تاریکی میں ایک وحشت خیز دیرانی کا منظر تھا۔ کچھ نظر آ رہا تھا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ خانقاہ مجھے چڑیلوں کا مسکن لگتی تھی۔

آسیبی لڑکی اکھڑے ہوئے پتھروں کا ایک زینہ چڑھنے لگی۔ وہ میرے ساتھ چل رہی تھی مگر مجھے اُس کے قدموں کی چاپ بالکل سنائی نہیں دے رہی تھی جبکہ مجھے اپنے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ زینے کی چھ سات سیڑھیاں تھیں اوپر ایک اور راہ داری تھی جہاں چھت کے قریب بنے ہوئے روشندان میں سے صبح کے اجالے کی پھیکی پھیکی روشنی خانقاہ کے آسیب زدہ اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

دائیں جانب ایک کوٹھڑی کا بند دروازہ تھا۔ دروازے پر بھاری تالا پڑا ہوا تھا۔ اس کوٹھڑی کے پاس آکر آسیبی لڑکی رُک گئی۔ پھر اس نے مجھے بند دروازے کی طرف دھکیل دیا۔ میں نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ چہرے کے آگے کر لئے کہ دروازے سے نکلنا نہ جاؤں لیکن میں دروازے سے نکل آیا اور نہ دروازہ کھلا بلکہ میں کوٹھڑی کے اندر تھا۔

یہ کوٹھڑی نہ کشادہ تھی اور نہ چھوٹی تھی۔ اس کی چھت اونچی تھی، ایک لمبی محرابی کھڑکی تھی جو بند تھی۔ کھڑکی کے اوپر چھت کے بالکل قریب ایک روشندان

تھا جس نے آگے پتھر کی جالی لگی ہوئی تھی۔ اس روشندان میں سے صبح کی مدھم سی روشنی اندر آرہی تھی۔ سامنے والی دیوار میں ایک پرانی طرز کا آتش دان بنا ہوا تھا جو خدا جانے کب سے ٹھنڈا پڑا تھا۔ اپنے جسم میں واپس آنے کے بعد مجھے ٹھنڈ کا احساس ہونے لگا تھا۔

یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ یہاں سردی تھی۔ آتش دان کے آگے دونوں جانب دو پرانے گرد آلود بھاری بھر کم و کثورین زمانے کے صوفے پڑے تھے جن پر گرد جم رہی تھی۔ دوسری دیوار کے ساتھ ایک پلنگ لگا تھا جس پر گدیلا بچھا ہوا تھا اور پانکتی کی جانب دو بھاری کبل تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے۔ سرہانے کی جانب ایک سواری رنگ کا پرانا گاؤ تکیہ پڑا تھا۔ پلنگ کے قریب ہی دیوار کے ساتھ بیگر پر ایک کالے رنگ کی برساتی لٹک رہی تھی۔ میں نے قریب جا کر دیکھا وہ کھر درے کبل کا بنا ہوا لمبا کوٹ تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اس کی وضع قطع ملکہ و کثور یہ سے بھی پہلے کے زمانے کی تھی۔ مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں صرف پتلون قمیض میں تھا۔ میں نے کوٹ پہنا تو وہ مجھے بالکل پورا آیا۔ ایسے لگتا تھا کہ کسی نے میرے لئے ہی بنایا تھا۔ لمبا گرم کوٹ پہن لینے سے سردی کا احساس کچھ کم ہوا۔ میں آتش دان کے پاس آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی میں صوفے پر بیٹھا مجھے ایسی آواز آئی جیسے میں کسی بلی کے اوپر بیٹھ گیا ہوں۔ میں گھبرا کر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جھک کر صوفے کو دیکھا مگر وہاں کوئی بلی وغیرہ نہیں تھی۔ یہ شاید پرانا ہونے کی وجہ سے اس کے سپرنگوں کی آواز تھی۔ لگتا تھا کہ سو سال سے اس پر کوئی نہیں بیٹھا۔ اس خیال سے کہ شاید باہر دھوپ نکلی ہوئی ہو اور کھڑکی میں سے کچھ دھوپ شاید کوٹھڑی میں بھی آجائے میں نے بڑی کوشش کر کے کھڑکی کھول دی۔ باہر دھند کے بادل تیر رہے تھے۔ کھڑکی کے اوپر کسی جنگلی بیل نے چھج سا ڈال رکھا تھا۔ کھڑکی میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور ان سلاخوں کے درمیان صرف اتنی سی جگہ ہی چھوڑی گئی

تھی کہ میں وہاں سے صرف اپنا ہاتھ ہی باہر نکال سکتا تھا۔ باہر سے سرد ہوا اندر آنے لگی۔

میں کھڑکی بند کر کے تازہ ہوا کو اندر آنے سے نہیں روکنا چاہتا تھا۔ پرانا ہی سہی مگر لمبا گرم کوٹ مجھے مل گیا تھا اس نے کسی حد تک سردی کو روک لیا تھا۔ میں نے کھڑکی کھلی ہی رہنے دی اور آتش دان کے پاس صوفے پر بیٹھ کر کوٹھڑی کے دروازے کی طرف نگاہ اٹھائی۔ دروازہ اسی طرح بند تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر کی جانب دروازے پر پرانے زمانے کا مضبوط تالا بھی اسی طرح دروازے پر لگا ہوا تھا۔ پھر بھی میں نے اٹھ کر دروازے کو آہستہ سے اپنی طرف کھینچنا چاہا مگر دروازہ تو جیسے چٹان بنا ہوا تھا اس نے ذرا سی بھی حرکت نہ کی۔ میں مایوس ہو کر آتش دان کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے میں ہر حالت میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر بھاگنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اب مجھے بھوک بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ جب روہنی کے ساتھ بھی غائب ہو جایا کرتا تھا یادہ مجھے غائب کر دیتی تھی تو میری بھوک پیاس معطل ہو جاتی تھی پھر غیبی حالت سے زندہ انسانی حالت میں ظاہر ہوتا تھا تو بھوک اور پیاس دوبارہ واپس آ جاتی تھی مگر وہاں کھانے کو کسی شے کے دستیاب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مجھے اس آسیب زدہ کوٹھڑی میں دھکیلنے کے بعد آسپی لڑکی بھی واپس نہیں آئی تھی۔ اُس نے مجھے کوٹھڑی میں بند کر دیا تھا اور شاید وہ یہی چاہتی تھی کہ مجھے اپنا قیدی بنا کر بھول جائے۔ میں نے اٹھ کر ایک بار پھر کھڑکی کی سلاخوں کا جائزہ لیا۔ یہ بڑی مضبوط اور موٹے لوہے کی تھیں۔ ان میں سے میں بڑی مشکل کے ساتھ صرف اپنا ہاتھ ہی باہر نکال سکتا تھا۔ میں نے سلاخوں میں سے جھانک کر نیچے دیکھا۔

یہ کوٹھڑی پرانی خانقاہ کی دوسری منزل پر واقع تھی۔ نیچے دھند کی لہریں پھیلی ہوئی تھیں۔ دن نکل چکا تھا مگر سورج کو سرد دھند کے بادلوں نے چھپا رکھا تھا۔ کھڑکی

کے اوپر جنگلی خشک بیل کے سوکھے پتے کسی وقت ہوا کے جھونکے کے ساتھ گرنے لگتے تھے۔ ہوا کا جھونکا گزر جاتا تھا تو پتے گرتا رُک جاتے۔ مجھے دروازے والی دیران راہ داری کی طرف سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں جلدی سے آتش دان کی طرف مڑا اور صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ قدموں کی چاپ دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پھر یہ چاپ دروازے کے پاس آکر رُک گئی۔ میری نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ کوئی باہر سے تالا کھول رہا تھا۔ اس کے بعد دروازہ کھلا اور ایک کبڑی عورت کو ٹھڑی میں داخل ہوئی اس نے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کا طشت تھام رکھا تھا۔

کھڑکی میں سے آتی دن کی سرد دھندلی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ عورت کے سر کے بال روئی کے گالوں کی طرح سفید ہیں۔ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا ہے اور چلتے ہوئے ہانپ رہی ہے۔ میں ڈر کر صوفے سے اٹھنے لگا لیکن جیسے میری طاقت نے جواب دے دیا۔ میں اپنی جگہ سے ذرا سی بھی حرکت نہ کر سکا۔ کبڑی بڑھیا نے صوفوں کے درمیان جو چھوٹی سی سیاہ لکڑی کی تپائی پڑی ہوئی تھی اس پر طشت رکھ دیا اور واپس چلی گئی۔ اس کے ہانپنے کی آواز نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے۔

کو ٹھڑی میں سے نکلنے کے بعد اس نے دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ میں نے جبک کر دیکھا کہ طشت میں کیا رکھا ہوا ہے۔ لوہے کے ایک پیالے میں پانی تھا، دوسرے پیالے میں ابلے ہوئے چاول تھے۔ لکڑی کا ایک چمچ بھی تھا۔ مجھے اپنے آپ پر دو سو سال پہلے کے زمانے کے یورپ کے قیدی کا گمان ہونے لگا۔ اُس زمانے میں پرانے قلعوں میں بند قیدیوں کو یہی غذا دی جاتی تھی۔ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں چاول کھانے لگا۔ چاول نمکین تھے۔ میں خاموشی سے چاول کھا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر یہ آسبی لڑکی مجھے پسند کرتی ہے تو پھر وہ مجھ سے اس قسم کا قیدیوں والا سلوک کیوں کر رہی ہے؟

چاول کھا کر میں نے پانی پیا اور اٹھ کر کو ٹھڑی میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ کو ٹھڑی کی سرد فضا میں بیٹھے بیٹھے مجھے سردی لگنے لگی تھی۔ میں نے کھر درے سیاہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال رکھے تھے اور کھڑکی کے آگے ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس گورکھ دھندے سے مجھے کب اور کیسے چھٹکارا ملے گا۔ کچھ دیر کے بعد کو ٹھڑی کا دروازہ دوبارہ کھلا اور وہی کبڑی بوڑھی عورت جھکی جھکی چلتی ہانپتے ہوئے اندر داخل ہوئی اور سیدھی آتش دان کے پاس گئی جہاں خالی برتن پڑے تھے۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے کا پٹ کھلا تھا۔ بھاگ جانے کا سنہری موقع تھا۔ میں ٹہلتے ٹہلتے دروازے کے پاس آگیا اور ایک دم باہر کی طرف دوڑا۔ جیسے ہی میں دروازے میں سے گزرنے لگا مجھے ایک جھٹکا لگا اور میں پچھاڑ کھا کر پیچھے کو گر پڑا۔ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت بوڑھی عورت خالی برتن لئے دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے میری طرف دیکھے بغیر اس نے ہانپتی ہوئی کمزور آواز میں کہا۔ ”دوبارہ یہ حرکت کرو گے تو مر جاؤ گے۔“ اور وہ کو ٹھڑی سے نکل گئی۔ باہر جاتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا اور مجھے باہر سے تالا لگانے کی آواز سنائی دی۔

جھٹکا ایسا تھا جیسے مجھے بجلی کا کرنٹ لگا ہو۔ میرا جسم ابھی تک جھنجھنارہا تھا۔ میں جلدی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ مجھے سانس چڑھ گیا تھا۔ شاید یہ بجلی کے جھٹکے کی وجہ سے تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آسبی لڑکی نے مجھے اپنا قیدی بنا لیا ہے۔ یہ ایک ایسی قید تھی جس سے رہائی ناممکن لگتی تھی۔

سارا دن مجھے اس کو ٹھڑی میں گزر گیا۔ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا کبھی پھر صوفے پر بیٹھ جاتا۔ کھڑکی پر باہر سے دن کی روشنی جو اندر آرہی تھی پہلے ہی سرد اور دھندلی تھی۔ دن ڈھلنے کے ساتھ یہ بجھ سی گئی اور کو ٹھڑی میں اندھیرا اچھانے لگا۔ ایک بار پھر بہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ اسی بوڑھی عورت کے قدموں کی آواز تھی۔

وہ پہلے کی طرح تالا کھول کر کوٹھڑی میں آگئی۔ اس کے ہاتھ میں وہی سیاہ طشت تھا جس میں ابلے ہوئے چاول اور پانی کا کٹورہ رکھا ہوا تھا۔ طشت اس نے میرے آگے تپائی پر رکھ دیا اور جانے لگی تو میں نے کہا۔ ”میں نہانا چاہتا ہوں۔“

بوڑھی عورت نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”چپ چاپ بیٹھے رہو۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی اور اس نے دروازے کو تالا لگا دیا۔ میں خاموشی سے چاول کھانے لگا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ آسبی لڑکی مجھ سے کیا چاہتی ہے اور مجھے وہاں کیوں لے آئی ہے۔ چاول کھاتے ہوئے اچانک میری نظر اپنے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پر پڑی۔ میں چونک سا پڑا۔ میری انگلی میں روہنی کی دی ہوئی انگوٹھی نہیں تھی۔ یہی ہاتھ آسبی لڑکی نے فضا میں پرواز کرتے ہوئے پکڑا ہوا تھا۔ یہ انگوٹھی اسی نے غائب کی تھی۔ اگر انگوٹھی میرے پاس ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ جب میں کوٹھڑی کے کھلے دروازے میں سے باہر بھاگنے لگا تھا تو مجھے آسبی لڑکی کے پھونکے ہوئے طلسم کا جھکا نہ لگتا۔ اسی لئے اس نے میری انگوٹھی غائب کر دی تھی۔ امید کی یہ ہلکی سی کرن تھی وہ بھی مجھ گئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد بوڑھی عورت خالی برتنوں والا طشت اٹھا کر لے گئی۔ کچھ دیر کے بعد شام ہو گئی۔ کوٹھڑی میں اندھیرا چھا گیا۔ ایک بار پھر وہی بوڑھی عورت دروازہ کھول کر کوٹھڑی میں داخل ہوئی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں ایک شمع دان تھام رکھا تھا جس پر تین موم بتیاں روشن تھیں۔

اس نے شمع دان خاموشی سے آتش دان کے مینٹل پیس پر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ قدم قدم اٹھاتی واپس چلی گئی۔ جاتے ہوئے کوٹھڑی کے باہر تالا لگا گئی۔ میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ میرا ذہن سخت پریشان تھا کیونکہ مجھ پر صورت حال واضح نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں کب تک اس کوٹھڑی میں بند رہوں گا اور یہ کہ مجھے کیوں بند کیا گیا ہے؟ کھڑکی میں سے سرد ہوا آرہی تھی۔ میں کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ باہر اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ خاموشی دہشت زدہ کر دینے والی تھی۔ باہر دو

سوسال پرانا قبرستان تھا۔ رات کی خاموشی نے قبرستان کی خاموشی کے ساتھ مل کر ماحول کو اور زیادہ وحشت خیز بنا دیا تھا۔

میں پلنگ پر دراز ہو گیا۔ میری نیند اڑ چکی تھی۔ سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ بہت سے قدموں کی چاپ تھی۔ میں پلنگ پر سیدھا ہوا کر بیٹھ گیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ قدموں کی چاپ دروازے کے پاس آکر رُک گئی۔ پھر دروازہ کھل گیا اور کوٹھڑی میں دو آدمی اور ایک عورت داخل ہوئی۔ مردوں نے سیاہ چغے پہنے ہوئے تھے۔ سروں پر بھی مخروطی سیاہ ٹوپیاں تھیں۔ انہوں نے ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔ عورت لمبے قد کی تھی وہ بھی سیاہ چغے میں ملبوس تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک پیالہ تھا جس میں سے سفید دھوئیں کی پتی لہریں نکل رہی تھیں۔

یہ عجیب و غریب جلوس میرے قریب آکر رُک گیا۔ عورت کا رنگ گورا تھا اور ناک طوطے کی طرح نیچے کو مڑی ہوئی تھی۔ اس کی شکل ہی سے خوف آتا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر سوئی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہمارے ساتھ چلو۔“ میں نے کہا۔ ”تم لوگ کون ہو۔ مجھے یہاں کیوں بند کر رکھا ہے؟“

پراسرار عورت نے کہا۔ ”ہمارے ساتھ چلو۔“

اس پر میرے سوالات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس نے سنا ہی نہیں۔ میں نے کہا۔ ”میں نہیں جاؤں گا۔“

عورت ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ مجھ پر جیسے ایک روشنی سی پڑ کر غائب ہو گئی۔ عورت نے کہا۔ ”میرے ساتھ آ جاؤ۔“

میں اٹھ کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس نے میرے ارادے کی طاقت کو معطل کر دیا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔ میں اس کے حکم کا پابند ہو گیا تھا۔ شاید اس نے مجھ پر کوئی طلسم بھروسہ کیا تھا۔ بھوت پریت کا یہ جلوس مجھے لے کر کوٹھڑی سے

باہر آیا تو ہمارے استقبال کو باہر ایک لمبی عورت لمبا چنہ پہنے ہاتھ میں شمع دان تھاے کھڑی تھی۔ وہ ہمارے آگے آگے چل پڑی جیسے ہمیں روشنی میں راستہ دکھا رہی ہو۔ ہم گرد آلود نیم روشن راہ داریوں میں سے گزر رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر ہم ایک لمبے ہال کمرے میں آگئے۔ یہ کمرہ چوڑائی میں چھوٹا مگر لمبائی میں لمبا تھا۔ دونوں جانب دیواروں کے ساتھ عجیب و غریب خوفناک چہروں والے جانوروں کے بت کھڑے تھے۔ کمرے میں اندھیرا اندھیرا سا تھا۔ کمرے کے آخر میں ایک پتھر کا چوترہ تھا جس کے وسط میں پتھر کے پیالے میں آگ جل رہی تھی۔ قریب ہی سیاہ پتھر کی دو کرسیاں بنی ہوئی تھیں۔ مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ میری حالت ایک ایسے شخص کی تھی جس پر کسی نے ظلم پھونکا ہوا ہو میں وہی کچھ کر رہا تھا جو مجھے کہا جاتا تھا۔ سامنے ایک پتھر کی ایک بڑی کرسی رکھی ہوئی تھی۔ دونوں آدمی کرسی کے دائیں بائیں بڑے ادب سے کھڑے ہو گئے۔ عورت نے شمع دان میز پر رکھا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کونے میں پردے کے پیچھے جیسے غائب ہو گئی۔ ہال میں خاموشی چھا گئی۔ میں بھی بت بنا پتھر کی کرسی پر بیٹھا تھا اور دونوں آدمی بھی ساکت و جامد کھڑے تھے۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ کونے والا پردہ ایک طرف کو ہٹا اور ایک بھاری بھر کم اونچا لمبا، لمبی سیاہ داڑھی والا آدمی ہاتھ میں عصا لئے نمودار ہوا۔ اس کی دونوں جانب غلام شمع دان تھاے چل رہے تھے۔ داڑھی والے آدمی کے سر پر چوگوشہ لمبی سیاہ ٹوپی تھی۔ وہ عصا نیکیا آرام آرام سے چلتا چوترے پر آیا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ غلاموں نے اپنے اپنے شمع دان میز پر رکھ دیئے اور مودب ہو کر کھڑے ہو گئے۔ سیاہ داڑھی والے آدمی نے میری طرف بڑے غور سے دیکھا۔ پھر عصا والا ہاتھ اوپر اٹھا کر حکم دینے کے انداز میں کہا۔ ”نتالیا کو لایا جائے۔“

اس کے ساتھ ہی کونے والا بھاری پردہ ایک بار پھر ہٹا اور دو سیاہ مخروطی ٹوپوں والے آدمی ایک عورت کو ساتھ لئے داخل ہوئے۔ آگے آگے وہی طوطے کی مڑی

ہوئی ناک والی عورت تھی جو میری کوٹھڑی میں آتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بوسیدہ سی کتاب تھی۔ جب یہ لوگ چوترے کے قریب آئے تو شمع کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ عورت ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کی عمر اکیس بائیس سال کی ہو گئی۔ اس نے گلابی رنگ کا ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر گلابی شگوفوں کا تاج تھا اس کا رنگ ایسا تھا جیسے میدے میں سیندھور ملا ہوا ہو۔ میں اس لڑکی کا حسن و جمال دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

یقین کریں میں نے ایسی حسین و جمیل لڑکی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لڑکی میرے ساتھ والی پتھر کی خالی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ جیسے ہی وہ میرے قریب آکر بیٹھی مجھے گلاب کے شگوفوں کی خوشبو آنے لگی۔ میں حیران تھا کہ اتنی حسین و جمیل لڑکی ان جنوں بھوتوں کے درمیان کہاں سے آگئی ہے۔ کیسے آگئی ہے؟

میں لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ذرا سا مسکرائی۔ اس دوران طوطے کی ناک والی عورت کتاب کھول کر بھاری بھر کم آدمی کے دائیں جانب کھڑی ہو گئی۔ بھاری بھر کم آدمی نے عصا کو دوبار فرش پر آہستہ سے مار کر کہا۔ ”مکارروائی شروع کی جائے۔“

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں کس قسم کی کارروائی شروع ہونے والی ہے۔ حکم پاتے ہی طوطے کی ناک والی عورت نے کتاب میں سے اونچی آواز میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ خدا جانے وہ کون سی زبان تھی۔ اس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جب عورت کتاب کا ایک ورق پڑھ چکی تو بھاری بھر کم داڑھی والے آدمی نے بھاری آواز میں کہا۔ ”دونوں کو ہمارے سامنے لایا جائے۔“

یہ حکم سنتے ہی دو آدمی ہماری طرف بڑھے۔ ایک نے میرا ہاتھ اور دوسرے نے میرے ساتھ بیٹھی ہوئی حسین و جمیل لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہم دونوں کو داڑھی والے آدمی کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ داڑھی والا آدمی کرسی

پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پہلے لڑکی جس کا نام نتالیا پکارا تھا کے سر پر ہاتھ رکھا اور عجیب و غریب زبان میں کچھ جملے دہرائے۔ اس کے بعد اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر وہی جملے دہرائے۔ پھر ہمارے چہروں پر باری باری پھونک ماری اور بلند آواز میں کہا۔ ”اہر من! اہر من! میں نے تیرے نام سے ان دونوں کی شادی کر دی ہے۔ اب یہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔“

شادی کا سن کر مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ میں حیران پریشان ہو کر بھاری بھر کم داڑھی والے آدمی کا منہ تنکے لگا۔ اگرچہ لڑکی بڑی حسین اور نوجوان تھی مگر اس کے ساتھ شادی کا میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ وہ کوئی جن تھی، بھوت تھی، چڑیل تھی۔ وہ ان تینوں میں سے کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ ظاہر ہے وہ کوئی نارمل لڑکی نہیں تھی کیونکہ میں جن حالات اور لوگوں میں گھرا ہوا تھا وہ بھوت پریت ہی ہو سکتے تھے۔ نارمل انسان نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے چیخ کر اس فیصلے کے خلاف احتجاج کرنا چاہا مگر میں اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکال سکا۔ یہ اس طلسم کا اثر تھا جو طوطے کی ناک والی عورت نے مجھ پر کوٹھڑی سے باہر لے جانے سے پہلے پھونکا تھا۔ داڑھی والے عفریت نما آدمی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”کیا تمہیں کچھ کہنا ہے؟“

میری زبان سے جیسے اپنے آپ نکل گیا۔ ”مجھے کچھ نہیں کہنا۔“

داڑھی والے آدمی نے عصا والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور بلند آواز سے کہا۔ ”اہر من! اہر من! جاؤ۔ اب تم دونوں خاندانوں کی بیوی ہو۔“

اس کے فوراً بعد ہمیں ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا جہاں کچھ اندھیرے اور کچھ روشنی میں بڑا پر اسرار ماحول تھا۔ بہت سے سیاہ ٹوپوں والے لوگ میز کے گرد بیٹھے تھے۔ میز پر موم بتیاں روشن تھیں لیکن عجیب بات تھی کہ موم بیوں کی روشنی صرف وہیں ہو رہی تھیں جہاں وہ روشن تھیں۔ یہاں ہماری شادی کی دعوت

کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہمیں شاندار کرسیوں پر ساتھ ساتھ بٹھا دیا گیا۔ مجھے یہ سب کچھ ایک ڈر اور ناخواب لگ رہا تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ وہ کس جانور کا بھنا ہوا گوشت تھا جو مجھے کھلایا گیا اور وہ کس قسم کا تیز مشروب تھا جو مجھے لڑکی نتالیا کے ساتھ ہی پلایا گیا۔ اس کے بعد وہاں رقص شروع ہو گیا۔ یہ نیم عریاں عورتوں کا شیطانی رقص تھا۔ میں بت بنایہ سب کچھ دیکھ رہا تھا میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی حسین لڑکی جس کو زبردستی میری دلہن بنادیا گیا تھا بار بار میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے دبا رہی تھی۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ میں اپنا ہاتھ پیچھے کر لیتا۔ ان لوگوں نے طلسم کے زور سے میری قوت ارادی سلب کر لی تھی۔ میں ان کے حکم کا، ان کی خواہشات کا پابند ہو گیا تھا۔

مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ یہ شیطانی محفل کب تک جاری رہی۔ میں بت بنایہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پھر یہ محفل ختم ہو گئی اور مجھے میری دلہن کے ساتھ ایک بے سجائے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ لڑکی نے مجھے اپنے پاس پلنگ پر بٹھالیا۔ وہ بڑی محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے لباس سے گلاب کے شگوفوں کی خوشبو اسی طرح آ رہی تھی۔ اس نے خواب آلود آواز میں کہا۔ ”میرا نام نتالیا ہے۔ تمہیں اپنا نام بتانے کی ضرورت نہیں مجھے تمہارا نام معلوم ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہے؟“

حالانکہ میں جانتا تھا کہ یہ بھوت پریت ہیں۔ ان کو اس قسم کی باتیں معلوم ہوتی ہیں پھر بھی میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔

اس نے کہا۔ ”مجھے تم سے محبت ہے نا۔ محبت سب کچھ بتا دیتی ہے۔ کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو؟“

میں نے اسی لمحے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اس عورت نتالیا کے ساتھ محبت کا ڈرامہ کرنا میرے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اس طریقے سے مجھے اس بھوت

پریت کی مخلوق سے فرار ہونے کا موقع مل سکے گا۔ ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا چنانچہ میں نے نتالیا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بڑی محبت کے ساتھ کہا۔ ”کیوں نہیں نتالیا! میں بھی تم سے پیار کرتا ہوں۔ میں تو اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے تم مل گئی ہو۔“

نتالیا کا چہرہ خوشی سے کھل کر اور زیادہ حسین ہو گیا تھا۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ یہ لڑکی بے حد حسین تھی۔ اگر عام حالات میں نارمل انسانوں کی دنیا میں یہ مجھے کہیں مل جاتی تو اس سے شادی کر کے میں واقعی اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی کہتا۔ مگر مجھے پورا یقین تھا کہ یہ لوگ ہوائی مخلوق ہیں۔ ان کا تعلق شیطانی روحوں سے ہے۔ یہ نارمل انسان نہیں ہے۔ یہ کالا جادو، طلسم اور بھوت پریت کی دنیا کے لوگ تھے اور میں ہر حالت میں ان سے نجات حاصل کر کے اپنی دنیا میں واپس جانا چاہتا تھا۔

نتالیا مجھے محبت کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”اب ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکے گا۔“

میں نے جان بوجھ کر ایک فقرہ کہہ دیا۔ دراصل میں اسے کریدنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”مگر نتالیا! ایک نہ ایک دن موت ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دے گی۔“

نتالیا کا چہرہ ایک لمحے کے لئے ساکت ہو گیا۔ وہ ٹھٹھکی باندھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”نہ میں مروں گی، نہ تمہیں مرنے دوں گی۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔“

یہ جملہ اس امر کی تصدیق کرتا تھا کہ یہ عورت زندہ نہیں ہے پہلے سے مر چکی ہے اور میں چونکہ زندہ انسانوں کی طرح ہوں اس لئے اس نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ مجھے موت کے منہ سے بچانے کی کوشش کرے گی۔

میں نے اُسے مزید کریدنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”نتالیا! موت تو ہر زندہ انسان کو ایک نہ ایک دن آنی ہی ہوتی ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں

موت سے بچ جائیں گے؟“

اس نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ تمہیں یہ باتیں نہیں پوچھنی چاہئیں۔ کہنے لگی۔ ”یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور پھر یہ موقع ایسی باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ آج ہماری شادی ہوئی ہے۔ ہمیں پیار محبت کی باتیں کرنی چاہئیں۔“

میں نے کہا۔ ”نتالیا! یہ باتیں بھی میں نے اس لئے پوچھی تھیں کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں اور تم سے جدا نہیں ہونا چاہتا۔“

نتالیا نے بڑے پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تم کبھی مجھ سے جدا نہیں ہو گے۔ تم مر بھی گئے تو میں تمہیں اپنے پاس لے آؤں گی۔“

اس فقرے کو سن کر میرے بدن میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ یہ جملہ اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ ایک بدروح ہے اور میری موت کے بعد میری روح پر قبضہ کر کے مجھے بھی بدروح بنادے گی جو میرے لئے موت کے بعد سب سے بڑا عذاب تھا۔ یہ مجھے ہرگز قبول نہیں تھا۔ میں دوبارہ اس سے محبت بھری باتیں کرنے لگا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں کہا۔ ”نتالیا! میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب میری شادی ہو گی تو میں اپنی دلہن کے ساتھ ہنی مون منانے کسی سمندری جزیرے میں چلا جاؤں گا۔ تم تو جانتی ہی ہو گی کہ دنیا میں بعض شادی شدہ جوڑے ہنی مون منانے کسی خوبصورت مقام پر ضرور جاتے ہیں۔“

نتالیا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم ہنی مون منانا چاہتے ہو؟“

میرے دل کی مراد برآ رہی تھی۔ میں نے فوراً کہا۔ ”کیوں نہیں۔ مجھے نتالیا کی شکل میں دنیا کی سب سے حسین دلہن ملی ہے تو میں ہنی مون بھی کسی خوبصورت جگہ پر منانا چاہتا ہوں۔“

نتالیا اسی طرح مسکرا رہی تھی۔ اس کا مسکراتا ہوا حسین چہرہ دیکھ کر مجھے کیا کسی کو بھی یقین نہیں آسکتا تھا کہ یہ کوئی بدروح بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے کہا۔ ”تم ہنی مون منانے کہاں جانا چاہتے ہو؟“

میں اسے کوئی ایسی جگہ بتانا چاہتا تھا کہ جہاں سے مجھے فرار ہونے کا آسانی سے موقع مل جائے۔ میں اپنے ذہن میں ایسے شہر سوچنے لگا جو پاکستان کی سرحد کے قریب ہوں اور میں فرار ہونے کے فوراً بعد پاکستان پہنچ سکوں۔ جب تک میں کسی شہر کا فیصلہ نہیں کر سکا میں نے اسے باتوں میں لگائے رکھا۔ میں نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ میں کس جگہ اور کس ملک میں ہوں اس سے پوچھا۔ ”ہم تو اس وقت انڈیا میں ہیں۔ یہاں کوئی میری پسند کی خوبصورت جگہ مجھے کہیں نظر نہیں آرہی۔“

نتالیا نے کہا۔ ”کیوں نہیں ہے۔ شملہ ہے۔ نینی تال ہے اور پھر کشمیر ہے۔ ہم کشمیر چل کر ہنی مون مناتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کشمیر میں تو بڑی گڑبڑ ہے۔ وہاں ہم سکون سے ہنی مون نہیں منا سکیں گے۔“

”تو پھر تم کہاں جانا چاہتے ہو؟“ نتالیا نے پوچھا۔ ”اگر تم پسند کرو تو ہم یورپ کے کسی خوبصورت ملک میں چلے چلتے ہیں۔ مثلاً سوئٹزر لینڈ چلے جاتے ہیں۔ یہ بڑا حسین ملک ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ یہ عورت بدروح ہے اور کہیں بھی مجھے لے جاسکتی ہے۔ اس کے لئے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ مگر میں اپنے وطن پاکستان سے اتنی دور نہیں جانا چاہتا تھا کہ جہاں سے واپس آتے ہوئے مجھے پاسپورٹ ویزے کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے اور پھر میرے پاس کوئی پیسہ بھی نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ”کیوں نہ ہم پاکستان چلے چلیں۔ وہاں ایک پہاڑی مقام بڑا ہی پرسکون اور خوبصورت ہے۔“

”کیا نام ہے اس جگہ کا؟“ نتالیا نے پوچھا۔

میں نے نام اتنی دیر میں سوچ ہی لیا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے میں پیدل بھی اپنے گھر پہنچ سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”یہ شہر ایبٹ آباد ہے۔ بڑا خوبصورت نیم پہاڑی شہر ہے۔ وہاں سردی بھی زیادہ نہیں ہوتی اور گرمی بھی نہیں ہوتی۔ وہاں ماڈرن ہوٹل بھی ہیں۔ مجھے یہ شہر بہت پسند ہے۔“

مجھے لگ رہا تھا کہ نتالیا میری محبت میں سرشار ہو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اس عورت کو زندگی میں کبھی کسی نے اتنا پیار نہیں دیا۔

کہنے لگی۔ ”اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو ہم ہنی موت منانے ایبٹ آباد ہی چلے چلتے ہیں۔“

میں نے اس سے بالکل نہ پوچھا کہ انڈیا سے پاکستان جانے کے لئے پاسپورٹ اور فارن کرنسی وغیرہ کی ضرورت ہوگی وہ کہاں سے آئے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ عورت سب کچھ کر سکتی ہے۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ پر اپنے بدروح ہونے کا راز ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ وہ مجھ پر یہی ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ وہ ایک نارمل عورت ہے اور شادی کے بعد میرے ساتھ ہنی خوشی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔ کم از کم میں نے اس کی باتوں سے یہی محسوس کیا تھا۔ ابھی تک اس نے میرے پاس بیٹھے ہوئی کوئی بدروحوں والی شعبہ بازی نہیں دکھائی تھی۔ کہنے لگی۔ ”ہم کل صبح ہی ایبٹ آباد روانہ ہو جائیں گے۔“

میں نے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ میرے لئے یہی کافی تھا کہ میں اپنے پیارے وطن پاکستان کے خوبصورت شہر ایبٹ آباد جا رہا ہوں۔ وہاں سے میں اس بدروح سے بھاگنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ اور موقع تلاش کر لوں گا۔ میں نے نتالیا کا ہاتھ چوم لیا اور بڑے لگاؤ کے ساتھ کہا۔ ”نتالیا! تمہیں میرا کتنا خیال ہے۔“

نتالیا نے کہا۔ ”میں تم سے محبت کرتی ہوں اور اب تو تم میرے خاوند بھی ہو۔“

میں کیوں نہیں تمہارا خیال کروں گی۔“

باتوں باتوں میں نہ جانے کتنی رات گزر گئی۔ نہ میرے پاس گھڑی تھی نہ وہاں کوئی کلاک تھا۔ میرا خیال ہے کہ رات کا آخری پہر گزر رہا تھا کہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ نتالیا نے کہا۔ ”تمہیں نیند آرہی ہے۔ سو جاؤ۔ میں بھی سو جاتی ہوں۔“ میں وہیں لیٹ گیا۔ نتالیا بھی میرے ساتھ ہی لیٹ گئی۔ اس کے لباس سے گلاب کی خوشبو آرہی تھی۔ پھر میں سو گیا۔

جس وقت میری آنکھ کھلی میں پلنگ پر اکیلا لیٹا ہوا تھا۔ جلدی سے اٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ بدروح دلہن نتالیا وہاں نہیں تھی۔ اس بند تابوت ایسے کمرے میں کوئی روشندان یا کھڑکی بھی نہیں تھی کہ دیکھتا رات کا وقت ہے یا صبح ہو گئی ہے۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور نتالیا اندر داخل ہوئی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کارنس پر شمع دان روشن تھا۔ اس کی روشنی میں نے دیکھا کہ نتالیا نے ریشمی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ کندھے پر پرس لٹک رہا تھا۔ گچے میں بڑا خوبصورت جالی دار دوپٹہ تھا۔ اس لباس میں بھی وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے میرے پاس آئی اور بولی۔ ”میری جان! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ یاد نہیں ہم ہنی مون منانے ایبٹ آباد جا رہے ہیں۔“

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اُسے یاد تھا کہ ہمیں پاکستان ہنی مون منانے جانا ہے ورنہ میرا تو خیال تھا کہ اس کو میرے دل کا حال معلوم ہو گیا ہے کہ میں اسے دھوکے سے پاکستان لے جا رہا ہوں تاکہ وہاں جاتے ہی اس کو چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ میں نے پلنگ سے اترتے ہوئے کہا۔ ”نتالیا! میں نہانا چاہتا ہوں۔ یہاں کوئی ایسا انتظام ہے؟“ نتالیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیوں نہیں میری جان! وہ سامنے غسل خانے کا

دروازہ ہے۔ جا کر جلدی سے نہالو۔“

• میں نے پوچھا۔ ”نائم کیا ہو گا؟“

اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر کہا۔ ”میری گھڑی بند ہو گئی ہے۔ ویسے دن چڑھ چکا ہے۔“

میں غسل خانے کی طرف آ گیا۔ دروازہ کھول کر اندر گیا تو دیکھا کہ وہاں غسل کرنے کا تمام ساز و سامان موجود تھا۔ ایک طرف میرے لئے ایک نئی پتلون، نئی جیکٹ اور نئی قمیض بھی تہہ کر کے رکھی ہوئی تھی۔ تولیہ صاف شفاف تھا۔ چمکیلے نل میں سے سنگ مرمر کے ٹب میں پانی گر رہا تھا۔ میں نے ہاتھ لگایا۔ پانی نیم گرم تھا مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ بھوت پریتوں کا مسکن تھا۔ یہ بدروحیں ہر چیز مہیا کر لیتی ہیں۔ اس کا تجربہ مجھے روہنی کے ساتھ کئی بار ہو چکا تھا۔

میں نے جلدی جلدی غسل کیا اور نئی پتلون قمیض اور جیکٹ پہن کر باہر نکلا تو نتالیا پلنگ پر بیٹھی پرس میں سے کچھ نکال کر شمع دان کی روشنی میں دیکھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کیا دیکھ رہی ہو؟“

اس نے کہا۔ ”دلی سے پاکستان کے شہر کراچی تک کے دوایر ٹکٹ ہیں اور ہم دونوں کے پاسپورٹ ہیں۔ میں نے ان پر صبح صبح ہی ویزے لگوائے تھے۔ میری جان! ہم دوسرے ملک میں جا رہے ہیں۔ ان چیزوں کی تو ضرورت ہوتی ہی ہے۔“

میں نے اس پر بھی کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہ کیا۔ یہی ظاہر کیا جیسے یہ سب کچھ نارمل طریقے سے ہوا ہے۔ حالانکہ وہ اگرچاہتی تو مجھے اس کمرے سے اپنے ساتھ غائب کر کے بھی پاکستان لے جاسکتی تھی۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں وہ نہ جانے کیوں مجھ پر یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ لوگ نارمل انسان ہیں اور بھوت پریت نہیں ہیں۔ میں بھی چپ تھا اور آگے سے کوئی سوال نہیں کر رہا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ جہاں اس بدروح کے ساتھ میرا بیابا کر دیا گیا ہے وہ جگہ بھارت کے کس پہاڑی علاقے میں واقع تھی۔

اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور خوش ہو کر بولی۔ ”میری جان! تم کتنے

پیارے لگ رہے ہو۔“

اور اس نے میری بغل میں ہاتھ ڈالا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے اسی راستے سے لے کر جائے گی جس راستے سے مجھے اس منحوس جگہ پر لایا گیا تھا اور ہمیں ایک ویران پرانے قبرستان میں سے بھی گزرنا پڑے گا۔ لیکن جب وہ مجھے لے کر اس آسیب زدہ عمارت سے باہر نکلی تو میں نے دیکھا کہ سنہری دھوپ نکلی ہوئی تھی اور جہاں ڈھلان پر پہلے میں نے بہت سی ٹوٹی پھوٹی شکستہ قبریں دیکھی تھیں وہاں اب ان قبروں کا نام و نشان تک نہ تھا بلکہ ان کی جگہ سرسبز ڈھلان پر پھول دار پودے اگے ہوئے تھے۔ ایک پتھر کا زینہ نیچے سڑک تک جاتا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا جس عمارت سے ہم باہر نکلے تھے وہ کھنڈر نما خانقاہ کی عمارت نہیں تھی بلکہ کوئی پرانی وضع کا کالج نما ڈاک بنگلہ تھا۔

یہ سب ان بدروحوں کے طلسم کا عمل ہی تھا لیکن میں خوش تھا کہ میں اس جگہ سے ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں۔ تاریک آسیب زدہ عمارت کے تہہ خانے سے نکل کر سنہری دھوپ میں آکر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی تنگ و تاریک قبر میں سے زندہ سلامت نکل آیا ہوں۔ سردی بڑی خوشگوار تھی۔ ہوا چل رہی تھی جس میں نتالیا کے کٹے ہوئے سنہری بالوں کی ایک لٹ اس کے ماتھے پر اڑ رہی تھی۔ وہ واقعی بڑی حسین لڑکی تھی۔ میں آپ کو سچ کہہ رہا ہوں۔ اگرچہ میں اس سے جتنی جلدی ہو سکے چھکارا حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن یقین کریں اگر وہ کوئی بدروح یا بھوت پریت نہ ہوتی تو میں اس سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ہم ڈاک بنگلے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر آ گئے۔ چھوٹی سی پہاڑی سڑک تھی جو نیلے کے گرد گھوم کر نیچے اتر گئی تھی۔ ہم سڑک پر چلتے نیچے ایک بڑے بازار میں آ گئے۔ یہاں ایک طرف کتنی ہی پرانے اور نئے ماڈل کی کاریں کھڑی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر ایک باوردی ڈرائیور دوڑ کر آگیا کہنے لگا۔ ”میم صاحب! چند ہی گڑھ جائیں

گے؟ میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔ بالکل نئے ماڈل کی کار ہے۔“

ہمارے پاس سامان تو تھا نہیں صرف ایک ٹریولنگ بیگ نتالیا نے کندھے سے لٹکایا ہوا تھا ایک ٹریولنگ بیگ میرے کندھے سے لٹک رہا تھا۔ نتالیا نے اس سے کراہی بھی طے نہ کیا۔ اس کو کراہی طے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو ہوا میں سے ہاتھ گھما کر جتنے نوٹ چاہے پیدا کر سکتی تھی۔ گو میرے سامنے اس نے ابھی تک ایسا نہیں کیا تھا مگر میں نے بدروحوں کو ایسا کرتے دیکھا تھا۔

اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ گاڑی لے آؤ۔“

وہ جلدی سے گاڑی لے آیا۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ بڑی آرام دہ کار تھی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میں نے رات بھارت کے پنجاب کے شمالی پہاڑی علاقے میں کسی جگہ گزاری تھی۔ اور اب ہم چند ہی گڑھ جا رہے تھے۔ گاڑی نیم پہاڑی علاقے کی سڑک پر چند ہی گڑھ کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ چونکہ نتالیا نے خود مجھ سے کہا تھا کہ ہم دلی سے بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان جائیں گے اس لئے میں نے راستے میں اس سے پوچھا۔ ”چند ہی گڑھ سے دلی جانے والی ٹرین ہمیں مل جائے گی اس وقت؟“

پر اسرار نتالیا نے آہستہ سے کہا۔ ”ہم چند ہی گڑھ سے بائی ایر دلی جائیں گے۔“ یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی کیونکہ میں جلدی سے جلدی اپنے پیارے وطن پاکستان پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ کراچی سے ایبٹ آباد پہنچنے کا بھی میں انتظار نہیں کروں گا۔ اگر راستے میں اس حسین بدروح سے فرار ہونے کا کوئی موقع مل گیا تو اسے وہیں چھوڑ کر فرار ہو جاؤں گا۔ اس کے ساتھ ہی دل میں یہ خیال بھی ضرور آتا کہ آخر یہ بھوت پریت ہے، بدروح ہے۔ اس کو فوراً پتہ چل جائے گا کہ میں اسے چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہوں۔ یہ تو مجھے وہیں آکر دبوچ لے گی۔ لیکن میں یہ سوچ کر اس خیال کو دل سے نکال دیتا تھا کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ہو سکتا ہے اس کو پتہ ہی نہ چل سکے کہ میں کہاں ہوں۔ اس کے ساتھ بدروحوں ایسی زندگی بسر کرنے

سے تو یہی بہتر تھا کہ میں اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ شاید میں کامیاب ہو جاؤں۔ پھر مجھے یہ بھی بڑا حوصلہ تھا کہ میں اپنے اسلامی وطن پاکستان میں ہوں گا جہاں ہر کوئی میری مدد کرنے کو تیار ہوگا۔

چندی گڑھ آیا تو نتالیا نے ڈرائیور سے کہا۔ ”ایئر پورٹ لے چلو۔“

ہم ایئر پورٹ پر آگئے۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں وہاں کسی ٹریولنگ ایجنسی کے آفس سے دلی تک کے ایئر ٹکٹ خریدنے پڑیں گے اور جہاز میں سیٹ ریزرو کروانی پڑے گی لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ ایئر پورٹ پر کار سے اتر کر نتالیا سیدھی ایئر پورٹ کی عمارت کی طرف بڑھی۔ میں نے اپنی تسلی کی خاطر اس سے پوچھا۔ ”کیا یہاں سے ہمیں دلی کے ٹکٹ مل جائیں گے؟“

نتالیا ایک بک شال کے پاس رُک گئی۔ اس نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کر دو ٹکٹ نکالے۔ ایک مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارا چندی گڑھ سے دلی تک کا ٹکٹ ہے اور یہ میرا ٹکٹ ہے۔“

حسین بدروح نتالیا نے اپنی شعبہ بازیوں دکھانی شروع کر دی تھیں۔ میں ان شعبہ بازیوں سے خوش تھا کیونکہ میری منزل جلدی قریب آرہی تھی۔ پراسرار نتالیا مجھے لے کر عین اس وقت ایئر پورٹ پر پہنچی تھی جب دلی کی طرف جانے والے جہاز کے روانہ ہونے میں صرف پندرہ بیس منٹ ہی باقی تھے۔ جب ہم لاؤنج میں پہنچے تو اعلان ہو رہا تھا کہ دلی جانے والے مسافر جہاز میں سوار ہو جائیں۔ ہم بھی مسافروں کی قطار میں شامل ہو گئے۔ کشم کی کمپیوٹر مشین نے ایک منٹ میں ہمارے ٹریولنگ بیگ چیک کر لئے تھے اور تعجب کی بات ہے کہ پراسرار نتالیا کے پاس بورڈنگ کارڈ بھی موجود تھے اور جہاز میں ہماری سیٹیں بھی بک ہو چکی تھیں۔

قطار میں کھڑے کھڑے نتالیا نے میرا بورڈنگ کارڈ مجھے دے دیا۔ پراسرار نتالیا کی ان ماورائے انسانی عقل شعبہ بازیوں سے مجھے ڈر بھی لگنے لگا تھا کہ یہ حسین بلا مجھے

فرار ہونے کے بعد کہیں نہ کہیں ضرور دبوچ لے گی لیکن اب اس قسم کی باتیں سوچنے کا وقت گزر چکا تھا اور میں نے ہر حالت میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا خواہ اس کے لئے مجھے کچھ ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔

ہم جہاز میں سوار ہو گئے۔ جہاز نے ہمیں دلی پہنچا دیا۔ دلی ایئر پورٹ پر اترنے کے بعد ہم ایئر پورٹ کی بلڈنگ ہی میں ایک ریستورنٹ میں آکر بیٹھ گئے۔ وہاں ہم نے ناشتہ کیا۔ پراسرار نتالیا نے کہا۔ ”ایک گھنٹے بعد اسی ٹرمینل سے پاکستان کے لئے جہاز روانہ ہوگا۔ میں نے تمام کاغذات تیار کروا کر رکھ لئے ہیں تم فکر نہ کرنا۔“

اس نے پرس مین سے دو پاسپورٹ نکالے۔ ایک پاسپورٹ اپنے پاس رکھ لیا دوسرا پاسپورٹ مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارا پاسپورٹ ہے۔“

میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ یہ انڈین پاسپورٹ تھا اس پر میری فوٹو لگی ہوئی تھی نیچے انگریزی اور ہندی زبانوں میں میرا ہندو نام لکھا تھا۔ میں نے ورق الٹ کر دیکھا اس پر انڈیا سے پاکستان تک کا ایک مہینے کا ویزا بھی لگا ہوا تھا۔ میں عالم حیرت میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں کسی عام کمزور اور نارمل عورت کے ساتھ سفر نہیں کر رہا۔ جو عورت میرے ساتھ سفر کر رہی ہے وہ ایک بدروح ہے اور بے اندازہ شیطانی طاقت رکھتی ہے۔

پراسرار نتالیا میرا ہاتھ تھام کر مجھ سے پیار محبت کی باتیں کرنے لگی میں اس کی محبت کا جواب محبت ہی سے دیتا رہا۔ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اس نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بولی۔ ”چلو میری جان! وقت ہو گیا ہے۔“

وہاں سے ہم ایک دوسرے لاؤنج کی طرف بڑھے۔ اسے سب معلوم تھا کہ کہاں جانا ہے۔ لاؤنج کے باہر سیورٹی گارڈ کھڑے تھے۔ انہوں نے ہمارے پاسپورٹ دیکھے، ہمارا سامان چیک کیا۔ ہم سے کچھ سوال پوچھے جن کے جواب ہم نے دے دیئے۔ ہمیں آگے جانے کی اجازت مل گئی۔ ہمارے پاس انڈین پاسپورٹ تھے اس

لئے ہم سے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔ سامان کے علاوہ ہماری بھی الگ الگ تلاشی بڑی سختی سے لی گئی تھی۔

ہم کشم کے کاؤنٹر پر آ گئے۔ وہاں پاکستان جانے والے کچھ اور مسافر بھی کھڑے اپنے اپنے کاغذات چیک کر رہے تھے۔ ہم نے بھی پاسپورٹ آگے کر دیئے۔ کشم آفیسر نے میرا پاسپورٹ کھول کر غور سے دیکھا پھر میری طرف گھور کر دیکھا اور مختلف سوال کرنے لگا۔ پاکستان کیوں جا رہے ہو؟ کس کے پاس ٹھہرو گے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے یہی کہا کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں پاکستان کی سیر و سیاحت کرنے جا رہے ہیں۔ دس پندرہ دنوں میں واپس آ جائیں گے۔ نتالیا سے بھی اسی قسم کے سوال پوچھے گئے۔ اس کے پاسپورٹ پر بھی نتالیا کے بجائے اس کا ہندوانہ نام لکھا ہوا تھا۔ ہمیں ڈیپارچر لاؤنچ میں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ڈیپارچر لاؤنچ ساتھ ہی تھا۔ ہم وہاں آ کر بیٹھ گئے۔ کشم والوں نے جب ہم سے پوچھا تھا کہ تمہارے پاس کتنی پاکستانی کرنسی ہے تو نتالیا نے اپنا پرس کھول کر کہا تھا۔ ”ہمارے پاس پاکستانی کرنسی کے صرف پندرہ سو روپے ہیں۔“

کشم آفیسر نے پوچھا تھا۔ ”تم لوگوں نے ایک مہینے کا ویزہ لگوا لیا ہے ان روپوں سے تو تمہارا ایک ہفتے گزارہ نہیں ہو گا۔“

پراسرار نتالیا نے کہا تھا کہ وہاں ہمارے جانے والی ایک فیملی ہے ہم ان کے ہاں جا کر ٹھہریں گے اور ہمارے پیسے بہت کم خرچ ہوں گے۔ لاؤنچ میں آنے کے بعد پراسرار نتالیا نے مجھے ایک ہزار روپے کے پاکستانی کرنسی کے نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم اپنے پاس رکھ لو کسی بھی وقت کوئی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

میں نے ایک ہزار روپے کے پاکستانی نوٹ اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لئے۔ اس زمانے میں دلی سے مسافر جہاز سیدھے کراچی جایا کرتے تھے ہمیں بھی کراچی ہی جانا

تھا۔ نتالیا نے کہا۔ ”کراچی سے ہم بذریعہ ریل راولپنڈی اور وہاں سے بذریعہ کار ایٹ آباد چلے جائیں گے۔“

اسے ایک ایک روٹ کا پتہ تھا۔ ابھی تک وہ مجھے یہی تاثر دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ جو کچھ ہو رہا ہے بڑی معمول کے مطابق کارروائی سے ہو رہا ہے اور اس کو پاکستان کے سارے شہروں کے بارے میں پتہ ہے کہ کون سا شہر کس جگہ پر ہے اور میں بھی اس پر اپنی حیرانی ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ اس نے ایک ہی رات میں یہ سب کچھ کیے کر لیا کہ ہم دونوں کے پاسپورٹ بھی بن گئے، ان پرویز نے بھی لگ گئے اور پاکستانی کرنسی بھی حاصل ہو گئی۔ مجھے پاکستان پہنچنے سے غرض تھی اور پاکستان اب تھوڑی دور ہی رہ گیا تھا۔

O

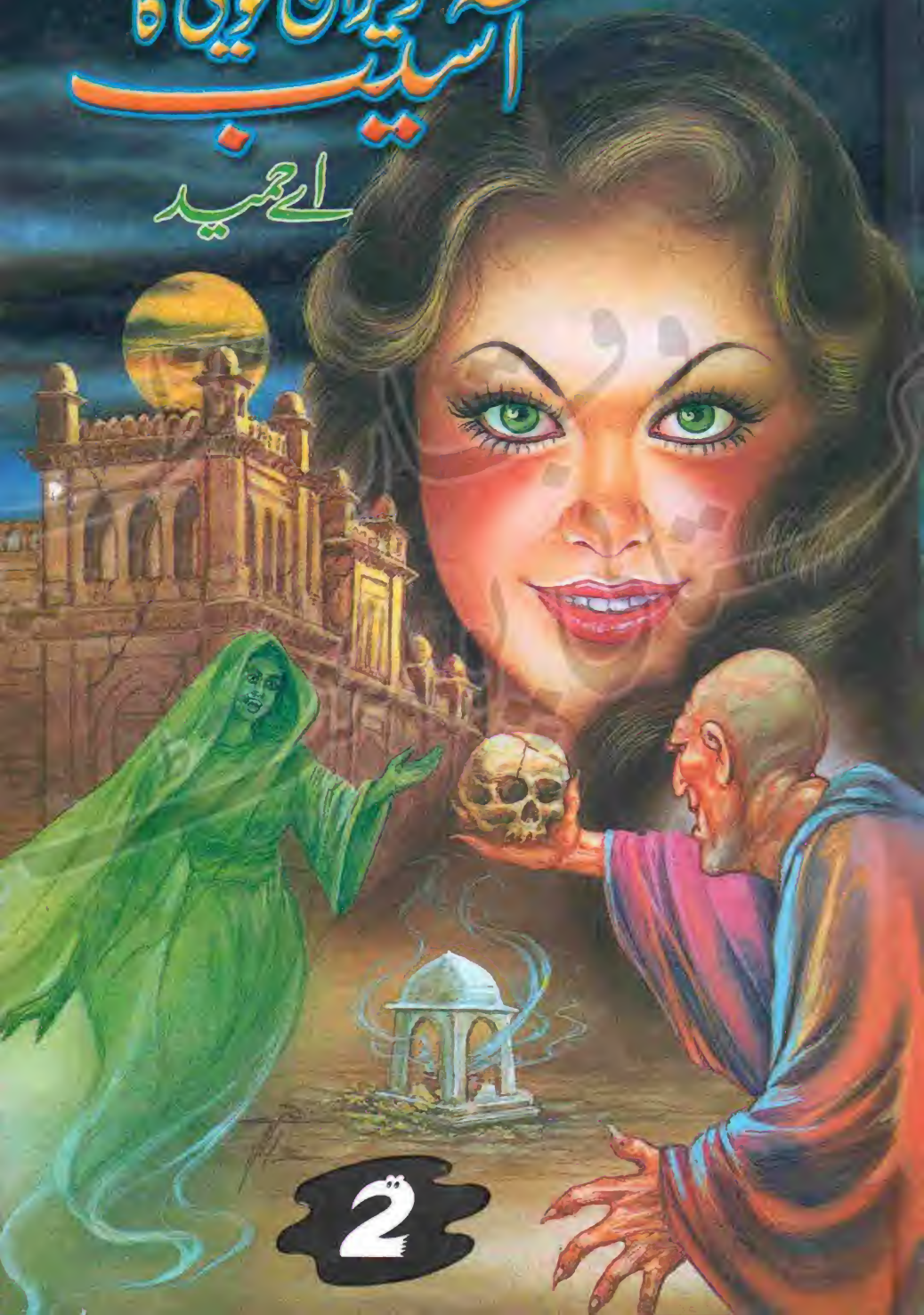
اس کے بعد ”دیران حویلی کا آسیب“ کی دوسری اور آخری جلد کا مطالعہ کریں۔

لازوال کہانیوں کے خالق انوار صدیقی کے پراسرار ناول

400-00	انکارانی (2 جلدیں)
300-00	ابوالہول
1200-00	امبریل (4 جلدیں)
450-00	تار عنکبوت (2 جلدیں)
300-00	خبیث (5 حصے)
120-00	درخشاں (2 حصے)
200-00	برہمچاری
200-00	نکا
180-00	وہ کون تھا؟
250-00	تخریب کار
200-00	برق پاش
180-00	رقص ابلیس
200-00	آئینہ زدہ
250-00	طاغوت

ایک دہشت ناک اسپید کی لڑہ حکیر داستان

اسپید ویران حویلی کا الحمد



آخر پاکستان کو جانے والے جہاز کی روانگی کا بھی اعلان ہو گیا۔ ہم دوسرے مسافروں کے ساتھ انڈین ایئر لائنز کے جہاز میں سوار ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد جہاز ٹیک آف کر گیا اور اس نے اپنا رخ پاکستان کے شہر کراچی کی طرف کر لیا۔ پراسرار نتالیا میری ساتھ والی سیٹ پر ہی بیٹھی تھی۔ جہاز میں ہی ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ آخر ہم کراچی پہنچ گئے۔ پاکستان کی سر زمین پر اتر کر اور ایئر پورٹ پر پاکستان کا ہلالی پرچم لہراتا دیکھ کر میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کس قدر خوشی ہوئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں اپنے بہن بھائیوں کے پاس آ گیا ہوں اور اب کوئی دشمن کوئی بدروح میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ پراسرار نتالیا میرے ساتھ تھی۔ میں نے پاکستان کی سر زمین پر قدم رکھتے ہی فرار ہونے کے مواقع تلاش کرنے شروع کر دیئے تھے۔ لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ جلدی میں کوئی غلط قدم اٹھا کر دوبارہ اسی مصیبت میں پھنس جاؤں۔ میں نتالیا سے اس طرح الگ ہونا چاہتا تھا کہ اسے میرے فرار ہونے کا کم از کم دس بارہ گھنٹوں تک علم نہ ہو سکے اور اس دوران مجھے اس سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانے کا موقع مل جائے۔

یہ اس صورت میں ممکن تھا کہ جب وہ رات کو گہری نیند سو رہی ہو تو میں چپکے سے نکل جاؤں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیا وہ رات کو سوتی بھی تھی؟ شادی کی پہلی رات وہ تقریباً ساری رات مجھ سے باتیں کرتی رہی تھی اور شاید رات کے پچھلے پہر جب میں سو گیا تھا تو وہ لیٹ ضرور گئی تھی مگر مجھے یقین ہے کہ وہ جاگ رہی تھی اور میرے

معیاری اور خوبصورت کتابیں

با اہتمام..... محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ایڈیشن..... 2009ء

مطبع..... نیر اسد پریس لاہور

ڈیزائن..... ذاکر

کمپوزنگ..... کائنگس گرافکس

قیمت..... 225/- روپے

مکمل سیٹ..... 450/- روپے

سو جانے کے بعد وہاں سے چلی گئی تھی۔ یہ بدروحیں اور بھوت پریت سویا نہیں کرتے۔

تجربے نے مجھے یہی بتایا تھا۔ میں نے روہنی بدروح کو کبھی سوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ کسی بہانے میں بدروح نتالیا کو خواب آور گولیاں پیس کر کھلا دوں گا۔ پھر سوچا کہ شاید خواب آور گولیاں کھا کر بھی اسے نیند نہ آئے اور یہ بھی ممکن تھا کہ اسے میرے دل کا حال معلوم ہو جائے۔ پھر تو وہ مجھے ایسا جکڑے گی کہ میں شاید ساری عمر اس کی قید سے آزاد نہ ہو سکوں گا۔ بہر حال مجھے اس سے بھاگنے کی ایک کوشش ہر حالت میں کرنی تھی۔ اس کے بعد جو ہو سو ہو۔ میرے لئے یہی ایک راستہ باقی رہ گیا تھا۔

ایئرپورٹ پر پاکستانی کسٹم پوسٹ پر بھی ہماری پوری چیکنگ ہوئی۔ پراسرار نتالیا نے خود کو بھی اور مجھے بھی ہندو ظاہر کیا ہوا تھا۔ پاسپورٹ پر میرا نام پرکاش کھنہ لکھا ہوا تھا۔ نتالیا مسز پرکاش کھنہ بن گئی تھی۔ ضروری چیکنگ کے بعد ہم سے پوچھا گیا کہ ہم پاکستان میں پہلے کہاں جائیں گے۔ نتالیا نے بتایا کہ ہم پہلے لاہور جائیں گے اور وہاں کانٹی نینٹل ہوٹل میں ایک ہفتہ قیام کر کے لاہور شہر کی سیر کریں گے۔ وہاں سے ہم راولپنڈی جائیں گے۔ نتالیا نے کہا۔ ”وہاں میرے ماما تاجی کے ایک پرانے مسلمان دوست راجہ گل زمان ہیں ہم دو دن ان کے پاس ٹھہریں گے اس کے بعد ایبٹ آباد جا کر ویزے کے باقی دن وہیں گزاریں گے۔“

ہمیں کہا گیا کہ لاہور جاتے ہی چیئرنگ کر اس تھانے میں رپورٹ کریں۔ اس کے بعد ہم ایئرپورٹ سے باہر آگئے۔ وہاں سے ہم نے ٹیکسی پکڑی اور سیدھے کراچی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ شام کے وقت ایک ایکسپریس ٹرین لاہور جا رہی ہے۔ نتالیا نے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔ ٹکٹ لے آتے ہیں۔“

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔

بلنگ آفس میں جا کر نتالیا نے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ لئے اور ہم پلیٹ فارم پر آکر ایک سال پر چائے پینے کے لئے کھڑے ہو گئے۔

نتالیا کہنے لگی۔ ”میں لاہور میں کچھ نئے کپڑے خریدوں گی۔ مجھے پاکستانی عورتوں کا لباس بڑا پسند ہے۔“

میں نے سوچا کہ میں نتالیا کو لاہور کے انارکلی بازار میں شاپنگ کے لئے لے جاؤں گا اور وہیں کسی بہانے غائب ہو جاؤں گا۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے یہ میرے لئے بڑا سنہری موقع بن سکتا تھا۔

جب لاہور جانے والی ٹرین پلیٹ فارم پر آکر لگی تو دوسرے مسافروں کے ساتھ ہم بھی ٹرین میں سوار ہو گئے۔

ہمارا فرسٹ کلاس کا کپار ٹمنٹ تھا۔ ہمارا سفر بڑا آرام سے کٹا۔ ہم جس وقت لاہور پہنچے دن ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ ایک مدت بعد اپنے شہر لاہور آکر مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ اسٹیشن سے باہر نکلے تو میں نے نتالیا سے کہا۔ ”ہمیں ہوٹل کانٹی نینٹل میں ٹھہرنا ہے۔ اسی علاقے میں چیئرنگ کر اس تھانہ لگتا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے وہاں جا کر رپورٹ کرنی ہوگی۔“

نتالیا کہنے لگی۔ ”اس کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن تم کہتے ہو تو تھانے چل کر رپورٹ کر دیں گے۔“

مجھے معلوم تھا کہ اس بدروح کو تھانے جانے کی کیا ضرورت ہے لیکن وہ مجھے ابھی تک یہی تاثر دے رہی تھی کہ وہ کوئی بدروح نہیں ہے۔ اسٹیشن سے ہم سیدھا چیئرنگ کر اس تھانے آگئے۔ تھانے میں موجود کانٹیل محرنے ہمارے پاسپورٹ بڑے غور سے دیکھے۔ پھر پوچھا کہ ہم پاکستان کیوں آئے ہیں۔ ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہیں، کہاں جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے تمام سوالوں کا اُسے تسلی بخش جواب دیا۔

اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ لاہور سے ایبٹ آباد جاتے ہوئے ہمیں رپورٹ کر کے جائیں۔“

نتالیا نے کہا۔ ”شکریہ! ہم ضرور رپورٹ کر کے جائیں گے۔“

وہاں سے ہم ٹیکسی میں سوار ہو کر ہوٹل میں آگئے۔ یہاں ایک کمرہ ہم نے میاں بیوی یعنی پرکاش کھنہ اور مسز پرکاش کھنہ کے نام سے لے لیا۔ بڑے آرام سے ہم نے غسل کیا۔ تازہ دم ہو کر نیچے لابی میں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔

نتالیا کہنے لگی۔ ”ہم ابھی انارکلی جائیں گے۔ میں اپنے لئے گرم جری خریدنا چاہتی ہوں۔ ایبٹ آباد میں سردی ہوگی تم بھی سویٹر خرید لینا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ نئے کپڑے خریدوں گی مگر یہاں زنانہ ریڈی میڈ کپڑے تو ملیں گے نہیں۔ ساڑھیاں پہننے کا یہاں رواج نہیں ہے۔“

ہم چائے پیتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی کچھ فاصلے پر بیٹھا ہے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہمیں دیکھ لیتا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ ہندوستان سے کوئی بھارتی آتا ہے تو اس کی ضرور نگرانی کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں بھی کوئی پاکستانی جاتا ہے تو وہاں کی سی آئی ڈی اس کی نگرانی کرتی ہے۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا مگر یہ خیال ضرور آیا کہ جب میں انارکلی بازار نتالیا سے الگ ہو گیا تو ممکن ہے یہ سی آئی ڈی والا نتالیا کو چھوڑ کر میرے پیچھے لگ جائے۔ میرے لئے ایک نئی مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ میں اس کو ساری کہانی بیان کر دوں گا اور بتا دوں گا کہ میں ہندوستانی نہیں ہوں اور ہندو بھی نہیں ہوں بلکہ پاکستانی ہوں۔ مسلمان ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اُسے میری بات کا یقین نہ آئے۔ لاہور میں میرا کوئی رشتہ دار وغیرہ بھی نہیں تھا۔

میں نے سوچ سوچ کر آخر یہی فیصلہ کیا کہ مجھے لاہور میں نتالیا سے الگ نہیں ہونا چاہئے یہ کام مجھے کسی دوسرے شہر مثلاً راولپنڈی پہنچ کر کرنا چاہئے۔ جب یہ سی آئی

ڈی والا وہاں نہ ہو کیونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ خفیہ کا آدمی لاہور میں ہی رہ جائے گا۔ ہم ہوٹل سے نکل کر انارکلی آگئے۔ یہاں ہم نے اپنے لئے گرم جریاں وغیرہ خریدیں۔ نتالیا نے نئے جوتے خریدے۔ وہ بالکل ایسے ظاہر کر رہی تھی جیسے وہ ایک عام گھریلو عورت ہے اور بدروحوں اور بھوت پریت کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک رات ہم ہوٹل میں رہے۔ دوسرے دن ہم بذریعہ ریل کار صبح راولپنڈی روانہ ہو گئے اس وقت مجھے سی آئی ڈی والا کوئی آدمی اپنے آس پاس نظر نہیں آیا تھا۔ شاید وہ ہمیں سٹیشن پر چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔

راولپنڈی ہم دن کے ایک بجے پہنچے۔ وہیں سٹیشن کے فرسٹ کلاس میں ڈائننگ روم میں بیٹھ کر ہم نے کھانا کھایا۔ وہاں سے ہمیں ایک پرائیویٹ ٹیکسی لے کر ایبٹ آباد پہنچنا تھا۔ راولپنڈی پہنچتے ہی میں نے نتالیا سے بھاگ جانے کے مواقع تلاش کرنے شروع کر دیئے تھے۔ لیکن میں رات کے وقت فرار ہونا چاہتا تھا جس وقت نتالیا بدروح سو رہی ہو تاکہ اسے میرے فرار کا صبح کو علم ہو اور مجھے اس سے دور نکل جانے کا موقع مل جائے۔ اس کے لئے راولپنڈی میں ایک رات قیام کرنا ضروری تھا چنانچہ میں نے نتالیا سے کہا۔ ”نتالیا! میں سفر کی وجہ سے بڑا تھک گیا ہوں۔ آگے بھی ایبٹ آباد تک ٹیکسی کا سفر ہے میں چاہتا ہوں کہ ایک رات راولپنڈی میں آرام کر لوں۔“

نتالیا بدروح کہنے لگی۔ ”اگر تم چاہتے ہو تو کسی ہوٹل میں ایک رات ٹھہر جاتے ہیں۔ کل ایبٹ آباد چلے چلیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”یہاں صدر میں شور ہوٹل بڑا اچھا ہوٹل ہے وہاں ٹھہر جائیں گے۔“

اس زمانے میں شور ہوٹل کا شمار پنڈی کے کلاس ون ہوٹلوں میں ہوتا تھا۔ اسلام آباد پاکستان کا نیا دارالحکومت ضرور بن چکا تھا مگر ابھی وہ تکمیل کے آخری مراحل

میں تھا اور نئے ہوٹل بن رہے تھے، نئی عمارتیں بھی بن رہی تھیں۔

ہم نے شور ہوٹل میں ایک ڈبل بیڈ والا کمرہ لے لیا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر شہر کی سیر کرنے نکل گئے۔ شام کو واپس آ کر چائے پی اور باتیں کرنے لگے۔ رات ہو گئی تو رات کا کھانا کھا کر ہم آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ میں اب نتالیا بدروح کے سو جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں جاگ رہا تھا۔ نتالیا پلنگ پر ہلکا سا کبل اوپر لئے منہ دوسری طرف کر کے لیٹی ہوئی تھی۔

میں پلنگ پر لیٹا تھوڑی تھوڑی دیر بعد دیوار پر لگے کلاک کو دیکھ لیتا تھا۔ ابھی رات کے دس بجے تھے۔ کمرے میں دھیمی روشنی والا ٹیبل لیپ روشن تھا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ میں جاگ رہا تھا۔ مجھے نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب رات آدھی گزر گئی تو مجھے نتالیا کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز سنائی دی۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ آواز پیدا کئے بغیر پلنگ سے اٹھ کر کلوزٹ روم میں گیا۔ وہاں میں نے پتلون قمیض اور جیکٹ اور بوٹ پہنے اور دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گیا۔ سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ میں نے جیکٹ کے بٹن بند کئے اور ریلوے اسٹیشن کی طرف چلنے لگا۔ میں نے اپنی جیب میں سے بٹہ نکال کر دیکھا۔ میرے پاس نتالیا کے دیئے ہوئے دو ہزار روپے اسی طرح پڑے تھے۔ یہ اس زمانے میں کافی رقم ہوا کرتی تھی۔

مجھے ہوٹل سے ذرا فاصلے پر ہی ایک ٹیکسی مل گئی۔ میں اس میں بیٹھ کر اسٹیشن پر آ گیا۔ اسٹیشن پر آ کر معلوم ہوا کہ لاہور کی طرف کوئی گاڑی نہیں جا رہی۔ وہاں سے میں ایک اور اڈے پر آ گیا۔ لاری اڈے سے لاہور کی طرف رات کے ایک بجے آخری لاری جایا کرتی تھی۔ وہ لاری مجھے مل گئی اور میں اس میں بیٹھ گیا۔ لاری میں بیٹھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ ایک آدمی نے مجھے لاری میں سوار ہوتے گھور کر دیکھا تھا اور میرے ساتھ ہی لاری میں سوار ہو گیا تھا۔

مجھے شک ہوا کہ شاید یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے اور چونکہ میں انڈیا سے آیا ہوں اس لئے میرا پیچھا کرنے لگا ہے جو اس کی ڈیوٹی ہے۔ مگر میں اپنے وطن پاکستان میں تھا میں پاکستانی تھا اور مسلمان تھا مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔

لاری لاہور کی طرف روانہ ہو گئی۔ لاری جہلم پہنچی تو میں دوسرے مسافروں کے ساتھ چائے پینے کے لئے اُترا۔ وہ آدمی بھی میرے ساتھ ہی اُترا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ مجھے اپنی نظروں میں رکھے ہوئے ہے۔ میں نے کوئی خاص خیال نہ کیا۔ لاری لاہور پہنچی تو صبح ہو رہی تھی۔ میں بڑا مطمئن تھا کہ نتالیا بدروح کو میرے فرار کا ابھی تک علم نہیں ہوا اور اب اگر ہو بھی گیا ہو گا تو میں اس سے بہت دور نکل آیا تھا۔

میرا پروگرام لاہور سے سیدھا کراچی جانے کا تھا تاکہ میں نتالیا سے جتنی دور جا سکتا ہوں چلا جاؤں۔ میں لاری اڈے سے ایک ٹیکسی لے کر سیدھا ریلوے اسٹیشن آ گیا۔ کراچی جانے والی گاڑی میں ابھی دیر تھی۔ میں ریفرشمنٹ روم میں آ گیا اور ناشتہ کرنے لگا۔ ناشتہ کے بعد چائے پی رہا تھا کہ وہی سی آئی ڈی والا آدمی جو پنڈی سے میرے ساتھ لاری میں سوار ہوا تھا دو سپاہیوں کے ساتھ اندر آ گیا۔

وہ سیدھا میرے پاس آیا اور بولا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”فیروز۔“

اُس نے کہا۔ ”مگر تم انڈیا سے دو روز پہلے پاکستان میں داخل ہوئے ہو اور انڈین پاسپورٹ پر آئے ہو اور تمہارا نام پرکاش کھنہ ہے۔“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”بالکل غلط ہے۔ میں پاکستانی ہوں، مسلمان ہوں اور میرا نام فیروز ہے۔“

اُس نے کہا۔ ”تم جھوٹ بولتے ہو۔ تمہارے ساتھ تمہاری بیوی مسز پرکاش کھنہ بھی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”میری کوئی بیوی نہیں ہے۔ میں شادی شدہ نہیں ہوں۔“

اس نے ایک سپاہی سے کہا۔ ”اس کی تلاشی لو۔“

سپاہی میری تلاشی لینے لگا۔ میری جیکٹ کی اندروالی جیب میں سے میرا انڈین پاسپورٹ نکل آیا۔ یہ مصیبت متالیانے میرے گلے میں ڈال دی تھی۔ اُس نے میرا پاسپورٹ میری جیکٹ میں ڈال کر کہا تھا۔ ”اسے جیکٹ میں ہی رکھنا۔ یہ غیر ملک ہے یہاں کسی وقت بھی یہ دکھانا پڑ سکتا ہے۔“

اور مجھ سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ شور ہو نل سے فرار ہوتے وقت میں نے پاسپورٹ نکال کر وہیں نہیں پھینکا تھا۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میرا انڈین پاسپورٹ جو متالیانے خدا جانے کس جن بھوت کے ذریعے بنوایا تھا میری جیکٹ میں ہی ہے۔ انڈین پاسپورٹ برآمد ہونے کے بعد یہ ثابت ہو گیا تھا کہ میں انڈین نیشنل ہوں۔ ہندو ہوں اور میرا نام پرکاش کھنہ ہے۔ پاسپورٹ پر باقاعدہ میری تصویر لگی ہوئی تھی اور نیچے میرا نام لکھا ہوا تھا۔ وہاں میرے دستخط بھی تھے۔ سی آئی ڈی والے نے سپاہیوں سے کہا۔ ”اسے تھانے لے چلو۔“

میں نے کہا۔ ”آپ میرا میڈیکل معائنہ کروالیں۔ میں ہندو نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔“

اُس نے کہا۔ ”پاکستان میں بھارت کے ایسے جاسوس بھی جاسوسی کرنے آتے ہیں جن کے مسلمانوں کی طرح ہسپتال میں ختنے کرا دیئے جاتے ہیں تاکہ اُن پر ہندو ہونے کا کسی کو یقین ہی نہ آئے۔ تم بھی ان ہی بھارتی جاسوسوں میں سے ہو۔ ہم نے ایسے دو جاسوس پہلے پکڑے تھے۔ تھانے چلو۔“

میں کیا کرتا بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ دونوں سپاہیوں نے مجھے پکڑ کر رکھا تھا۔ وہ مجھے ریفر شمنٹ روم سے باہر پلیٹ فارم پر لے آئے۔ پلیٹ فارم پر پہلے سے دو سپاہی موجود تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس جھٹھڑی تھی۔ اسی وقت مجھے جھٹھڑی لگادی گئی

اور پولیس مجھے لے کر سٹیشن سے باہر آگئی۔

میں بڑا پریشان ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں کیانہ کروں۔ پولیس مجھے سیدھی چیرنگ کر اس تھانے لے آئی۔ وہاں میرا پاکستان میں داخلے کا باقاعدہ اندراج ہو چکا تھا۔ مجھے اسی وقت حوالات میں بند کر دیا گیا۔ ایک گھنٹے بعد ایک پولیس انسپکٹر آیا۔ اس نے مجھے حوالات کی سلاخوں میں سے دیکھا اور اپنے ساتھ آئے ہوئے کانٹیل سے کہا۔ ”اسے لے آؤ۔“

کانٹیل مجھے جھٹھڑی لگا کر تھانے کے ایک کمرے میں لے آیا۔ وہاں پولیس انسپکٹر موجود تھا۔ میں اس کے سامنے میز کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس نے کانٹیل کو باہر بھیج دیا اور مجھ سے کہا۔ ”یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ تم انڈیا کے جاسوس ہو۔ جس عورت کو اپنی بیوی بنا کر اپنے ساتھ لائے تھے ہم نے پنڈی کے ہو نل میں چھاپہ مار کر گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی ہے مگر ہم اسے بہت جلد گرفتار کر لیں گے۔ یہ بتاؤ کہ پاکستان میں تمہارے انڈین جاسوس ساتھی کہاں کہاں پر ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”جناب! میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ میں بھارتی جاسوس نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں، پاکستانی ہوں۔ قیام پاکستان کے وقت مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے لاہور آکر آباد ہو گیا تھا پھر بمبئی اپنے دوست کے پاس کچھ دنوں کے لئے چلا گیا اور وہیں ایک ایسی مصیبت میں پھنس گیا کہ جس کو سن کر آپ کو بھی یقین نہیں آئے گا۔“

پولیس انسپکٹر نے کہا۔ ”اس قسم کی فضول باتیں کرنے میں اپنا اور ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تمہارا تعلق انڈیا کے اُن جاسوسوں سے ہے جو ہندو ہوتے ہیں مگر جن کے آپریشن کے ذریعے ختنے کروادیئے جاتے ہیں اور مسلمان بنا کر پاکستان میں جاسوسی کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”سر! میں انڈین جاسوس نہیں ہوں۔“
پولیس انسپکٹر نے کہا۔ ”جس عورت کے ساتھ تم پاکستان آئے ہو وہ عورت کیا تمہاری بیوی نہیں تھی؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں جناب! وہ میری بیوی نہیں تھی۔ یقین کریں وہ ایک بدروح تھی اس نے مجھے اپنے قبضے میں کیا ہوا تھا۔ اُسی نے میرا بھارتی پاسپورٹ بنایا تھا اور وہی مجھے اپنے ساتھ یہاں لائی تھی۔“

پولیس انسپکٹر نے میری طرف جھکتے ہوئے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا۔ ”اس قسم کی باتوں سے تم پولیس کو بیوقوف نہیں بنا سکو گے۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ پاکستان میں اپنے بھارتی ساتھیوں کے نام اور پتے ہمیں بتادو کہ وہ کہاں کہاں پر ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! یقین کریں نہ میں انڈین جاسوس ہوں اور نہ میرا انڈیا سے کوئی تعلق ہے۔ میں ایک بڑی بھیاںک مصیبت میں پھنس گیا تھا جس سے بڑی مشکل سے نکل کر آ رہا ہوں۔ جو عورت میرے ساتھ تھی وہ ایک چڑیل تھی، بدروح تھی۔ میرا پاسپورٹ اس نے جن بھوتوں کے ذریعے انڈیا میں بنوایا تھا۔ اُس نے مجھ سے زبردستی شادی کر لی تھی کیونکہ میں اُسے پسند آ گیا تھا اور میں نے اُسے کہا تھا کہ شادی کے بعد میں پاکستان میں ہنی مون منانا چاہتا ہوں۔ میں اس بہانے اسے پاکستان لانا چاہتا تھا تاکہ یہاں آکر میں اُس سے چھٹکارا حاصل کر لوں کیونکہ یہ میرا وطن ہے یہاں مجھے پناہ مل جائے گی۔“

پولیس انسپکٹر پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ کہنے لگا۔ ”اگر وہ بدروح تھی تو اسے پاسپورٹ بنوانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو تمہیں غائب کر کے اور خود غائب ہو کر بھی پاکستان آسکتی تھی کیونکہ جن بھوت تو غائب ہو جاتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ایسا وہ اس لئے کر رہی تھی کہ وہ مجھ پر یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ کوئی بدروح نہیں ہے بلکہ ایک نارمل عورت ہے اور نارمل عورت کی طرح میرے

ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔“
پولیس انسپکٹر مسکرایا۔ کہنے لگا۔ ”تمہیں انڈیا کی خفیہ ایجنسی نے ایک دلچسپ مگر بوگس کہانی کے ساتھ پاکستان میں بھیجا ہے۔ تمہارے خیال میں ہم لوگ تمہاری من گھڑت جن بھوت کی کہانی پر اعتبار کر لیں گے؟ ہم مسلمان ہیں۔ پاکستان اسلامی ملک ہے۔ ہم لوگ جن بھوتوں کے قائل نہیں ہے ہم صرف ایک خدا اور اس کے رسول اور قرآن پاک کو ماننے والے ہیں۔ یہ جنوں بھوتوں کی کہانی تم ہندوؤں کو ہی سنا سکتے ہو ہمیں نہیں۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ مجھے سچ بتادو کہ تم کس مشن پر یہاں بھیجے گئے ہو؟“

میں کیا بتاتا۔ مجھے تو کسی بھی حکومت نے کسی بھی مشن پر نہیں بھیجا تھا۔ مگر میرے بھارتی جاسوس ہونے کے سارے ثبوت پولیس انسپکٹر کے پاس موجود تھے۔ سب سے بڑا ثبوت میرا انڈین پاسپورٹ تھا جس پر میری فوٹو لگی تھی اور نیچے میرا ہندو نام پر کاش کھنہ لکھا تھا۔ مجھے ایک دوسرے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ظاہر ہے وہاں مجھ پر تھوڑا بہت تشدد تو ہونا ہی تھا۔ ایسا ہر ملک میں ہوتا ہے۔ اگر مجھے بھارت میں پاکستانی جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا جاتا تو وہاں بھی مجھ پر لازمی طور پر تشدد ہوتا بلکہ کچھ زیادہ ہی تشدد کیا جاتا۔

رات ہو گئی۔ مجھے تھوڑا بہت کھانے کو دیا گیا۔ پھر اُس کو ٹھڑی سے نکال کر ایک دوسری کو ٹھڑی میں بند کر دیا گیا جس کا دروازہ لوہے کی سلاخوں والا تھا اور جس کے باہر ایک سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ میں ایک بات پر ضرور حیران تھا کہ نتالیا ابھی تک میری تلاش میں وہاں نہیں پہنچی تھی۔

اگر وہ آسیبی عورت تھی، بدروح تھی جس کا مجھے یقین تھا تو اُسے تو اب تک میری مدد کرنے اور دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کے لئے پہنچ جانا چاہئے تھا لیکن سارا دن گزر گیا تھا۔ میں گرفتار بھی کر لیا گیا تھا۔ مجھ پر تھوڑا بہت تشدد بھی ہوا تھا اور اب

میں حوالات میں بند تھا مگر نتالیا ابھی تک میری مدد کو نہیں پہنچی تھی۔ مجھے کچھ کچھ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ نتالیا بدروح یا آسیبی عورت نہیں تھی۔ اگر وہ آسیبی عورت نہیں تھی تو پھر جو آسیبی عورت مجھے میرا ہاتھ پکڑ کر ہوا میں اڑاتے ہوئے نیم مردہ نیم زندہ لوگوں کی عجیب و غریب دنیا سے انڈیا کے شہر چندی گڑھ کے کرپین قبرستان کی قدیم خانقاہ میں لائی تھی وہ عورت کون تھی؟ وہ تو یقیناً کوئی بدروح یا آسیبی عورت ہی تھی۔ اُس کے گرم سانس کو میں نے اپنے چہرے پر اڑنے سے پہلے محسوس کیا تھا اور اُس نے میری گردن کو چوما بھی تھا۔ یہ تو وہی آسیبی لڑکی تھی جس کو روہنی نے مٹھرا شہر کے دیران شمشان گھاٹ کی کوٹھڑی میں سے غلطی سے آزاد کر دیا تھا اور جس کے بارے میں روہنی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ بڑی ہی خطرناک آسیبی بدروح ہے لیکن اگر اس نے تمہاری گردن کو چوم لیا ہے تو سمجھ لو کہ وہ تمہیں پسند کرنے لگی ہے تم اسے پسند آگئے ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر نتالیا وہ آسیبی لڑکی نہیں تھی تو پھر وہ کون تھی اور کس خوشی میں وہ مجھے پہاڑی قبرستان کی قدیم خانقاہ میں لائی تھی اور پھر خفیہ طور پر مجھ سے شادی بھی رچالی تھی۔

یہ ایک ایسا معمہ تھا جو میری سمجھ سے باہر تھا۔ مجھے روہنی کا بھی خیال آیا کہ وہ پجاری رگھو کی قید میں تھی۔ خدا جانے وہ کہاں ہو گی؟ کس حال میں ہو گی؟ روہنی جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کوئی بدروح نہیں تھی۔ وہ ایک بھگی ہوئی روح تھی۔ جھانسی کے مسلمان مغل صوبیدار شہزادہ شیروان نے اس سے شادی کر لی تھی اور وہ اپنی رضامندی سے مسلمان ہو گئی تھی اور شہزادے نے اس کا نام سلطانہ رکھ دیا تھا۔ سلطنت کے کاہن پجاری رگھو نے ایک سازش کے تحت روہنی عرف سلطانہ کو قتل کروا کر اس کی روح کو کالے جادو کے ذریعے ایک مرتبان میں بند کر کے چبوترے کی دیوار میں دفن کر دیا تھا۔ میں نے وہاں سے مرتبان نکال کر روہنی کی روح کو

نادانستگی میں آزاد کر دیا تھا جس کی وجہ سے رگھو پجاری کی بدروح میری جانی دشمن بن گئی تھی۔ وہ روہنی کی روح کو بھی دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی اور اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ آخر جیسا کہ آپ کو میں پہلے بیان کر چکا تھا مٹھرا کے قریب پرانے شمشان گھاٹ پر پجاری رگھو کی بدروح کا مقابلہ کرتے ہوئے روہنی عرف سلطانہ کی روح شکست کھا گئی اور پجاری رگھو نے اسے دوبارہ اپنے قبضے میں کر لیا۔ اسی قدیم شمشان گھاٹ کی ایک کوٹھڑی میں آسیبی لڑکی کی بدروح بھی ایک مکے میں بند تھی جس کو روہنی نے غلطی سے آزاد کر دیا۔ یہ لڑکی ایک آسیب بتایا آسیب لڑکی تھی جس کے بارے میں روہنی نے مجھے بتایا تھا کہ آسیب بدروحوں اور چڑیلوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے مگر اتفاق سے اس آسیبی لڑکی کو میں پسند آ گیا اور بعد میں وہ مجھے آدھے زندہ آدھے مردہ لوگوں کے قبرستان سے اڑا کر بھارت کے شمالی پہاڑی علاقے کی طرف لے گئی۔

ابھی معمر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر نتالیا یہ آسیبی لڑکی نہیں ہے تو پھر یہ کون ہے اور آسیبی لڑکی مجھے اس کرپچین قبرستان کی خانقاہ میں چھوڑنے کے بعد کہاں چلی گئی تھی۔

نتالیا کے بارے میں بھی مجھے یقین تھا کہ یہ بھی ایک بدروح ہے مگر وہ مجھے پسند کرتی ہے اور اسی وجہ سے اُس نے مجھ سے بیاہر چایا ہے جبکہ میں ہرگز ہرگز اسے اپنی بیوی سمجھنے پر تیار نہ تھا۔ اس نے جو میرا انڈین پاسپورٹ بنا کر میری جیکٹ کی جیب میں ڈال دیا تھا اس کی وجہ سے میں ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو کر لاہور کے تھانے کی حوالات میں بند کر دیا گیا تھا۔ یہ لوگ مجھے بھارتی جاسوس سمجھنے میں حق بجانب تھے کیونکہ ایک تو میرا پاسپورٹ انڈیا کا تھا دوسرے پاسپورٹ پر میری تصویر کے نیچے میرا ہندو نام پرکاش کھنہ لکھا ہوا تھا۔

میں تو نتالیا کو راولپنڈی کے شور ہوٹل میں چھوڑ کر بھاگ آیا تھا اور انڈیا پاسپورٹ کی وجہ سے پولیس کی قید میں پھنس گیا تھا لیکن اس بات پر بھی مجھے تعجب تھا کہ غیر انسانی طاقت رکھنے کے باوجود نتالیا ابھی تک میرے پاس کیوں نہیں پہنچی۔ وہ تو بدروح تھی بڑی آسانی سے پنڈی سے لاہور اڑ کر آ سکتی تھی اور مجھے اپنے قبضے میں کر کے واپس جہاں چاہے لے جاسکتی تھی۔

دوسری طرف جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں مجھے روہنی عرف سلطانہ کی بھٹکتی روح کا بھی خیال آ رہا تھا۔ روہنی سے مجھے ایک لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ وہ کئی سالوں

سے میرے ساتھ تھی اور اُس نے ہر مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا تھا اور میری مدد کی تھی مگر اب وہ خود اپنے اور میرے مشترکہ دشمن پجاری رگھو کی بدروح کے قبضے میں تھی وہ بے چاری میری مدد کرنے سے معذور تھی۔

میں ان ہی خیالوں میں گم لاہور کے ایک پولیس سٹیشن کی دوسری منزل کی کوٹھڑی میں قید کی حالت میں پڑا تھا کیونکہ مجھ سے انڈین پاسپورٹ برآمد ہو چکا تھا اور میں اپنے آپ کو بھارتی جاسوس نہ ہونا ثابت نہ کر سکا تھا۔ میرے پاس کوئی ماورائے انسانی طاقت تو تھی نہیں کہ پولیس کی قید سے غائب ہو کر نجات حاصل کر سکتا۔ روہنی بھی میری مدد کو نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہ دشمن رگھو کی قید میں تھی اور اُسے خود مدد کی ضرورت تھی۔ رات ہو گئی تھی۔ کوٹھڑی ایک قسم کی حوالات ہی تھی۔ دروازہ لوہے کی سلاخوں والا تھا جس کے باہر ایک مسلح کانسٹیبل پہرہ دے رہا تھا۔ کوٹھڑی میں کوئی جی نہیں لگی ہوئی تھی۔ اگر کوئی بلب لگا ہوا بھی تھا تو وہ جل نہیں رہا تھا۔ کوٹھڑی کے باہر برآمدے میں ایک بلب روشن تھا جس کی روشنی سلاخوں میں سے گزر کر کوٹھڑی میں مجھ پر پڑ رہی تھی۔ رات شاید آدھی ہو گئی تھی۔ تھانے کے آگے سے گزرنے والی سڑک بھی خاموش تھی۔ کبھی کبھی کوئی موٹر کار یا کوئی تانگہ گزر جاتا تھا اور پھر وہی خاموشی چھا جاتی۔ ابھی تک مجھے قیدیوں والے کپڑے نہیں پہنائے گئے تھے کیونکہ ابھی میں حوالات میں ہی تھا اور دوسرے دن پولیس نے مجھے عدالت میں پیش کر کے میرا ریماڈ لینا تھا اس ریماڈ کے دوران مجھ سے باقاعدہ پوچھ گچھ ہونی تھی اور ظاہر ہے کہ مجھ پر تشدد بھی کیا جاتا تھا۔

میں ایک تکلیف دہ چکر میں پھنس گیا تھا اور اُس کا انجام دس پندرہ سال کی قید ہی ہو سکتا تھا یعنی مجھے دس پندرہ سال جیل میں رہ کر بسر کرنے تھے جس کے خیال ہی سے مجھے وحشت ہونے لگتی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے خدا سے بڑی دعا مانگی کہ یا اللہ پاک! مجھے کسی دہیلے سے اس عذاب سے نجات عطا فرما۔ میں آئندہ کبھی کوئی ایسی

حرکت نہیں کروں گا جس کے بعد مجھے پچھتانا پڑے۔

خدا کے حضور دُعا مانگنے سے مجھے کچھ حوصلہ ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ میری نجات کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور بن جائے گا۔ میں کوٹھڑی کے کونے میں ایک پرانے کمبل کے اوپر لیٹا ہوا تھا۔ ایک پرانا کمبل میں نے اوپر لے رکھا تھا۔

نیند غائب تھی۔ دروازے کی سلاخوں کے باہر پہلا مسلح کانسٹیبل جاچکا تھا اس کی جگہ دوسرا کانسٹیبل ڈیوٹی دینے آگیا ہوا تھا۔ وہ راتفل کندھے سے لگائے کھڑا تھا۔

اتنے میں مجھے فضا میں ایک مانوس سی خوشبو محسوس ہوئی۔ میں ٹھٹھک سا گیا۔ یہ خوشبو مجھے اس وقت آئی تھی جب میں نے روہت گڑھ جھانسی کے پرانے قلعے کے دیران محل سے روہنی کی روح کو مرتبان سے آزاد کیا تھا۔

تو کیا روہنی کوٹھڑی میں موجود ہے؟

اس خیال سے میں آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور بڑے غور سے کوٹھڑی میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کوٹھڑی خالی اور سنسان پڑی تھی۔ خوشبو برابر آرہی تھی۔ یہ روہنی ہی کی خوشبو ہو سکتی تھی۔ خوشبو مدھم تھی جیسے دُور سے آرہی ہو۔ پھر خوشبو گہری ہونے لگی جیسے دُور سے قریب آرہی ہو۔ میں دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ کانسٹیبل نے سلاخوں میں سے مجھ پر نگاہ ڈالی اور یہ دیکھ کر کہ میں اٹھ کر بیٹھ گیا ہوں منہ دوسری طرف کر لیا۔ اس کے لئے فکر کرنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ قیدی کوٹھڑی میں موجود تھا۔

اب خوشبو مجھے بڑے قریب سے آنے لگی تھی۔

میں چوکس اور ہوشیار ہو کر بیٹھا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر یہ خوشبو روہنی ہی کی ہے تو وہ اس وقت کوٹھڑی میں میرے پاس موجود ہے۔ مجھے اپنے قریب ہی کسی کے ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ سی سنائی دی۔ میں بالکل ساکت ہوا گیا۔ پھر کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُس ہاتھ کی نرمی اور محبت بھرے احساس کو میں نے

پہچان لیا۔ یہ روہنی کا ہاتھ تھا۔ وہ کوٹھڑی میں آچکی تھی۔ مگر میں اُسے آواز دے کر بلا نہیں سکتا تھا۔ پھر میرے کان میں روہنی کی سرگوشی سنائی دی۔

”شیروان فکر نہ کرو۔ میں تمہاری مدد کو آگئی ہوں۔“

میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”روہنی! روہنی! کیا یہ تم ہو؟“

”ہاں۔“ روہنی نے سرگوشی کی۔ ”میں تمہاری روہنی یعنی شہزادی سلطانہ ہوں۔“

میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ تم رگھو پجاری کی قید سے آزاد ہونے میں کامیاب ہو گئیں۔“

روہنی نے سرگوشی میں کہا۔ ”یہ لمبی کہانی ہے پھر سناؤں گی۔ اس وقت میں تمہیں یہاں سے نکالنے آئی ہوں۔“

گارڈ کانسٹیبل نے شاید ہماری سرگوشیوں کی آواز سن لی تھی یا اسے کوئی شک سا پڑ گیا تھا اُس نے سلاخوں میں سے جھانک کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ”تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”اگر میں کسی سے باتیں کر رہا ہوتا تو دوسرا آدمی تمہیں نظر آ جانا چاہئے تھا مگر تم دیکھ رہے ہو کہ میں کوٹھڑی میں اکیلا ہوں۔“

گارڈ نے غور سے کوٹھڑی میں چاروں طرف دیکھا پھر باہر سے سوچاؤن کیا اور کوٹھڑی کا بلب روشن ہو گیا۔ وہ بولا۔ ”مگر یہ آواز سی کیسی آرہی تھی؟“

میں نے کہا۔ ”میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔“

گارڈ نے ڈانٹ کر کہا۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ خاموشی سے لیٹ جاؤ۔“

روہنی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”اُس کو معلوم ہی نہیں کہ تم ابھی کوٹھڑی سے غائب ہونے والے ہو۔ پھر تو اس کی حیرانی دیکھنے والی ہوگی۔“

میں نے روہنی سے کہا۔ ”جو کرنا ہے خاموشی سے کرو تاکہ یہاں سے ایک بار

باہر نکل جائیں۔“ میری سرگوشی کچھ اونچی ہو گئی تھی۔ ”ڈیوٹی گارڈ نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”تم پھر باتیں کرنے لگے؟ تمہیں کہہ دیا ہے کہ خاموشی سے سو جاؤ۔“ خدا جانے روہنی کو کیا مذاق سوچا اس نے پوری آواز میں کہا۔ ”قیدی مجھ سے باتیں کر رہا ہے تمہیں کیا اعتراض ہے؟“ ایک عورت کی آواز سن کر ڈیوٹی گارڈ کا نشیبل نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”یہ کون تھا؟“

میں نے کہا۔ ”میں ہی عورت کی آواز میں بول رہا تھا۔“ کا نشیبل کو میری بات کا یقین کرنا ہی پڑا کیونکہ کوٹھڑی میں اُسے روہنی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے روہنی کو سرگوشی میں کہا۔ ”روہنی! خدا کے لئے کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا۔“

روہنی نے پوری آواز میں کہا۔ ”کا نشیبل! میں قیدی کو لے جا رہی ہوں لیکن میں نہیں چاہتی کہ بعد میں تم پر الزام لگے کہ تم نے قیدی کو رشوت لے کر بھگادیا تھا اس لئے فوراً نیچے سے پولیس انسپکٹر یا تھانیدار کو بلاؤ تاکہ میں اُن کی موجودگی میں قیدی کو لے جاؤں۔“

کا نشیبل پر ایک عجیب خوف طاری ہو گیا تھا۔ وہ ایک عورت کی آواز سن رہا تھا مگر کوٹھڑی میں عورت موجود نہیں تھی۔ اس نے وہیں سے کسی کو آواز دے کر کہا۔ ”خدا داد! خدا داد! ایس ایچ او صاحب کو فوراً اوپر بھیجو۔ اوپر گڑ بڑ ہو گئی ہے۔“

نیچے ایک شور مچا دیا۔ میں نے روہنی سے اپنی پوری آواز میں کہا۔ ”روہنی! یہاں سے نکل چلو اس کی ضرورت نہیں۔“

روہنی نے کہا۔ ”شیردان! میں تمہیں لے کر غائب ہو گئی تو اس کا نشیبل پر مصیبت آجائے گی۔ یہ معطل ہو جائے گا اور ایک بھارتی جاسوس کو فراز کرانے کے

الزام میں ہو سکتا ہے بے چارے کو قید بھی ہو جائے اس لئے میں تھانے کے ذمہ دار افسروں کے سامنے تمہیں غائب کرنا چاہتی ہوں تاکہ اس سپاہی کی جان بچ جائے۔“ کوٹھڑی میں سے عورت کی آواز آتی سن کر گارڈ کا نشیبل آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کوٹھڑی میں دیکھ رہا تھا اور اس نے رائفل اپنے ہاتھوں میں سیدھی کر لی تھی۔

اتنے میں برآمدے میں بہت سے تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر تھانیدار اور چار سپاہی دروازے پر نمودار ہوئے۔

”کیا بات ہے؟“ تھانیدار نے گارڈ کا نشیبل سے پوچھا۔ گارڈ کا نشیبل نے کہا۔ ”سر! کوٹھڑی میں سے کسی غیبی عورت کی آواز آرہی ہے وہ کہہ رہی ہے میں قیدی کو لینے آئی ہوں۔“

تھانیدار نے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور میری طرف سلاخوں کے پیچھے سے دیکھا اور بولا۔ ”اندر تو کوئی عورت نہیں ہے۔ تم سو تو نہیں گئے تھے؟“

کا نشیبل نے کہا۔ ”نہیں سر! میں جاگ رہا ہوں۔ میں نے جاگتے میں عورت کی آواز سنی تھی۔ اُس نے کہا تھا اپنے افسروں کو بلاؤ میں اُن کے سامنے قیدی کو لے جانا چاہتی ہوں۔“

تھانیدار نے کا نشیبل کو ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تم ڈیوٹی دینے کے لائق نہیں رہے۔“

اسی وقت روہنی نے اپنی پوری آواز میں کہا۔ ”تھانیدار صاحب! بے چارے کا نشیبل کو نہ ڈانٹئے۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے خود اُسے کہا تھا کہ اپنے افسروں کو بلاؤ۔“

غیبی عورت کی آواز سن کر تھانیدار بھی ایک بار ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا۔ روہنی نے کہا۔ ”حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کوٹھڑی میں موجود ہوں مگر تم لوگ مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ جس آدمی کو آپ لوگوں نے پکڑ رکھا ہے وہ بھارتی جاسوس نہیں

ہے۔ وہ پاکستان سے محبت کرنے والا سچا پاکستانی ہے اور مسلمان ہے۔ اسی لئے میں اسے لے جا رہی ہوں۔“

تھانیدار نے بڑی ہمت کر کے پوچھا۔ ”کیا تم کوئی جن بھوت ہو؟“
روہنی نے کہا۔ ”جی ہاں! جن بھوت ہی سمجھ لیجئے۔ میں اس بے گناہ قیدی کو لے جا رہی ہوں۔ خدا حافظ!“

اس کے ساتھ ہی روہنی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جیسے ہی اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا مجھے اپنا آپ نظر آتا بند ہو گیا۔ میں اپنے جسم کا وزن باقاعدہ محسوس کر رہا تھا مگر مجھے اپنا جسم نظر نہیں آ رہا تھا۔ روہنی پہلے ہی غائب تھی اب میں بھی اس کے ساتھ غائب ہو گیا تھا۔

اس وقت جس حیرت اور دہشت کے عالم میں کوٹھڑی کے سلاخوں والے دروازے کے باہر کھڑے سپاہی اور تھانیدار کوٹھڑی میں دیکھ رہے تھے میں اسے نہیں بھول سکتا۔ تب روہنی مجھے ساتھ لے کر فرش سے چارپانچ فٹ بلند ہو گئی اور ہم اپنے فیبی جسموں کے ساتھ دروازے کی سلاخوں میں سے اس طرح گزر گئے جس طرح دھواں سلاخوں میں سے گزرتا ہے۔

سپاہی اور تھانیدار سلاخوں کے ساتھ لگے ابھی تک کوٹھڑی میں ہی بت بنے دیکھ رہے تھے اور ہم ان کے درمیان سے اس طرح سلاخوں میں سے نکل گئے تھے جیسے ہوا کا جھونکا نکل جاتا ہے۔ ہمارے جانے کے بعد ان کا کیا حال ہوا؟ اس کی مجھے خبر نہیں ہے۔ میں روہنی کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے پولیس ہیڈ کوارٹر کی دوسری منزل سے نیچے آنے کی بجائے صحن کے درختوں کے اوپر سے ہو کر جا رہا تھا۔ میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”روہنی! تمہیں معلوم ہے میرے ساتھ کیا گزری؟“

روہنی نے کہا۔ ”ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ مجھے معلوم ہے تمہارے ساتھ کیا بتی تھی۔ کسی جگہ بیٹھ کر میں تمہیں یہ سناؤں گی کہ میرے ساتھ کیا

گزری۔“

میں خاموش ہو گیا۔ روہنی سچ کہہ رہی تھی۔ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ میرے ساتھ کیا گزری ہے اور میں کہاں ہوں۔ اگر وہ میری حالت سے بے خبر ہوتی تو میری مدد کو کیسے پہنچتی۔ رات خاموش تھی۔ ہم لاہور کی مال روڈ کے درختوں کے اوپر سے ہو کر ٹوٹنگٹن مارکیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ مال روڈ سنسان پڑی تھی۔ اُس زمانے میں رات کے وقت لاہور کی سڑکوں پر ٹریفک بالکل نہیں ہوتی تھی۔ سڑک کی بتیاں روشن تھیں۔ ہم ٹوٹنگٹن مارکیٹ کے بھی اوپر سے ہو کر گزر گئے۔

میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“
روہنی نے کہا۔ ”مجھے لاہور شہر میں شہنشاہ جہانگیر کا مقبرہ بہت پسند ہے۔ ہم جہانگیر کے مقبرے میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

ہم ٹوٹنگٹن مارکیٹ سے گورنمنٹ کالج کے اوپر سے ہوتے ہوئے بھائی دروازے کی طرف آ گئے۔ وہاں سے ہم نے دریائے راوی کے پل کی طرف رخ کر لیا اور شاہدرہ پہنچنے کے بعد مقبرہ جہانگیر کو جانے والی چھوٹی سی سڑک کے اوپر آ گئے۔ ابھی یہ سڑک پکی نہیں ہوئی تھی۔ مقبرہ جہانگیر کا دروازہ بند تھا اور چوکیدار ایک طرف بچ پر لٹا ہوا تھا۔

ہم بند دروازے میں سے گزر کر مقبرے کے اندر آ گئے۔ عجیب تجربہ تھا یہ..... آج اس کا تصور کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ شاید میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ ہم مقبرہ جہانگیر کے بڑے چوترے پر ایک طرف درختوں کے نیچے بیٹھ گئے۔ روہنی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور مجھے اپنا جسم پھر سے دکھائی دینے لگا۔ روہنی اسی طرح غائب تھی لیکن میں اپنی انسانی حالت میں واپس آ گیا تھا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ مقبرے کے چاروں طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ روہنی کہنے لگی۔ ”شیروان! کیا تم بے پور کے دیران محل میں میری سہیلی ڈرگاہی بدروح کے پاس گئے

تھے؟“

میں نے کہا۔ ”روہنی! جب میں نے مٹھرا شہر کے شمشان گھاٹ پر تمہیں پجاری رگھو کے ہاتھوں قید ہوتے اور اس کے قبضے میں جاتے دیکھا تو تمہاری ہدایت کے مطابق میں اسی وقت اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ نکلا اور میں سمجھ گیا تھا کہ تمہارا کوئی بھی منتر ہمارے دشمن پجاری رگھو کو ہلاک نہیں کر سکا اور اُس نے تمہیں اپنے قابو میں کر لیا ہے اور اب یقیناً وہ مجھے جان سے مارنے کی کوشش کرے گا تو میں وہاں سے فرار ہو کر سپیدھا جے پور کے ویران محل میں پہنچا اور جیسی بھی میری حالت تھی اسی حالت میں جب آدھی رات کو دُرگاکا بدروح ظاہر ہوئی تو میں نے اُسے بتایا کہ روہنی کو پجاری رگھو اغواء کر کے لے گیا ہے اور اُس نے مجھے تمہارے پاس مدد کے لئے بھیجا ہے۔“

روہنی نے پوچھا۔ ”پھر دُرگاکے کیا جواب دیا؟“

میں نے کہا۔ ”دُرگاکے کہا کہ میں پجاری رگھو کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ پجاری رگھو نے روہنی کو پھر اپنے قبضے میں کر لیا ہے لیکن افسوس کہ میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے کوئی طریقہ بتاؤ کہ میں روہنی کو پجاری رگھو کی قید سے آزاد کرا سکوں۔“

پھر اُس نے کیا کہا؟“ روہنی نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”دُرگاکے کہا تم عام منش یعنی عام انسان ہو۔ تم پجاری رگھو کی جادوئی طاقت کا مقابلہ کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ روہنی کو اس کے حال پر چھوڑ دو اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن پجاری رگھو کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے گی۔ میں کیا کہتا ہوں سے واپس چلا گیا۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”دُرگاکے صحیح کہا تھا۔ خود مجھے بھی پجاری رگھو کی نئی طاقت کا اندازہ نہیں تھا جو اُس کو کوشیش ناگن نے دے رکھی تھی۔ پجاری رگھو نے اپنی اُسی

طاقت سے مجھے شکست دی تھی ورنہ میں نے جس طلسمی منتر سے اُس پر حملہ کیا تھا اس کا دار کبھی خالی نہیں جاسکتا تھا۔“

”لیکن پھر تم اُس کی قید سے کیسے فرار ہوئیں روہنی؟“

میرے سوال کے جواب میں روہنی کہنے لگی۔ ”یاد رکھو! شیطان کی طاقت کتنی بھی کیوں نہ بڑھ جائے وہ نیکی کی طاقت کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اگر میں بدروح ہوتی تو شاید میں اپنے دشمن رگھو کی قید سے کبھی رہائی حاصل نہ کر سکتی لیکن شیروان! میں بدروح نہیں ہوں بلکہ ایک بھنگی ہوئی روح ہوں وہ بھی اس لئے ہوں کہ مجھ سے نادانستگی میں یعنی انجانے پن میں ایک گناہ سرزد ہو گیا تھا میں اُس کی سزا بھگت رہی ہوں۔ چنانچہ قدرت کسی نہ کسی وسیلے سے جب میری مصیبت انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو ضرور میری مدد کرتی ہے۔ تمہیں یاد ہے جب میری اذیت میری برداشت سے باہر ہو گئی تھی تو قدرت نے تمہیں میری مدد کے لئے بھیج دیا تھا اور تم نے مجھے مرتبان سے آزاد کر دیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن اس کے ساتھ ہی میں بھی تو ایک ایسی مصیبت میں مبتلا ہو گیا تھا کہ جس کو ابھی تک بھگت رہا ہوں۔“

روہنی نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے یہ تمہیں کسی تمہارے گناہ کی سزا مل رہی ہو بہر حال میری عقل چھوٹی سی ہے میں یہ مسئلے نہیں سمجھ سکتی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ انسان کو سخت مصیبتوں میں بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے اور ہمیشہ اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے دعا مانگنی چاہئے۔ سب مصیبتیں انسان کے کسی نہ کسی اپنے برے عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ بہر حال پجاری رگھو نے مجھے ایک ایسی جگہ بند کر دیا جہاں سے اس دنیا کا کوئی انسان مجھے باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ جس طرح اپنے محل کی دیوار میں مرتبان میں بند ہونے کے بعد میں ہر وقت خدا کے حضور اپنے گناہوں کی بخشش کی دعا مانگتی رہتی تھی اسی طرح جب رگھو نے مجھے زمین کے اندر پاتا ل کے سب

سے گہرے غار میں ایک چھپکلی بنا کر پھینک دیا تو میں یعنی میری بھنگی ہوئی روح سجدہ ریز ہو کر خدا سے اپنے گناہوں کی بخشش کی دعائیں مانگنے لگی۔
 روہنی ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی۔ وہ مجھے نظر نہیں آرہی تھی لیکن اُس کی خوشبو مجھے برابر آرہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا روہنی؟“

اُس نے کہا۔ ”آخر خدا نے میری فریاد سن لی اور پھر ایسا ہوا کہ میری مدد کے لئے ایک ذریعہ پیدا کر دیا۔ ہمارے دشمن پجاری رگھو نے مجھے پاتال کے جس گہرے غار میں پھینکا تھا وہاں ایک نہر بہہ رہی تھی۔ اُس نہر کا پانی اتنا گرم تھا کہ اس میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ میں اس نہر کے کنارے گیلی دیوار سے چمٹی ہوئی تھی۔ گرم نہر کے پانی کی بھاپ مجھے جلا رہی تھی مگر میں اپنی جگہ سے حرکت کرنے سے معذور تھی اور دوڑ کر کسی دوسری جگہ نہیں جاسکتی تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اس عذاب میں مجھے کتنے دن، کتنی راتیں گزر گئیں میں اس قدر تھک گئی تھی کہ لگتا تھا ابھی دیوار سے الگ ہو کر نیچے نہر کے کھولتے ہوئے پانی میں گر پڑوں گی۔

پھر ایسا ہوا کہ میں نے کسی سفید سی چیز کو دیوار پر ریگ کر اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ جب یہ شے میرے قریب آئی تو میں نے دیکھا کہ یہ ایک سفید سانپ تھا۔ میں تمکلی باندھے سہمی ہوئی آنکھوں سے سانپ کو دیکھ رہی تھی۔ سانپ چھپکلی کا دشمن ہوتا ہے۔ میں سمجھ گئی کہ سانپ ابھی اپنا منہ کھول کر مجھ پر حملہ کر کے مجھے نگل جائے گا۔ لیکن سفید سانپ نے ایسا نہ کیا۔ جس طرح انسانوں اور اور زمین کے اوپر رہنے والے پرندوں اور جانوروں کی اپنی زبان ہوتی ہے اسی طرح زمین کے نیچے رہنے والے حشرات الارض کی بھی اپنی ایک زبان ہوتی ہے جس میں وہ ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔ سفید سانپ نے مجھ سے کہا۔ گھبراؤ نہیں میں تمہیں ہڑپ کرنے نہیں بلکہ تمہاری مدد کرنے آیا ہوں۔ میں بڑی حیران ہوئی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو سفید سانپ نے کہا خاموش رہو تمہاری آواز دوسرے

سانپوں نے سن لی تو تمہارے دشمن کو خبر ہو جائے گی اور پھر میں بھی تمہیں پاتال سے نہیں نکال سکوں گا۔ میں چپ ہو گئی۔ سفید سانپ نے کہا جیسے میں کہتا ہوں ویسے کرتی جاؤ۔ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ بڑی احتیاط سے میرے جسم کے ساتھ چٹ جاؤ۔ سفید سانپ یہ کہہ کر ریگ کر میرے بالکل نیچے دیوار پر آ گیا۔ میں ہمت کر کے اپنی جگہ سے تھوڑی سی ہلی اور پھر اُچک کر سانپ کی پشت پر آ کر اُس کے جسم سے چٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی سانپ دیوار پر آگے کی طرف رینگنے لگا۔ وہ دیوار پر اونچا ہو کر ریگ رہا تھا اور وہاں گرم پانی کی بھاپ کی گرمی کم محسوس ہو رہی تھی۔ نہر آگے جا کر ایک طرف کو گھوم گئی۔ سفید سانپ بھی اُس طرف مڑ گیا۔ یہ غار بہت لمبا تھا۔ خدا جانے سانپ کب تک مجھے اپنے جسم سے چٹائے دیوار پر رینگتا چلا گیا۔ پھر ایسا ہوا کہ نہر کے پانی سے بھاپ خارج ہونا بند ہو گئی اور شدید گرمی کا احساس ختم ہو گیا۔ کچھ اور آگے جا کر گرمی کا احساس بالکل ہی ختم ہو گیا اس کی بجائے مجھے ہلکی ہلکی خنکی محسوس ہونے لگی۔ سفید سانپ نے کہا ہم منزل کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ایک جگہ بڑی زبردست گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ سفید سانپ نے کہا گھبراتا نہیں آگے نہر ایک کنوئیں میں گر رہی ہے۔ اس کنوئیں کی کوئی تہہ نہیں ہے۔ اس کنوئیں کا پانی زمین کے اندر ہی اندر سمندر سے جا کر مل جاتا ہے۔ میں خاموشی سے سانپ کی باتیں سن رہی تھی اور خدا سے دعا مانگ رہی تھی کہ وہ مجھے اس مصیبت سے خیر و عافیت کے ساتھ نکال دے۔“

میں بڑی دلچسپی سے روہنی کی داستان سن رہا تھا۔ جب وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہو گئی تو میں نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا روہنی؟“

روہنی نے کہا۔ ”پھر ایسا ہوا کہ جہاں زمین کے اندر بہنے والی نہر کا پانی ایک گہرے اندھیرے کنوئیں میں خوفناک آواز کے ساتھ گرتا تھا وہاں سے کنوئیں کی گول دیوار اوپر کی طرف بھی جاتی تھی۔ سفید سانپ مجھے لے کر کنوئیں کی دیوار سے

چمٹ گیا اور اوپر کی طرف ریگنے لگا۔ کنوئیں کی دیوار ایسی تھی کہ جگہ جگہ سے بڑے بڑے نوکیلے پتھر باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ سفید سانپ بڑی احتیاط کے ساتھ اُن نوکیلے پتھروں کے درمیان سے راستہ بناتا اور پر کنوئیں کے دہانے کی طرف ریگ رہا تھا۔ چونکہ سفید سانپ نے مجھے بولنے سے منع کر دیا تھا اس لئے میں نے اس سے بالکل نہ پوچھا کہ یہ کس قسم کا کنواں ہے کہ جس کی گول دیوار میں سے اتنے خوفناک پتھر باہر کو نکلے ہوئے ہیں۔ کنوئیں کے اندر سے گندھک کی تیز بو آرہی تھی۔ ایک جگہ دیوار کے پتھروں پر سرخ لاوے کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ سفید سانپ مجھے لے کر اوپر کی طرف ریگتا ہی چلا گیا۔ کافی وقت گزر گیا آخر مجھے اوپر روشنی کا گول نقطہ سا نظر آنے لگا۔ جیسے جیسے ہم اوپر کی طرف ریگ رہے تھے نقطہ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ اس کنوئیں کا دہانہ ہے۔ جب سفید سانپ دہانے کے قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ ایک طرف دیوار پر جے ہوئے ٹھنڈے لاوے نے اوپر جانے کا ایک قدرتی سارا راستہ بنا دیا تھا۔ سفید سانپ اُس راستے پر ریگنے لگا۔ آخر ہم کنوئیں کے دہانے سے باہر نکل آئے۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا وہ کوئی آبی کنواں تھا؟“

روہنی نے کہا۔ ”نہیں۔ وہ ایک آتش فشاں پہاڑ تھا جو ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ آتش فشاں پہاڑ کے دہانے سے باہر آکر سفید سانپ نے مجھے نیچے اتار دیا۔ مجھ میں اب حرکت کرنے کی طاقت آچکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے ارد گرد فاصلے فاصلے پر کتنے ہی آتش فشاں پہاڑ تھے جن میں دھماکے ہو رہے تھے اور اُن کے دہانوں سے گرم کھولتا ہوا سرخ رنگ کا لاوا اُبل اُبل کر باہر بہہ رہا تھا۔ اگرچہ یہ آتش فشاں ہم سے کافی فاصلے پر تھے لیکن ان کی تپش وہاں تک ہمیں محسوس ہو رہی تھی۔ سفید سانپ نے کہا یہ وہ جگہ ہے جہاں بدروحوں کے آسیب رہتے ہیں۔ میں نے کہا کیا میں کچھ بول سکتی ہوں۔ سانپ نے کہا اب ہم پاتال سے باہر آگئے ہیں تم بات کر سکتی ہو۔ میں

نے سفید سانپ سے پوچھا کہ کیا یہ بدروحوں کے آسیب ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔ سفید سانپ نے کہا آسیب بڑے خطرناک اور ظالم ہوتے۔ ہیں وہ انسانوں اور حشرات الارض سب کے دشمن ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں اس لئے کچھ نہیں کہیں گے کہ میرے منہ میں شیش ناگن کا دیا ہوا مہرہ موجود ہے۔ جس کے پاس یہ مہرہ ہو بدروح آسیب اس سے ڈرتے ہیں اور اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ اس لئے میں نے تمہیں اپنی پیٹھ سے چمٹا لیا تھا۔ اب تم ایسا کرو کہ اس سے پہلے کہ کوئی آسیب تم پر حملہ کر دے فوراً میری پیٹھ کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ میں نے ایسا ہی کیا اور سفید سانپ کی پیٹھ پر چڑھ کر اُس سے چمٹ گئی۔ سانپ وہاں سے چل پڑا۔ خدا جانے وہ کس طرح دھماکوں کی دراوڑی آوازیں پیدا کرتے کھولتا ہوا لاوا لگتے، چھوٹے بڑے آتش فشاں پہاڑوں کے درمیان سے بچ بچ کر ریگتا، اس علاقے سے آگے نکل گیا۔ اب ہم ایک ایسی جگہ سے گزر رہے تھے جہاں ہمارے ارد گرد نوکیلے ستونوں کی شکل میں سیاہ چٹانیں کھڑی تھیں۔ یہاں ڈراوڑی، پراسرار آوازیں اور کبھی ان آوازوں کی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ سفید سانپ نے کہا ڈرنا مت یہ بدروحوں کے آسیب کی آوازیں ہیں مگر وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ ہم اُن سیاہ فام خوفناک چٹانوں میں سے بھی گزر گئے۔ پھر ہم ایک ایسے میدان میں آگئے جہاں پہلی بار مجھے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے محسوس ہوئے۔ میں نے اوپر دیکھا تو آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ دُور درختوں کے جھنڈ نظر آرہے تھے۔ میں نے سفید سانپ سے پوچھا یہ کون سی جگہ ہے؟ اس نے کہا ہم بدروحوں اور آسیبوں کی دنیا سے نکل کر انسانوں کی دنیا میں آگئے ہیں۔ آگے ایک چھوٹا سا جنگل ہے۔ جنگل کے آگے ایک شہر ہے۔ جنگل کے کنارے میں تم سے جدا ہو جاؤں گا۔ چنانچہ جنگل کے کنارے پر آکر سفید سانپ نے مجھے زمین پر اتار دیا اور کہنے لگا میں جانتا ہوں تم ایک اچھی رُوح ہو، مگر اپنے ایک گناہ کی سزا بھگت رہی ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہیں تمہارے دشمن پجاری رگھو نے پاتال

میں پھینک دیا تھا۔ مگر اب تم آزاد ہو۔ میں نے سفید سانپ سے کہا پجاری رگھو تو پھر مجھے پکڑ کر پاتال میں پھینک دے گا۔ سفید سانپ نے کہا اب وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔ میں جانتا ہوں اس نے تمہیں شیش ناگن کے منتری کے بتائے ہوئے ایک منتر سے شکست دی تھی اور تمہیں اپنے قبضے میں کر لیا تھا مگر اب وہ ایسا نہیں کر سکے گا میں تمہیں شیش ناگن کا مہرہ دیتا ہوں اس مہرے کو سنبھال کر اپنے پاس رکھنا اس کو اپنے پاس رکھ کر جب تم اپنے دشمن اور قاتل پجاری رگھو پر حملہ کرو گی تو تم اس پر افح پالو گی اور اسے بڑی آسانی سے ہلاک کر کے اپنے قتل کر بدلہ لے لو گی۔ میں بڑی خوش ہوئی چنانچہ سفید سانپ نے اپنے منہ کی تھیلی میں سے انار کے دانے کے برابر ایک کالے رنگ کا مہرہ نکال کر مجھے دیا اور بولا۔ ”یہ شیش ناگن کا مہرہ ہے۔ یہ تمہارے پاس ہو گا تو رگھو تو کیا کسی خطرناک سے خطرناک بدروح کا آسیب بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اور تمہارے قریب بھی نہیں آئے گا۔ میں نے سفید سانپ سے کہا مگر اس کے بغیر آسیب تم پر حملہ کر دے گے تم کیا کرو گے؟ اس نے کہا میری فکر نہ کرو۔ میرے پاس شیش ناگن کا آتش ناک منتر بھی ہے اس کو پڑھ کر پھونکوں گا تو آسیب اور بدروحیں بھاگ جائیں گے اور پھر میں شیش ناگن سے دوسرا مہرہ بھی لے لوں گا۔ تم اسے اپنے پاس رکھو اور پجاری رگھو کو بھسم کر کے خلق خدا کو اس کے عذاب سے نجات دلاؤ۔ تمہیں اس کی بہت ضرورت ہے۔ میں نے سفید سانپ کا شکریہ ادا کیا اور آخر میں کہا کہ میں ابھی تک چھپکلی کے روپ میں ہوں میں ایسے انسانوں کی دنیا میں نہیں جانا چاہتی اور میرے پاس میری طاقت بھی نہیں ہے۔ سفید سانپ نے کہا میرے سامنے آ جاؤ۔ میں زمین پر ریگ کر سفید سانپ کے سامنے آ گئی۔ سانپ نے مجھ پر ایک گرم پھنکار پھینکی اور اس کے ساتھ ہی میں اپنے اصلی عورت کے روپ میں واپس آ گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری ساری طاقت بھی واپس آ گئی ہے۔ سفید سانپ نے کہا انسانوں کی دنیا میں جاؤ اور اپنی طاقت سے دیکھی انسانوں کی مدد کرو۔ کبھی کسی انسان کو

نگ نہ کرنا۔ کوئی مصیبت زدہ ہو تو اس کی مدد کرنا، اس سے تمہارے گناہ کی بخشش ہو جائے گی۔ یہ کہہ کر سفید سانپ غائب ہو گیا۔ میں رات کے سناٹے میں جنگل کے کنارے اپنے عورت کے روپ میں ساڑھی میں ملبوس کھڑی تھی اور سفید سانپ کا دیا ہوا شیش ناگ کا سیاہ مہرہ میری مٹھی میں تھا۔

روہنی چپ ہو گئی۔ میں اس کی عجیب و غریب حیرت انگیز داستان میں کھو گیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

روہنی نے کہا۔ ”پھر میں نے ایسا کیا کہ اپنی طاقت کو استعمال کر کے منتر پڑھ کر غائب ہو گئی کیونکہ آگے کوئی شہر تھا اور رات کے وقت خوبصورت لباس پہن کر اکیلی عورت شہر کی سڑک پر پھرتی عجیب لگتی ہے اور ویسے بھی میں اس شہر کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ یہ کون سا شہر ہے اور میں کس ملک میں ہوں چنانچہ میں جنگل میں داخل ہو گئی۔“

O

روہنی کی طلسمی داستان میں بڑی توجہ اور گہری دلچسپی سے سن رہا تھا کیونکہ اب یہی عورت مجھے اس مصیبت سے نکال سکتی تھی جس مصیبت میں، میں اور زیادہ پھنس چکا تھا میں نے اُس سے پوچھا۔ ”جنگل کے آگے کون سا شہر تھا؟“

روہنی نے کہا۔ ”وہی میں تمہیں بتانے والی ہوں۔ میں جنگل میں سے گزر گئی۔ اب میرے سامنے ایک شہر کی روشنیاں تھیں۔ میں ایک سڑک پر چلنے لگی۔ سڑک خالی پڑی تھی۔ مجھے وہ سڑک کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ وہ شہر بھارت کا قدیم مندروں کا شہر متھرا تھا۔ یہی وہ شہر تھا جس کے ویران شمشان گھاٹ میں ہمارے دشمن پجاری رگھو نے اپنے ایک خاص خفیہ منتر کو پڑھ کر مجھے اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور پاتال میں پھینک دیا تھا۔ مگر اب مجھے اس کے خفیہ منتر کی پرواہ نہیں تھی اس لئے کہ میرے پاس شیش ناگن کا مہرہ تھا جس کے طلسم کا مقابلہ پجاری رگھو کا کوئی منتر نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ سب سے پہلے اس بدکردار پجاری رگھو کا کام تمام کر کے اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کرنا چاہئے۔ مجھے معلوم تھا کہ پجاری رگھو کی بدروح اماوس کی رات کو شہر سے باہر والے شمشان گھاٹ کی یا ترا کرنے آتی ہے۔ ابھی اماوس کی رات میں ایک ہفتہ باقی تھا۔ میں نے شہر کے ایک پرانے قلعے کے کھنڈر میں بسیرا کر لیا اور رات وہیں گزاری۔ دوسرے دن میں عام عورتوں کے حلیے میں متھرا شہر کے صرافہ بازار میں گئی اور وہاں ایک سار کو شیش ناگن کا مہرہ دے کر کہا کہ اسے چاندی کی انگوٹھی میں

جڑ دے۔ میں نے اپنے سامنے شیش ناگن کا مہرہ چاندی کی انگوٹھی میں جڑوا کر اپنی انگلی میں پہن لیا۔ یہ دیکھو.....“

روہنی نے ہاتھ آگے کر کے مجھے اپنی انگلی دکھائی۔ اُس کے انگلی میں چاندی کی انگوٹھی تھی جس میں انار کے دانے کے برابر سیاہ مہرہ جڑا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔ ”اس کی طاقت سے تم واقف نہیں ہو۔ اس کی طاقت کا توڑ تو کوئی بڑے سے بڑا آسیب بھی نہیں کر سکتا۔“

میں نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟ کیا تمہارا اور رگھو کی بدروح کا مقابلہ ہوا؟“

”تم سنو تو سہی۔“ روہنی بولی۔ ”میں نے ایک ہفتہ متھرا شہر کے پرانے کھنڈر میں گزار دینے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ پجاری رگھو کی بدروح کو ایک ہفتہ بعد اماوس کی رات کو اس کھنڈر کے قریب شمشان گھاٹ کی یا ترا کو آنا تھا۔ اماوس کی رات آنے میں دو ہی دن باقی تھے کہ مجھے یکایک تمہارا خیال آگیا اور پھر جب میں نے تمہارے حالات معلوم کئے تو مجھے پتہ چلا کہ اس وقت تمہیں میری اشد ضرورت ہے۔ تب میں یہاں تمہارے پاس حوالات میں پہنچ گئی۔“

میں نے کہا۔ ”روہنی! تم نے اچھا کیا کہ چلی آئیں ورنہ یہ پولیس والے نہ جانے میرا کیا حشر کرتے۔ اب آگے کا کیا پروگرام ہے؟“

روہنی نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔ ”ابھی پجاری رگھو کی بدروح سے نجات حاصل کرنے کا مرحلہ باقی ہے اور اب یہ بدروح میرا مقابلہ نہیں کر سکتی کیونکہ میرے پاس شیش ناگن کا مہرہ موجود ہے۔ پجاری رگھو کو جہنم واصل کرنے کے بعد ہم دونوں بے فکر اور آزاد ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں گے۔“

میں روہنی کے اس خیال سے متفق نہیں تھا کیونکہ بہر حال روہنی بھی ایک قسم کی بدروح ہی تھی اور وہ انسان نہیں تھی اور میں ایک بھکتی روح کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔ مگر ابھی مجھے روہنی کی ضرورت تھی کیونکہ ایک اور آسیب نتالی کی

صورت میں میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ مجھے اس سے بھی نجات حاصل کرنی تھی جبکہ خود روہنی کا کہنا تھا کہ آسیب جو ہوتا ہے، وہ بدروح سے زیادہ طاقتور اور زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اگرچہ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ شیش ناگن کا مہرہ اس کے پاس ہے اور جس کے پاس یہ مہرہ ہو کوئی خطرناک اور طاقتور سے طاقتور آسیب بھی اس کے قریب نہیں پھٹکتا۔ لیکن یہ مہرہ روہنی کی انگوٹھی میں جڑا ہوا تھا اور انگوٹھی روہنی کی انگلی میں تھی۔ اگر میں یہ انگوٹھی کسی طریقے سے اس سے لے بھی لیتا تو نتالیا کے آسیب کا خطرہ میرے سر پر ہر وقت تلوار کی طرح لٹکا رہتا۔ اگر کسی وقت انگوٹھی پہننی مجھے یاد نہیں رہتی تو نتالیا کا آسیب وہ انگوٹھی غائب کر کے مجھے دوبارہ اپنے قبضے میں کر سکتا تھا۔

یہ اندیشہ مجھے اس لئے تھا کہ میرا دل کہتا تھا کہ نتالیا اسی لڑکی کا آسیب ہے جس کو روہنی نے شمشان گھاٹ کی کوٹھڑی کے منکے سے آزاد کیا تھا اور جس نے مجھے پسند کر لیا ہوا تھا۔ اس کی تصدیق صرف روہنی ہی کر سکتی تھی چنانچہ میں نے روہنی سے کہا۔ ”میں بھی رگھو کی بدروح کی موت سے بزاخوش ہوں گا۔ روہنی! پھر ہم ہنسی خوشی ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزار سکیں گے لیکن ابھی ہمارا ایک اور دشمن بھی باقی ہے مجھے اس کا فکر لگا ہوا ہے۔“

روہنی نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”وہ کون سا دشمن ہے؟“

میں نے کہا۔ ”شمشان گھاٹ کی آسیبی لڑکی۔ اس لڑکی کا آسیب جس کو تم نے غلطی سے منکے کا ڈھکن سر کا کر آزاد کر دیا تھا اور جو مجھ کو پسند کرنے لگی ہے۔ وہ یہ کبھی برداشت نہیں کرے گی کہ میں کسی دوسری عورت کے ساتھ زندگی بسر کروں اور روہنی! مجھے یقین ہے کہ جو عورت مجھے مردہ اور نیم مردہ لوگوں کی دنیا سے نکال کر بھارت کے شمالی پہاڑی علاقے کی دیران خانقاہ والے قلعے میں لے گئی تھی اور پھر اس نے وہاں مجھ سے شادی رچائی تھی وہ وہی شمشان گھاٹ والی آسیبی لڑکی ہی ہے۔۔۔۔۔“

شاید تمہیں میرے ان حالات کا علم نہیں ہے۔ اب میں تمہیں اپنی داستان سناتا ہوں کہ تم سے جدا ہونے کے بعد مجھ پر کیا گزری۔۔۔۔۔“

پھر میں نے روہنی کو اس غیبی لڑکی کا سارا قصہ سنا دیا جس نے مجھے مردہ اور نیم مردہ دنیا سے نکالا تھا اور پھر مجھ سے زبردستی شادی کر لی تھی اور جس کا نام نتالیا تھا اور جس سے بھاگ کر میں پولیس کی قید میں آ گیا تھا۔ روہنی خاموشی سے میری داستان سنتی رہی۔ جب میں نے اپنی پیتا ختم کی تو اس نے کہا۔ ”تمہارا اندازہ بالکل صحیح ہے شیروان! وہ لڑکی شمشان گھاٹ کی آسیبی لڑکی ہی ہے اور وہ تمہیں نتالیا کے انسانی روپ میں ملی اور اس نے تم سے بیاہ رچا لیا کیونکہ وہ تمہیں پسند کرتی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”اگر یہ سچ ہے تو میں پہلے سے زیادہ مشکل میں پھنس گیا ہوں کیونکہ بقول تمہارے آسیب جو ہوتا ہے وہ بدروح سے زیادہ طاقتور اور خطرناک ہوتا ہے۔ یہ آسیبی لڑکی تو مجھے کبھی نہیں چھوڑے گی اور مجھے بڑی آسانی سے تلاش کر کے اپنے قبضے میں کر لے گی۔“

روہنی بھی کچھ فکر مند ہو گئی تھی۔ کہنے لگی۔ ”اس کا فوری طور پر ایک ہی علاج ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

روہنی نے کہا۔ ”وہ یہ کہ شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی تم اپنی انگلی میں پہن لو۔ پھر وہ آسیبی لڑکی نتالیا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن اس طرح تم خطرے میں ہو گی۔ رگھو پجاری کی بدروح اور آسیبی لڑکی تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے اور تم شیش ناگن کی انگوٹھی کے بغیر ان کا مقابلہ نہیں کر سکو گی۔“

روہنی نے کہا۔ ”میں اُن سے کسی نہ کسی طرح اپنا بچاؤ کر لوں گی میں ایک روح ہی تو ہوں، میں غائب ہو سکتی ہوں، کوئی نہ کوئی منتر پھونک کر آسیبی لڑکی کو تھوڑی

دیر کے لئے اپنے سے دُور رکھ سکتی ہوں۔ لیکن تم انسان ہو۔ تمہارے پاس کوئی طلسمی طاقت نہیں ہے وہ بڑی آسانی سے تمہیں اپنے قابو میں کر سکتی ہے اور اگر اُس کے اندر اس خیال سے حسد کی آگ بھڑک اٹھی کہ تم اس کے خاوند ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے پیار کرتے ہو یا کوئی دوسری عورت تم سے پیار کرتی ہے تو ہو سکتا ہے تمہیں ہلاک کر کے تمہاری روح کو اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کرے اور یہ بڑی خطرناک اور عذاب دینے والی صورت ہوگی۔“

میں ڈر گیا۔ میں نے کہا۔ ”اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی وجہ سے انگوٹھی مجھ سے الگ ہو جائے میں اسے پہننا بھول جاؤں یا وہ گم ہو جائے یا آبی لڑکی نکالیا ہی کسی ذریعے سے میری انگوٹھی اپنے قبضے میں کر لے، تو میں تو مارا جاؤں گا۔“

روہنی گہری سوچ میں تھی۔ لگتا تھا کہ اُسے حالات کی نزاکت اور سنگینی کا احساس ہو گیا ہے۔ کہنے لگی۔ ”اس کا ایک ہی علاج ہے کہ کسی طرح اس آبی لڑکی کو بھی ہمیشہ کے لئے جلا کر بھسم کر دیا جائے۔“

”کیا ایسا ممکن ہے؟“ میں نے پر امید لہجے میں پوچھا۔

روہنی نے کہا۔ ”ایسا ممکن ہو سکتا ہے لیکن کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ابھی مجھے معلوم نہیں ہے۔ اس کے لئے مجھے جے پور کے دیران محل والی اپنی سہیلی دُرگا کی بدروح سے مشورہ کرنا پڑے گا۔ اس کا کوئی حل وہی بتا سکتی ہے۔“

میں نے روہنی سے کہا۔ ”مجھے تو خطرہ ہے کہ آبی لڑکی نکالیا اس وقت بھی یہاں نہ آجائے۔“

روہنی نے اپنی انگلی سے شیش ناگن کی انگوٹھی اتار کر اسی وقت میری انگلی میں ڈال دی اور کہا۔ ”تمہارا اندیشہ غلط نہیں۔ نکالیا بڑی طاقتور اور خطرناک آبی لڑکی ہے۔ ایسی آبی لڑکی اگر کسی سے نفرت کرے تو اسے فوراً ہلاک کر ڈالتی ہے اور اگر کسی سے محبت کرے اور وہ آدمی کسی دوسری عورت سے پیار کرنے لگے تو وہ اس

آدمی کو بھی زندہ نہیں چھوڑتی۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ ان جن بھوتوں، بدروحوں اور آسیبوں کی دوستی اور دشمنی دونوں چیزیں خطرناک ہوتی ہیں۔ انسان کو ان دونوں سے بچنا چاہئے۔ اور اللہ کے دکھائے ہوئے راستے پر چل کر سادہ اور قناعت کی زندگی بسر کرنی چاہئے۔

میں نے کہا۔ ”لیکن میں تو اپنی حماقت سے تمہیں مرتبان سے آزاد کر کے اس مصیبت میں پھنس چکا ہوں۔ اب تمہیں ہی کسی طرح مجھے اس مصیبت سے نجات دلانی ہوگی۔“

روہنی نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے تسلی دی اور پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ”شیردان! تم میری زندگی ہو۔ میری محبت ہو۔ تمہاری خاطر میں بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتی ہوں۔ آگ کے شعلوں میں کود سکتی ہوں اس کی تم فکر نہ کرو۔ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آئے گا۔ ابھی شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی تمہارے پاس ہے اور آبی لڑکی نکالیا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“

میں نے کہا۔ ”روہنی! تم ایک بدروح یا بھکی ہوئی روح ہو۔ کیا تم یہ پتہ نہیں لگا سکتیں کہ آبی لڑکی نکالیا اس وقت کہاں ہے اور میرے فرار ہو جانے کے بعد وہ مجھے پکڑنے کے لئے کیا کچھ کر رہی ہے؟“

روہنی کہنے لگی۔ ”میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ ایک بدروح ہوتی ہے، ایک آسیب ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ آسیب بدروح کی بدروح ہوتی ہے اور بدروح سے ایک ہزار گنا زیادہ طاقتور اور خطرناک ہوتی ہے۔ اس کی دنیا بدروحوں کی دنیا سے بالکل الگ تھلگ زمین کے نیچے پاتال کی گہرائیوں میں ہوتی ہے۔ آسیب مسلمان نہیں ہوتے۔ یہ کافر ہوتے ہیں۔ ہندو دھرم کے شاستروں میں لکھا ہے کہ یہ ان ہندوؤں کی روحیں ہوتی ہے جو بے گناہ، غریب اور بے سہارا بچوں کو پکڑ کر دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انہیں مورتیوں کے آگے قتل کر کے ان کے

خون سے مورتیوں کو اٹھانے کے لیے ایک ایسے عذاب کی آگ میں جل رہے ہوتے ہیں کہ جس کے نظر نہ آنے والے شعلے انہیں ہر وقت جلاتے رہتے ہیں اور اس کا انتقام وہ انسانوں سے لیتے ہیں۔ لیکن یاد رکھو مسلمانوں کے سینے میں ایمان کی شمع روشن ہوتی ہے۔ مسلمان کیسا بھی ہو وہ ایک خدا اور خدا کی آخری کتاب قرآن پاک اور خدا کے نبی آخر الزمان کا ماننے والا ہوتا ہے۔ چنانچہ بدروہیں اور آسیب کبھی کسی مسلمان کو نہیں چھنتے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے کسی مسلمان کا ایمان کمزور ہو گیا ہو اور شرک میں پڑ گیا ہو اور جادو ٹونہ کرنے لگا ہو تو یہ بدروہیں اور آسیب بڑی آسانی سے اس پر اپنا سایہ ڈال دیتے ہیں اور پھر اس سے اپنی مرضی کے کام کرواتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ”لیکن میں نے کبھی جادو ٹونہ نہیں کیا تھا پھر یہ آسیب میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟“

روہنی کہنے لگی۔ ”اس آسیبی لڑکی کے آسیب نے تم پر اپنا سایہ نہیں ڈالا وہ تمہیں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا سکا اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ تم مسلمان ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آسیبی لڑکی تمہیں پسند کرنے لگی ہے بس تم سے یہ غلطی ہو گئی کہ تم نے قلعہ روہت گڑھ کے محل میں رات کو میرے قتل ہونے کا منظر دیکھا اور پھر یہ بھی دیکھا کہ میرے قاتل رگھو نے میری روح کو مرتبان میں بند کر دیا ہے تو تم نے ہمارے معاملات میں دخل اندازی کر کے میری روح کو مرتبان کھول کر آزاد کر دیا۔ تمہاری ساری مصیبت اسی وجہ سے شروع ہوئی ہے۔ عقل مندی کا تقاضا یہ تھا کہ جو کچھ تم نے دیکھا تھا اسے دیکھ کر خاموشی کے ساتھ قلعے سے نکل جاتے مگر تم نے مہم جو اور ایڈونچر بننے کی کوشش کی اور وہ کام کر بیٹھے جو کسی زندہ انسان کو نہیں کرنا چاہئے تھا۔ بہر حال تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک نہ ایک دن تمہیں تم سے محبت کرنے والی لڑکی نکالیا کے آسیب سے بھی چھٹکارا دلا دوں گی۔ بس اس کے لئے مجھے جے پور کے دیران محل میں جا کر دُرگاکا بدروح سے مشورہ

کرنا ہو گا کیونکہ وہی مجھے کوئی راستہ دکھا سکتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تو پھر ہمیں اسی وقت جے پور روانہ ہو جانا چاہئے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“ روہنی نے کہا۔ ”کیونکہ ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے آسیبی لڑکی نکالیا کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے اور تمہیں دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کر رہی۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمارے خلاف کوئی کارروائی کرے ہمیں اس کا توڑ سوچ لینا چاہئے۔“

مقبرہ جہانگیر کے چوتھرہ پر بیٹھے باتیں کرتے ہمیں کافی رات گزر گئی تھی۔ آسمان پر صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ روہنی نے کہا۔ ”اپنا ہاتھ مجھے دو۔ ہم اسی وقت جے پور جائیں گے اور دُرگاکا بدروح سے ملاقات کریں گے۔“

ہمیں جے پور جانے کے لئے نہ تو ویزا سپورٹ کی ضرورت تھی نہ کسی ہوائی جہاز یا ٹرین کی ضرورت تھی۔ عجیب مسافر تھے، عجیب سفر تھا۔ روہنی غائب ہو گئی۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما تو میں بھی غائب ہو گیا۔ ہم مقبرہ جہانگیر سے فضا میں بلند ہوئے اور ہم نے لاہور ریلوے اسٹیشن کی طرف رخ کر لیا۔ ہم اس وقت زمین سے دو ڈھائی سو فٹ کی بلندی پر اُڑ رہے تھے۔ ہماری رفتار بھی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”ہم زیادہ تیز کیوں نہیں اُڑ رہے؟“

روہنی کہنے لگی۔ ”جے پور میں ہمیں دُرگاسے رات کو ہی ملنا ہے۔ اتنی جلدی وہاں پہنچ کر کیا کریں گے؟ صبح ہو رہی ہے راستے میں شہروں کی سیر ہی کرتے جائیں گے۔“

اس کا مطلب تھا کہ ہم شہروں کے اوپر سے گزرتے ہوئے اُن کا نظارہ کرتے جائیں گے۔ مجھے بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ لاہور اسٹیشن کے اوپر سے گزرنے کے بعد ہم امرتسر جانے والی ریلوے لائن کے اوپر آ گئے۔ ہماری اڑنے کی رفتار اتنی بھی کم نہیں تھی۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد ہم امرتسر کے اوپر سے گزر رہے تھے۔

پھر امر تسر بھی پیچھے رہ گیا۔ اسی طرح ہم جالندھر اور لدھیانہ اور انبالہ شہروں کے اوپر سے بھی گزر گئے۔ آگے میرٹھ کا شہر تھا وہ بھی آیا اور ہمارے نیچے سے نکل گیا۔ اب دلی کا انتظار تھا۔

دلی اس زمانے میں ابھی اتنا نہیں پھیلا تھا۔ ہم دلی سے بھی گزر گئے۔ دلی سے متھرا کوئی زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ متھرا سے ہم نے راجستھان کی طرف رخ کر لیا اور بے پور پہنچ گئے۔ اس وقت تک ابھی دن کا پہلا پہر ہی تھا۔ ہم دو تین گھنٹوں میں بہت ہلکی رفتار کے ساتھ اڑتے ہوئے بے پور پہنچ گئے تھے۔ بے پور کے ایک الگ تھلگ علاقے میں جمیل کے پاس ایک باغ میں ہم اترے تھے اور زمین پر اترنے کے بعد اپنی اپنی انسانی شکلوں میں واپس آ گئے تھے۔ غیبی حالت سے انسانی صورت میں واپس آنے کے بعد مجھے بھوک سی محسوس ہونے لگی۔

میں نے روہنی سے کہا۔ ”میں کہیں ناشتہ کرنا چاہتا ہوں۔“
وہ مسکرائی۔ کہنے لگی۔ ”ہمیں کم از کم اس مصیبت سے تو چھٹکارا مل گیا ہے۔ نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس لگتی ہے۔ چلو کسی جگہ بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہیں۔“
”تم بھی ناشتہ کرو گی؟“ میں نے پوچھا۔ مجھے معلوم تھا کہ روہنی کو ضرورت تو نہیں ہے لیکن وہ جب اور جس وقت چاہے کھا پی سکتی ہے۔ کہنے لگی۔ ”تمہارا ساتھ دینے کے لئے ناشتہ کروں گی۔“

ہم بے پور کے ایک ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے۔ ناشتہ منگوا کر کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔ روہنی نے کہا۔ ”میں نے تمہیں ایک انگوٹھی دی تھی۔ مجھے اچانک اس کا خیال آ گیا ہے وہ تم نے کہاں رکھی ہے؟“

میں نے اسے کہا۔ ”جس وقت نتالیا مجھے بدروحوں کی دنیا سے ہوا میں اڑا کر دیران خانقاہ میں لائی تھی تو اسی وقت اس نے میری انگوٹھی میرے ہاتھ سے اتار کر اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ کیونکہ اُس نے میرا انگوٹھی والا ہاتھ ہی پکڑ رکھا تھا۔“

روہنی نے کہا۔ ”اب یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ نتالیا ہی شمشان گھاٹ والی آسبی لڑکی ہے۔ اگرچہ میری انگوٹھی اس کی طاقت کا توڑ نہیں تھی اور وہ تمہیں اس کے آسبی جادو سے نہیں بچا سکتی تھی پھر بھی وہ چونکہ تم کو پسند کرتی تھی اور تم سے محبت کرنے لگی تھی اس لئے تمہارے پاس میری کوئی نشانی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔“
میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”روہنی! اگر فرض کیا تمہاری شیش ناگن کی انگوٹھی کا مہرہ بھی مجھے آسبی لڑکی نتالیا سے نہ بچا سکا اور اس نے مجھے ہمیشہ کے لئے اپنے قبضے میں کر لیا تو میرا کیا حشر ہو گا؟ کیا میں بھی اس کے ساتھ ایک بدروح بن جاؤں گا؟“
روہنی کہنے لگی۔ ”اول تو ایسی بات نہیں ہو گی اور اگر بد قسمتی سے ایسا ہو گیا اور شیش ناگن کا مہرہ بھی تمہیں نہ بچا سکا تو پھر جہاں تک میں سمجھتی ہوں نتالیا تمہیں اپنے ساتھ اُس جگہ لے جائے گی جہاں کی وہ رہنے والی ہے۔“

”وہ کہاں کی رہنے والی ہے؟“ میں نے پوچھا۔
روہنی نے کہا۔ ”تم کو یہ بات میں نے ابھی تک نہیں بتائی کہ نتالیا ہندوستان کی رہنے والی نہیں ہے۔ وہ شمالی افریقہ کے ملک ایتھوپیا کی رہنے والی ہے۔“
میں نے کہا۔ ”مگر اس کی شکل و صورت حبشی عورتوں والی نہیں ہے اور اُس کا رنگ بھی گورا ہے۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”اصل میں نتالیا کی ماں انگریز تھی جس نے ایتھوپیا کے ایک نیگرو سے شادی کر لی تھی۔ نتالیا انگریز ماں پر گئی تھی۔“
”پھر یہ آسبی عورت کیسے بن گئی؟“

میرے اس سوال پر روہنی نے کہا۔ ”یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔ نتالیا کے ماں باپ جب وہ دس پندرہ سال کی تھی تو مر گئے تھے اور نتالیا کو اس کے باپ کے قبیلے والے اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ یہ آدم خور وحشی لوگوں کا قبیلہ تھا۔ نتالیا اُن کے درمیان بڑی ہوئی اور اُن کے ساتھ وہ بھی آدم خور بن گئی۔ پھر اس سے ایک

ایسا گناہ سرزد ہو گیا کہ جس کی سزا وہ آسیب بن کر بھگت رہی ہے۔ اس سے زیادہ میں نہ تمہیں بتا سکتی ہوں اور نہ تم سمجھ ہی سکو گے۔“

یہ سن کر کہ نتالیا آدم خور قبیلے کی لڑکی تھی میرے جسم میں خون کی لہر دوڑ گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ نتالیا آدم خور تھی اور وہ کسی وقت مجھے بھی ہڑپ کر سکتی تھی۔ میں اس سے اور زیادہ ڈرنے لگا۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”لیکن وہ تو میرے ساتھ بڑی محبت کا سلوک کرتی رہی ہے۔“

روہنی ہنسنے لگی۔ ”تم اپنی فکر نہ کرو۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اس لئے تمہیں کچھ نہیں کہے گی لیکن اس کے باوجود وہ ایک نارمل عورت نہیں ہے وہ ایک آسیبی لڑکی ہے اور آدم خور رہ چکی ہے وہ کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتی ہے۔“

”پھر تو مجھے ہر حالت میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہو گا۔“ میں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

روہنی نے میرے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں ہس کے پاس نہیں رہنے دوں گی۔ میں اسے ختم کر کے ہی چھوڑ دوں گی۔ آخر تم بھی تو میرے محبوب شہزادے شیردان کی تصویر ہو اور میں تو تمہیں اپنا محبوب شہزادہ شیردان ہی سمجھتی ہوں۔ تمہارے لئے تو میں اپنی جان بھی قربان کر سکتی ہوں۔“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”تم تو پہلے سے ہی مری ہوئی ہو تم اپنی جان کہاں سے قربان کرو گی؟“

روہنی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ ہم بھگتی روحوں اور بد روحوں کی بھی موت ہوتی ہے۔ ہمیں بھی موت آ جاتی ہے مگر یہ بڑی گہری راز کی باتیں ہیں تم انہیں نہیں سمجھ سکو گے۔“

ناشتہ ختم ہوا تو وٹیر مل لے آیا۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا نتالیا نے مجھے جو

دو ہزار روپے دیئے تھے وہ تلاشی کے بعد پولیس نے اپنے قبضے میں کر لئے تھے مگر روہنی کے ہوتے ہوئے مجھے پیسوں کی کوئی پریشانی نہیں ہو سکتی تھی۔ روہنی نے اسی طرح اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا اور سو روپے کا انڈین کرنسی کا بالکل نیا نوٹ نکال کر وٹیر کو دے دیا۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”یہ بالکل نیا نوٹ تھا۔ کیا یہ انڈین نکال سے آیا تھا؟“

روہنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم یہ کہاں سے آتا ہے۔ بس مجھے ضرورت ہوتی ہے تو پیسے اپنے آپ آ جاتے ہیں۔ چلو شہر کی سیر کرتے ہیں۔“
ہوٹل سے نکل کر ہم شہر کی سیر کرنے لگے۔ ہمیں دیکھ کر اور خاص طور پر روہنی کو دیکھ کر کسی کو یقین نہیں آ سکتا تھا کہ یہ عورت ایک بھگتی ہوئی روح ہے اور جب چاہے غائب ہو سکتی ہے، جب چاہے ہوائیں اڑ سکتی ہے۔

دوپہر تک ہم شہر کی سیر کرتے رہے۔ پھر دوپہر کا کھانا بھی اسی ہوٹل میں بیٹھ کر کھایا۔ اس کے بعد جے پور کے ایک تاریخی باغ میں آکر بیٹھ گئے۔ ابھی آدھی رات ہونے میں بہت وقت تھا۔ اُس وقت اچانک مجھے اپنے بچپن کے دوست بمبئی والے جشید کا خیال آ گیا۔ اُس سے ملے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”روہنی! میرا اپنے ایک دوست سے ملنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔ ابھی ہمارے پاس وقت بھی بہت ہے کیوں نہ میں اُس سے مل لوں۔“

اس نے پوچھا۔ ”کیا تم اسے ضرور ملنا چاہتے ہو؟“
میں نے کہا۔ ”وہ میرا ایک ہی دوست ہے اور میں ایک عرصے سے اسے نہیں ملا مگر وہ یہاں سے بڑی دور بمبئی میں رہتا ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”فاصلہ میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو چلو اس سے جا کر مل لیتے ہیں۔“

یہ کہہ کر روہنی دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئی۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا تو میں بھی

غائب ہو گیا۔ اُس کے بعد ہم ہوا میں پرواز کر رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہماری رفتار کسی جیٹ ہوائی جہاز سے بھی دو گنی تھی۔ ہم بڑی اونچائی پر اُڑ رہے تھے اور نیچے مجھے دُھند کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں پرواز کرتے ہوئے آدھ گھنٹہ ہی گزرا ہو گا کہ روہنی نے کہا۔ ”بہی آ رہا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی ہم بلندی سے نیچے اُترنے لگے۔ کچھ ہی دیر کے بعد مجھے نیچے بہی کی نواحی آبادیاں نظر آنے لگیں۔ روہنی نے پوچھا۔ ”تمہارا دوست بہی کہاں رہتا ہے؟“

میں نے اسے جگہ بتائی تو وہ بولی۔ ”میں سمجھ گئی۔ میں بہی شہر کے تمام علاقوں سے واقف ہوں۔“

اور وہ مجھے بہی کے اس علاقے کے لوکل سٹیشن کے باہر لے آئی جہاں جمشید کا آٹو سٹور اور گیراج تھا۔ ہم ایک الگ سی جگہ دیکھ کر درختوں کے نیچے اُتر آئے۔ زمین پر اترنے کے فوراً بعد ہم اپنی انسانی شکلوں میں واپس آ گئے۔ روہنی کہنے لگی۔ ”تم اپنے دوست سے کیا کہو گے کہ میں کون ہوں؟“

میں نے کہا۔ ”تم ہی بتا دو کہ میں اسے کیا کہوں؟“
روہنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم کہہ دینا کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔ کیا تم یہ کہنا پسند نہیں کرو گے؟“

میں نے کہا۔ ”کیوں نہیں پسند کروں گا۔ میں اسے یہی بتاؤں گا کہ تم میری بیوی ہو اور تمہارا نام سلطانہ ہے۔“

”اس میں کوئی جھوٹ تھوڑی ہے۔“ روہنی نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہم نے بہی کے لوکل سٹیشن سے ٹیکسی لی اور جمشید کے گیراج پر آ گئے۔

میں نے دیکھا کہ جمشید اس وقت ایک کرسی پر بیٹھا اپنے ایک مستری کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ اس نے ٹیکسی میں سے مجھے اترتے دیکھا تو فوراً اٹھا اور آتے ہی مجھے گلے لگا لیا۔ ”فیروز! تم اچانک کیسے آ گئے میرے دوست! کوئی چٹھی وغیرہ بھی نہیں لکھی۔“

میں نے روہنی کا اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”اس سے ملو۔ یہ سلطانہ ہے میری بیوی۔ بس اچانک ہی پروگرام بن گیا اور ہم ویزا لگوا کر پاکستان سے تمہارے پاس آ گئے۔“

جمشید نے روہنی کو سلام کیا اور کہا۔ ”بھابھی! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ اچھا ہوا میرے دوست کا بھی گھر آباد ہو گیا۔“ وہ ہمیں اوپر لے گیا اور ہماری بڑی خاطر مدارت کی۔ کہنے لگا۔ ”کتنے دنوں کا ویزا لے کر آئے ہو؟“
میں نے کہا۔ ”دس پندرہ دن تو ٹھہریں گے ہی۔“

حالانکہ ہم وہاں چار پانچ گھنٹوں سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتے تھے کیونکہ ہمیں واپس جے پور جا کر آدھی رات کو پرانے محل میں دُرگ کی بدروح سے بھی ملاقات کرنی تھی۔ میں نے ویسے ہی کہہ دیا تھا کیونکہ اگر میں اسے کہتا کہ بس دو چار گھنٹوں کے لئے آئے ہیں تو اس کی مجھے بڑی لمبی چوڑی وضاحت کرنی پڑتی۔ ہمارا کیا تھا ہم دو چار گھنٹوں کے بعد وہاں سے غائب ہو سکتے تھے۔ شام ہو گئی۔ کوئی آٹھ بجے ہم نے کھانا کھایا اور اس کے بعد جمشید کے گیراج کے باہر کرسیوں پر بیٹھ کر بازو کی رونق سے

لطف اندوز ہونے لگے۔ جمشید نے وہیں ہمارے لئے چائے منگوالی۔ میں اور روہنی چائے پیٹے ہوئے باتیں کرنے لگے۔

روہنی کہنے لگی۔ ”تمہارا یہ دوست بڑا اچھا آدمی ہے۔ یہ تمہارا صحیح معنوں میں دوست ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہم بچپن میں ایک ساتھ کھیلے ہیں۔“

اسی طرح ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور بازار کی رونق بھی دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں فٹ پاتھ پر سے ایک سادھو گزرا۔ وہ چلتے چلتے اچانک رُک گیا اور رُک کر ہم دونوں کو گھور کر دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ سادھو کو دیکھتے ہی روہنی کچھ گھبرا گئی۔ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ”چلو شیروان! اوپر چلتے ہیں۔“

اور وہ میرے آگے آگے سیر ہیاں چڑھ کر جمشید کے فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔ ”خیریت تو ہے روہنی۔“

اس نے کہا۔ ”جلدی سے اپنا ہاتھ مجھے دو۔ ہم ابھی بے پور جا رہے ہیں۔“

میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ میں نے اپنا ہاتھ روہنی کو پکڑا دیا۔ میرا ہاتھ پکڑتے ہی ہم دونوں غائب ہو گئے اور کمرے کی پچھلی کھڑکی سے نکل کر ہوائیں پرواز کرنے لگے۔ روہنی دیکھتے ہی دیکھتے کافی بلندی پر چلی گئی اور اُس نے اتنی تیزی سے اُڑنا شروع کر دیا کہ شاید تین چار سیکنڈ میں ہم بمبئی کو کافی پیچھے چھوڑ کر تاریک جنگلوں کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ روہنی سادھو کو دیکھ کر میرے دوست کے مکان سے ایک دم نکل آئی ہے۔ مگر میں نے ابھی تک اس سے بالکل نہیں پوچھا تھا کہ وہ سادھو کو دیکھ کر گھبرا کیوں گئی تھی اور اس نے ایک دم بمبئی سے نکل جانے کا پروگرام کیوں بنالیا تھا۔ ہم بے پور پہنچ گئے۔

ہم بڑی جلدی آگئے تھے ابھی آدمی رات نہیں ہوئی تھی۔

روہنی بے پور کے پرانے محل کی ایک بارہ دری میں اُتری تھی۔ ہم وہیں بیٹھ

گئے۔ اب ہم غائب نہیں تھے بلکہ انسانی رُوپ میں بیٹھے تھے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”روہنی! تم اتنی جلدی وہاں سے کیوں چل پڑی تھیں؟ کیا کوئی خاص بات ہوئی تھی؟“

روہنی مجھ سے سادھو والی بات چھپانا چاہتی تھی۔ کہنے لگی۔ ”کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ بس میرا جی چاہا کہ اب ہمیں وہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ہم بدروحوں کو بہت سی باتوں کا پہلے سے خطرہ محسوس ہو جاتا ہے اسی لئے جب میرے دل میں وہاں سے نکل پڑنے کا خیال آیا تو میں تمہیں لے کر چل پڑی۔“

میں نے اُس سے یہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ وہ سادھو کو دیکھ کر گھبرا کیوں گئی تھی۔ ہم آدمی رات تک قدیم محل کی بارہ دری میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جب روہنی کو محسوس ہوا کہ آدمی رات ہو گئی ہے تو وہ مجھے لے کر نیچے ویران محل کے اُس تہہ خانے میں آگئی جہاں آدمی رات کے بعد دُرگاکا بدروح نمودار ہوتی تھی۔ اس وقت میں اور روہنی دونوں عام انسانی شکل و صورت میں تھے۔ روہنی نے مجھے پیچھے ایک ستون کے پاس بٹھادیا اور کہنے لگی۔ ”خواہ کچھ ہو جائے تم اس جگہ سے مت ہلنا۔“

جہاں اُس نے کہا تھا میں وہاں بیٹھ گیا۔ تہہ خانے میں اندھیرا تھا۔ میں جب غائب ہوتا تھا تو اندھیرے میں بھی دیکھ لیتا تھا لیکن انسانی شکل میں ظاہر ہوتے ہی میرے اندر سے یہ صلاحیت ختم ہو جاتی تھی اور میں عام انسانوں کی طرح اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن میں اندھیروں میں اتنا بھٹکتا رہا تھا کہ اب انسانی شکل میں بھی میری آنکھیں اب ویران قلعوں اور تہہ خانوں کے اندھیروں کی عادی ہو گئی تھیں اور ان اندھیروں میں بھی مجھے کچھ نہ کچھ نظر آ جاتا تھا۔

روہنی اس جگہ ایک ستون کے پاس کھڑی ہو گئی تھی جہاں دُرگاکا بدروح نمودار ہوتی تھی۔ جب ٹھیک آدمی رات گزر گئی تو اسی طرح اندھیرے کونوں میں سے

رونے کی دردناک آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ پھر یہ آوازیں گم ہو گئیں اور ایک روشنی سی ہو کر بجھ گئی۔ پھر میں اس دیوار کو تک رہا تھا جس کے اندھیرے میں سے دُرگاکا بدروح نمودار ہوا کرتی تھی۔ اتنے میں دُرگاکا بدروح آگئی۔

اس نے اپنی سیپلی روہنی کو دیکھ لیا تھا۔ اُس نے اپنی آسبی آواز میں پوچھا۔ ”روہنی! کہو۔ کیسے آنا ہوا؟ تمہیں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم اپنے دشمن رگھو کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی ہو۔“

روہنی نے کہا۔ ”دُرگا! مجھے اس بات کا تم سے کوئی گلہ نہیں ہے کہ تم میری مدد نہیں کر سکی تھیں۔“

دُرگابدروح نے کہا۔ ”تمہارا پتی دیو شیروان میرے پاس آیا تھا مگر میں نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ میں مجبور ہوں۔ روہنی! تم کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ پجاری کے پاس شیش ناگنی کے مہمانتری کا خفیہ منتر ہے جس کی طاقت کا میں مقابلہ نہیں کر سکتی۔“

روہنی بولی۔ ”دُرگا! تم میری پیاری سیپلی ہو۔ مجھے تم سے گلہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا لیکن اب میں اپنے دشمن رگھو کا صرف مقابلہ ہی نہیں کر سکتی بلکہ اس کا کام تمام بھی کر سکتی ہوں۔“

دُرگابدروح نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“

روہنی نے کہا۔ ”اگر ہمارے دشمن رگھو کے پاس شیش ناگن کے مہمانتری کا خفیہ منتر ہے تو میرے پاس شیش ناگن کا مہرہ ہے جس کی طاقت کا پجاری رگھو کے پاس کوئی توڑ نہیں ہے۔“

دُرگاکا بدروح نے تعجب سے پوچھا۔ ”کیا تم سچ کہہ رہی ہو روہنی؟ کیا واقعی تمہارے پاس شیش ناگن کا مہرہ ہے؟“

روہنی نے کہا۔ ”میں تمہیں دکھا سکتی ہوں۔“

روہنی نے میری طرف منہ کر کے کہا۔ ”شیروان! مہرے والی انگوٹھی مجھے دے

جاؤ۔“

میں نے انگلی میں سے انگوٹھی اتاری اور اسے روہنی کو دے دیا اور نظریں جھکائے جھکائے واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔

روہنی نے آگے بڑھ کر دُرگاکا بدروح کو انگوٹھی دکھائی۔ دُرگاکا بدروح انگوٹھی کو تنکلی باندھے دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے کہا۔ ”روہنی! تم بڑی خوش قسمت ہو کہ تمہیں شیش ناگن کا نایاب مہرہ مل گیا ہے مگر یہ تمہیں کہاں سے ملا؟“

روہنی کہنے لگی۔ ”بس میرے خدا نے میری مدد کی اور مجھے یہ مہرہ مل گیا۔“

دُرگابدروح نے انگوٹھی روہنی کو واپس دیتے ہوئے کہا۔ ”مگر تم نے یہ مہرہ شیروان کو کیوں دے رکھا ہے۔ وہ ایک عام کمزور انسان ہے اس سے یہ مہرہ کوئی بھی چھین کر لے جاسکتا ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”شیروان کو اس کی ضرورت ہے۔ اسے کیوں ضرورت ہے؟ یہی بتانے کے لئے میں اسے اپنے ساتھ تمہارے محل میں لے آئی ہوں۔“

دُرگاکا بدروح خاموش تھی۔ وہ روہنی کو تک رہی تھی۔ اُس نے پوچھا۔ ”کیا یہ انسان پھر کسی مشکل میں پھنس گیا؟“

روہنی کہنے لگی۔ ”دُرگا! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ آج سے تین سو سال پہلے میری شادی صوبے دار شہزادہ شیروان سے ہو گئی تھی اور میں نے شادی کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔ مگر پجاری رگھو نے میرے اسلام قبول کرنے کا مجھ سے یہ بدلہ لیا کہ اس نے مجھے قتل کر دیا مگر میری روح کو اپنی طلسمی طاقت سے قید میں ڈال دیا لیکن اس شخص نے جو اس وقت میرے قریب بیٹھا ہے اور جس کو میں شیروان ہی سمجھتی ہوں مجھے آزاد کر دیا مگر خود میری وجہ سے ایک نہ ختم ہونے والی مصیبت میں پھنس گیا۔“

دُرگاکا بدروح نے کہا۔ ”لیکن یہ تمہارے پتی دیو شیروان کا دوسرا جنم نہیں

ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ مسلمانوں کا کوئی دوسرا جہنم نہیں ہوتا اور یہ میرے خاوند کا دوسرا جہنم نہیں ہے صرف اس کی شکل و صورت میرے مرحوم خاوند سے بے حد ملتی جلتی ہے۔ اس کی شکل میں مجھے میرا خاوند مرنے کے بعد دوبارہ مل گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اسے کھونا اور اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن یہ ایک اور مشکل میں پھنس گیا ہے جس کے بارے میں، میں تجھ سے مشورہ کرنے آئی ہوں۔“

”وہ کیا مشکل ہے؟“ ڈرگا کی بدروح نے پوچھا۔

روہنی نے آسبی لڑکی کی ساری داستان بیان کر دی کہ کس طرح متھرا کے دیران شمشان گھاٹ کی کوٹھڑی میں اُس کی غلطی سے ایک لڑکی کا آسیب آزاد ہو گیا اور اس کی نظر شیردان پر پڑی تو وہ اس پر عاشق ہو گئی اور پھر کس طرح اُسے نتالیا کی شکل میں ملی اور اس کے ساتھ اس کی مرضی کے خلاف شادی رچالی۔ پھر کس طرح شیردان موقع پا کر اس آسبی لڑکی کو چھوڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور اُس کے بعد وہ یعنی روہنی بھی رگھو کی قید سے آزاد ہو کر شیردان یعنی مجھ سے آکر مل گئی۔

ڈرگا کی بدروح خاموشی سے یہ طلسمی داستان سنتی رہی۔ جب روہنی ساری بات بیان کر چکی تو اُس نے روہنی سے پوچھا۔ ”اب تم کیا چاہتی ہو؟“

روہنی نے کہا۔ ”وہ آسبی لڑکی نتالیا کے روپ میں شیردان کا پیچھا کر رہی ہے اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ آسیب بڑی زبردست طاقت رکھتا ہے۔ آسب کسی عورت کا ہویا مرد کا اس کی طاقت کا مقابلہ کوئی جن بھوت یا بدروح نہیں کر سکتی۔“

ڈرگانے کہا۔ ”مگر تمہارے پاس شیش ناگن کا مہرہ ہے جس کے پاس یہ مہرہ ہوتا ہے کوئی جن، بھوت، چڑیل، بدروح یا آسیب اُس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔ تم نے یہ مہرہ انگوٹھی میں ڈال کر اسے دے بھی دیا ہے پھر تمہیں شیردان کی کیوں فکر

ہے؟“

روہنی کہنے لگی۔ ”مگر شیردان کوئی بدروح نہیں ہے۔ وہ ایک عام انسان ہے۔ ایک کمزور انسان۔ آسبی لڑکی نتالیا اس کے پیچھے لگ چکی ہے اور اسے دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کے لئے اس کا پیچھا کر رہی ہوگی۔ وہ شیردان کے قریب تو نہیں آسکے گی اور اسے اغوا کر کے بھی نہیں لے جاسکے گی کیونکہ شیردان کے پاس شیش ناگن کا مہرہ ہوگا لیکن کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ شیردان سے خود انگوٹھی کہیں گر سکتی ہے۔ آسبی لڑکی نتالیا عیاری سے کام لے کر اس کی انگوٹھی حاصل کر سکتی ہے اور پھر میں ہر وقت شیردان کے پاس رہ کر مہرے کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ میں شیردان کو لے کر تمہارے پاس اس لئے آئی ہوں کہ مجھے کوئی ایسی ترکیب، کوئی ایسا منتر بتاؤ جس کی مدد سے میں شیردان کو ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے نتالیا کے آسیب سے محفوظ کر لوں۔“

ڈرگا کی بدروح نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ”روہنی! میری کتنی طاقت ہے تم اچھی طرح سے جانتی ہو۔ آسبی لڑکی نتالیا کی طاقت کا میں بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ٹھیک ہے کہ تم نے شیردان کو شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی پہنا دی ہے لیکن شیردان کمزور انسان ہے اس کی ذرا سی غفلت سے اگر کسی وقت انگوٹھی اس سے الگ ہو گئی تو آسبی لڑکی شیردان کو جھپٹا مار کر چیل کی طرح دبوچ کر لے جائے گی اور تم کچھ نہ کر سکو گی۔“

روہنی نے کہا۔ ”یہی سوچ کر میں پریشان ہوں۔ میں آج بمبئی شہر میں تھی۔ شیردان بھی میرے ساتھ تھا۔ وہاں میں نے ایک سادھو کو دیکھا جو مجھے اور شیردان کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سادھو ایک بدروح تھی جسے آسبی لڑکی نے شیردان کی انگوٹھی اڑا کر لے جانے کے لئے بھیجا تھا۔ میں اسے بمبئی سے فوراً یہاں لے آئی ہوں۔ آسبی لڑکی نتالیا نے شیردان کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دیا ہے۔ اگر کسی وقت میں شیردان سے الگ ہو گئی اور وہ اکیلا

رہ گیا تو آسیبی لڑکی کسی بدروح کو بھیج کر یا خود کسی انسان یا عورت کے روپ میں آکر شیردان کو درغلا کر اُس سے شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے شیردان سے جدا ہو جاؤں گی اور شیردان کی زندگی کی حفاظت اور اسے اس مصیبت سے نکالنے کا جو فرض مجھ پر لاگو ہو چکا ہے میں وہ بھی ادا نہ کر سکوں گی۔“

دُرگاہ بدروح نے کہا۔ ”تم نے صحیح اندازہ لگایا ہے۔ وہ سادھو آسیبی لڑکی کی بھیجی ہوئی بدروح ہی تھی۔ بدروحیں آسیب کی غلام ہوتی ہیں اور اُن کے حکم پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔“

”پھر میں کیا کروں؟ مجھے کوئی راستہ دکھاؤ۔“ روہنی نے انتہائی مایوسی کے لہجے میں کہا۔ دُرگاہ کی بدروح خاموش ہو گئی۔

میں یہ سارا بھوت پریت کا نالکہ دیکھ رہا تھا اور اُن کی ساری باتیں سن رہا تھا اور دل میں دُعا مانگ رہا تھا کہ یا اللہ پاک مجھے تو ہی اس مصیبت سے نکال سکتا ہے۔ کوئی ایسا سبب پیدا کر دو کہ اس عذاب سے میری جان چھوٹے اور میں دوبارہ انسانوں کی دنیا میں رہ کر نارمل انسان کی طرح زندگی بسر کر سکوں۔

دُرگاہ کی بدروح کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ”روہنی! تو میری بچپن کی سہیلی ہے۔ میں تجھے پریشان نہیں دیکھ سکتی مگر میں بھی مجبور ہوں۔ صرف ایک صورت ہو سکتی ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ روہنی نے بے تاب سے پوچھا۔

دُرگاہ کی بدروح نے کہا۔ ”جیسا کہ تم بھی جان گئی ہو گی اس آسیبی لڑکی کا تعلق افریقہ کے ایک آدم خور قبیلے سے تھا۔ جب یہ زندہ تھی تو اپنے آدم خور قبیلے کے ساتھ افریقہ کے ایک جزیرے کے جنگل میں رہتی تھی۔ یہ لوگ بھولے بھٹکے مسافروں کو پکڑ کر لے آتے تھے اور انہیں پہلے تو خوب کھلاتے پلاتے تھے۔ جب وہ

بڑے صحت مند ہو جاتے تھے تو اُن کو باندھ کر گردن کاٹ کر پہلے اُن کا سارا خون پی جاتے تھے پھر اُن کے جسموں کے ٹکڑے کر کے انہیں آگ میں بھون کر کھا جاتے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ ڈر کے مارے اس جزیرے میں مسافروں نے آنا جانا چھوڑ دیا۔ آدم خور قبیلے والے جب بھوکوں مرنے لگے تو انہوں نے ایک دوسرے کو کھانا شروع کر دیا۔ یہ آسیبی لڑکی ان سب میں بڑی چالاک اور عیار تھی۔ وہ جنگل میں چھپ گئی اور چھپ کر رات کو قبیلے کی جھونپڑیوں کی طرف آتی اور کسی نہ کسی بچے کو پکڑ کر لے جاتی اور اُسے کھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھاتی۔ لیکن آخر ایک رات وہ خود قابو میں آگئی۔ وہ رات کے اندھیرے میں قبیلے کے کسی بچے کو اٹھا کر لے جانے کے لئے جھونپڑیوں کے پاس آئی تو ایک آدم خور نے اُسے دیکھ لیا اور وہیں چھرا مار کر اُس کا سر دھڑ سے الگ کر دیا اور پھر قبیلے والوں نے مل کر اُس کا خون پیا اور اس کو بھون کر کھا گئے۔ اس ڈر سے کہ اس کی بدروح اُن سے بدلہ لینے کی کوشش کرے گی انہوں نے اس آسیبی لڑکی کی کھوپڑی پر جادو ٹونہ کر کے اُسے ایک درخت کے نیچے زمین کھود کر دفن کر دیا۔ اُس کے بعد ایسا ہوا کہ اُس آسیبی لڑکی کی بدروح کو زندگی میں لوگوں اور معصوم بچوں پر کئے گئے ظلم و ستم کی سزا ملی اور یہ ایک خطرناک منحوس آسیب کی شکل میں زمین کی گہرائیوں میں بھڑکتی آگ میں ڈال دی گئی۔ ایک خاص مدت گزر جانے کے بعد یہ آسیبی لڑکی آگ کے شعلوں سے نکل کر ہمیشہ کے لئے در بدر بھٹکنے کے واسطے انسانوں کی دنیا میں آگئی جہاں ایک نیک آدمی نے انسانوں کو اس کے شر سے بچانے کے لئے اسے شمشان گھاٹ کی کوٹھڑی میں بند کر دیا جہاں سے تو نے اپنی غلطی سے اسے آزاد کر دیا۔“

روہنی نے دُرگاہ سے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہو گا؟“

دُرگاہ کی بدروح نے کہا۔ ”اس لڑکی بتالیا کے آسیب کی طاقت اس کی کھوپڑی میں موجود ہے۔ اگر کسی طرح تم اس جزیرے میں جا کر درخت کے نیچے دفن اس کی

کھوپڑی کے سر پر اینٹ یا پتھر مار کر اس کو توڑ دو تو آسیبی لڑکی نتالیا کی ساری برائی کی طاقت اس سے جدا ہو جائے گی اور اس کے بعد وہ آسیب نہیں رہے گی بلکہ ایک عام بدروح بن جائے گی جس پر ہم بڑی آسانی سے قابو پا کر اُسے کسی مرجان یا بوتل میں ہمیشہ کے لئے بند کر سکیں گے۔“

روہنی نے کہا۔ ”یہ کام میرے لئے کوئی مشکل نہیں ہے۔ میں آج ہی افریقہ کے آدم خوروں کے جزیرے میں چلی جاتی ہوں۔ تم مجھے جزیرے اور اُس درخت کی نشانی بتا دو۔ میں اُس درخت کے نیچے زمین میں سے اُس آسیبی لڑکی کی کھوپڑی نکال کر اس کو پاش پاش کر دوں گی۔“

دُرگاکا بدروح نے کہا۔ ”یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا تم اسے سمجھتی ہو۔ آسیبی لڑکی اپنی کھوپڑی سے غافل نہیں ہے۔ اس نے اس کی حفاظت کے لئے ایک بڑی طاقتور اور خطرناک بدروح کو وہاں پہرے پر لگا رکھا ہے جو ہر وقت درخت میں موجود ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جب تم کھوپڑی والے درخت کے قریب پہنچو گی تو آسیبی لڑکی نتالیا کو بھی خبر ہو جائے گی اور وہ ایک لمحے میں وہاں پہنچ جائے گی اور پھر تمہاری جان بھی خطرے میں ہوگی۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں چھپکلی یا کنکھجور ایتنا کر کسی ایسے تاریک غار میں پھینک دے جہاں سانپ ہی سانپ ہوں اور وہ تمہیں ہڑپ کر جائیں۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”لیکن میرے پاس شیش ناگن کی مہرے والی انگوٹھی ہوگی۔ وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔“

دُرگاکا بدروح نے ہنس کر کہا۔ ”تم نے بڑی بے وقوفوں والی بات کی ہے۔ اگر تم شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی شیروان کے ہاتھ سے اُتار کر اپنے ساتھ لے جاؤ گی تو شیروان بالکل نہتارہ جائے گا۔ وہ آسیبی لڑکی کے لئے بڑا آسان شکار ہو گا اور وہ اُسے جھپٹا مار کر اٹھا کر لے جائے گی۔“

روہنی نے جواب دیا۔ ”لیکن میں آسیبی لڑکی کی کھوپڑی توڑ کر اس کی طاقت کو تو ختم کر دوں گی۔ پھر میں واپس آکر اپنے شیروان کو آسیبی لڑکی کی قید سے بڑی آسانی سے آزاد کرالوں گی اور وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔“

دُرگاکا بدروح نے کہا۔ ”آسیبی لڑکی تمہارے ہاتھ آئے گی تو تم شیروان کو اُس سے چھین سکو گی۔ ٹھیک ہے اس کی آسیبی طاقت ختم ہو جائے گی مگر وہ آسیب سے ایک بدروح بن چکی ہوگی اور بدروح کی اپنی طاقت ہوتی ہے۔ آسیبی لڑکی کی بدروح شیروان سے محبت کرتی ہے وہ اسے اٹھا کر ایسی دنیا میں لے جائے گی کہ تم ہزاروں سال تک بھی اسے تلاش نہ کر سکو گی۔“

دونوں بدروحیں میری قسمت کے فیصلے کر رہی تھیں اور میں بے بسی کے عالم میں اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ ایک طرح سے مجھے میرے کسی گناہ یا میری کسی حماقت کی سزا مل رہی تھی۔ روہنی پریشان ہو گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں مجھے اس آسیبی لڑکی سے بچانا چاہتی تھی۔ اُس نے دُرگاکا بدروح سے پوچھا۔ ”تو پھر تم ہی بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

دُرگاکا بدروح نے ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ”ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ تم شیروان کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ جس وقت تم کھوپڑی والے درخت کے قریب پہنچو تو میرا گنی منتر پڑھ کر پھونک دینا۔ تمہیں میرا گنی منتر یاد ہے نا؟“

”ہاں۔ مجھے یاد ہے۔“ روہنی نے کہا۔

دُرگاکا بولی۔ ”اس گنی منتر کے اثر سے درخت پر بیٹھی پہرہ دیتی بدروح وہاں سے غائب ہو جائے گی۔ اس کے بعد تمہیں بڑی تیزی سے اور بڑی جلدی سے اپنا کام کرنا ہو گا۔ شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی کے بغیر تم آسیبی لڑکی کی کھوپڑی کو ہاتھ نہیں لگا سکو گی۔ اگر ہاتھ لگاؤ گی تو جل کر وہیں راکھ ہو جاؤ اس۔ اس سے پہلے کہ آسیبی لڑکی کو خبر ہو تمہیں بڑی تیزی سے زمین کے اندر سے کھوپڑی نکال کر اس کے

دو ٹکڑے کر دینے ہوں گے۔ اس دوران میں اگر تمہاری بد قسمتی سے آسیبی لڑکی نتالیا کا آسیب وہاں پہنچ گیا تو پھر تمہاری اور شیروان دونوں کی خیر نہیں ہوگی۔ وہ نہ صرف شیروان کو غائب کر کے اپنے قبضے میں کر لے گی بلکہ تمہیں بھی جو الاکھی منتر پھونک کر کھولتے ہوئے لاوے کی طرح پکھلا کر ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گی۔“

روہنی نے کہا۔ ”لیکن میری انگلی میں تو شیش ناگن کی انگوٹھی ہوگی۔ پھر وہ مجھ پر کیسے حملہ کر سکے گی؟“

دُرگاکا بدروح نے کہا۔ ”وہ تمہارے قریب نہیں آئے گی۔ وہ تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکے گی لیکن تم پر اپنا جو الاکھی منتر پھونک سکے گی۔ یہ منتر جو الاکھی کا کھولتا ہوا لاوا ہے بلکہ کھولتے ہوئے لاوے سے بھی زیادہ آتش ناک ہے۔ تم ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں پکھل کر بہہ جاؤ گی۔“

روہنی بت بنی دُرگاکا بدروح کی باتیں سن رہی تھی۔ دُرگاکا بدروح نے کہا۔ ”روہنی! یہ تمہاری چالاکی، عیاری اور تمہاری بدروحوں والی بدی کی طاقت کا امتحان ہے۔ تم نے کھوپڑی والے درخت کے پاس پہنچ کر میرا گنی منتر پھونک کر پہرہ دینے والی بدروح کو غائب کر دینے کے بعد بدروحوں والی حیرت انگیز پھرتی اور برق رفتاری سے کام لیا اور کھوپڑی کو زمین کے نیچے سے نکال کر اسے پتھر مار کر پاش پاش کر دیا تو سمجھ لو کہ پھر اگر آسیبی لڑکی کا آسیب وہاں آ بھی گیا تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا کیونکہ تم اس کے فوراً بعد شیروان کو لے کر وہاں سے غائب ہو چکی ہو گی۔ یہ کام تمہیں ایک لمحے کے ہزارویں حصے کے اندر اندر کرنا ہو گا۔ کیا تم ایسا کر سکو گی؟“

روہنی نے کہا۔ ”میں اپنے شیروان کے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں۔“

دُرگاکا بدروح نے اس کے جواب میں کہا۔ ”تو پھر تم اپنی مہم میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گی۔ اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ وہ جزیرہ کہاں ہے اور جزیرے میں وہ درخت کہاں ہے جس کے سائے میں آسیبی لڑکی نتالیا کی کھوپڑی دفن ہے۔ اپنی آنکھیں بند

کرو۔“

روہنی نے آنکھیں بند کر لیں۔ دُرگاکا بدروح نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے بعد شاید ان دونوں میں کوئی وائز لیس سسٹم قائم ہو گیا تھا جس کے ذریعے دُرگاکا بدروح کھوپڑی والے درخت اور اس آدم خور جزیرے کا حدود اربعہ اور نقشہ روہنی کے ذہن میں نقش کر رہی تھی۔ یہ کام ایک سیکنڈ میں ہو گیا۔

دُرگاکا نے آنکھیں کھول کر کہا۔ ”آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھو۔“

روہنی نے آنکھیں کھول دیں اور دُرگاکا بدروح کی طرف دیکھنے لگی۔ دُرگاکا پوچھا۔ ”جو میں تمہیں سمجھانا چاہتی تھی کیا تم سمجھ گئی ہو؟“

روہنی بولی۔ ”مجھے ساری سمجھ آ گئی ہے کہ آدم خور جزیرہ افریقہ کے کس ملک کے پاس واقع ہے اور اس جزیرے میں کھوپڑی والا درخت کہاں ہے۔“

دُرگاکا بدروح نے کہا۔ ”تو پھر ابھی شیروان کو لے کر روانہ ہو جاؤ تمہیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ آسیبی لڑکی نتالیا کا آسیب کسی بھی وقت تم پر حملہ کر سکتا ہے۔“

روہنی نے دُرگاکا بدروح کا شکریہ ادا کیا تو دُرگاکا بدروح غائب ہو گئی۔ روہنی میرے پاس آ کر کہنے لگی۔ ”شیروان! اب تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہمیں کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ تم نے سب کچھ سن لیا ہو گا۔“

میں نے کہا۔ ”میں نے اتنا کچھ سن لیا ہے کہ کچھ اور سننے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔“

”آؤ یہاں سے باہر چلتے ہیں۔“ روہنی نے کہا۔

ہم دیران محل سے باہر آ گئے۔ اس وقت رات ڈھلنا شروع ہو گئی تھی اور آسمان پر ستاروں کی چمک پھمکی پڑنے لگی تھی۔ دُور جے پور کے کسی مندر سے گھنٹیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ روہنی نے کہا۔ ”مندر میں اماوس کی پچھلی رات کی پوجا ہو رہی ہے۔“

ویران محل کی میز حیاں اتر کر ہم گیٹ کی طرف آنے کی بجائے محل کے احاطے کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھے اس لئے کہ ہم غائب نہیں تھے اور گیٹ پر چوکیدار موجود تھے۔ مجھے یہ تجربہ ہوا تھا کہ روہنی صرف اسی وقت غائب ہوتی تھی جب اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔ وہ خواہ مخواہ کبھی غائب نہیں ہوتی تھی۔ ہم پچھلے دروازے سے گزر سکتے تھے کیونکہ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ ہم محل کے احاطے سے باہر آ گئے۔

○

روہنی مجھے ساتھ لے کر محل سے دور ایک باغ میں آ گئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ باغ سنان پڑا تھا۔ ہم ایک جگہ بیٹھ گئے۔ روہنی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کہنے لگی۔ ”شیروان! میری اور دُرگاکا جو باتیں ہوئی ہیں وہ تم نے بھی سنی ہیں۔ تمہیں ضرور تشویش ہوئی ہوگی۔ میں تمہیں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں کسی حالت میں بھی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنے دوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”روہنی! مجھے تم پر نہیں بلکہ اپنے اللہ پر بھروسہ ہے کہ وہ میرے گناہ معاف کر دے گا اور مجھے اس اذیت سے ضرور باہر نکال لے گا۔ باقی جہاں تک فکر مند ہونے کی بات ہے تو آخر میں ایک انسان ہوں۔ مجھ میں کمزوریاں بھی ہیں۔ مجھے تشویش ضرور ہے کیونکہ جس مہم پر ہم جارہے ہیں یہ کم از کم میری زندگی اور موت کی مہم ہے لیکن میرا ایمان ہے کہ زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”تو تم کیا سمجھتے ہو کہ میرا یہ ایمان نہیں ہے؟ میں تو مسلم سہی لیکن مسلمان ہوں اور میں نے سچے دل سے اسلام قبول کیا تھا۔ اگر تم اپنی کسی غلطی کا ثمنازہ بھگت رہے ہو تو میں بھی اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہی ہوں۔ تمہاری طرح مجھے بھی یقین ہے کہ خدا میرے گناہوں کو بھی معاف فرمادے گا اور تمہارے ساتھ مجھے بھی نجات مل جائے گی۔“

میں نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں روہنی کہ تم ایسا ہی سوچتی ہو۔ یہ بتاؤ کہ اب تمہارا

کیا پروگرام ہے؟“

روہنی بولی۔ ”ہم یہاں سے سیدھے افریقہ کے ملک اتھوپیائی کی طرف روانہ ہو جائیں گے تاکہ سب سے پہلے آسبی لڑکی نتالیا سے چھٹکارا حاصل کیا جائے اس کے بعد اپنے مشترکہ دشمن پجاری رگھو سے بھی نمٹ لیں گے۔ میرے پاس شیش ناگن کا مہرہ ہے۔ پجاری رگھو اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔“

پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”کیا تم میرے ساتھ افریقہ جانے کے لئے تیار ہو؟“

”میں کیوں تیار نہیں ہوں گا۔“ میں نے بے دلی سے کہا۔

روہنی بولی۔ ”میں جانتی ہوں تم بھی ان حالات سے تنگ آ چکے ہو۔ لیکن پیارے شیروان! مشکلات انسان کی زندگی میں آتی ہی رہتی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم ان مشکلات کا مردوں کی طرح مقابلہ کر رہے ہو۔ اب اٹھو ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ نتالیا تمہاری تلاش میں ہے۔ میں حیران ہوں کہ ابھی تک اس نے تم پر حملہ کیوں نہیں کیا۔“

میں نے کہا۔ ”شاید اسے علم ہو گیا ہے کہ میرے ہاتھ میں شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”لیکن وہ اپنا آپ تمہیں دکھا تو سکتی تھی۔ اس نے ایسا بھی نہیں کیا۔ وہ انتہائی خطرناک ہونے کے ساتھ انتہائی عیار آسبی لڑکی بھی ہے۔ وہ تمہیں یہی احساس دلانا چاہتی ہے کہ اسے تم نہیں مل رہے اور پھر اچانک تمہیں غافل پا کر تمہیں جھپٹ کر لے اڑے گی۔“

”خدا مجھے اس سے محفوظ رکھے۔“ میں نے جواب دیا۔

روہنی نے کہا۔ ”اب ہم چل رہے ہیں۔“

پہلے وہ غائب ہوئی۔ اس کے بعد اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں بھی غائب ہو

گیا۔ پھر ہم معمول کے مطابق آہستہ سے زمین پر سے بلند ہوئے اور آہستہ آہستہ بلند ہوتے چلے گئے۔ جب میں نے دیکھا کہ باغ کے درخت پچھلی رات کے دھندلے میں دوڑنے والے دھبوں کی طرح نظر آنے لگے ہیں تو روہنی نے پرواز کی رفتار تیز کر دی۔ میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں یہاں سے افریقہ تک کا راستہ معلوم ہے؟“

میرا مطلب ہے فضائی راستہ۔“

مجھے روہنی کے ہلکے سے تہقہ کی آواز سنائی دی۔ کہنے لگی۔ ”ہم فضاؤں میں ہلکنے والی بدردھیں ہیں۔ ہمیں فضائی راستوں کا ہوائی جہازوں کے ہوا بازوں سے زیادہ علم ہوتا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”ہم کس وقت افریقہ پہنچیں گے؟“

روہنی نے جواب دیا۔ ”یہ بڑا لمبا سفر ہے مگر جتنی دیر میں ہوائی جہاز وہاں پہنچتا ہے ہم اس سے پہلے پہنچ جائیں گے۔“

ہم بے پور سے اڑے تھے۔ ہم اتنی بلندی پر تھے کہ مجھے نیچے زمین دکھائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد صبح ہو گئی اور نیچے پہاڑیاں، کھیت، گاؤں اور شہر اور چھوٹے چھوٹے مکان نظر آنے لگے۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ ہم کافی تیزی سے جا رہے ہیں۔ ہم کئی شہروں کے اوپر سے گزر گئے۔ پھر ایک بہت بڑا شہر آ گیا۔ روہنی نے کہا۔ ”ہم اس وقت تمہارے دوست جمشید کے شہر بمبئی کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔“

پھر بمبئی بھی گزر گیا اور سمندر شروع ہو گیا۔ روہنی نے کہا۔ ”ہم بصرہ، کویت اور عراق کے ممالک سے گزرتے ہوئے قاہرہ اور پھر قاہرہ سے افریقہ پہنچیں گے۔ اتھوپیائی افریقہ میں مصر کے ساتھ ہی واقع ہے۔“

یہ سب کچھ مجھے الف لیلا کی کوئی طلسمی داستان کی طرح لگ رہا تھا۔ میں نے کبھی اندگی میں سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اس طرح ہوا میں اڑتا ہوا ان ملکوں کی سیر کروں گا۔ اس زمانے میں ابھی حیث ہوائی جہاز چلنا شروع نہیں ہوئے تھے۔ چار پنکھوں

والے ٹرانڈنٹ جہاز ایک ملک سے دوسرے ملک میں پرواز کیا کرتے تھے اور ان کی رفتار ہلکی ہوتی تھی۔ ہم ابھی سمندر کے اوپر ہی تھے کہ میں نے نیچے نگاہ ڈالی تو مجھے ایک ہوائی جہاز اڑتا دکھائی دیا اس کا رخ بھی بصرے کی طرف تھا۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”لگتا ہے یہ جہاز بھی بصرے جا رہا ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”کیا تم ہوائی جہاز کی سیر کرنا چاہتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”اگر ہم ہوائی جہاز کی سیر کر سکتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

روہنی نے کہا۔ ”چلو تھوڑی دیر کے لئے ہوائی جہاز کی ہی سیر کر لیتے ہیں۔“

اور وہ میرا ہاتھ تھامے نیچے کو غوطہ لگا گئی۔ ہم تھوڑی ہی دیر میں ہوائی جہاز کے اوپر آگئے۔ وہاں سے ہم جہاز کی کھڑکیوں کی طرف آگئے۔ میں نے کھڑکیوں میں سے دیکھا اندر مسافر اپنی اپنی نشستوں پر بڑے سکون کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ایئر ہوسٹس ان میں ٹھنڈے مشروبات تقسیم کر رہی تھی۔ روہنی نے کہا۔ ”ہم جہاز میں داخل ہو رہے ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی روہنی مجھے لئے ہوئے ہوا کی ایک لہر کی طرح تیرتے ہوئے ایک جگہ سے ہوائی جہاز کے اندر داخل ہو گئی۔ جب میں اس کے ساتھ جہاز کی کھڑکیوں کی طرف آیا تو قدرتی طور پر میں نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں اس خیال سے کہ جہاز کی کھڑکیوں سے میں ضرور نکل جاؤں گا۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ مجھے ذرا سا دھچکا تک نہ لگا اور جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں جہاز کے اندر تھا۔ روہنی نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ کہنے لگی۔ ”اپنا ہاتھ مت چھڑانا ورنہ تم لوگوں کو نظر آنے لگو گے۔“

جہاز کافی بڑا تھا اور اس میں کئی نشستیں خالی پڑی تھیں۔ ہم کھڑکی کے پاس والی دو سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ میرا ایک ہاتھ روہنی کے ہاتھ میں تھا مجھے شرارت سوچھی۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”روہنی! میرا دل تھوڑی سی شرارت کرنے کو چاہتا ہے۔“

”کس قسم کی شرارت؟“ روہنی نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم تھوڑی دیر کے لئے میرا ہاتھ چھوڑ دو اور میں لوگوں کو نظر آنے لگوں گا اور ایئر ہوسٹس وغیرہ ضرور حیران ہوں گے کہ میں کہاں سے آگیا ہوں۔ بڑا مزہ آئے گا۔ یہ لوگ ہمارا کچھ بگاڑ تو سکیں گے نہیں۔ ہم جس وقت چاہیں گے غائب ہو جائیں گے۔“

روہنی مسکرانے لگی۔ ”اس قسم کی شرارتیں زندہ انسانوں کو ہی سوجھ سکتی ہیں۔“

یہ اچھی بات ہے زندہ دلی کا ثبوت ہے۔ میں تمہارا ہاتھ چھوڑ رہی ہوں۔“

روہنی نے جیسے ہی میرا ہاتھ چھوڑا میں انسانی شکل میں نظر آنے لگا۔ روہنی میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی مگر وہ کسی کو نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے اپنے پیچھے کی طرف دیکھا۔ ایک ایئر ہوسٹس چلی آرہی تھی۔ میں نے اُسے روک کر کہا۔ ”میڈم! میں چائے پینا چاہتا ہوں۔“

ایئر ہوسٹس نے مجھے حیران ہو کر دیکھا۔ پھر اُس نے اوپر سیٹ نمبر پر نگاہ ڈالی۔ کہنے لگی۔ ”شما کیجئے گا۔ آپ کے پاس بورڈنگ کارڈ کا باقی حصہ ہے؟ پلیز مجھے دکھا دیجئے۔“

یہ انڈیا کی کسی ہوائی کمپنی کا جہاز تھا اور بمبئی سے بصرے جا رہا تھا۔ میں نے یونہی جیبوں کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہیں گر گیا ہے میرے پاس نہیں ہے۔“

ایئر ہوسٹس نے مسکرا کر کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ میں آپ کے لئے چائے لے کر آتی ہوں۔“

وہ چلی گئی تو روہنی کہنے لگی۔ ”اب وہ اپنی ساتھی کو لے کر آئے گی۔“

اور ایسا ہی ہوا۔ مشکل سے ایک منٹ گزرا ہو گا کہ وہ ایئر ہوسٹس اپنی ایک ساتھی ایئر ہوسٹس کو لے کر آگئی۔ دوسری ایئر ہوسٹس کے ہاتھ میں ایک چارٹ تھا جس پر مسافروں کے نام اور ان کے سیٹ نمبر لکھے ہوئے تھے۔ پہلی ایئر ہوسٹس کے ہاتھ

میں چائے کی پیالی تھی۔ اُس نے چائے کی پیالی مجھے پکڑادی۔ دوسری ایئر ہو سٹس نے مجھ سے پوچھا۔ ”شما کبجے گا ہم مسافروں کی سیٹیں چیک کر رہے ہیں۔ آپ کا شجرہ نام کیا ہے؟“

اس وقت مجھے یہی نام یاد آگیا۔ میں نے کہا۔ ”پرکاش کھنہ میرا نام ہے۔“ ایئر ہو سٹس چارٹ کو دیکھنے لگی۔ اس نے دو تین بار مسافروں کے نام چیک کئے مگر وہاں اُسے کہیں بھی میرا نام نظر نہ آیا۔ اُس نے حیران سی ہو کر مجھ سے پوچھا۔ ”سر آپ کو کریو کے کس آدمی نے یہاں بٹھایا ہے؟ ایسے پہلے کبھی نہیں ہوا لیکن میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ مسافروں کی لسٹ میں آپ کا نام کہیں نہیں ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے عملے کے کسی آدمی نے نہیں بٹھایا مجھے ابھی ابھی میری ساتھی عورت نے یہاں بٹھایا ہے۔“

دونوں ایئر ہو سٹس پریشان ہو کر میرا منہ تکتے لگیں۔ ایک نے پوچھا۔ ”آپ کی ساتھی عورت کہاں ہے سر؟“

میں نے کہا۔ ”میری ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہے۔“ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر تیز تیز قدموں سے کاک پٹ کی طرف چلی گئیں جہاں پائلٹ بیٹھا کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک پائلٹ کو لے کر ہمارے پاس آگئیں۔ بڑی مزیدار چوایشن پیدا ہو گئی تھی اور میں اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس سے میری بوریت کافی حد تک دور ہونے لگی تھی۔

پائلٹ نے مسکراتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بڑے اخلاق سے پوچھا۔ ”سر! آپ کہاں سے جہاز میں سوار ہوئے تھے؟“

میں نے چائے کی پیالی ایئر ہو سٹس کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو یقین نہیں آئے گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اور میری ساتھی عورت ہم دونوں پانچ منٹ پہلے جہاز میں سوار ہوئے ہیں۔“

پائلٹ نے کہا۔ ”معاف کیجئے گا۔ پرواز کرتے جہاز میں تو کوئی بھی سوار نہیں ہو سکتا۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور کوئی داخل ہو یا نہ ہو مگر ہم داخل ہو سکتے ہیں۔“

پائلٹ نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے وہ مجھے پاگل خیال کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”آپ کی ساتھی عورت کہاں ہے؟“

میں نے کہا۔ ”میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کی ساتھ والی سیٹ تو خالی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”خالی نہیں ہے۔ میری ساتھی عورت سیٹ پر باقاعدہ بیٹھی ہوئی ہے۔ میں اسے دیکھ رہا ہوں مگر آپ نہیں دیکھ سکتے۔“

پھر میں نے انہیں اور زیادہ پریشان دیکھنے کی خاطر روہنی سے کہا۔ ”روہنی! تم میرے ساتھ بیٹھی ہوئی ہونا؟“

روہنی نے عورت کی آواز میں کہا۔ ”ہاں میں تمہارے ساتھ بیٹھی ہوئی ہوں۔“

ایک غیبی عورت کی آواز سن کر پائلٹ اور دونوں ایئر ہو سٹسوں کے چہروں کا رنگ اُڑ گیا۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”ان کو یقین نہیں آتا۔“

روہنی نے جواب دیا۔ ”ابھی یقین آ جائے گا۔“ اور اس کے ساتھ ہی روہنی بھی غیبی حالت سے انسانی شکل میں واپس آگئی۔ خالی سیٹ پر ایک عورت کو غیب سے اچانک نمودار ہوتے دیکھ کر ان لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اوپر سے روہنی نے ایک اور شرارت کی۔ اس نے کہا۔ ”کیا تم لوگوں نے کبھی کوئی جن بھوت دیکھا ہے؟ اگر نہیں دیکھا تو مجھے دیکھ لیں۔ میں جن بھوت ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی دونوں ایئر ہو سٹس بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ پائلٹ ڈر کر

پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرے مسافر بھی عجیب نظروں سے ہم دونوں کو دیکھنے لگے۔ کچھ مسافروں نے ہماری باتیں سن لی تھیں۔ روہنی فوراً غائب ہو گئی اور کہنے لگی۔ ”اس سے زیادہ شرارت ٹھیک نہیں۔“

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں بھی غائب ہو گیا۔ لیکن ہم جہاز میں بیٹھے رہے۔ پائلٹ نے ہمیں غائب ہوتے دیکھا تو وہ بھی ڈر کر کاک پٹ کی طرف بھاگ گیا۔ دوسری ایئر ہوسٹس آگئیں اور بے ہوش ایئر ہوسٹس کو ہوش میں لانے لگیں۔ جب انہیں ہوش آگیا تو ایک نے کہا۔ ”یہاں.... یہاں دو بھوت بیٹھے تھے۔ اس جہاز میں بھوت گھس آئے ہیں۔“ اور وہ دوبارہ بے ہوش ہو گئی۔

روہنی نے کہا۔ ”بس اتنا کھیل ہی کافی ہے۔ اب ہمیں نکل چلنا چاہئے۔“ اور ہم فضا میں تیرتے ہوئے جہاز سے باہر نکل آئے اور بلند ہو کر جہاز سے کافی اوپر آنے کے بعد اڑتے ہوئے جہاز سے آگے نکل گئے۔ اب ہماری منزل شمالی افریقہ کا ملک ایٹھوپیا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا جب ہم ایٹھوپیا کے پہاڑی سلسلے کے آسمان پر پہنچے۔ روہنی نے کہا۔ ”ہم اپنی منزل پر آگئے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ جنگل یہاں سے کس طرف ہے جہاں ہمیں جانا ہے؟“

روہنی نے کہا۔ ”جب میں وہاں پہنچوں گی تمہیں بتا دوں گی۔“

نیچے رات کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ کہیں پہاڑی سلسلہ تھا اور کہیں ریتلا میدان تھا۔ ایک دریا بھی ہم نے دیکھا۔ ہم شہری آبادیوں سے کافی آگے نکل آئے تھے اور اب جنگلات شروع ہو گئے تھے۔

ایک جگہ آکر روہنی کے اڑنے کی رفتار بہت مدہم ہو گئی۔ پھر اُس نے ایک طرف کو غوطہ لگایا۔ وہ بڑی تیزی سے آگے نکل گئی۔ میں اس کے ساتھ ہی پرواز کر رہا تھا۔ چونکہ میں غیبی حالت میں تھا اس لئے مجھے اندھیرے میں بھی سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ ہمارے نیچے اس وقت سمندر تھا۔ روہنی نے کہا۔ ”وہ جزیرہ آنے والا ہے

جس کے جنگل میں ہمیں اترنا ہے۔ جب تک میں نہ کہوں بالکل مت بولنا۔“ میں خاموش رہا۔ ہم اب بہت مدہم رفتار کے ساتھ اڑ رہے تھے۔ روہنی اڑتے اڑتے کسی وقت مجھ سے کوئی بات کر لیتی تھی مگر مجھے بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ نیچے سمندر میں ایک بہت وسیع و عریض جزیرہ نظر آنے لگا۔ روہنی اب سرگوشی میں بات کرتی تھی۔ کہنے لگی۔ ”آسیبی لڑکی کی کھوپڑی والا جزیرہ آگیا ہے۔ بالکل خاموش رہنا۔“

ایک مقام پر آکر ہماری اڑنے کی رفتار اتنی ہلکی ہو گئی کہ مجھے احساس ہونے لگا کہ ہم رات کی تاریکی میں فضا میں لٹکے ہوئے ہیں۔ روہنی مجھے لے کر جزیرے کے ایک کونے میں آہستہ آہستہ نیچے آرہی تھی۔ جہاں ہم اترے وہاں جنگلی جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے ٹیلے تھے۔ روہنی مجھے لے کر ایک ٹیلے کے چھوٹے سے غار میں آگئی۔ اُس نے مجھے اپنے سامنے بٹھالیا اور سرگوشی میں کہنے لگی۔ ”شیردان! ہم کھوپڑی والے درخت سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے آسیبی لڑکی تالیا کے آسیب کو ہمارے آنے کی اطلاع مل چکی ہو۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر وہ کسی بھی لمحے وہاں نمودار ہو سکتی ہے۔“

میں نے بڑی دھیمی سرگوشی میں کہا۔ ”میرے پاس شیش ناگن کی انگوٹھی ہے۔“ ”ہاں۔“ روہنی نے کہا۔ ”وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی لیکن اگر میں اُس کے سامنے آگئی تو وہ اپنا جوا لاکھی منتر پھونک کر مجھے ہلاک کر سکتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میری انگوٹھی تم پہن لو۔“

روہنی بولی۔ ”ابھی نہیں۔ ابھی یہ انگوٹھی تم ہی پہنے رہو۔ میں عین وقت پر تم سے شیش ناگن والی انگوٹھی لوں گی۔ تمہارے پاس انگوٹھی نہ ہوئی تو مجھے ڈر ہے کہ تالیا کا آسیب تمہیں اٹھا کر لے جائے گا۔ اس وقت مجھے دو محاذوں پر جنگ کرنی ہے۔ ایک تو تمہیں آسیب سے بچانا ہے دوسرے آسیبی لڑکی کی کھوپڑی پاش پاش کرنی

ہے۔“

پھر وہ کہنے لگی۔ ”تم اس جگہ چھپ کر بیٹھے رہو۔ میں اس درخت کی نشاندہی کرتی ہوں جس کے نیچے آسیبی لڑکی نکالیا کی کھوپڑی دفن ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اپنا خیال رکھنا۔“

میرے اس فقرے پر روہنی نے مجھے پلٹ کر دیکھا اور بولی۔ ”یہ جان کر میرا حوصلہ بلند ہو گیا ہے کہ تمہیں میری فکر ہے۔“

میں نے آگے سے کوئی جواب نہ دیا۔ روہنی غائب ہو گئی۔ اس وقت میں غائب نہیں تھا ظاہر حالت میں تھا اور نیلے کے غار میں اندھیرے میں ایک طرف سٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ جنگل میں ہر طرف اندھیرا تھا اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔

اچانک اس سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک چیخ کی آواز سے جنگل کی خاموشی گونج اٹھی۔ میں اپنی جگہ پر کانپ سا گیا۔ اس کے بعد پھر سناٹا چھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد روہنی غار میں داخل ہوئی۔ وہ غیبی حالت میں تھی اور کچھ گھبرائی ہوئی بھی تھی۔ آتے ہی کہنے لگی۔ ”تم ٹھیک ہونا؟“

میں نے کہا۔ ”یہ چیخ کی آواز کیسی تھی؟“

روہنی نے کہا۔ ”میں نے اس بدروح کو ختم کر دیا ہے جو کھوپڑی والے درخت پر بیٹھی آسیبی لڑکی کی کھوپڑی کی حفاظت کر رہی تھی۔ اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ میرے ساتھ آؤ۔“

میں اٹھ کر اس کے ساتھ ہو گیا۔ روہنی خود بھی غائب تھی اور اس نے مجھے بھی غائب کر دیا ہوا تھا۔ ہم زمین پر چل نہیں رہے تھے بلکہ زمین سے کوئی سات فٹ کی بلندی پر ہوا میں بڑی آہستہ آہستہ جس طرح فلموں میں دکھایا جاتا ہے سلوموشن میں تیر رہے تھے۔ درختوں اور جھاڑیوں میں گہرا اندھیرا تھا مگر ہمیں دھندلاؤ دھندلاؤ سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔

فضا میں تیرتے تیرتے روہنی نے میرے بالکل قریب آ کر ایک درخت کی طرف اشارہ کیا۔ یہ ایک بہت بڑا گھناور درخت تھا۔ روہنی نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی وہ درخت ہے جس کے نیچے آسیبی لڑکی نکالیا کی کھوپڑی دفن ہے۔ جب یہ درخت کوئی پندرہ بیس فٹ دور رہ گیا تو ہم ایک جگہ گھنی جھاڑیوں میں اتر گئے اور وہیں دبک کر بیٹھ گئے۔ اب ہم بالکل زمین کے ساتھ لگ کر سلوموشن سے بھی کم رفتار کے ساتھ آگے کو جا رہے تھے۔ جب درخت تین چار قدموں کے فاصلے پر رہ گیا تو روہنی نے اپنے ساتھ مجھے بھی روک دیا۔ اس نے زبان سے کوئی لفظ نکالے بغیر میرے ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ سے ٹٹولا اور میری انگلی سے شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی اتارنے لگی۔ میری انگلی میں پڑے پڑے انگوٹھی سخت ہو گئی تھی اور انگلی سے نکل نہیں رہی تھی۔ ہم آپس میں بات نہیں کر سکتے تھے۔ روہنی انگوٹھی میری انگلی سے اتارنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ انگوٹھی اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہل رہی تھی۔

عین اسی وقت اچانک ہمارے سروں کے اوپر سے ہیبت ناک گونج کے ساتھ کوئی چیز آگے کو نکل گئی جیسے کوئی ہوائی جہاز ہمارے سروں کے قریب سے ہو کر گزر گیا ہو۔ روہنی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی جنگل دہشت ناک چیخوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ روہنی مجھے لے کر ایسے ایک جانب اوپر کو پرواز کر گئی جیسے کوئی راکٹ چھوٹ گیا ہو۔ ایک سیکنڈ کے اندر اندر ہم خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ دہشت ناک آوازیں اب بھی ہمارے ساتھ ساتھ تھیں۔

روہنی نے گھبرائی ہوئی آواز میں مجھے کہا۔ ”شیروان! نکل جاؤ۔۔۔۔۔ نکل جاؤ۔“

اور اس نے مجھے پوری طاقت سے ایک جانب دھکا دیا۔ میرا ہاتھ روہنی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں اکیلا اپنے آپ رات کی تاریک فضا میں بڑی تیزی سے اڑنے لگا۔ خدا جانے یہ روہنی کے دھکیلنے کا اثر تھا کہ میں فضا میں پستول کی گولی کی رفتار سے

اس سے پہلے جب روہنی میرا ہاتھ چھوڑ دیتی تھی تو میں غیبی حالت سے ظاہری حالت میں آجاتا تھا اور نظر آنے لگتا تھا۔ مگر اب روہنی کا ہاتھ چھوڑنے کے باوجود میں ابھی تک غائب تھا اور فضا میں اُڑ رہا تھا۔ جبکہ پہلے روہنی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ اُڑایا کرتی تھی۔

یہ میرے ساتھ ایک نئی بات ہوئی تھی۔ کوئی طاقت مجھے اپنے آپ کسی طرف لئے جا رہی تھی۔ پہلے میرا وزن کم ہو کر غائب ہو گیا تھا اب اپنے آپ میری رفتار کم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ابھی رات ہی تھی۔ اوپر آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ نیچے سے کوئی آبادی گزرتی تو اس کی ٹٹماتی روشنیاں نظر آ جاتی تھیں۔ ابھی تک مجھے یہ علم نہیں تھا کہ میں کس ملک میں ہوں۔

میری رفتار ضرور کم ہو گئی تھی لیکن میں نیچے نہیں آ رہا تھا۔ پھر جیسے اپنے آپ کسی نے مجھے آہستہ آہستہ نیچے کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ پر آکر میں بالکل سیدھا ہو کر اُڑنے لگا۔ اُس وقت میرے نیچے اندھیرے میں پہاڑوں کے دھندلے دھندلے خاکے دکھائی دے رہے تھے۔ پھر یہ پہاڑ پیچھے رہ گئے اور دور سے شہر کی روشنیاں قریب آنے لگیں۔ میں اپنے آپ نیچے ہوتا گیا۔ زمین سے کوئی سو ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر آکر میں ایک بار پھر سیدھی پرواز کرنے لگا۔

میں شہر کی روشنیوں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔

ابھی تک میں نے اس شہر کو بالکل نہیں پہچانا تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ جو غیبی قوت مجھے اُڑائے لئے جا رہی ہے وہ مجھے اسی شہر میں کسی جگہ اتارنا چاہتی ہے۔ میری رفتار کبھی آہستہ ہو جاتی کبھی ذرا تیز ہو جاتی۔ میری کیفیت بالکل ایسی تھی جیسے کوئی ہوا جہاز لینڈ کرنے والا ہو۔ میں درختوں کے ایک جھنڈ کے اوپر سے گزر گیا۔ سامنے ایک قلعہ نما محل دکھائی دیا جس کی چار دیواری کے احاطے میں بجلی کے بلب روشن تھے۔ میں نے فوراً اسے پہچان لیا۔ یہ وہی قدیم محل تھا جہاں آدھی رات کو روہنی کی

اُڑتا چلا جا رہا تھا۔ میرے چاروں طرف جیسے کوئی شے، شاں شاں کی آواز سے جھپٹے مار رہی تھی۔ میری رفتار اتنی تیز تھی کہ مجھے لگتا تھا جیسے میں فضا میں تحلیل ہو کر ہوا کے جھونکے میں تبدیل ہو گیا ہوں۔ مجھے اوپر نیچے، دائیں بائیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

پھر جھپٹنے کے شرانے اور چیخوں کی آوازیں غائب ہو گئیں۔ میں ابھی تک ناقابل تصور رفتار سے اُڑتا چلا جا رہا تھا۔

میں آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میری آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں۔ مجھ پر جیسے کسی کا دباؤ پڑا ہوا تھا۔ میرے ہاتھوں کی مٹھیاں اپنے آپ بند ہو گئی تھیں۔ اتنی تیز رفتاری بلکہ برق رفتاری سے پرواز کرنے کا مجھے روہنی کے ساتھ پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ پہلی بار پرواز کرتے ہوئے مجھے اپنا جسم بے حد بو جھل محسوس ہونے لگا تھا۔ مجھے یاد آ گیا میں نے سائنس کی کتاب میں ایک جگہ پڑا تھا کہ فضا میں جیسے جیسے کسی پرواز کرتی مادی شے کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے اس کا وزن بڑھتا چلا جاتا ہے۔ میرا وزن بڑھ گیا تھا کہ لگتا تھا میں کوئی چٹان ہوں جو ہوا میں اُڑ رہی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں آواز کی رفتار سے بھی کئی سو گنا تیز رفتاری کے ساتھ اُڑ رہا تھا۔

یقیناً یہ روہنی کے دھکے کا اثر تھا۔ شاید اُس نے مجھے فضا میں کسی خاص رُخ کو بھی ڈال دیا تھا کیونکہ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں ایک سمت کو پرواز کر رہا ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ سب سے پہلے میرے جسم کا وزن کم ہونا شروع ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد میرے جسم کا وزن غائب ہو گیا اور میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ میری آنکھیں اور میری ہاتھوں کی مٹھیاں بھی اپنے آپ کھل گئی تھیں۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ مجھے نیچے کسی شہر کی روشنیاں چھوٹے چھوٹے نقطوں کی طرح جھلملاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ خدا جانے یہ کون سا شہر تھا، کون سا ملک تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ میرا اُڑنا اور میرا غائب ہونا میرے اختیار میں نہیں تھا۔

سہیلی دُرگاکے بدروح آیا کرتی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ میں راتوں رات برق رفتاری سے پرواز کرتا ہوا افریقہ کے ملک سے اُڑ کر بھارت کے شہر جے پور پہنچ گیا تھا۔ یہ کام روہنی کی طلسمی طاقت نے انجام دیا تھا۔ روہنی چاہتی تھی کہ میں اپنے آپ کو بچا کر دُرگاکے پاس چلا جاؤں۔ روہنی ہی کی طلسمی طاقت نے مجھے غیبی حالت میں رکھتے ہوئے راتوں رات اُڑا کر دُرگاکے محل پر پہنچا دیا تھا۔ میں محل کی چھت کے اوپر آگیا اور پھر اپنے آپ چھت پر اتر گیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی پہلی کا پڑا ہوا ہے۔ میں ابھی تک غیبی حالت میں تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی میری انگلی میں موجود تھی۔

O

خدا جانے روہنی پر کیا گزری ہوگی۔

لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ بھی اپنے آپ کو بچا کر کسی طرف نکل گئی ہوگی۔ وہاں ہوا یہ تھا کہ عین اس وقت جب روہنی میری انگوٹھی اتار کر اپنی انگلی میں ڈالنے کے بعد آسبی لڑکی کی کھوپڑی زمین سے نکالنے والی تھی تو آسبی لڑکی بتالیا کا آسیب سر پر پہنچ گیا تھا۔ وہ مجھ پر تو حملہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میرے ہاتھ میں شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی تھی۔ لیکن روہنی نہتی تھی۔ اس کے پاس آسیب کے خوفناک حملے سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے کوئی طاقت نہیں تھی۔ وہ یہی کر سکتی تھی کہ مجھے وہاں سے نکال کر خود کسی طرف کو فرار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ آسیب اس کے پیچھے گیا ہو گیا کیونکہ اسے پتہ چل گیا تھا کہ روہنی اس کی دفن شدہ کھوپڑی توڑ کر اس کی طاقت کو ختم کرنے آئی ہے۔ روہنی کے ساتھ کیا بتی تھی اس کا مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ اس کا حال اگر کوئی بتا سکتا تھا تو وہ دُرگاکے بدروح ہی تھی شاید اسی لئے روہنی نے مجھے اُس کے پاس بھیج دیا تھا۔

میں چھت پر سے اتر کر ویران محل کے تہہ خانے میں آگیا۔ میرا خیال تھا کہ میں آدھی رات کو افریقہ کے ملک سے چلا تھا اور جس قیامت خیز رفتار کے ساتھ اُڑتا ہوا میں جے پور پہنچا تھا اس کے پیش نظر ابھی آدھی رات کا ہی وقت ہونا چاہئے تھا۔ تہہ خانے میں آکر میں غیبی حالت میں ہی ایک ستون کے پاس کھڑے ہو کر سامنے والے

ستون کے پیچھے جو دیوار تھی اُس کو تکتے لگا۔ دُرگا کی بدروح اسی دیوار پر ظاہر ہوتی تھی۔ مجھے وہاں آئے دو تین منٹ ہی گزرے تھے کہ دُور سے ہلکی ہلکی چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ دُرگا کی بدروح آرہی ہے۔ کچھ دیر کے بعد چیخوں کی آواز غائب ہو گئی۔ دیوار پر ایک روشنی سی چمک کر بجھ گئی اور پھر دُرگا کی بدروح نمودار ہو گئی۔

میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

دُرگا کی بدروح اپنی لال انگارہ ایسی آنکھوں سے مجھے مسلسل تکتی رہی۔ میں بالکل خاموش رہا۔ دُرگا کی بدروح نے گہرا سانس بھرا۔ جیسے کسی سانپ نے دھیمی سی پھنکار ماری ہو۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ ”شیروان! تم خوش قسمت ہو کہ نتالیا کے آسیب کے حملے سے بچ گئے۔ اگر تمہارے پاس شیش ناگن کی انگوٹھی نہ ہوتی تو اس وقت یہاں نہ ہوتے۔“

میں نے کہا۔ ”دُرگا! مگر مجھے روہنی کے بارے میں تشویش ہے۔ اُس نے مجھے تو آسیب کی مصیبت سے نکال دیا تھا مگر معلوم نہیں اُس کے ساتھ کیا گزری ہوگی اور وہ اس وقت کہاں ہوگی۔ کس حالت میں ہوگی۔“

دُرگا کی بدروح کہنے لگی۔ ”آسیب کی دنیا ہم بدروحوں کی دنیا ہے بالکل مختلف اور الگ ہوتی ہے۔ کوئی بدروح آسیب کی دنیا میں داخل ہونے کی جرات نہیں کر سکتی اس لئے مجھے خود معلوم نہیں ہے کہ روہنی اس وقت کہاں ہوگی۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ جس وقت تم اُس سے الگ ہوئے تھے کیا تمہیں روہنی کی کوئی چیخ وغیرہ سنائی دی تھی؟“

میں نے کہا۔ ”کوئی چیخ سنائی نہیں دی تھی۔ روہنی گھبرائی ہوئی ضرور تھی۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ شیروان یہاں سے نکل جاؤ۔۔۔۔۔ نکل جاؤ۔“

”اس کے بعد کیا ہوا تھا؟“ دُرگانے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”اس کے بعد روہنی نے مجھے بڑے زور سے ایک طرف دھکیل دیا تھا اور میں ایک راکٹ کی طرح فضا میں اڑ گیا تھا۔“

دُرگا کی بدروح کچھ دیر کے لئے کسی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کہنے لگی۔ ”اگر روہنی کی کوئی چیخ سنائی نہیں دی تھی تو اس کا مطلب ہے کہ اسے کچھ نہیں ہوا اور وہ اپنے آپ کو بچا کر لے گئی ہے۔“

”مگر وہ کہاں گئی ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ میرے ساتھ کیوں نہیں بھاگی؟“

دُرگانے کہا۔ ”روہنی نے تمہارے ساتھ اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ بھاگتی تو اگرچہ تمہارے پاس شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی تھی لیکن اس بات کا خطرہ تھا کہ آسیبی لڑکی نتالیا کا آسیب تم پر بھی حملہ نہ کر دے کیونکہ آسیبی لڑکی نتالیا تمہیں بھی اغوا کر کے واپس لے جانا چاہتی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن میرے ہاتھ میں تو شیش ناگن کی انگوٹھی تھی وہ مجھے کیسے اغوا کر سکتی تھی؟“

دُرگا کی بدروح نے اس کے جواب میں کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ نتالیا کا آسیب تمہارے نزدیک نہیں آ سکتا تھا لیکن روہنی نہیں چاہتی تھی کہ نتالیا کا آسیب اسے چھوڑ کر تمہارے پیچھے لگ جائے۔ اگر آسیب تمہارے پیچھے لگ جاتا تو پھر اُس نے تمہیں نہیں چھوڑنا تھا اور کسی نہ کسی طریقے سے تمہارے ہاتھ کی انگوٹھی غائب کر کے تمہیں پکڑ لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ روہنی نے آسیب کو اپنے پیچھے لگایا اور تمہیں بچالیا۔“

میں روہنی کی اس قربانی سے کافی متاثر ہوا تھا۔ مجھے اُس سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ اب مجھے اُس کی جان کا فکر لگ گیا تھا۔ میں نے دُرگا سے کہا۔ ”دُرگا! نتالیا کا آسیب تو روہنی کا جانی دشمن بن چکا ہے کیونکہ روہنی اس کی دفن شدہ کھوپڑی کو توڑنے اور اس کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے لئے وہاں آئی تھی۔“

دُرگانے کہا۔ ”ہاں۔ نتالیا کا آسیب روہنی کی جان کا دشمن بن چکا ہے۔ کیونکہ

نتالیا کی کھوپڑی کے ٹوٹ جانے سے اُس کی ساری طاقت اس سے چھن جانی تھی اور پھر کوئی کمزور سے کمزور معمولی بدروح بھی اسے اپنا غلام بنا سکتی تھی اور اُسے ہلاک بھی کر سکتی تھی۔“

”پھر تو روہنی کو ہمیں بچانا چاہئے۔“ میں نے دُرگا سے کہا۔ ”اگر روہنی کو کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ کیونکہ اُس نے یہ سارا خطرہ صرف مجھے اس مصیبت سے نکالنے کے لئے مول لیا تھا۔ مجھے بتاؤ دُرگا! روہنی کہاں ہو گی؟ میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

دُرگا کی بدروح بولی۔ ”مجھے خود معلوم نہیں کہ روہنی کہاں ہے۔ میں تمہیں کیسے بتا سکتی ہوں؟“

میں نے فکر مندی کے ساتھ کہا۔ ”کیا تم کسی طرح اس کا پتہ نہیں لگا سکتیں دُرگا؟ تم تو دُور کی چیزیں بھی دیکھ لیتی ہو۔“

دُرگا کہنے لگی۔ ”اگر روہنی کا مقابلہ کسی بدروح سے ہوتا تو میں ضرور اُس کا پتہ لگا سکتی تھی اور اُس کی مدد بھی کر سکتی تھی لیکن اُس کا مقابلہ ایک آسیب سے ہے۔ میں آسیب کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ”ایک بات ہو سکتی ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

دُرگانے کہا۔ ”روہنی کا پتہ صرف مالینی بدروح ہی بتا سکتی ہے۔ اس کے لئے مجھے اُس کے پاس بدروحوں کی سب سے خطرناک دُنیا میں جانا ہو گا۔“

میں نے کہا۔ ”دُرگا! روہنی تمہیں اپنی سب سے پیاری اور گہری سہیلی سمجھتی ہے۔ وہ میرے سامنے تمہارا ذکر ہمیشہ بڑی محبت سے کیا کرتی ہے۔ کیا تم اپنی سہیلی کے لئے اتنا سا کام بھی نہیں کرو گی؟“

دُرگا اگرچہ بدروح تھی لیکن میری باتوں کا اُس پر اثر ہو گیا۔ کہنے لگی۔ ”کیوں نہیں جاؤں گی۔ میں ابھی مالینی کے پاس جاتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔“

وہ بولی۔ ”وہاں جانے کا پھر کبھی نام نہ لینا۔ تم اس محل میں ٹھہرو مجھے وہاں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“

یہ کہہ کر دُرگا کی بدروح غائب ہو گئی۔

میں تہہ خانے میں ایک ستون کے پاس بیٹھ گیا۔ دُرگا بدروح کو گئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ تہہ خانے کی دیواریں اس طرح ہلنے لگیں جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ میں لمبی حالت میں ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ دیواریں لرز رہی تھیں۔ ایسے لگتا تھا ابھی ایک دوسری سے ٹکرا جائیں گی۔ میں وہاں سے بھاگنے ہی والا تھا کہ تہہ خانے کی فضا میں ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی اور میں وہیں سہم کر بیٹھ گیا۔ چیخ کی آواز دیر تک تہہ خانے میں گونجتی رہی۔

اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔

اچانک مجھے گلاب کے پھولوں کی خوشبو آنے لگی۔ میں چونک گیا۔ یہ خوشبو نتالیا کے لباس سے آیا کرتی تھی۔ وہی نتالیا جو حقیقت میں ایک انتہائی ظالم اور خطرناک آسیبی لڑکی تھی اور جو مجھ سے محبت کرتی تھی اور جس نے زبردستی مجھ سے شادی کر لی تھی اور جو اب میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور جس نے روہنی کو ہلاک کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ آسیبی لڑکی نتالیا اُس تہہ خانے میں آ گئی ہے۔ میں نے بھاگنا چاہا لیکن غیبی حالت میں ہونے کے باوجود میں اپنی جگہ سے بالکل نہ ہل سکا اور مجھے اپنے پاؤں ایک ایک من کے بھاری محسوس ہونے لگے۔ میں نے جلدی سے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ میرے ہاتھ کی انگلی میں شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی موجود تھی۔ میں مطمئن ہو گیا۔ اگر روہنی کو پاتال کی دلدلی گہرائیوں سے نکال کر باہر لانے والے سفید سانپ کے کہنے کے مطابق شیش ناگن کے مہرے کی وجہ سے کوئی جن بھوت کوئی

آسیب میرے قریب نہیں آسکتا تھا تو آسیبی لڑکی بتالیا بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

میں پتھر کا بت بنا اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

گلابوں کی خوشبو گہری ہو گئی۔ پھر مجھے آسیبی لڑکی بتالیا کی محبت بھری آواز آئی۔ ”میری جان! تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟ میں تمہاری تلاش میں بھٹکتی پھرتی تھی۔ تمہاری خوشبو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ دیوتاؤں کا شکر ادا کرتی ہوں کہ انہوں نے مجھے دوبارہ تم سے ملا دیا۔ چلو گھر چلیں جہاں ہماری شادی ہوئی تھی۔“

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ تم یہاں سے چلی جاؤ۔“

بتالیا نے اداس آواز میں کہا۔ ”میری جان! تم مجھ سے کس لئے ناراض ہو۔ کیا تمہیں ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”بتالیا! مجھے یہ راز معلوم ہو چکا ہے کہ تم کون ہو۔ میں تمہاری اصلیت جان گیا ہوں۔ اب میں کبھی تمہارے جال میں نہیں پھنسون گا۔“

بتالیا کی آواز آئی۔ ”میری جان! تم کو میرے بارے میں کسی نے غلط بتایا ہے۔ میں تمہاری داسی ہوں۔ تمہاری کنینہ ہوں تم سے پیار کرتی ہوں پھر تم کیوں مجھ سے دور بھاگتے ہو؟“

ابھی تک بتالیا کی مجھے آواز ہی آرہی تھی۔ وہ خود کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”میں تم سے اس لئے دور بھاگتا ہوں کہ تم انسان نہیں ہو۔ ایک چڑیل ہو۔ بدروح سے بھی بدتر ایک خطرناک آسیب ہو۔ اب میں تمہاری چال میں اُٹنے والا نہیں ہوں۔“

بتالیا نے کہا۔ ”اگر میں کوئی چڑیل ہوں، کوئی آسیب ہوں تو پھر میں تمہیں اٹھا کر بھی لے جاسکتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”میرے ہاتھ میں شیش ناگن کی انگوٹھی ہے۔ میں جانتا ہوں تم مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتیں۔“

بتالیا ایک دم ظاہر ہو گئی۔ وہ مجھ سے دس پندرہ گز دور ستونوں کے درمیان کھڑی میری طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے عام عورتوں کی طرح شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ گلے میں ریشمی دوپٹہ تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایک نظر اُسے دیکھ کر مجھے یقین سا ہونے لگا کہ بتالیا کوئی چڑیل یا آسیب نہیں ہے بلکہ یہ بڑی ہی درد دل رکھنے والی اور اپنے خاوند کی محبت میں ڈوبی ہوئی عورت ہے اور جتنا یہ مجھ سے پیار کرتی ہے اتنا پیار شاید ہی کوئی مجھ سے کرتا ہوگا۔ لیکن فوراً مجھے خیال آ گیا کہ یہ سب دکھاوا ہے۔ یہ عورت کوئی بدروح یا چڑیل ہی نہیں بلکہ اس سے ایک ہزار گنا زیادہ خطرناک آسیب ہے جو کھڑے کھڑے زندہ انسانوں کا خون پی جاتی ہیں اور آدمی ایک سیکنڈ میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر گر پڑتا ہے۔ ٹھیک ہے یہ آسیبی لڑکی مجھے پسند کرتی ہے لیکن اس کی محبت میں بھی میری موت ہے۔

میں نے اُسے کہا۔ ”بتالیا! میرا پیچھا کرنا چھوڑ دو اور اپنی دنیا میں واپس چلی جاؤ کیونکہ میں کبھی تمہارے قابو میں نہیں آسکوں گا۔ شیش ناگن کی انگوٹھی اب ساری زندگی میرے ساتھ رہے گی۔“

بتالیا نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ ”میرے پیارے! کیا تم بھول گئے ہو کہ ہماری شادی ہو چکی ہے۔ میں تمہاری بیوی ہوں اور تم میرے خاوند ہو۔“

میں نے کہا۔ ”نہ تم میری بیوی ہو نہ میں تمہارا خاوند ہوں۔ میری شادی چڑیلوں اور بھوتوں نے کی تھی۔ میں اسے شادی نہیں مانتا۔ یہ شادی میری مرضی کے خلاف ہوئی ہے۔“

اچانک ایسا ہوا کہ جہاں بتالیا کھڑی تھی وہاں ایک شعلہ بھڑکا اور ایک ایسی چیخ بلند ہوئی جس سے محل کے در و دیوار لرز اٹھے۔ میرا دل خوف کے مارے ڈوبنے لگا۔

دوسرے لمحے جہاں نتالیا کھڑی تھی وہاں ایک ایسی عورت کھڑی تھی جس کی آنکھوں میں آگ کے شعلے لپک رہے تھے، چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ چہرے اور سارے جسم کا رنگ نیلا.... گہرا نیلا تھا۔ سر کے بال میں سینکڑوں سانپ رینگ رہے تھے، کلبلا رہے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی دوسرے ہاتھ میں نوکیلا ترشول تھا۔

یہ نتالیا کا اصل روپ تھا۔ یہ اس کا آسیب تھا۔ میں خوف سے کانپ رہا تھا۔ بھاگنا چاہتا تھا مگر بھاگ نہیں سکتا تھا۔ میرا سارا غیبی جسم پہاڑ کی طرح بھاری ہو گیا تھا۔ پتھر ہو گیا تھا۔ وہ ترشول کو میری طرف کر کے آگے بڑھی۔ شیش ناگن کے مہرے پر میرا یقین غائب ہو گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ مہرہ مجھے اُس آسیب، اُس چڑیل سے نہیں بچا سکے گا۔ میں خدا کے حضور گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگا۔ نتالیا کا آسیب مجھے غیبی حالت میں بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے ترشول کا رخ میرے چہرے کی طرف تھا۔ اس کے حلق سے ڈراؤنی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اُس نے دہشت ناک آواز میں کہا۔ ”فیروز! میں جانتی ہوں تمہیں میرے خلاف روہنی نے ورغلا دیا ہے۔ وہ میری دشمن ہے۔ میں تمہارے ساتھ اسے بھی نہیں چھوڑوں گی۔ اسے تو میں نے ایسی جگہ پہنچا دیا ہے جہاں سے وہ ہزاروں سال تک باہر نہیں نکل سکے گی۔ اب میں تم سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لوں گی۔ میں تمہیں اس طرح قتل کروں گی کہ سب سے پہلے تمہارا خون پی جاؤں گی۔ پھر تمہارے جسم کے ٹکڑے کر کے ایک ایک کر کے کھا جاؤں گی۔“

اس نے ایک دل ہلا دینے والی چیخ ماری اور زور سے ترشول میری طرف پھینکا۔ میں نے بے اختیار اپنے اللہ کو پکارا۔ اُس کے ساتھ ہی ترشول مجھ سے چار قدم کے فاصلے پر آکر غائب ہو گیا۔ آسیبی چڑیل نتالیا کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اُس نے دوڑ کر مجھ پر تلوار کا دار کرنا چاہا لیکن ایک جھٹکے کے ساتھ کسی نے اُسے اٹھا کر دور پٹخ دیا۔ نتالیا کے آسیب کے حلق سے بھیانک آواز بلند ہوئی اور وہ چیختی چلاتی غائب ہو

گئی۔ پھر جیسے دور سے اس کی آواز آئی۔ ”فیروز! یاد رکھ۔ میں تیرا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔ آج نہیں تو کل میں تیرا خون پی کر رہوں گی۔“ اور پھر تہہ خانے میں موت کی خاموشی چھا گئی۔

میں ابھی تک خوف سے لرز رہا تھا۔ آسیبی چڑیل کے غائب ہوتے ہی میرا جسم پھول کی طرح ہلکا ہو گیا۔ خدا نے مجھے اس بلا سے محفوظ کر لیا تھا۔ میں سجدے میں گر پڑا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اتنے میں تہہ خانے کے سامنے والی دیوار پر روشنی ہوئی اور دُرگا بدروح کا چہرہ نمودار ہوا۔ اُس نے آتے ہی مجھ سے کہا۔ ”مجھے یہاں کسی آسیب کی بو آرہی ہے۔ کیا نتالیا کا آسیب یہاں آیا تھا؟“

میں نے دُرگا کو سارا خوفناک واقعہ سنا دیا۔ وہ بولی۔ ”شیروان! شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی نے تمہیں بچا لیا ہے۔ اگر یہ انگوٹھی تمہاری انگلی میں نہ ہوتی تو آج تمہارا زندہ بچنا ناممکن تھا۔“

میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ انگوٹھی تو ایک بہانہ تھا۔ اصل میں تو مجھے خدا نے اُس منحوس بلا سے بچا لیا ہے۔ اب مجھے روہنی کی فکر لگ گئی تھی۔ نتالیا کے آسیب نے کہا تھا کہ اس نے روہنی کو اس جگہ پہنچا دیا ہے جہاں سے وہ ہزاروں سال تک بھی باہر نہ نکل سکے گی۔ میں نے یہ بات دُرگا کو بتائی اور اس سے پوچھا۔ ”دُرگا! آسیبی عورت نتالیا نے روہنی کو کہاں قید میں ڈالا ہوگا۔ میں اسے ہر حالت میں وہاں سے نکالنا چاہتا ہوں۔“

دُرگا کہنے لگی۔ ”نتالیا کے آسیب نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے بالکل صحیح بتایا ہے۔ اُس نے روہنی کو ہلاک تو نہیں کیا لیکن اُسے اپنے قبضے میں کر کے ایک ایسی جگہ پھینک دیا ہے جہاں انسان تو کیا کسی بدروح کا پہنچنا بھی مشکل ہے۔“

میں نے اُس سے پوچھا۔ ”مالینی نے تمہیں کیا بتایا ہے؟“

دُرگا بولی۔ ”مالینی نے بھی یہی بتایا ہے کہ نتالیا کے آسیب نے روہنی کو اپنے قبضے

غار کے اندر اندر بہتا ہوا یہ تیز رفتار دریا غار کے اندر بنے ہوئے ایک بہت بڑے اور ڈراؤنی شکل والے اژدھا کے بت کے لمبے دانتوں والے منہ کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں تمہیں ہمت سے کام لے کر دریا کی تیز رفتار موجوں کے ساتھ ہی اژدھا کے منہ میں داخل ہو جانا ہو گا۔ اژدھا کے منہ کے اندر دریا شور مچاتا، غراتا ایک تاریک غار میں سے گزر کر ایک جگہ نکل آتا ہے جہاں تمہیں چاروں طرف بڑا ڈراؤنا منظر نظر آئے گا مگر تمہیں ڈرنا نہیں ہو گا۔ اگر ڈر گئے تو تم وہیں پتھر کا بت بن جاؤ گے۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہاں روہنی کہاں ہو گی؟“

دُرگانے کہا۔ ”وہاں سیاہ کالی چٹانوں کے درمیان تمہیں ایک چٹان میں ایک دروازہ بنا ہوا نظر آئے گا۔ دروازے کی دونوں جانب دو اژدھے بیٹھے ہوں گے جن کے منہ سے شعلے نکل رہے ہوں گے۔ اگر تم ان اژدھوں کے منہ سے نکلنے والے شعلوں میں سے گزر کر دروازے کے اندر داخل ہو گئے تو وہاں تمہیں روہنی مل جائے گی۔ اس سے زیادہ میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی کیونکہ مجھے خود معلوم نہیں ہے کہ روہنی وہاں کس حال میں ہو گی اور وہاں کس قسم کی ڈراؤنی مخلوق آباد ہو گی۔“

میں نے کہا۔ ”دُرگا! اپنے خدا پر ایمان بڑا پختہ ہے اور اسے کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا۔ میں کسی بدروح یا اژدھا سے ڈروں گا بھی نہیں لیکن وہاں آگ کے شعلوں نے دروازے میں سے گزرنے والے راستے کو بند کر رکھا ہو گا اور آگ کا کام ہر شے کو جلا دینا ہے۔ ہو سکتا ہے میں بھی اس آگ میں جل جاؤں کیونکہ میں کوئی پیر اولیا نہیں ہوں بڑا گناہ گار انسان ہوں۔“

دُرگاہیہ سن کر بولی۔ ”میں جانتی تھی تم یہی جواب دو گے اس لئے میں نے اس کا ایک حل سوچ رکھا تھا۔ یہاں سے تم بنگور جاؤ گے۔ بنگور شہر کے باہر دریا کے کنارے ایک پہاڑی پر ایک بزرگ بخاری جی کا مزار ہے۔ یہ بڑے عبادت گزار،

پرہیز گار اور خلق خدا کی خدمت کرنے والے اور خلق خدا سے محبت کرنے والے بزرگ تھے۔ وہ دیکھی انسانوں کی مدد فرمایا کرتے تھے اور اُن کے نیک عمل کو دیکھ کر اس علاقے کے ہزاروں بت پرست کفر سے توبہ کر کے مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کے مزار شریف سے ہر وقت تلاوت کلام پاک کی آواز سنائی دیتی ہے۔ تم بخاری جی کے مزار پر جا کر اپنے طریقے سے خدا کی عبادت کرو گے۔ وہاں تمہیں ایک بزرگ ملیں گے جو تمہاری راہ نمائی فرمائیں گے۔ بس مجھے یہی کہنا تھا۔ صبح ہونے والی ہے تم یہاں سے اپنے سفر پر روانہ ہو جاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”کیا میں اسی طرح غائب رہ کر ہی سفر کروں گا؟“

دُرگانے کہا۔ ”بنگور میں بخاری جی کے مزار شریف تک تم اسی طرح غائب ہو کر سفر کرو گے۔ وہاں پہنچنے کے بعد تم اپنی انسانی شکل میں واپس آ جاؤ گے۔ بس اب جاؤ میرے جانے کا وقت بھی ہو گیا ہے۔“

اس کے فوراً بعد دُرگا غائب ہو گئی۔

میں تہہ خانے میں ستون کے پاس کھڑا دُرگا کی بتائی ہوئی ساری باتیں اپنے دل میں دہراتا رہا کہ مجھے کہاں جانا ہو گا اور کیا کرنا ہو گا۔ جب مجھے اس کی بتائی ہوئی ایک ایک بات پوری طرح سے ذہن نشین ہو گئی تو میں تہہ خانے کا زینہ چڑھ کر محل کے بڑے کمرے میں آ گیا۔ دیواروں کے شکستہ پرانے محرابی روشندانوں میں سے دن کی روشنی اندر آرہی تھی۔ میں محل کی چھت پر آ گیا۔ صبح کی گلابی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ دور دور تک بے پور شہر کے گلابی مکانوں کی دیواریں چمکتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

مجھے یہاں سے بھارت کے جنوب کی سمت سفر کرنا تھا۔ بنگور میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی غیبی طاقت ضرور پرواز میں میری مدد کرے گی اور میں اپنی سمت کو صحیح رکھ سکوں گا۔ میں نے طلوع ہوتے سورج کی طرف دیکھا۔ سورج مشرق سے طلوع ہو رہا تھا۔ مجھے جنوب کی طرف اڑنا تھا۔ میں نے اپنا

منہ جنوب کی طرف کر لیا اور پھر ایسا ہوا جیسے کسی نے مجھے دیران محل کی چھت پر سے اٹھا کر جنوب کی طرف اچھال دیا اور اس کے ساتھ ہی میں اپنے آپ ہوا میں پرواز کرنے لگا۔

میں زمین سے کافی بلندی پر چلا گیا اور پھر سیدھا ہو گیا۔ مجھے کوئی طاقت اس طرح اڑا رہی تھی کہ نہ میں اپنی مرضی سے اوپر جاسکتا تھا نہ اپنی مرضی سے نیچے آسکتا تھا۔ جس نپنی تلی رفتار سے اڑ رہا تھا میں اسی طرح اڑتا رہا جیسے کسی نے مجھے ایک خاص رفتار اور ایک خاص سمت کو پابند کر دیا تھا۔ اس سے مجھے اطمینان بھی تھا کہ میں اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا۔ کئی شہر، کئی جنگل، کئی دریا، کئی پہاڑی سلسلے میرے نیچے سے گزر گئے۔ اگر آپ انڈیا کا نقشہ دیکھیں تو آپ کو بنگلور کا شہر ملک کے جنوبی سرے پر بالکل وسط میں نظر آئے گا۔ اس کے مغرب کی جانب میسور کا شہر ہے اور مشرق کی طرف مدراس کا مشہور ساحلی شہر ہے۔ دلی سے آدمی ٹرین میں سفر کرے تو اسے بنگلور پہنچتے ہوئے کم از کم تین دن لگ جاتے ہیں۔ مگر میں ہوا میں پرواز کرتے ہوئے سفر کر رہا تھا اور میری رفتار اگرچہ زیادہ نہیں تھی لیکن ایک ہوائی جہاز کی رفتار سے کچھ زیادہ ضرور تھی چنانچہ میرا خیال ہے کہ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں بنگلور پہنچ گیا۔

آپ ضرور سوچیں گے کہ مجھے کس طرح معلوم ہوا کہ میں بنگلور شہر کے اوپر آ گیا ہوں۔ ایسا ہوا کہ جب میں نے نیچے ایک بہت وسیع اور گنجان آبادی والے شہر کو دیکھا تو اچانک میری رفتار اپنے آپ کم ہو گئی اور کسی نے مجھے نیچے کی طرف آہستہ سے دھکیل دیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی بنگلور شہر ہے۔

میں ایک پہاڑی کے دامن میں درختوں کے درمیان اترا۔ اترنے کے ساتھ ہی میں اپنی انسانی شکل و صورت میں ظاہر ہو گیا۔ ڈرگاہے جو جو کہا تھا عجیب ثابت ہو رہا تھا۔ میں درختوں میں سے نکل کر باہر آیا تو دیکھا کہ پہاڑی پر اوپر کو کشادہ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جن پر لوگ اوپر کو جا رہے تھے معلوم ہوا کہ بخاری جی کا مزار اوپر پہاڑی پر

ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ جو طاقت مجھے وہاں تک لائی تھی اس نے مجھے اس بزرگ کے مزار کے پاس ہی اتارا تھا۔

میں بھی دوسرے زائرین اور عقیدت مندوں کے ساتھ پہاڑی کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر دیکھا کہ ایک سفید چار دیواری کے اندر بہت بڑے چبوترے پر گنبد والا ایک مزار ہے جس کے اوپر سبز پرچم لہرا رہا ہے۔ مزار کے دروازے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ داخل ہوا تو مجھے کلام پاک کی تلاوت کی مقدس آواز سنائی دی۔ میں دل ہی دل میں کلمہ پاک کا ورد کرنے لگا۔ دیکھا کہ مزار کی ایک جانب چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی تھی۔ میں نے مزار پر جا کر فاتحہ پڑھی اور مسجد میں آگیا۔ وضو کیا اور مسجد کے صحن میں ایک طرف دو نفل شکرانے کے ادا کئے اور وہیں دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور کلام پاک کی جو آیات مجھے یاد تھیں وہ دل ہی دل میں پڑھنے لگا۔

مجھے مسجد میں ہی دوپہر ہو گئی۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ ایک صاحب میرے پاس آئے اور فرمایا۔ ”بھائی صاحب! چلے لنگر شروع ہو گیا ہے۔“

”میں نے لنگر پر جا کر کھانا کھایا اور واپس مسجد میں آگیا۔ میں نے باجماعت نماز ادا کی اور وہیں بیٹھا رہا۔ رات کو لنگر میں جا کر تھوڑا بہت کھانا کھایا اور وضو کر کے باجماعت عشاء کی نماز ادا کی اور مسجد کے صحن کے کونے میں ایک درخت کے سائے میں سر جھکائے بیٹھا خدا کے حضور اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے دعا مانگتا رہا۔ ایک مدت بعد نماز پڑھنے کے بعد میرے دل کو اتنا سکون حاصل ہوا تھا کہ اتنے سکون کا احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ آدھی رات تک میں مسجد کے صحن میں بیٹھا خدا کو یاد کرتا رہا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی کہ کسی نے پیچھے سے آکر میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ ایک نورانی شکل والے سبز لباس میں ملبوس

بزرگ تھے جنہوں نے بڑی پرسکون آواز میں کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“
میں ان کے ساتھ مسجد سے باہر آ گیا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر درختوں کے ایک
جھنڈ کی طرف چل پڑے۔ درختوں کے جھنڈ میں ایک چبوترے پر چھوٹی سی پرانی بارہ
دری بنی ہوئی تھی۔ وہ بزرگ بارہ دری میں بیٹھ گئے اور مجھے بھی اپنے پاس بٹھالیا۔

O

میں بڑے ادب سے اُن کے پاس بیٹھا تھا۔
میں خاموش تھا۔ بزرگ نے بڑی پرسکون اور دل میں اتر جانے والی آواز میں
فرمایا۔ ”تم نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی ہے اور آئندہ سے گناہ نہ کرنے کا دل سے
عہد کیا ہے۔ خداوند کریم نے تمہاری توبہ قبول فرمائی ہے اور تمہاری راہ نمائی کے
لئے ایک ذریعہ، ایک سبب پیدا کر دیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایک نیک مقصد کو لے
کر اس مہم پر جا رہے ہو۔ تم ایک ایسی بھنگی ہوئی روح کو کفر کے اندھیروں سے نکالنے
جا رہے ہو جس نے اپنی زندگی میں دل سے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اللہ کی ذات پاک
غفور الرحیم ہے۔ اُس نے اس عورت کے گناہ بھی معاف فرمادیئے ہیں۔“ اتنا فرما کر
وہ بزرگ خاموش ہو گئے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بزرگ نے میرے
آنسوؤں کو دیکھ کر فرمایا۔ ”ان آنسوؤں نے تمہارے گناہوں کے رہے سہے داغ
بھی دھو ڈالے ہیں۔ یاد رکھو! جو شخص اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہے وہ دنیا اور
آخرت دونوں میں سرخرو ہوتا ہے۔“

مجھ پر رقت کی کیفیت طاری تھی۔ میری زبان سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔
میں سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ بزرگ نے اپنے سبز کرتے کی جیب سے سبز رنگ
کے کپڑے میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا تعویذ نکال کر میرے دائیں بازو پر باندھ دیا اور
فرمایا۔ ”اس تعویذ پر اللہ پاک کا اسم پاک لکھا ہوا ہے۔ یہ تمہیں کافر بدروحوں کے
حملے سے محفوظ رکھے گا۔“

پھر اس بزرگ نے ایک طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ ”تم یہاں سے جنوب مشرق کی سمت جاؤ گے۔ وہاں تمہیں سیاہ چٹانوں کے درمیان بہتا وہ دریا ملے گا جس کے ساتھ ساتھ تمہیں سفر کرنا ہوگا۔ خدا تمہاری حفاظت فرمائے۔“

بزرگ آہستہ سے اٹھے اور مسجد کی طرف چل پڑے۔ میں بارہ دری میں بیٹھا انہیں جاتے دیکھنے لگا۔ جب رات کے اندھیرے نے انہیں میری نظروں سے اوجھل کر دیا تو میں نے اپنی خطرناک مہم کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اُس وقت رات تھی۔ مجھے دن کی روشنی میں اپنی مہم کا آغاز کرنا تھا۔ یہ بات مجھے پریشان کرنے لگی کہ میں اتنا دشوار گزار اور لمبا سفر اپنی عام جسمانی حالت میں کیسے طے کر سکوں گا اور پھر مجھے تو سیاہ چٹانوں کے درمیان بہنے والے دریا کا بھی پتہ نہیں تھا۔ میں یہ سوچ کر بارہ دری سے اٹھ کر مسجد کی طرف آگیا کہ اُن بزرگ سے مل کر اس سلسلے میں مدد کی درخواست کرتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔

میں نے مسجد کے اندر اور باہر اور مزار کے آس پاس ہر جگہ اُن بزرگ کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئے۔ میں مسجد کے باہر ایک درخت کے پاس پتھر کے چھوٹے سے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ دن نکلے ہی مجھے جنوب مشرق کی جانب اللہ کا نام لے کر چل پڑنا چاہئے آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے دن نکل آیا۔ میں نے مسجد کے غسل خانے میں غسل کیا۔ لنگر پر کھانا کھایا اور اللہ کا نام لے کر مزار شریف کی پہاڑی سے اتر کر جنوب مشرق کی سمت چل پڑا۔

میں پہاڑی علاقے میں سے گزر رہا تھا۔ زمین اونچی نیچی تھی۔ پہاڑی ٹیلے دور دور تھے۔ کہیں درختوں کے جھنڈ شروع ہو جاتے تھے اور کہیں خالی پتھریلی زمین آ جاتی تھی۔

مجھے یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ چل تو پڑا ہوں لیکن آگے جا کر بھوک پیاس لگی تو کیا

کروں گا کیونکہ مجھے دور دور تک پانی کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر سوچا کہ اس علاقے میں ناریل کے درخت عام ہوتے ہیں کہیں سے گرا پڑا ناریل توڑ کر اس کے پانی سے پیاس بجھالوں گا اور اس کی گری کھا کر بھوک مٹا لوں گا۔ گری کا لفظ میں نے خاص طور پر استعمال کیا ہے۔ پنجابی میں ہم ناریل کے گودے کو گری کہتے ہیں۔ گودے اور کھوپے کا لفظ مجھے پسند نہیں۔

میں ایسی جگہ پر چل رہا تھا جہاں زمین کی چڑھاکی تھی۔ میں آہستہ آہستہ جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میں جس مہم پر جا رہا ہوں اس میں قدم قدم پر میری جان کو خطرہ ہے۔ میں جس زمانے میں اپنے بمبئی والے دوست جمشید کے ساتھ جنگلوں میں شکار کھیلنے جایا کرتا تھا تو مجھے اپنے اندر ایک ایڈونچر، ایک خوشی محسوس ہوا کرتی تھی مگر یہ کوئی مرغابیوں اور جنگلی جانوروں کے شکار کی ایڈونچر نہ تھی۔ میں ایک ایسی عورت کو بدروحوں اور چڑیلوں سے بھی بڑھ کر خطرناک اور دہشت ناک آسب کی قید سے چھڑانے جا رہا تھا جو خود ایک بدروح تھی۔ یہ کام الف لیلٰی کی طلسمی دنیا کا کوئی ماتم طائی ہی کر سکتا تھا لیکن یہ مجھے کرنا پڑ گیا تھا۔ حاتم طائی تو ایک خیالی کردار تھا مگر میں بیسویں صدی میں رہنے والا ایک زندہ اور حقیقی دنیا کا آدمی تھا۔

میں طاقتور ہونے کے باوجود کمزور بھی تھا۔ اگر مجھے اپنے آپ پر بھروسہ اور بردست اعتماد تھا تو ساتھ ہی ساتھ یہ وسوسے بھی لگے ہوئے تھے کہ اگر کہیں ذرا سا کمزور پڑ گیا یا میرا اعتماد کمزور پڑ گیا تو میری موت یقینی ہے۔ میں آپ کے آگے مہوٹ نہیں بولوں گا۔ مجھے روہنی کو آسب لڑکی متالیا کے آسب سے بچانے کا اتنا خیال نہیں تھا جتنا خود کو اس آسب سے نجات دلانے کا خیال تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ممکن ہے میں دُرگاد روح سے ملنے کے بعد بے پور سے سیدھا کسی نہ کسی طرح بھاگ پاکستان آ جاتا۔ مصیبت یہ تھی کہ جس عذاب میں روہنی مبتلا تھی اس میں، میں بھی گردن تک پھنسا ہوا تھا۔ جب تک میں متالیا کے آسب اور پجاری رگھو سے اپنی جان

نہیں چھڑا لیتا میرے لئے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

پتھر لے میدان کی چڑھائی ختم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ دوسری جانب نشیب میں دور تک چھوٹے بڑے ٹیلے اور ساتھ ساتھ کھڑی اوپر کو اٹھی ہوئی نوک دار چٹانیں ہی چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہی وہ آبپبی وادی تھی جس کے بارے میں دُر گا بدروح نے مجھے بتایا تھا کہ ان چٹانوں اور ٹیلوں کے درمیان ایک طوفانی دریا بہتا ہے جس کے ساتھ ساتھ مجھے اس پہاڑی تک سفر کرنا ہو گا جس کے تاریک غار میں یہ دریا خوفناک گڑ گڑاہٹ کے ساتھ داخل ہو جاتا ہے۔ میں نشیب میں اترنے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد نشیب و فراز والی زمین کے جنگل کی جھاڑیاں سر کندھے اور اکاؤ کا درخت شروع ہو گئے۔ یہ درخت بڑے ٹیڑھے میڑھے، نیچے کو جھکے ہوئے تھے۔ کسی کسی درخت کی تنگی ٹہنیاں کسی انسانی پنجر کے ہاتھ کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔

ان درختوں کو دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔

میرے دل پر دہشت کا ہلکا سا احساس طاری ہونے لگا تھا۔ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ فیروز! اس طرح کام نہیں چلے گا۔ تمہیں ہمت اور پختہ عزم سے کام لینا ہو گا۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ اللہ کے پاک نام کا تعویذ تمہارے بازو پر بندھا ہوا ہے۔ اللہ کا پاک نام تمہاری حفاظت کرے گا۔ اٹھو اور اپنے دل کو چٹان کی طرح مضبوط بناؤ۔ اللہ تمہارا مددگار ہے۔

اس کے ساتھ ہی یقین کریں میں اپنے اندر اتنی طاقت محسوس کرنے لگا تھا کہ اگر میں کسی چٹان سے ٹکرا گیا تو چٹان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ ایک فرلانگ چلنے کے بعد ٹیلوں اور چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

پہلے پہاڑی ٹیلے آگئے۔ یہ بھورے رنگ کے بخر ٹیلے تھے اور چھوٹی چھوٹی خشک جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے۔ یہ بالکل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ ایک ٹیلے

متم ہوتا تھا تو دوسرا شروع ہو جاتا تھا۔ اُن کے درمیان تنگ راستے بنے ہوئے تھے جن میں اونچی نیچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ میں بڑی مشکل کے ساتھ ان راستوں میں سے گزر رہا تھا۔ ٹیلے ختم ہوئے تو آگے سیاہ فام ڈراؤنی چٹانیں شروع ہو گئیں۔ یہ چٹانیں اوپر جا کر نوکیلی ہو گئی تھیں۔ ان کی سیاہ دیواروں پر سبز رنگ چٹا ہوا تھا جس میں سے پانی رس رس کر نکل رہا تھا۔ ان چٹانوں کے درمیان بھی تنگ و تاریک گلیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ یہاں دن کی روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ بعض چٹانوں میں سے مھاڑیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور انہوں نے تنگ راستے پر سایہ ڈال کر اندھیرا کیا ہوا تھا۔

ان چٹانوں میں سے گزر کر میں ایک جگہ آیا تو مجھے شور سانسائی دینے لگا۔ جیسے آگے بڑھ رہا تھا شور کی آواز بڑھ رہی تھی۔ پھر یہ آواز اتنی بڑھ گئی کہ سوائے شور کے مجھے کچھ سانسائی نہیں دے رہا تھا۔ ذرا آگے گیا تو سامنے ذرا نیچے تنگ چٹانی دیواروں کے درمیان بڑے زور و شور کے ساتھ ایک دریا بہہ رہا تھا۔ موجوں کی رفتار بے حد تیز تھی اور وہ جھاگ اڑاتی، سر بخٹی چٹانوں سے ٹکرا کر ڈراؤنی آوازیں پیدا کرتی طوفانی رفتار کے ساتھ آگے کو جا رہی تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے چھ سات میل کے پاٹ میں پھیلے ہوئے کسی دریا کو تیس چالیس فٹ قطر کی سرنگ میں بند کر کے چٹانوں کے درمیان چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس طوفان خیز ڈراؤنے دریا کو دیکھتے ہی میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا اور چٹان کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

یہ سوچ کر ہی میرے دل میں ہول اٹھنے لگے تھے کہ مجھے اس دریا کے ساتھ ساتھ چلنا ہو گا اور پھر اس کے ساتھ کسی پہاڑی غار میں بھی داخل ہونا ہو گا۔ لیکن میں رُک نہیں سکتا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ فیروز! جتنا ڈرنا ہے یہاں بیٹھ کر ایک ہی بار ڈر لے کیونکہ تجھے ہر حالت میں اس دریا کے ساتھ سفر کرنا ہو گا۔ میں کچھ

نام لے کر ایک چٹان کے قریب سے باہر نکلی ہوئی جھاڑیوں کو پکڑ کر نیچے اتر گیا۔ دریا کی موجیں مجھ سے تین چار فٹ نیچے چٹانوں کے درمیان سے شاید ایک سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے کو جا رہی تھیں۔

میں دریا کے ساتھ چٹانی پتھروں کے درمیان راستہ بناتا چلنے لگا۔ دریا کو دیکھ کر ہی خدا کی قدرت یاد آ جاتی تھی۔ میں نے اپنے دل اور اعصاب کو مضبوط کر لیا تھا اور اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے ساتھ دریا نہیں بلکہ کوئی تیز رفتار نہر بہہ رہی ہے۔ دریا آگے جا کر چٹانوں کی دیواروں کے ساتھ ہی ایک طرف کو مڑ گیا۔ میں بھی اس طرف مڑ گیا۔ اس طرح دو تین موڑ مڑنے کے بعد سامنے ایک بہت بڑا پہاڑ آ گیا۔ دریا اس پہاڑ کی دیوار میں اندر چلا گیا تھا۔

میں نے آگے جا کر دیکھا۔ یہ ایک غار تھا۔ بہت بڑا غار۔ تاریک اندھیرا غار جس میں طوفانی دریا ایک بہت ناک گڑ گڑاہٹ کے ساتھ داخل ہو رہا تھا۔ میں وہیں رک گیا۔ میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا پہاڑ کی ڈھلان کی جھاڑیوں کے سہارے غار کے دہانے کے پاس آ گیا اور جھک کر اندر دیکھا۔ غار کے اندر سوائے اندھیرے کے مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ یہ خالی اندھیرا ہی نہیں تھا اس اندھیرے میں دریا کے گرنے کی ڈراؤنی آواز بھی تھی جو ایسی تھی جیسے کسی گہرے کنوئیں میں گر رہا ہو۔ لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ دریا جس غار میں داخل ہوتا ہے وہاں کوئی کنواں نہیں ہے۔ وہ پہاڑ کا ایک قدرتی غار ہے اور اس کے اندر دریا کے کناروں پر چلنے کے لئے پگڈنڈی بھی ہے۔

مجھے دریا کے کنارے اندھیرے میں کوئی پگڈنڈی نظر نہیں آرہی تھی لیکن مجھے اس پگڈنڈی کو تلاش کرنا تھا۔ میں بھیگی ہوئی جنگلی جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر غار کے دہانے کی طرف بڑھا۔ اگر میں غائب ہوتا تو میں اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا اور پہاڑ کے اوپر سے اڑ کر بھی جاسکتا تھا۔ لیکن میں غیبی حالت میں نہیں تھا زندہ انسانی حالت میں تھا اور مجھے اندھیرے میں کوشش کر کے راستہ تلاش کرنا تھا۔

آخر اندھیرے میں مجھے غار کی دیوار کے ساتھ دریا کی تیز رفتاری سے آگے کو جاتی موجوں سے تین فٹ کی بلندی پر ایک پگڈنڈی نظر آ گئی۔ ایسے لگتا تھا کہ جیسے یہ خاص طور پر پیدل چلنے والوں کے لئے بنائی گئی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر اس پتھریلی پگڈنڈی پر چل پڑا۔ میں ایک ایک قدم کر کے چل رہا تھا۔ غار کی دیوار اور چھت کم از کم چار پانچ ہاتھ اونچی تھی۔ مگر غار میں اندھیرا بہت تھا اور دریا کا بہت ناک شور گونج پیدا کر رہا تھا۔ میں غار کے اندھیرے میں اندھیرا ہی بن گیا تھا۔ دیوار اور پگڈنڈی کو ٹٹول ٹٹول کر چل رہا تھا۔

غار بھی دریا کو ساتھ لے کر ایک طرف کو مڑ گیا۔ کچھ دور سیدھا چلنے کے بعد پھر دوسری طرف گھوم گیا۔ تیسری بار دریا موڑ کاٹ کر سیدھا ہوا تو مجھے پہلی بار غار میں دور روشنی کا ایک نقطہ سادکھائی دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہاں غار ختم ہو گیا ہے اور دریا پہاڑ کے اندر سے باہر نکل جاتا ہے۔ میرا قیاس غلط نہیں تھا۔ روشنی کا نقطہ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا پھیلتا جا رہا تھا۔ اب غار کے اندر باہر کی روشنی آنے لگی تھی۔ یہ روشنی بڑی دھندلی اور پھیکی پھیکی تھی جیسے آسمان کو گہرے بادلوں نے ڈھانپ رکھا ہو۔ میں قدم قدم آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ غار کے دوسرے دہانے پر پہنچ گیا۔ یہاں سے دریا غار میں سے باہر نکل گیا تھا۔ میں غار میں سے باہر آ کر دیکھا کہ سامنے ایک جنگل تھا۔ دریا دائیں جانب مڑ گیا تھا۔ آسمان سیاہ بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ روشنی بڑی مدھم اور پراسرار تھی۔

میرے سامنے بائیں جانب جنگل کے درخت شروع ہو جاتے تھے۔ مجھے اسی جنگل میں سے گزرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ میں جنگل میں داخل ہو گیا۔ میں نے اپنی شکاری زندگی میں برصغیر کے کئی جنگل دیکھے تھے مگر ایسا جنگل میں نے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ اس جنگل میں درختوں کی گھنی شاخوں نے ایسی چھت ڈال رکھی تھی کہ درختوں کے نیچے ایسا اندھیرا چھایا ہوا تھا کہ لگتا تھا جنگل میں رات پڑ گئی ہے۔ مگر میں

پہاڑی غار کے اندھے اندھیرے میں سے گزر کر آ رہا تھا۔ میں جنگل کے اس اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا۔ کوئی درخت ایسا نہیں تھا جس کے تنے پر کانٹے دار بلیں اوپر تک نہ چڑھی ہوئی ہوں۔ دوسری حیران کر دینے والی بات یہ تھی کہ جنگل میں قبرستان ایسا بنا چھایا ہوا تھا۔ کسی پرندے کی آواز تک نہیں آرہی تھی۔ درختوں کے نیچے گیلی اور نرم زمین پر گلے سڑے پتوں کا فرش بچھا ہوا تھا جس میں سے ناگوار قسم کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔

اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں بدروحوں اور آسیبوں کی دنیا میں داخل ہو چکا ہوں۔

یہ خیال ہی بڑا وحشت خیز تھا مگر مجھے یقین کرنا ہی پڑ رہا تھا کہ میں بدروحوں اور آسیبوں کی دنیا میں آ گیا ہوں اور اب مجھے ہر مشکل کا مقابلہ اپنی ایمانی طاقت اور اللہ کی مدد کے بھروسے پر کرنا ہے۔ میں نے پانچ مرتبہ لا حول ولاقوة الا باللہ پڑھ کر اپنے اوپر پھونکا اور جنگل میں آگے بڑھا۔ اس وقت مجھے اپنے آپ پر حاتم طائی سے بھی بڑھ کر کسی ایسے سپر مین کا گمان ہونے لگا تھا جس کے اندر قدرت نے شیطانی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے زبردست غیبی طاقت بھر دی ہو۔

جنگل آگے جا کر زیادہ گھنا اور زیادہ تاریک ہوتا گیا۔ پھر اس کا اندھیرا چھٹنے لگا اور پھینکی پھینکی زرد اور بیمار سی روشنی ہو گئی۔ یہ روشنی نہیں لگتی تھی بلکہ روشنی کا سایہ لگتا تھا۔ درختوں کے درمیان ایک جگہ باہر جانے کا راستہ سا بنا ہوا تھا میں وہاں سے باہر نکل آیا۔ اب میرے سامنے پھر وہی سیاہ فام ڈراؤنی چٹانیں تھیں۔ یہ چٹانیں ایک دوسری سے فاصلے فاصلے پر تھیں اور زمین سے نکل کر بالکل سیدھی اوپر کو چلی گئی تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی قیامت خیز زلزلے کے بعد زمین میں سے بہت بڑے بڑے اژدھا نکل کر اوپر کو اٹھے ہیں اور وہیں پتھر ہو گئے ہیں۔

مجھے دُرگانے بتایا تھا کہ جب تم دریا کے غار سے باہر نکلو گے تو سیاہ چٹانوں میں

تمہیں ایک ایک جگہ پرانے مندر کا شکستہ دروازہ ملے گا جس کی دونوں جانب اژدھا پہرہ دے رہے ہوں گے۔ روہنی تمہیں اس دروازے میں داخل ہونے کے بعد کسی جگہ ملے گی۔ اب مجھے اس شکستہ مندر کے دروازے کی تلاش تھی۔ میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا تا ڈراؤنی چٹانوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ اچانک مجھے ایک ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی مگر مجھ سانس لے رہا ہو۔ میں وہیں رک گیا اور جس طرف سے آواز آرہی تھی اس طرف دیکھنے لگا اس طرف چٹانوں نے ایک سیاہ دیوار کھڑی کر رکھی تھی۔ میں آگے بڑھا۔

سانس لینے کی آواز اب قریب سے سنائی دے رہی تھی۔

میں آہستہ آہستہ چل کر ایک چٹان کی دیوار کے پاس آ کر رُک گیا۔ کان لگا کر سنا۔ سانس لینے کی آواز چٹان کے پیچھے سے آرہی تھی۔ میں نے چٹان کی اوٹ میں سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر ایک پرانی طرز کے مندر کا شکستہ اونچا دروازہ نظر آیا جس کا منہ ایک بہت بڑے اژدھا کا تھا جس کے نوکیلے دانت باہر کو نکلے ہوئے تھے اور دروازے کی دونوں جانب دوزندہ اژدھے گردنیں جھکا کر بیٹھے لمبے لمبے سانس لے رہے تھے جیسے ہانپ رہے ہوں۔ میں غور سے اس خوفناک دروازے کو دیکھنے لگا۔

مجھے یاد آ گیا۔ دُرگانے کہا تھا کہ جہاں دریا چٹانوں میں سے نکل کر پہاڑ کے غار میں گرتا ہے وہاں غار پر ایک اژدھا کا منہ بنا ہوا ہو گا جس کے نوکیلے دانت باہر کو نکلے ہوئے ہوں گے۔ شاید وہ بھول گئی تھی کیونکہ اژدھا کا منہ پہاڑی غار کے دہانے پر نہیں بنا ہوا تھا بلکہ وہ آسیبی مندر کے دروازے پر بنا ہوا تھا۔ مجھے اس دروازے میں داخل ہونا تھا جہاں اوپر تک اژدھا کا بہت بڑا بہت منہ پھاڑے ہوئے تھا اور جس کی دونوں جانب دوزندہ اژدھے پہرہ دے رہے تھے۔ یہ موت کے منہ میں جانے والی بات تھی مگر مجھے اس کے اندر ہر حالت میں جانا ہی تھا۔ کچھ دیر میں چٹان کی اوٹ میں

کھڑا موت کے دروازے کی طرف ٹٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر کلمہ پاک پڑھا۔ دل میں لا حول ولاقوة پانچ بار پڑھا اور اللہ کا نام لے کر چٹان کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔

میں نے مندر کے خوفناک دروازے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میرے قدم سست پڑ گئے۔ دل میں اژدھوں کا خوف چھا گیا لیکن میں نے اپنے دل کو مضبوط کیا اور اپنے آپ سے کہا۔ آگے بڑھو یہ اژدھے تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ میں نے نئے عزم کے ساتھ قدم آگے بڑھائے۔ جیسے ہی میں آسبی دروازے کے مزید قریب ہوا دونوں اژدھوں نے اپنے سر اوپر اٹھائے اور زبردست پھنکار کے ساتھ مجھے اپنی سرخ آنکھوں سے دیکھنے لگے مگر میں نہ رکا۔ میرے قدم ایک بار پھر ضرور وزنی ہو گئے تھے لیکن میں رکا نہیں چلتا چلا گیا۔ میں اژدھوں کے درمیان سے گزرا تو اژدھوں کے منہ سے پھنکار کے ساتھ آگ کے شعلے نکل کر مجھ پر گرے۔

میرے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔

لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آگ کے ان شعلوں سے میرے سر کا ایک بال تک نہیں جلا تھا۔ میرا حوصلہ بلند ہو گیا۔ مجھے پہلے سے زیادہ یقین ہو گیا کہ میرے بازو پر اللہ پاک کا نام لکھا ہوا ہے۔ کوئی بدروح، کوئی اژدھا مجھے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ اب میں بے دھڑک ہو کر چل رہا تھا۔ دروازے میں سے گزرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ دونوں جانب سوکھی سیاہ ٹہنیوں والے درخت ہی درخت کھڑے ہیں۔ ان درختوں کے درمیان ایک دلدلی میدان سا ہے۔ دلدل اوپر نیچے ہو رہی ہے اور اس میں کہیں کہیں سے زرد گیس نکل رہی ہے۔ دلدل کے درمیان ایک تنگ راستہ بنا ہوا تھا جس پر چوکر پتھر پڑے ہوئے تھے۔ میں ان پتھروں پر پاؤں رکھ کر آگے چل پڑا۔ عجیب بات تھی یہ پتھر بھی اوپر نیچے ہو رہے تھے جیسے دلدل کے اوپر رکھ کر وہاں راستہ بنایا گیا ہو۔ میں بہت آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ ہر قدم پر ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں دلدل میں نہ

گر پڑوں۔ میری دونوں جانب کالی سیاہ دلدل تھی جو ایسے اوپر نیچے ہو رہی تھی جیسے کوئی عفریت سانس لے رہا ہو۔

ایک دم سے میری دائیں جانب دلدل میں سے ایک انسان کا آدھا دھڑ باہر نکلا۔ اس کا چہرہ اور آدھا جسم دلدل میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے ایک اذیت ناک چیخ کے ساتھ پکار کر کہا۔ ”مجھے یہاں سے باہر نکالو۔“

اور دوسرے لمحے دلدل نے اسے اندر کھینچ لیا اور وہ دلدل میں غائب ہو گیا۔ میں نے قدم آگے اٹھایا تو میری بائیں جانب اسی طرح ایک انسان کا آدھا دھڑ دلدل سے اچانک باہر نکل آیا۔ یہ کسی عورت کا دھڑ تھا۔ اس کے بال اور چہرہ سیاہ دلدل میں لتھڑا ہوا تھا۔ وہ پورا منہ کھول کر سانس لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے حلق سے بھی ایک اذیت ناک چیخ بلند ہوئی اور اس نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ”مجھے باہر نکال لو۔“

اور اسی لمحے دلدل نے اسے نگل لیا اور عورت کا آدھا دھڑ دلدل میں ڈوب گیا۔ یہ عبرت انگیز منظر دیکھ کر مجھ پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا تھا۔ خدا جانے ان لوگوں سے زندگی میں کون سے گناہ سرزد ہو گئے تھے جن کی سزا ان کی روحیں یہاں بھگت رہی تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر خدا سے اپنے گناہوں کی بخشش کی دعا مانگی اور ایک بار پھر عہد کیا کہ میں آئندہ کبھی کوئی گناہ نہیں کروں گا اور اپنی زندگی اللہ اور اس کے رسول پاک کے دکھائے ہوئے نیکی کے راستے پر چل کر بسر کروں گا۔ میں دلدلی میدان سے گزر گیا۔

اب میرے سامنے ایک دیو قامت سیاہ پہاڑی تھی۔ اس پہاڑی میں ایک غار تھا جس کے دہانے پر ایک انسانی پنجر اس طرح تلوار ہاتھ میں لئے کھڑا تھا جیسے پہرہ دے رہا ہو۔ میرے کان میں جیسے کسی نے سرگوشی کی کہ روہنی تمہیں اس غار میں ملے گی۔ میں غار کے منہ کے پاس آیا تو انسانی پنجر میں حرکت پیدا ہوئی۔ یہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا

اس کی کھوپڑی نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گڑھوں میں مجھے انگارے دکھتے ہوئے دکھائی دیئے۔ یہ بھی آسپی خرافات میں سے کوئی شے تھی۔ جیسے ہی میں غار میں داخل ہونے لگا ہڈیوں کے پنجر کے بازو میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے پوری طاقت سے میرے بازو پر تلوار کا وار کیا۔ میرا یہ وہی بازو تھا جس پر اللہ کے پاک نام کا تعویذ بنا ہوا تھا۔ پنجر کا وار اس قدر بھرپور تھا کہ مجھے یقین تھا کہ میرا بازو کٹ کر گر پڑے گا لیکن اس کی بجائے تلوار میرے بازو سے ٹکراتے ہی ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو گئی اور ہڈیوں کا پنجر ایک چیخ کے ساتھ غائب ہو گیا۔

میں غار میں داخل ہو گیا۔

اس غار میں بھی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں غار کی دیوار کے ساتھ لگا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد میرے کانوں میں ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے دور کچھ عورتیں اور آدمی کسی میت کے پاس بیٹھے رو رہے ہوں۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ غار میں وہی پھسکی پھسکی روشنی سی ہونے لگی۔ غار ایک بہت بڑے دالان میں جا کر ختم ہو گیا۔ دالان میں جگہ جگہ فرش پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ کونے میں دیوار کے ساتھ آہنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ایک انسانی لاش لٹک رہی تھی۔ میں لاش کے قریب گیا تو دیکھا کہ یہ کسی مرد کی لاش تھی۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ اچانک لاش کے جسم نے حرکت کی اور اس نے اپنی گردن میں سے زنجیر اتار کر پوری قوت سے گھما کر میری طرف پھینکی۔ زنجیر میرے جسم سے ایک دھماکے کے ساتھ ٹکرائی اور میرے جسم کے ساتھ سانپ کی طرح لپٹ گئی۔

مجھے نہ کوئی چوٹ لگی اور نہ ہی درد محسوس ہوا لیکن زنجیر نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ زنجیر کا ایک سر لاش کے ہاتھوں میں تھا۔ اُس نے مجھے اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ لاش کی طرف نہ جاؤں اور کسی جگہ رُک جاؤں لیکن میرے

قدم اکھڑ رہے تھے اور کوئی طلسمی طاقت مجھے لاش کی طرف لئے جا رہی تھی۔ لاش نے زور سے زنجیر کو جھکادیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے زنجیر کو پکڑا اور جھکادے کر زنجیر اُس کے ہاتھوں سے چھڑانی چاہی۔ میرے جھٹکنے میں ایک ایسی قوت آگئی تھی کہ لاش کے ہاتھوں سے زنجیر چھوٹ گئی اور اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے لاش ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر فرش پر بکھر گئی۔ اس کے ساتھ ہی میرے جسم کے ساتھ لپٹی ہوئی زنجیر غائب ہو گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور دالان کا جائزہ لیا۔ مجھے یقین تھا کہ روہنی یہیں کہیں ہو گی۔ دالان کے کونے میں ایک چھوٹی کھڑکی پر نظر پڑی جو بند تھی۔ میں کھڑکی کے پاس آگیا۔ کھڑکی پر خون کا بہت بڑا دھبہ پڑا تھا۔ کھڑکی کے پیچھے سے ایک کمزور سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ کس کی آواز ہے۔ میں نے کھڑکی کے قریب ہو کر آواز کو غور سے سنا۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ وہ ڈراؤنے لہجے میں کسی کو کہہ رہی تھی۔

”تو رگھو کے طلسم سے زندہ بچ کر نکل آئی تھی لیکن میرا طلسم تیری روح کے اندر جذب ہو گیا ہے۔ یہ تیرے جسم کو آہستہ آہستہ دکھتا ہوا انگارہ بنا دے گا۔“

میں نے اس آواز کو پہچان لیا۔ یہ آسپی لڑکی نتالیا کی آواز تھی بلکہ اس کے آسیب کی آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں سمجھ گیا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔ وہ جس سے مخاطب تھی وہ سوائے روہنی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں کھڑکی کے ساتھ کان لگائے سن رہا تھا۔

نتالیا کے آسیب نے روہنی کا نام لے کر کہا۔ ”تو نے اسلام قبول کر کے ہمارے دیوتاؤں کے بتوں کو پاش پاش کر دیا تھا۔ دیوتا تم سے اس کا بھی بدلہ لیں گے۔“

پھر مجھے روہنی کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز جیسے کسی کنوئیں میں سے آرہی تھی۔ روہنی نے کہا۔ ”میں خوش قسمت ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں ہی بت پرستی سے توبہ کر کے اسلام کی روشنی سے اپنا سینہ منور کر لیا۔ میں جس عذاب میں مبتلا ہوں یہ

میرے اپنے ایک گناہ کی سزا مجھے مل رہی ہے جس کی مدت اللہ کی رحمت کے صدقے بہتے تھوڑی رہ گئی ہے۔ پھر میری روح تمام آلائشوں سے پاک ہو جائے گی اور میں نیک روحوں کی دنیا کی طرف اپنا سفر شروع کر دوں گی۔“

نتالیا کے آسیب نے غضب ناک آواز میں کہا۔ ”میں دیکھتی ہوں تمہیں یہاں سے کون بچاتا ہے۔ اب تو اس کنوئیں میں جل کر راکھ ہو جائے گی۔“

پھر ایسا ہوا کہ کسی غیبی طاقت نے میرے ہاتھ کو بند کھڑکی پر رکھ کر آہستہ سے دبایا۔ کھڑکی کھل گئی۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹنے لگا تو میرا جسم پیچھے ہٹنے کی بجائے اپنے آپ کھڑکی کی طرف بڑھا اور مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میں کیسے کھڑکی میں سے گزر گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میں ایک نیم روشن بہت بڑے غار میں ہوں جس کی چھت سے جالے لٹک رہے ہیں اور ایک انسانی سایہ غار کے وسط میں ایک گول چبوترے کے پاس کھڑا نیچے دیکھ رہا ہے۔

O

اب مجھ پر ایک اور حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ کھڑکی میں سے اندر داخل ہوتے ہی میرا مادی جسم غائب ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی طاقت میری مدد کر رہی ہے۔ اب مجھے یہ ڈر تھا کہ اگرچہ میں غائب ہوں لیکن نتالیا کا آسیب مجھے اس حالت میں بھی ضرور دیکھ لے گا۔ میں نے اس غیبی حالت میں ہی ایک کونے کی طرف جا کر چھپنے کی کوشش کی لیکن میرے قدم کونے کی طرف جانے کی بجائے چبوترے کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ میں اپنے آپ چبوترے کے پاس آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ جس کو میں چبوترہ سمجھ رہا تھا وہ ایک کنوئیں کی گول منڈیر ہے اور اس کے پاس نتالیا کھڑی نیچے دیکھ رہی ہے۔ نتالیا انسانی شکل میں ہی تھی مگر اس کے چہرے پر وحشت کے آثار تھے۔ اس کی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ میں اس سے تین قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا لیکن وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ اسے میری موجودگی کا احساس نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے ڈر کے مارے کوئی حرکت نہ کی اور اپنی جگہ پر ساکت ہو کر کھڑا رہا۔

نتالیا کا آسیب ہلکی باندھے گردن نیچی کئے کنوئیں میں دیکھ رہا تھا۔ اُس نے غصیلی آواز میں کہا۔ ”روہنی! تو میری طاقت کو نہیں جانتی۔ میں نے تمہارے جسم میں جو آسیبی طلسم داخل کیا ہے وہ تیرا قاتل ہے تیری موت ہے۔ ایک ایسی موت جو تجھے مرنے کے بعد بھی مارتی رہے گی۔“

نتالیا کے آسیب نے ایک ایسا بھیانک قہقہہ لگایا کہ غار کی دیواریں لرز گئیں میں

خود غیبی حالت میں اپنی جگہ پر ہل گیا مگر اپنی جگہ پر ثابت قدمی سے کھڑا رہا کیونکہ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ نتالیا کا آسیب مجھے دیکھ نہیں رہا۔ نتالیا نے دونوں بازو پھیلا کر خدا جانے کون سی چیزوں کی زبان میں کوئی منتر پڑھ کر کنوئیں میں پھینکا اور کہا۔ ”یہ آگ ہے جو میں نے تیرے اوپر پھینکی ہے۔“

نتالیا کے آسیب نے ایک اور بھیانک قہقہہ لگایا اور پیچھے ہٹ گئی۔ پھر اس نے چاروں طرف اپنی انگارہ ایسی آنکھوں سے دیکھا۔ میں اس کے بالکل پاس کھڑا تھا مگر وہ مجھے نہ دیکھ سکی اور چیخ مار کر غائب ہو گئی۔ اس کے غائب ہونے کے بعد ایک منٹ تک میں اپنی جگہ پر بت بنا کھڑا رہا۔ میں تسلی کر لینا چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے دفع ہو چکی ہے۔ ایک منٹ توقف کے بعد میں تیزی سے کنوئیں کی منڈیر پر آگیا اور نیچے جھانک کر کہا۔ ”روہنی! گھبراؤ نہیں۔ میں تیری مدد کے لئے آگیا ہوں۔“

میری آواز نے جیسے روہنی کی مردہ روح میں زندگی کی بھرپور طاقت بھردی تھی۔ اُس نے فوراً اپنی نارمل آواز میں کہا۔ ”شیروان! شیروان! میں جانتی تھی کہ تم ضرور میری مدد کو آؤ گے لیکن تم مجھے دکھائی نہیں دے رہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں غائب ہوں۔“

روہنی نے کہا۔ ”خدا کے لئے کچھ دیر کے لئے کسی جگہ چھپ جاؤ۔ نتالیا کا آسیب ابھی یہیں ہو گا۔“

میں نے کہا۔ ”وہ دفع ہو گیا ہے۔ میں نے خود اسے غائب ہوتے دیکھا ہے۔“

”کیا اس نے تمہیں نہیں دیکھا تھا؟“ روہنی نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ ”نہیں۔ میں اسے نظر نہیں آیا تھا۔“

روہنی نے پوچھا۔ ”تم غائب کیسے ہو گئے؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے خود معلوم نہیں۔ میں کھڑکی میں سے جیسے ہی اندر آیا غائب ہو گیا۔“

روہنی نے آہ بھر کر کہا۔ ”شیروان! خدا ہماری مدد فرما رہا ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ نتالیا کا آسیب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”روہنی! تم کنوئیں سے کیسے باہر آؤ گی؟“ میں نے پوچھا۔

روہنی کی آواز آئی۔ ”میری بات غور سے سنو شیروان! کنوئیں کی منڈیر کے

قریب دیوار کے پاس مٹی کا ایک ٹکڑا پڑا ہے۔ اس کے اندر ایک کھوپڑی ہے اس

کھوپڑی کو مٹکے سے باہر نکالو اور اس پر پانچ بار اللہ کا پاک نام پڑھ کر پھونکو۔ پھر سب

ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں نے ایسا ہی کیا۔ ”کنوئیں کی منڈیر کے پیچھے دیوار کی طرف گیا۔ وہاں ایک

ٹکڑا پڑا تھا۔ مٹکے کے ساتھ مٹریوں کے جالے چسپے ہوئے تھے۔ میں نے جالوں کو

ہٹانے کے بعد مٹکے کے ڈھکن کو اٹھا کر اندر ہاتھ ڈال کر ایک کھوپڑی باہر نکال لی۔ یہ

ایک انسانی کھوپڑی تھی۔ میں نے پانچ بار اللہ کا پاک نام دل میں پڑھ کر کھوپڑی پر

پھونک ماری۔ کھوپڑی کے اوپر چھت پر سے آتی ہوئی روشنی کی ایک چمکدار کرن پڑی

اور کھوپڑی اچھل کر کنوئیں میں گر پڑی۔ میں دوڑ کر کنوئیں کی منڈیر پر آگیا۔

میں نے دیکھا کہ کنوئیں میں روشنی ہی روشنی ہو گئی ہے اور اس روشنی میں روہنی

اپنے آپ اوپر کو آ رہی ہے۔ روہنی کے دونوں ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے تھے اور اُس

کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کنوئیں میں سے نکل کر باہر آگئی۔ کنوئیں کی روشنی غائب ہو گئی۔

روہنی نے اُس طرف دیکھا جہاں میں کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے غیبی حالت میں بھی دیکھ

لیا تھا۔ اُس نے اپنا بازو پھیلا کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بڑی رقت بھری

آواز میں بولی۔ ”شیروان! اللہ نے مجھ گناہ گار کا گناہ معاف کر دیا ہے۔ میں اس کی

رحمت کے سائے میں ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں جو گناہ کیا تھا اب اللہ پاک کی

رحمت سے میری روح اس سے پاک ہو گئی ہے۔ میں اب بدروح نہیں ہوں بلکہ ایک

پاک روح ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”روہنی! تم خوش قسمت ہو کہ تمہاری بخشش ہو گئی ہے۔“
 روہنی کہنے لگی۔ ”اب میرے دل میں سوائے اللہ کے اور کسی کا خوف نہیں ہے۔ چلو یہاں سے نکل چلتے ہیں۔“
 میں نے کہا۔ ”مجھے ڈر ہے تنہا لیا کا آسیب تمہیں دیکھ نہ لے۔ اس لئے تم بھی غائب ہو جاؤ۔“

روہنی بولی۔ ”اب وہ مجھے میری جسمانی صورت میں بھی نہیں دیکھ سکے گی۔ میرے ساتھ آؤ۔“

میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ”روہنی مجھے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ اگر تم غائب ہو سکتی ہو تو کم از کم اس جہنمی دنیا سے نکلنے کے لئے ضرور غائب ہو جاؤ۔“
 روہنی نے کہا۔ ”اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں غائب ہو جاتی ہوں۔“

اور دوسرے ہی لمحے روہنی بھی غائب ہو گئی۔ اب ہم دونوں غائب تھے لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ روہنی نے کہا۔ ”میں تمہارے اندر ایمان کی وہ طاقت دیکھ رہی ہوں جس کی مجھے ساری زندگی حسرت رہی کہ کاش میرے ایمان کو بھی ایسی طاقت نصیب ہو جاتی۔“

میں نے کہا۔ ”یہ سب اللہ کا کرم ہے روہنی۔“
 روہنی نے فوراً میری بات کاٹ کر کہا۔ ”شیروان! آئندہ سے مجھے روہنی کے نام سے نہ بلانا۔ اب مجھے ہمیشہ میرا مسلمان نام سلطانہ کہہ کر بلانا۔“

میں نے کہا۔ ”میں آج سے روہنی کے نام کو بھی بھول جاتا ہوں۔ اب تم سلطانہ ہو اور میں شیروان ہوں تمہارے مرحوم شہزادے کا ہم شکل۔“

”ہاں۔“ روہنی نے کہا۔ ”میرا سینہ روشن ہو گیا ہے۔ مجھ پر یہ راز بھی کھل گیا ہے کہ کسی مسلمان مومن کا مرنے کے بعد کوئی دوسرا جہنم نہیں ہوتا بلکہ روح کو اس کے اعمال کے مطابق درجہ عطا ہوتا ہے۔ تم میرے شہزادے کا دوسرا جہنم نہیں ہو

بلکہ محض اتفاق سے تمہاری شکل میرے مرحوم شہزادے سے ملتی ہے۔“
 میں نے روہنی سے کہا۔ (آپ کو میں اپنی داستان بیان کر رہا ہوں اس لئے آپ کے آگے میں سلطانہ کا نام روہنی ہی لوں گا تاکہ آپ فوراً سمجھ جائیں کہ میں اس عورت کی بات کر رہا ہوں جس کی روح یا بدروح کو میں نے روہت گڑھ والے قلعے کے مرجان سے آزاد کر دیا تھا)۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”سلطانہ! اب تم پاک روح بن چکی ہو۔ تم اپنے مرحوم خاندن سے اس قدر پیار کرتی ہو پھر تم اپنے خاندن کی روح سے جا کر کیوں نہیں مل جاتیں؟“

روہنی نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ ”میرا خاندن ایک نیک انسان تھا۔ وہ مسلمان پیدا ہوا تھا اور پیدا ہونے کے فوراً بعد اُس کے کان میں اذان دی گئی تھی۔ اس کی روح جنت کے جس مقام، جس درجے میں ہے وہاں تک ابھی میری رسائی نہیں ہے۔ جب میری روح کار ہا سہا میل بھی اتر جائے گا تو میں اسی روز اپنے خاندن کی روح سے جا کر مل جاؤں گی۔“

ہم باتیں کرتے غار کی کھڑکی میں سے نکل کر غار کے اندر سے گزر رہے تھے اور غار کے دہانے کے پاس پہنچ گئے۔ ہم غار سے سلامتی کے ساتھ نکل آئے۔ آگے وہی دلدل والا چھوٹا سا میدان تھا جس میں، میں نے ایک عورت اور ایک مرد کو آدھا دلدل میں ڈوبا ہوا مدد کے لئے پکارتے دیکھا تھا۔ غار کے اندر سے نکلنے کے بعد میں نے روہنی سے کہا۔ ”میں کھڑکی میں داخل ہونے کے بعد غائب ہو گیا تھا لیکن کھڑکی میں سے نکلنے کے بعد میں اپنی ظاہری شکل میں واپس نہیں آیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“
 روہنی کہنے لگی۔ ”یہ میں بھی نہیں جانتی۔ ہو سکتا ہے تم کسی بھی وقت اپنی انسانی صورت میں واپس آ جاؤ۔“

غار میں سے نکلنے کے بعد روہنی نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنے ساتھ ہی زمین کی سطح پر سے دس پندرہ فٹ اوپر اٹھالیا تھا۔ دلدل کے اوپر سے گزرنے کے بعد آگے

وہی پہاڑ تھا جس میں سے طوفانی دریا نکل کر ایک طرف کو مڑ گیا تھا۔ روہنی کہنے لگی۔
”ہم غار میں سے نہیں نکلیں گے بلکہ پہاڑ کے اوپر سے نکل جائیں گے۔“

اس سے بہتر بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ میں غار کے اندر کے تاریک ماحول سے
بچ گیا تھا۔ ہم پہاڑ کے اوپر آگئے۔ پہاڑ ہمارے نیچے کافی نیچے رہ گیا تھا۔ اس کے بعد
سیاہ ڈراؤنی چٹانوں کا سلسلہ تھا جس کی تنگ و تاریک راہ دریوں میں سے طوفانی دریا
قیامت کا ڈراؤنا شور مچاتا رہا تھا۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”سلطانہ! میں نے زندگی
میں اتنا خوفناک دریا نہیں دیکھا۔ اگر میرے خدا کی مدد میرے ساتھ نہ ہوتی تو میں
اس کے قریب سے کبھی نہیں گزر سکتا تھا۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”شیردان! حقیقت میں یہ دریا اور یہ عذاب دینے والے دلدلی
میدان اور اژدھا کیا ہیں؟ اس کا تمہیں علم نہیں ہے۔ ایسے کئی راز ہیں جن کا علم
انسان کو اس کی موت کے بعد ہوتا ہے۔ یہ راز بھی ان میں سے ایک ہے۔ لیکن یاد
رکھو۔ یہ راز بھی نیک روحوں پر کھلتا ہے۔ میری ایسی گناہ گار روحوں تو اپنے برے
اعمال کے عذاب میں پھنس جاتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے میرے گناہ بخش
دیئے۔“

میں نے کہا۔ ”تم تو مجھے یہ راز بتا سکتی ہو کیونکہ تم ایک اچھی روح ہو۔“
روہنی کہنے لگی۔ ”ہمیں بعض باتیں بتانے کی اجازت نہیں ہوتی اور ہم احکام
خداوندی کی حکم عدولی کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“

میں بشری کمزوری کے باعث اصرار کرنے لگا کہ روہنی مجھے یہ راز اور بعض
دوسرے راز جو اسے اچھی روح بن جانے کے بعد معلوم ہو چکے تھے بتادے۔ روہنی
یعنی سلطانہ نے اس کے جواب میں یہ کیا کہ فضا میں سیاہ چٹانوں کے اوپر اڑتے اڑتے
ایک دم رک گئی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”فیروز! اگر پھر کبھی تم نے مجھے یہ راز
بتانے کے لئے کہا تو میں تمہیں ہمیشہ ہمیشہ بننے کے لئے چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔“

روہنی نے پہلی بار مجھے میرے اصلی نام سے پکارا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ
اب اس کو دل سے یقین ہو گیا تھا کہ میں اس کے مرحوم خاوند شہزادہ شیردان کا
دوسرا جنم نہیں تھا۔

روہنی کہنے لگی۔ ”وعدہ کرو کہ پھر مجھ سے کبھی ایسا سوال نہیں کرو گے۔“
اس کے لہجے میں ایک یقین اور ایک عزم تھا۔ میں نے فوراً کہا۔ ”میں وعدہ کرتا
ہوں سلطانہ! کہ اس قسم کے سوال تم سے پھر کبھی نہیں پوچھوں گا۔“

روہنی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ”فیروز! مجھے ابھی تمہارے
ساتھ رہنا ہے۔ ابھی تمہیں میری ضرورت ہے اور مجھ پر تمہاری طرف سے ایک
قرض ہے جو مجھے اتارنا ہے اور وہ قرض یہ ہے کہ تمہیں پجاری رگھو کی گرفت اور اس
کی مصیبت سے ہمیشہ کے لئے نجات دلانی ہے تاکہ اس کے بعد تم ان بدروحوں کی
منوس دنیا سے آزاد ہو کر ہنسی خوشی نیک زندگی بسر کر سکو اور پھر ابھی نتالیا کا آسب
بھی تمہارا پیچھا کر رہا ہے تمہیں اس سے بھی رہائی دلانی ہے۔“
میں نے کہا۔ ”وہ تمہارے بھی تو پیچھے لگا ہوا ہے۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”اب یہ دونوں بدروحوں اور آسب مل کر بھی مجھے نقصان
نہیں پہنچا سکتیں۔ خدا کے حضور میرے گناہوں کی بخشش کے بعد میری روح ان کے
لعن یا نقصان سے بہت بلند ہو گئی ہے۔ اب میں جو کچھ بھی کروں گی تمہیں ان
بدروحوں اور آسب سے نجات دلانے کے لئے کروں گی۔ میرے پاس اب نہ کوئی
طلم ہے نہ جادو ہے اور نہ کوئی طلسمی منتر ہے۔ خداوند کریم کی خوشنودی اور اس پر
دل سے بھروسہ رکھنا ہی میرا سب سے بڑا طلسم اور میری سب سے بڑا طاقت ہے۔“
روہنی بالکل بدل گئی تھی۔ اس میں ایک حیرت انگیز روحانی تبدیلی آچکی تھی۔
اس کو دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر خود میرے اندر روحانیت اور نیکی کے
ہدایت اور خیالات پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے اور یہ میرے لئے بھی ایک نیک فال

تھی۔

ہم پرواز کرتے ہوئے سیاہ چٹانوں کے سلسلے کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور اب بے برگ و بار یعنی سوکھے ہوئے ٹیڑھے میڑھے درختوں کے جنگل کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ جب ہم اس جنگل کے اوپر سے بھی گزر گئے اور بنگلور کے گرد و نواح کا نیم پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا تو میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”سلطانہ! تمہارا ارادہ اب کہاں جانے کا ہے؟ کیا تم ڈرگا کی بدروح کے پاس جا رہی ہو؟“

سلطانہ کے پاکیزہ اور پرسکون چہرے پر ایک ناخوشگوار تاثر ابھر آیا۔ اس نے کہا۔ ”شیردان! میرا ان بدروحوں سے اب کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اُن کا میری دنیا سے اور میرا اُن کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کیا یہ بدروح ڈرگا بھی اگر چاہے تو تم سے نہیں مل سکتی؟“
روہنی نے کہا۔ ”جہاں اچھی روح ہو گی وہاں بری اور بدروح کا کبھی گزر نہیں ہو گا۔ وہ اُس طرف آنے کے خیال ہی سے ڈر جائے گی۔ یوں اچھی اور بری روح کی دنیا الگ الگ ہو جاتی ہے۔ نیکی نیکی اور برائی برائی ہی ہوتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ اب نتالیا کا آسیب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”ہاں۔“ روہنی نے کہا۔ ”اب وہ بھی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا بلکہ نتالیا کا آسیب بھی میرے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گا۔ جس طرح کہ جب تک تمہاری انگلی میں شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی ہے نتالیا کا آسیب تیرے قریب نہیں آ سکتا۔“

میں نے پوچھا۔ ”پھر ہم کہاں جا رہے ہیں؟“
روہنی نے کہا۔ ”میں سب سے پہلے تمہیں کسی محفوظ جگہ پر پہنچانا چاہتی ہوں تاکہ جب تک میں تمہارے پیچھے لگی ہوئی رگھو اور آسیب کی بلاؤں کو ہمیشہ کے لئے

ختم نہیں کر لیتی تم پوری حفاظت کے ماحول میں رہو۔“

”تمہارے خیال میں ایسی کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

روہنی نے مجھ سے پوچھ لیا۔ ”تم بتاؤ۔ تمہارے خیال میں ایسی کون سی جگہ ہو سکتی ہے جہاں تم ان بلاؤں کے حملوں سے محفوظ رہ سکتے ہو۔ رگھو اور نتالیا کی بدروحیں اور آسیب تمہیں اس وقت تک نقصان نہیں پہنچا سکتیں جب تک کہ تمہارے بازو کے ساتھ اللہ کے نام کا تعویذ بندھا ہوا ہے اور تمہاری انگلی میں شیش ناگن کی مالا ہے لیکن یہ بلائیں کسی روپ میں، کوئی بھیس بدل کر تمہارے پاس آ کر تمہیں درغلا کر یہ دونوں چیزیں تم سے حاصل کر کے تمہیں ہلاک کر سکتی ہیں اس لئے ان دونوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ نتالیا کے آسیب کو میری روحانی طاقت کا پتہ چل گیا ہو گا اور اس نے اپنی دفن شدہ کھوپڑی کو افریقہ کے جنگل سے نکال کر زمین کی پاتال کے اندر کسی جگہ چھپا دیا ہو گا اس طرح میرے لئے اس کا خاتمہ کرنا قدرے مشکل ہو جائے گا۔ لیکن تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ نیکی کی طاقت بہت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ بدی کے طلسم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میں کسی نہ کسی طرح نتالیا کے آسیب کو جہنم میں پہنچا کر ہی رہوں گی۔“

”اور رگھو کا کیا ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ تو میری جان کا دشمن ہے۔ نتالیا تو پھر بھی میری جان کی دشمن نہیں ہے بلکہ صرف مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”یاد رکھو! کسی بدروح یا آسیب کا کسی زندہ انسان کو اپنے ساتھ رکھ لینا اس کی موت ہی ہوتی ہے۔ رگھو کی تم فکر نہ کرو۔ اسے تو میں اس کی تمام بدروحوں سمیت اس کے انجام تک پہنچا دوں گی۔“

ہم پرواز کرتے ہوئے بنگلور شہر کو بھی پیچھے چھوڑ چکے تھے۔ روہنی نے مجھ سے پوچھا۔ ”تم کہاں جانا پسند کرو گے؟“

مجھے اپنے بچپن کے دوست بمبئی والے جمشید کا ہی خیال آ گیا۔ میں نے کہا۔ ”اگر

میں بمبئی میں اپنے دوست جمشید کے پاس چلا جاؤں تو کیا خیال ہے۔ اس کے ساتھ میرا دل بھی لگا رہے گا۔“

روہنی نے کہا۔ ”تمہارے دوست کی جگہ نتالیا کے آسیب نے دیکھ لی ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ جب ہم وہاں تھے اور تمہارے دوست کے گیراج کے باہر بیٹھے ہوئے تھے تو ایک سادھو وہاں سے گزرا تھا اور اس نے رُک کر میری طرف گھور کر دیکھا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں مجھے یاد ہے۔“

روہنی بولی۔ ”جیسا کہ میں نے تمہارے سامنے دُرگاکو بھی بتایا تھا وہ سادھو نہیں بلکہ نتالیا کے آسیب کی بھیجی ہوئی بدروح تھی۔ وہ ہم دونوں کی تلاش میں وہاں آئی تھی۔ اب تم وہاں گئے تو نتالیا کے آسیب کو فوراً پتہ چل جائے گا اور ممکن ہے وہ کسی دوسرے بھی میں کسی بدروح کو تمہاری انگوٹھی چرانے کے لئے بھیجے کیونکہ ایک بار تمہارے ہاتھ کی شیش ناگن والی انگوٹھی نتالیا کے قبضے میں آگئی تو پھر تم ساری زندگی کے لئے نتالیا کے آسیب کے قیدی بن جاؤ گے اور پھر شاید میں بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن سلطانہ! میرا جمشید کے سوا دنیا میں اور کوئی یار دوست بھی تو نہیں ہے۔ کوئی رشتے دار بھی نہیں ہے اور پھر کسی اجنبی اور اکیلی جگہ پر رہا تو نتالیا کا آسیب آسانی سے مجھے اپنا شکار بنا سکے گا۔ اپنے دوست جمشید کے پاس رہوں گا تو نتالیا کی بھیجی ہوئی بدروح کو مجھے درغلانے کا اتنی آسانی سے موقع نہیں مل سکے گا۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ روہنی نے کہا۔

”تو پھر مجھے جمشید کے پاس بمبئی لے چلو۔“ میں نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن وہاں تمہیں ہر وقت چوکس ہو کر رہنا ہو گا۔“ روہنی نے مجھے ہدایت کی۔

”اس کی تم فکر نہ کرو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے نتالیا کے آسیب اور ان بدروحوں کا

کا کافی تجربہ ہو چکا ہے۔ میں اُن کی بود و رہی سے پالیتا ہوں۔“

”تو پھر چلو۔ بمبئی کی طرف چلتے ہیں۔“ روہنی نے مسکرا کر کہا اور میرا ہاتھ تھام کر اپنا رخ مشرق کی طرف کر لیا۔ بمبئی وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ جس وقت روہنی نے اپنا رخ مشرق کی طرف کیا تو اُس نے مجھے کہا۔ ”اس وقت ہم بھوپال کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔“

اور بھوپال کے بعد بڑا شہر ہم جس فضائی راستے سے جا رہے تھے ہوشنگ آباد اور پھر کھنڈوا تھا۔ اس کے بعد ناسک کا شہر آ جاتا تھا جو بمبئی سے ریل کا ڈیڑھ دو گھنٹے کا سفر تھا۔ چنانچہ ہم بڑی جلدی بمبئی کی نواحی آبادیوں کے اوپر پہنچ گئے۔ اب تو بمبئی کا شہر بہت پھیل گیا ہے اور بھارت کی حکومت نے اس کا نام بھی بمبئی سے ممبئی رکھ دیا ہے۔ اصل میں یہ شہر ہندوؤں کی ایک دیوی مہادیوی کے نام پر آباد ہوا تھا۔ اس زمانے میں بھی اس کا نام ممبئی ہی تھا۔ بعد میں جب انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو انہوں نے اس شہر کا نام بمبئی یا ممبئی رکھ دیا تھا۔ جس وقت ہم بمبئی شہر کے اوپر آئے اس وقت شام کا وقت تھا اور شہر کی روشنیاں جگہ جگہ جگمگا رہی تھیں۔ مجھے تو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ جمشید کا علاقہ کس طرف ہے مگر روہنی کو سب معلوم تھا۔ اُس نے شہر کی روشنیوں کے اوپر ایک چمک لگایا اور پھر مجھے ساتھ لے کر ایک ریلوے اسٹیشن کے باہر سڑک کے فٹ پاتھ پر اتر آئی۔ کہنے لگی۔ ”یہ وہی لوکل اسٹیشن ہے جس کے قریب تمہارے دوست کافلیٹ اور گیراج ہے۔“

میں نے بھی اسٹیشن کو پہچان لیا تھا۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”سلطانہ! میں تو غائب ہوں۔ اپنے دوست جمشید سے کیسے ملوں گا۔ اس سے پہلے تو میں کبھی اسے اس حالت میں نہیں ملا اور اسے میرے بارے میں اس قسم کی باتوں کا علم بھی نہیں ہے۔“

ہم ایک جگہ فٹ پاتھ پر رُک گئے تھے۔ روہنی کہنے لگی۔ ”اس بارے میں میں کیا

کہہ سکتی ہوں کیونکہ میں نے تمہیں غائب نہیں کیا۔ تم خود بخود غائب ہوئے ہو۔ ہو سکتا ہے تم اپنے آپ ظاہر ہو جاؤ۔“

”اس کا مطلب ہے مجھے کسی جگہ ظاہر ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

روہنی نے کہا۔ ”آگے چلتے ہیں شاید اس دوران تم اپنی اصلی شکل میں واپس آ جاؤ۔“

ہم فٹ پاتھ پر چل نہیں رہے تھے بلکہ زمین سے ایک فٹ بلند ہو کر فضا میں تیر رہے تھے۔ ہماری رفتار اتنی ہی تھی جیسے ہم چل رہے ہوں۔ ہم تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ میرے جسم کو ایک ہلکا سا دھچکا لگا اور میں اپنی انسانی شکل میں واپس آ گیا۔ روہنی نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور بولی۔ ”خدا کا شکر ہے کہ تم عین وقت پر اپنی اصلی حالت میں واپس آ گئے۔“

میرے دوست جمشید کا آٹو سٹور اور گیراج اب ہمارے سامنے تھا۔ جمشید مجھے باہر نظر نہ آیا۔ روہنی نے کہا۔ ”اپنے دوست کو نہ بتانا کہ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”تم جیسے کہتی ہو میں ویسے ہی کروں گا۔“

جمشید اس وقت اپنے فلیٹ میں تھا۔ میرا سن کر فوراً نیچے آ گیا۔ بڑی گرمجوشی سے مجھے گلے لگا لیا اور حیران ہو کر کہنے لگا۔ ”فیروز! تم اچانک کس طرف سے نکل آتے ہو اور پھر اچانک کہاں غائب ہو جاتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”جمشید چاہے کچھ ہو مگر میں تمہیں ملنے کے لئے آتا جاتا ہوں۔ تم مجھ سے یہ نہ پوچھو کہ میں کہاں سے آتا ہوں اور کہاں غائب ہو جاتا ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب وقت آئے گا تو سب سے پہلے میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں اچانک کہاں سے آ جاتا تھا اور پھر اچانک کہاں غائب ہو جاتا تھا۔“

جمشید ہنس کر کہنے لگا۔ ”ٹھیک ہے بھائی! میں تم سے کبھی نہیں پوچھوں گا۔ لیکن

وعدہ کرو کہ تم اس طرح کبھی کبھی مجھ سے ملنے کے لئے آتے رہو گے۔“

ہم گیراج کے باہر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ میں اس دفعہ کافی دن تمہارے پاس رہوں گا۔“

”خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔“ جمشید نے ہنس کر کہا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ روہنی غیبی حالت میں ہمارے درمیان موجود تھی مگر جمشید اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آخر جمشید سے نہ رہا گیا۔ کہنے لگا۔ ”پچھلی بار تم آئے تھے تو تمہاری بیوی بھی تمہارے ساتھ تھی۔ اس دفعہ تم بھابھی کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لائے؟“

میں نے روہنی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”وہ میرے ساتھ ہی ہے۔“

جمشید نے حیران سا ہو کر کہا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

میں نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ سلطانہ کا خیال میرے ساتھ ہے۔ اس طرح وہ میرے ساتھ ہی ہے۔“

جمشید ہنسنے لگا۔ ”یار! تم نے اچانک کیسے شادی کر لی؟ کچھ بھابھی کے بارے میں بتاؤ کیا وہ تمہاری کوئی رشتہ دار خاتون تھی یا تم نے کسی دوسری برادری میں شادی کی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ میں تمہیں بعد میں کسی وقت بتاؤں گا۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں کتنے دن کا ویزا ملا ہے؟“ جمشید نے پوچھا۔

میں نے اس کے ہاتھ پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ”خاطر جمع رکھو۔ اس بار میں تین ماہ کا ویزا لگوا کر آیا ہوں۔“

”تمہارا سامان کہاں ہے؟“ اُس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”میں اپنے ساتھ کوئی سامان نہیں لایا۔ بس تین کپڑوں میں آیا ہوں۔“

اس دوران میں نے نوٹ کیا کہ روہنی میرے سامنے والی کرسی پر غیبی حالت میں بیٹھی سڑک پر سے گزرنے والوں کا بڑے غور سے جائزہ لے رہی تھی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ نتالیا کے آسیب نے میری سراغ رسانی کے لئے کسی بدروح کو انسانی بھیس میں نہ بھیجا ہو۔ میں نے اور جمشید نے رات کا کھانا اکٹھے کھایا۔ اس کے بعد ہم باتیں کرنے لگے۔ روہنی غیبی حالت میں کمرے میں موجود تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کھڑکی کے پاس جا کر باہر بازار میں جھانک کر دیکھ لیتی تھی کہ رگھوپجاری یا نتالیا کے آسیب کا بھیجا ہوا آدمی تو کسی بھیس میں باہر موجود نہیں ہے۔ جب رات زیادہ ہو گئی تو میں دوسرے کمرے میں سونے کے واسطے آ گیا۔ روہنی میرے ساتھ ہی آ گئی۔ کہنے لگی۔ ”میں برابر باہر نگاہ رکھے ہوئے تھی۔ ابھی تک تو حالات ٹھیک جا رہے ہیں۔ ہمارے دشمنوں میں سے نہ تو کوئی خود ہماری تلاش میں یہاں آیا ہے اور نہ انہوں نے اپنی کسی بدروح کو بھیجا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ انہیں ہمارے فرار کا ابھی علم نہیں ہوا۔“
روہنی میرے پلنگ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔ ”اپنے دشمن سے کبھی غافل نہ ہونا اور یہ آسیب اور بدروحوں کو سب پتہ لگ جاتا ہے۔ نتالیا کو میرے فرار کا اسی وقت علم ہو گیا ہو گا لیکن گناہ ڈھل جانے کے بعد میری روح میں نیکی کی طاقت آ گئی ہے۔ آسیب اور بدروحیں نیک پاک روحوں کے قریب نہیں آتیں۔ وہ ہماری خوشبودار ہی سے محسوس کر لیتی ہیں اور بھاگ جاتی ہیں۔“

میں نے روہنی سے کہا۔ ”سلطانہ! یہ بات میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا۔ جب سے تمہاری روح کے گناہ ڈھل گئے ہیں اور تم پاکیزہ روح بن گئی ہو مجھے تمہارے جسم سے بڑی روح پروردھیمی دھیمی خوشبو آتی محسوس ہونے لگی ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”یہ رحمت خداوندی کی خوشبو کی ایک ہلکی سی جھلک ہے۔ ابھی میں پاکیزہ اور نیک روحوں کے پہلے درجے میں ہی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہارے

ساتھ زمین پر بھی چل پھر لیتی ہوں کیونکہ ابھی میرے اندر دنیاوی خیالات اور دنیاوی خواہش موجود ہے اور یہ دنیاوی خواہش تمہیں تمہارے دشمنوں سے چھپکارا دلانے کی خواہش ہے تاکہ تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے وہ بوجھ اتار دوں۔ ہم دنیا کے بوجھ ساتھ لے کر روحانی درجے طے نہیں کر سکتیں اور میرا دوسرا بوجھ میرے مرحوم خاوند سے میری محبت ہے۔ یہ بھی ایک دنیاوی جذبہ ہے۔ نیک روحوں کو بلند درجوں تک پہنچنے کے لئے دنیا کی تمام محبتوں کو اپنے سے الگ کر کے صرف اللہ پاک کی محبت میں سرشار ہونا ہوتا ہے۔ ابھی میری روح میں یہ کمزوریاں موجود ہیں اس لئے میں روحانی بلندی کی پہلی سیڑھی پر ہی ہوں۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ میں بہت جلد ان فانی دنیاوی جذبوں سے آزاد ہو کر صرف خدائے واحد کی عبادت گزار اور صرف اسی کی حمد و ثناء کرنے والی روح بن جاؤں گی۔ پھر تم مجھے کبھی اس دنیا میں نہیں پاؤ گے۔“

روہنی یعنی سلطانہ نے پہلے کبھی میرے ساتھ ایسی روحانی عظمتوں والی گفتگو نہیں کی تھی۔ اس کی باتیں خود میرے اندر ایک روحانی بلندی کا احساس پیدا کر رہی تھیں اور خدا پر میرا ایمان اور پختہ ہو رہا تھا اور میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ۔ ”سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے۔“

میں نے روہنی سے کہا۔ ”سلطانہ! روحانیت کے اس مقام پر پہنچنے کے بعد کیا تم اپنے مشترکہ دشمن رگھو اور نتالیا کے آسیب کو ہلاک کر سکو گی؟“

روہنی نے اس کے جواب میں کہا۔ ”ہم منشاء خداوندی کے مطابق عمل کرتی ہیں۔ جس طرح جادو ٹونہ کرنے والے اور بدروحیں قدرت کے قانون میں دخل اندازی کر کے بعض مقاصد اپنی مرضی کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ہم ایسا نہیں کرتیں۔ یہ ہمارے مسلک کے خلاف ہے۔ ہم قانون قدرت کی خلاف ورزی کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ نتالیا کا آسیب تو میری شیش ناگن والی انگوٹھی چرانے کے بعد آسانی سے مجھے اپنے قابو میں کر لے گا اور رگھو جو کہ میری جان کا دشمن ہے جب چاہے گا مجھے موت کی نیند سلا دے گا۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”یاد رکھو! کوئی زندہ شے بے موت نہیں مرتی۔ انسان کی موت صرف اسی وقت آتی ہے جب اس کو اللہ کے حکم سے آنا ہوتا ہے۔ زندگی اور موت کا اختیار صرف اللہ کی ذات پاک کو ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس میں دخل دے سکے۔“

”لیکن روہنی۔“ میں نے کہا۔ ”بعض جادو ٹونوں سے تو انسان اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ پھر ایسا کیوں ہوتا ہے؟“

روہنی نے کہا۔ ”جادو ٹونے سے کبھی کبھی اپنا مقصد حاصل کرنے والا آدمی اسے اپنی کامیابی ہی سمجھتا ہے لیکن اسے علم نہیں ہوتا کہ یہ کامیابی اُس کی سب سے بڑی ناکامی ہے۔ ایسا آدمی خدا کے حضور مدد کے لئے جھولی پھیلانے کی بجائے جادو ٹونہ کرنے والے سے مدد کی بھیک مانگتا ہے۔ یہ شرک ہے یعنی وہ تمام جہانوں کے سب سے بڑھ کر پالنے والے اور تمام حاکموں کے سب سے اعلیٰ تر حاکم کے اختیار میں دخل اندازی کر کے شرک کے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور یوں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لے لیتا ہے اور یاد رکھو وہ آدمی دنیا کا بد قسمت ترین آدمی ہے جس سے اللہ تعالیٰ

ناراض ہو جائے۔۔۔۔۔ اب میں تمہیں تمہارے سوال کا جواب دیتی ہوں۔ تم نے پوچھا تھا کہ اگر رگھو کی بدروح یا نتالیا کے آسیب نے ہم پر حملہ کر دیا تو کیا میں ان کا مقابلہ نہیں کروں گی؟ تم نے بڑا صحیح سوال کیا ہے۔ میں مقابلہ اسی طرح کروں گی جس طرح ایک نیک آدمی برائی کا مقابلہ کرتا ہے جس طرح ایک نیک خیالات رکھنے والا آدمی برے خیالات کا مقابلہ کرتا ہے اور اپنے نیک خیالات کی طاقت سے برے خیالات کو شکست دیتا ہے۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ میں اپنا اور تمہارا دفاع کروں گی۔ میں کسی پر حملہ نہیں کروں گی اور جب کوئی انسان یا نیک روح نیکی کی طاقت کے ساتھ اپنا

دفاع کرتی ہے یا دفاع کرتا ہے تو بدی خود بخود شکست کھا کر روپوش ہو جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن سلطانہ! میں تو ایک کمزور انسان ہوں اور میرے ساتھ میرے گناہ بھی جڑے ہوئے ہیں۔ میں کیا کروں گا؟“

روہنی نے جواب دیا۔ ”تم صرف اللہ پاک پر اپنے ایمان کو مضبوط رکھنا۔ سوائے اللہ کے اور کسی کو مدد کے لئے نہ پکارنا۔ تمہارے سارے کام اپنے آپ ٹھیک ہو جائیں گے اور کوئی شیطانی طاقت تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔“

جیسے جیسے میں روہنی یعنی سلطانہ کی باتیں سن رہا تھا مجھے اپنے اندر ایک حیرت انگیز روحانی طاقت کا احساس ہو رہا تھا۔ روہنی کرسی پر سے اٹھ کر بیڈ روم کی کھڑکی کے پاس گئی۔ باہر جھانک کر دیکھا اور میرے پاس آ کر کہنے لگی۔ ”اب تم اطمینان سے سو جاؤ۔ میں فلیٹ کے اوپر اور باہر چل پھر کر تمہاری حفاظت کروں گی۔“

روہنی بیڈ روم کے بند دروازے میں سے نکل گئی۔ اُس کے جانے کے بعد میں نے باتھ روم میں جا کر وضو کیا۔ اس کے بعد واپس آ کر دو نفل شکرانے کے ادا کئے اور پانچ دفعہ کلمہ پاک پڑھ کر پلنگ پر لیٹ گیا اور خدا سے اپنے گناہوں کی بخشش کی دعائیں مانگتا مانگتا گہری نیند سو گیا۔

صبح مجھے جمشید نے آکر جگایا۔ کہنے لگا۔ ”کیا بات ہے۔ رات دیر سے سوئے تھے؟ اٹھو دن کے دس بج رہے ہیں۔ نیچے آؤ میں نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا۔“

میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور نیچے ناشتہ کرنے آگیا۔ میں نے نیچے آکر ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے روہنی کہیں نظر نہ آئی۔ میں اور جمشید بازار کی طرف والے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے۔ جمشید کہنے لگا۔ ”فیروز! جب سے تم گئے ہو میں بھی شکار پر نہیں گیا۔ اب تم آگئے ہو تو کیا خیال ہے کسی روز شکار کھیلنے نہ چلیں؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ پروگرام بنالو۔ چلے چلیں گے میں نے بھی ایک مدت سے شکار نہیں کھیلا۔۔۔۔۔“

کمرے کی کھڑکی کھلی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا اور نیچے سڑک پر بمبئی شہر کی ٹریفک کو دیکھنے لگا۔ اصل میں، میں روہنی کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک مجھے کہیں دکھائی نہیں دہی تھی۔

جمشید ابھی تک ناشتے کی میز پر ہی بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے آواز دے کر کہا۔ ”فیروز! یار میرے ساتھ چائے کی دوسری پیالی ہی پی لو۔ تم بڑی جلدی ناشتہ کرتے ہو۔“

میں ناشتے کی ٹیبل پر آکر بیٹھ گیا اور اپنے لئے چائے کی دوسری پیالی بنانے لگا۔

بمبئی کا علاقہ مرطوبہ علاقہ ہے۔ وہاں بارشیں بہت ہوتی ہیں اس لئے اس علاقے میں چائے بہت پی جاتی ہے۔ آدمی چائے نہ پئے تو جسم ٹوٹنے لگتا ہے۔ مرطوب آب و ہوا آدمی کو سست بنا دیتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے تمام مشرقی اور مغربی ساحل کے شہروں میں چائے کا بہت رواج ہے۔ جنوبی ہندوستان میں موسم اور زیادہ گرم موطوب ہو جاتا ہے کیونکہ وہاں بارشیں بہت ہوتی ہیں چنانچہ بنگلور، مدراس اور دوسرے جنوبی شہروں میں کافی بہت زیادہ پی جاتی ہے۔ وہاں چائے کی نسبت کافی کا رواج عام ہے۔

میں چائے کی دوسری پیالی کا ایک ایک گھونٹ پی رہا تھا اور کمرے میں ادھر ادھر بھی دیکھ لیتا تھا۔ میں حیران تھا کہ روہنی ابھی تک کیوں نہیں دکھائی دی۔ میرے ادھر ادھر بار بار دیکھنے کو جمشید نے نوٹ کر لیا اور پوچھنے لگا۔ ”تم ادھر ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”کچھ نہیں۔ ویسے ہی دیکھ رہا ہوں۔“

اتنے میں مجھے روہنی دروازے میں سے کمرے میں داخل ہوتی نظر آئی۔ روہنی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے ایسا ہوتا تھا کہ میں تو اس کی آواز سن لیتا تھا مگر وہاں پر موجود کوئی دوسرا آدمی اُس کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔ روہنی کو دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار نکلنے ہی لگا کہ تم کہاں تھیں مگر میں جلدی سے سنبھل گیا کہ جمشید نے سن لیا تو وہ حیران ہو کر پوچھ گئے گا کہ تم کس سے مخاطب ہو۔ روہنی سیدھی میرے پاس آکر میرے پاس جو کس تھی اُس پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔ ”میں علاقے میں بدروحوں کی سراغ رسانی کرتی ذرا دور نکل گئی تھی۔ تم پریشان تو نہیں ہوئے؟“

اب میرے منہ سے نکل گیا۔ ”تھوڑا پریشان تو ضرور تھا۔“

میرا جملہ جمشید نے سن لیا۔ وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اُس نے تو سننا ہی تھا۔ تعجب سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”تم کس لئے پریشان تھے فیروز؟“

میں نے جلدی سے سنبھل کر کہا۔ ”وہ میں... میرا مطلب ہے کہ میں نے بمبئی میں داخل ہونے کے بعد علاقے کے تھانے میں رپورٹ نہیں کی تھی۔ بس اسی لئے پریشان تھا۔“

جشید کہنے لگا۔ ”کوئی بات نہیں۔ تم ابھی میرے ساتھ پولیس سٹیشن چلے چلو۔ تھانیدار میرا دوست ہے۔ میں خود تمہاری آمد درج کروادوں گا۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں نہیں۔ تمہیں ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔“

یہ میں نے اس لئے کہا تھا کہ میرے پاس نہ تو کوئی پاسپورٹ تھا اور نہ میرا کوئی ویزا لگا ہوا تھا۔ میں کیا لے کر جشید کے ساتھ تھانے جاؤں گا۔ مگر جشید میرے پیچھے پڑ گیا۔ وہ بھی سچا تھا۔ کہنے لگا۔ ”تمہارا پولیس سٹیشن رپورٹ کرنا بہت ضروری تھا۔ تم نے پہلے ہی دیر کر دی ہے اکیلے گئے تو تھانیدار قانون کی خلاف ورزی کے جرم میں ممکن ہے تمہیں پاکستانی جاسوس سمجھ کر پکڑ لے اور اس طرح سے مجھ پر بھی کوئی مصیبت نازل ہو سکتی ہے۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ میں خود تمہیں لے کر تھانے جاؤں گا۔“

میں خواجواہ کی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ میں نے روہنی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”فکر کیوں کرتے ہو۔ میں تمہیں تمہارا پاسپورٹ بھی لادوں گی جس پر بمبئی کا ایک مہینے کا ویزا بھی لگا ہوا ہو گا۔“

جشید پیالی رکھ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”جلدی سے کپڑے بدل کر نیچے آ جاؤ۔ پولیس سٹیشن نزدیک ہی ہے۔ میں تھانیدار کو فون کر دیتا ہوں کہ ہم آرہے ہیں۔“

یہ کہہ کر جشید نیچے چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ ”میں خواجواہ بول پڑا۔ اب تھانے کا چکر لگانا پڑے گا۔“

روہنی نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔“

میں نے پوچھا۔ ”میرا پاسپورٹ تم کہاں سے لاؤ گی؟“

اُس نے کہا۔ ”وہ سامنے والی الماری کا نچلا دراز کھول کر دیکھو۔ ایک لفافے میں ہمارا پاسپورٹ موجود ہے۔“

میں اُٹھ کر الماری کے پاس گیا۔ اُس کے نچلے دراز کو کھولا تو اندر بھورے رنگ کا ایک لفافہ پڑا تھا۔ لفافہ لے کر میں روہنی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اسے کھول کر دیکھا تو اس میں ایک پاکستانی پاسپورٹ تھا۔ پاسپورٹ پر میری فوٹو بھی لگی ہوئی تھی اور اُس کے نیچے میرا پورا نام فیروز دین اور ولدیت بھی لکھی ہوئی تھی۔ میں نے ورق الٹ کر دیکھا۔ ایک ورق پر باقاعدہ بمبئی کا ویزا لگا ہوا تھا اور ساتھ پاکستان میں انڈیا کے ہائی کمشنر کے ویزا آفس کی مہر بھی لگی ہوئی تھی۔

میں نے مسکرا کر روہنی کی طرف دیکھا۔ ”یہ تم کہاں سے لائی ہو؟“

روہنی نے کہا۔ ”یہ مت پوچھو کہ میں یہ کہاں سے لائی ہوں اور یہ کہاں سے آیا ہے۔ اتنا میں تمہیں ضرور بتانا چاہوں گی کہ یہ جعلی پاسپورٹ نہیں ہے بالکل اصلی پاکستانی پاسپورٹ ہے اور یہ بھی سن لو کہ جب تمہاری بمبئی میں قیام کی مدت ختم ہو جائے گی یا جس دن تمہیں میرے ساتھ یہاں سے واپس جانا ہو گا یہ پاسپورٹ اپنے آپ غائب ہو جائے گا۔“

نیچے سے نوکرنے آ کر کہا۔ ”فیروز بابو... مالک نیچے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

میں نے پاسپورٹ کو لفافے میں ڈالا۔ لفافہ اپنی پتلون کی جیب میں رکھا اور دوسری بش شرٹ پہن کر نیچے آ گیا۔ روہنی بھی میرے ساتھ ہی نیچے آ گئی۔ جشید اپنی پرانی کھٹارا جیب کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ”آ جاؤ یار۔“

میں جیب میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور جیب پولیس سٹیشن کی طرف

روانہ ہو گئی۔ جیب کی چھت نہیں تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر کو دیکھا مجھے روہنی جیب کے اوپر ساتھ ساتھ اڑتی دکھائی دی۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ ہم پولیس سٹیشن پہنچ گئے۔ تھانیدار ہندو مرہہ تھا اور اُس کے دفتر کے باہر اے آر کھانڈیکر کی تختی لگی تھی۔ وہ بڑے تپاک سے جمشید کو ملا اور بولا۔ ”سیٹھ! آج کیسے آنا ہو گیا۔ بیٹھو۔“

جمشید نے کہا۔ ”کھانڈیکر صاحب! یہ میرا دوست ہے۔ اس کا نام فیروز ہے۔ پاکستان سے خاص طور پر ویزا لے کر مجھ سے ملنے آیا ہے۔“

مرہہ تھانیدار نے کہا۔ ”بات کیا ہے بولو۔ کیا اس کی جیب کٹ گئی ہے بہن! میں؟“

جمشید نے کہا۔ ”ارے نہیں کھانڈیکر بابو! آپ کے ہوتے ہوئے علاقے میں ایسے جرائم بھلا کبھی ہو سکتے ہیں۔“

”پھر کیا بات ہے؟“ تھانیدار نے پوچھا۔

تب جمشید نے تھانیدار کو بتایا کہ میرے دوست سے ایک غلطی ہو گئی ہے کہ اُس نے بمبئی میں آنے کے فوراً بعد پولیس سٹیشن رپورٹ نہیں کی تھی۔“

تھانیدار نے اب مجھے گھورتے ہوئے دیکھا اور پوچھا۔ ”تم بمبئی کس روز انہر ہوئے تھے؟“

میں نے کہا۔ ”ایک دن پہلے انٹر ہوا تھا سر! بس رپورٹ کرنا یاد نہیں رہا۔ آئی ایم ویری سوری سر!“

تھانیدار نے کہا۔ ”اپنا پاسپورٹ دکھاؤ۔“

میں نے پاسپورٹ دے دیا۔ تھانیدار دیر تک پاسپورٹ کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر اس ورق کو بڑے غور سے دکھا جس پر میرا ویزا لگا ہوا تھا اور ساتھ ہی بھارتی ہائی کمشنر کی مہر لگی ہوئی تھی۔

تھانیدار نے پاسپورٹ مجھے واپس دیتے ہوئے جمشید سے کہا۔ ”سیٹھ! پاسپورٹ تمہارے دوست کا ایک دم ٹھیک ہے۔ ویزا بھی ٹھیک لگا ہوا ہے۔ مگر اسے آتے ہی خانے میں رپورٹ کرنی چاہئے تھی۔ اس نے بلیا نہیں کیا اس لئے مجھے قانونی کارروائی پوری کرنی ہو گی۔“

جمشید نے تشویش کے ساتھ پوچھا۔ ”کس قسم کی کارروائی کھانڈیکر بابو!“

تھانیدار نے ہنس کر کہا۔ ”ارے سیٹھ! گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تمہارے دوست کو صرف اپنا پاکستانی شناختی کارڈ دکھانا ہو گا۔“

پھر تھانیدار نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”پلیز! اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ۔“

شناختی کارڈ میرے پاس کہاں سے آتا۔ میں نے کہہ دیا۔ ”سر! پاسپورٹ پر میرے شناختی کارڈ کی کاپی لگی ہوئی ہے۔“

تھانیدار نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ”وہ تو میں نے دیکھ لی۔ میں اور بجنل شناختی کارڈ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

پاکستان سے جو لوگ ویزا لے کر انڈیا جاتے تھے ان کے پاس ان کے شناختی کارڈ کا اونا ضروری ہوتا تھا۔ میرے منہ سے نکل گیا۔ ”سر! شناختی کارڈ تو میرے پاس نہیں ہے۔“

تھانیدار نے حیران ہو کر کہا۔ ”دوسرے ملک سے جو کوئی غیر ملکی انڈیا میں آتا ہے اس کے پاس اس کا شناختی کارڈ ہونا چاہئے۔ یہ قانون ہے۔ تمہارے پاس تمہارا شناختی کارڈ کیوں نہیں ہے؟“

روہنی میرے قریب ہی تھی۔ اُس نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا کہہ دیا تم نے؟ تمہارا شناختی کارڈ میرے پاس موجود ہے۔ اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں دیکھو۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”آئی ایم سوری سر! میں بھول گیا تھا کہ شناختی کارڈ تو

میں اپنے ساتھ لے کر چلا تھا۔ ابھی دکھاتا ہوں سر!

میں نے پتلون کی دو جیبیں محض دکھانے کے لئے ٹٹولیں اور پھر پچھلی جیب میں ہاتھ ڈالا تو میری انگلیاں کسی چیز سے ٹکرائیں۔ میں نے اسے باہر نکالا۔ یہ میرا پاکستانی شاختی کارڈ تھا۔ شاختی کارڈ دیکھ کر میرے دوست جمشید نے بھی اطمینان کا سانس لیا ورنہ وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے شاختی کارڈ تھانیدار کے حوالے کر دیا۔ اس نے شاختی کارڈ کو بڑے غور سے الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا۔ ”بالکل ٹھیک ہے۔“

تھانیدار نے ایک رجسٹر منگوا کر اس پر میرا نام، پتہ، پاسپورٹ نمبر اور تاریخ درج کی اور بولا۔ ”آئندہ آپ بھارت آئیں تو اسی روز تھانے میں رپورٹ کرنا۔“

جمشید نے کہا۔ ”کھانڈیکر بابو! اب آیا تو میں اسی وقت اسے آپ کے پاس لے آؤں گا۔“

روہنی نے مجھ سے کہا۔ ”یہ معاملہ بھی طے ہو گیا۔ اچھا ہوا۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں بڑا اچھا ہوا۔“

جمشید نے میری طرف کچھ چونک کر دیکھا اور بولا۔ ”ہاں.... بڑا اچھا ہو گیا ہے۔ چلو واپس چلتے ہیں۔“

جمشید نے کھانڈیکر تھانیدار کو نمستہ کیا اور ہم جیب میں بیٹھ کر واپس فلیٹ پر آ گئے۔ دوسرے دن شکار کا پروگرام بن گیا۔ روہنی کو میرے شکار کے پروگرام کا علم ہوا تو کہنے لگی۔ ”میرا دل نہیں مانتا کہ تم شکار پر جاؤ۔“

”کیوں؟“ میں نے کہا۔ ”اس میں کیا برائی ہے؟“

وہ بولی۔ ”جنگل میں بدروحوں اور آسیب کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”سلطانہ! اب اگر مجھے یہاں رہنا ہے تو میں بالکل پتھر کا بت بن کر

یہاں نہیں رہ سکتا۔ کچھ سیر و تفریح بھی کرنی ہوتی ہے اور پھر ہم دونوں شروع ہی سے شکار کے شوقین رہے ہیں۔“

روہنی نے کہا۔ ”اور شاید تم بھولے نہیں کہ اسی شکار کے شوق نے تمہیں اس مصیبت میں پھنسا دیا تھا جس میں تم ابھی تک پھنسے ہوئے ہو۔ نہ تم شکار پر جنگل میں جاتے، نہ وہاں تمہیں بارش کی طوفانی رات میں پرانے قلعے میں پناہ لینا پڑتی اور نہ تمہارے سامنے وہ قتل کی واردات دہرائی جاتی جس کے بعد تم میری بدروح کو آزاد کر کے آج تک اس کی سزا بھگت رہے ہو۔“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”سلطانہ! مقدر میں جو لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اور پھر میں سمجھتا ہوں کہ قدرت نے میرے ہاتھوں یہ کام کروانا تھا کہ میں تمہاری بدروح کو مرتبان سے نکال کر آزاد کر دوں تاکہ تم پچھتاوے اور ملال کے ایک طویل مرحلے سے گزر کر قدرت خداوندی سے معافی حاصل کر سکو۔“

روہنی خاموش ہو گئی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے کہا۔ ”اور پھر تم بھی تو میرے ساتھ ہو گی۔ تم ایک اچھی روح ہو۔ تمہیں کئی باتوں کا پہلے سے علم ہو جاتا ہو گا۔ تم مجھے کسی بھی خطرے سے پہلے ہی خبردار کر سکتی ہو۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”یہ تمہیں کس نے کہا کہ روحوں کو پہلے سے کئی باتوں کا علم ہو جاتا ہے۔ جس طرح بعض آدمیوں کی چھٹی حس بڑی تیز ہوتی ہے اور انہیں کسی آنے والے خطرے کا سنگل موصول ہو جاتا ہے اسی طرح ایک اچھی روح کو بھی کبھی کبھی کسی خطرے کی بات کا احساس ہو جاتا ہے لیکن کسی چیز کا تفصیل سے علم ہو جانا ایسا نہیں ہوتا۔ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے۔ ہاں وہ اپنی رحمت سے کسی نیک روح کو تھوڑا سا یہ وصف دے دے یہ الگ بات ہے لیکن اس نیک روح پر واجب بلکہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ قدرت کے دیئے ہوئے اس عطیے کو بے جا استعمال نہ کرے۔“

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں خطرے کا احساس تو ہو سکتا ہے نا؟“
 ”ہاں۔ تھوڑا تھوڑا۔ پیشگی احساس ہو سکتا ہے۔“ روہنی نے جواب دیا۔
 میں نے کہا۔ ”تو پھر میں شکار پر جانے سے کیوں ڈروں؟ اگر کہیں کوئی ایسی ویسی بات ہونے والی ہوگی تو تم مجھے خبر کر دینا میں اسی وقت شکار سے واپس آ جاؤں گا۔“
 روہنی کہنے لگی۔ ”پھر بھی میرا دل نہیں مانتا کہ تم شکار کھیلنے جنگل میں جاؤ۔“
 میں ہنس پڑا۔ ”سلطانہ! کبھی کبھی تم بالکل بچوں کی طرح ضد کرنے لگتی ہو۔“
 وہ بولی۔ ”کیا کروں۔ یہ میری تم سے محبت ہے جس کے ہاتھوں مجبور ہو جاتی ہوں۔ بس اس دنیا کی یہی ایک کمزوری میرے ساتھ رہ گئی ہے۔“

میں نے اور جمشید نے شکار کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بندوقیں، رائفلیں صاف کر کے انہیں آئیل وغیرہ دیا گیا۔ جمشید کے تین ملازم عبدال وغیرہ بھی ہمارے ساتھ شکار پر جا رہے تھے۔ وہ ہمیشہ شکار پر ساتھ جاتے تھے۔ عبدال شکار کا گوشت بڑا اچھا پکاتا تھا اور بندوق کا نشانہ بھی بڑا اچھا لگاتا تھا۔

آخر ایک دن ہم دو جیپوں میں شکار کا ساز و سامان رکھ کر شکار پر روانہ ہو گئے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ہم بمبئی کے قریبی جنگل میں ہی شکار کھیلنے جایا کرتے تھے۔ یہ جنگل ہمارے دیکھے بھالے تھے۔ بمبئی سے ہم دن کے وقت ناشتہ کر کے نکلے تھے۔ دوپہر کے وقت ہم بمبئی سے سوڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر واقع ایک بہت بڑے اور گھنے جنگل میں پہنچ گئے۔ اس جنگل میں ہرن، چیتل اور نیل گائے کا شکار بہت ملتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی شیر چیتا بھی اس جنگل میں آ نکلتا تھا مگر شیر اور چیتے عام طور پر اس جنگل کے بہت آگے جہاں دریا بہتا تھا وہاں ہی رہتے تھے۔

ہم نے گھنے جنگل میں ایک جگہ پڑاؤ ڈال دیا۔ عبدال دو تین جنگلی مرغیاں شکار کر کے لے آیا۔ انہیں بھون کر پکایا اور ہم نے انہیں کھا کر کچھ دیر آرام کیا اور شام ہونے سے کچھ دیر پہلے جنگل میں شکار کے لئے نکل پڑے۔ ہرنوں کی ڈاریں عام طور

شام کے وقت تالابوں پر پانی پینے آتی تھیں مگر اس روز وہاں کوئی ہرن دکھائی نہ آیا۔ میں نے جمشید سے کہا۔ ”آج یہ ہرن کس طرف پانی پینے نکل گئے ہیں؟“
 وہ کہنے لگا۔ ”میں بھی پہلی بار دیکھ رہا ہوں کہ تالاب پر ایک بھی ہرن نہیں ہے۔ چلو آگے چلتے ہیں۔“

جنگل میں اس جگہ دو تین چھوٹے بڑے تالاب تھے۔ ہم دوسرے تالاب پر گئے۔ وہاں بھی کوئی ہرن یا چیتل نہ ملا۔ اسی طرح تیسرا تالاب بھی خالی پڑا تھا۔ جمشید بولا۔ ”میں اپنی شکاری زندگی میں پہلی بار یہ بات دیکھ رہا ہوں کہ شام کے وقت تالاب پر ایک بھی ہرن نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کہیں ہرن ڈر کر اس جنگل سے فرار تو نہیں ہو گئے؟“
 جمشید نے کہا۔ ”ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ ہرن کو صرف شیر کا ہی ڈر ہوتا ہے لیکن شیر سے ڈر کر آج تک کوئی ہرن جنگل چھوڑ کر جاتا نہیں دیکھا، نہ کبھی سنا ہی ہے۔“
 ”پھر ہرن کہاں چلے گئے؟“ میں نے پوچھا۔

جمشید بولا۔ ”یہ معصہ میری سمجھ سے باہر ہے۔“
 روہنی اس وقت ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ مجھ سے کوئی بات کرے گی تو اس کی آواز میرے سوا اور کوئی نہیں سن سکے گا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”شیر وان! مجھے اس جنگل میں کسی آسیب کی بو محسوس ہو رہی ہے۔ شاید ہرن اس آسیب کی بو پا کر ہی یہاں سے بھاگ گئے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کیا جانور بھی آسیب اور بدروحوں سے ڈرتے ہیں؟“
 میرا یہ جملہ جمشید نے سن لیا تھا۔ وہ یہ سمجھا کہ یہ بات میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہی ہے۔ کہنے لگا۔ ”میرا خیال ہے جانوروں کو کسی بدروح کا سب سے پہلے احساس ہو جاتا ہے۔ مگر تمہیں بدروں کا خیال کہاں سے آگیا؟“

مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ مجھے روہنی کی بات کے جواب خاموش رہنا

چاہئے تھا۔ میں نے روہنی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ میں نے جشید سے کہا۔ ”یونہی خیال آگیا تھا۔ جنگل میں سنا ہے آسب اور بدروحیں راتوں کو گھومتی پھرتی رہتی ہیں۔“

جشید بولا۔ ”میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ چلو واپس چلتے ہیں۔ صبح کے وقت نکلیں گے اس وقت پرندوں کا شکار بھی بہت مل جائے گا۔“

ہم اپنے پڑاؤ پر واپس آگئے۔ ہم نے ایک چھوٹا سا خیمہ لگا رکھا تھا۔ خیمے کے آگے ہم نے آگ کا لاؤ روشن کر لیا۔ اس کے دو فائدے تھے ایک فائدہ تو یہ تھا کہ آگ کے دھوئیں سے ہمیں مچھروں سے نجات مل جاتی تھی اور دوسرا فائدہ یہ تھا کہ آگ کی وجہ سے کوئی جنگلی درندہ اُس طرف نہیں آتا تھا۔

وہیں ہم نے رات کا کھانا کھایا۔ عبدل نے چائے بنا دی۔ ہم چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ روہنی ہمارے خیمے کے آس پاس پھر رہی تھی جیسے میری دیکھ بھال کر رہی ہو۔ جب رات کافی گہری ہو گئی تو جشید بولا۔ ”یار! مجھے تو نیند آرہی ہے۔ میں سونے چلا۔“

وہ خیمے میں سونے چلا گیا۔ عبدل بھی برتن وغیرہ سمیٹ کر ایک درخت کے نیچے جا کر لیٹ گیا۔ ایک نوکر الاؤ کے قریب بندوق لے کر رات کی چوکیداری کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔ آدھی رات تک اسے پہرہ دینا تھا اس کے بعد اس کی جگہ دوسرے نوکر کو لے لینی تھی۔

میں خیمے کے باہر لکڑی کے سٹول پر بیٹھا روہنی یعنی سلطانہ کی نیک روح کو دیکھ رہا تھا کہ وہ کس طرح سے چوکس ہو کر میری خبر گیری کر رہی ہے۔ اُس نے بھی جب مجھے اکیلا دیکھا تو میرے پاس آگئی۔ میں نے پوچھا۔ ”اب بھی تمہیں یہاں کسی بدروح کی بو محسوس ہو رہی ہے؟“

روہنی نے کہا۔ ”نہیں۔ اب بو محسوس نہیں ہو رہی۔ مگر کوئی بری روح یہاں

ضرور آئی تھی ورنہ مجھے اس کی بو کبھی نہ آتی۔“

میں نے کہا۔ ”جنگل میں تو ہر قسم کی بری روحیں گھومتی پھرتی رہتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی بری روح آئی ہو اور تمہیں دیکھ کر فرار ہو گئی ہو۔“

وہ بولی۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن ہمیں ہوشیار ہو کر رہنا چاہئے۔ اگر یہ بدروح یہاں آگئی تھی تو نٹالیا کا آسب اور رگھو پجاری کی بدروح بھی یہاں آ سکتی ہے۔“

”مگر میرے پاس تم ہو اور پھر میرے ہاتھ میں شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی ہے اور میرے بازو پر اللہ کے پاک نام کا تعویذ بندھا ہوا ہے۔ مجھے کس بات کا ڈر ہے۔“

میری اس بات کے جواب میں روہنی کہنے لگی۔ ”ڈر تمہیں صرف خدا کا ہونا چاہئے۔ اگر انسان کے دل میں صرف خدا کا ڈر ہو تو پھر وہ دوسرے ہر ڈر خوف سے اپنے آپ نجات پالیتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے نیند آرہی ہے۔ میں تو خیمے میں سونے جا رہا ہوں۔ تم کہاں جاؤ گی سلطانہ؟“

سلطانہ یعنی روہنی نے کہا۔ ”میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتی۔ تم سو جاؤ میں تمہاری رکھوالی کروں گی۔“

میں خیمے میں جا کر درری پر لیٹ گیا۔ ایک طرف جشید سویا ہوا تھا اور خرائے لے رہا تھا۔ میں جنگل میں سارا دن پھر پھر کر تھک گیا تھا۔ لیٹتے ہی گہری نیند میں کھو گیا۔ مجھے کوئی خبر نہیں کہ میں کب تک سویا رہا۔ پھر اچانک کسی نے مجھے زور سے بلایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ روہنی میرے اوپر جھکی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ”جلدی سے میرے ساتھ باہر چلو۔“

میں جلدی سے روہنی کے ساتھ خیمے سے باہر آگیا۔ باہر الاؤ کی آگ مدھم پڑ

چکی تھی۔ اس کے پاس جو ملازم پہرہ دینے بیٹھا تھا وہ بھی وہیں لیٹ کر سو چکا تھا۔ روہنی مجھے خیمے سے کچھ دور ایک تالاب کے پاس لے گئی اور کہنے لگی۔ ”یہاں جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ جاؤ۔“

میں جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ روہنی تیزی سے پرواز کرتی تالاب کی طرف گئی۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ جنگل پر سناٹا چھایا ہوا تھا مگر روہنی مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے بڑی تیزی سے تالاب کے اوپر ایک چکر لگایا اور پھر اسی تیزی سے میرے پاس آگئی۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔ ”کیا بات ہوئی ہے سلطانہ؟“

سلطانہ نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ سر اٹھائے تالاب کی طرف ٹھنکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں تالاب کی طرف سے جنگل کے سناٹے میں ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی کسی کا گلا دبا رہا ہو اور اس کے گلے میں سے غرغراہٹ کی آوازیں نکل رہی ہوں۔

یہ آوازیں بڑی ڈراؤنی تھیں۔ آوازیں دور سے آرہی تھیں۔ پھر یہ قریب سے سنائی دینے لگیں۔ روہنی ایک دم سے تالاب کی طرف پرواز کر گئی۔ جیسے ہی وہ تالاب کے قریب پہنچی ڈراؤنی آوازیں دور ہوتے ہوتے غائب ہو گئیں۔ میں روہنی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تالاب کے اوپر مسلسل دائرے کی شکل میں چکر لگا رہی تھی۔ ایک دو منٹ تک وہ چکر لگاتی رہی پھر وہ واپس میرے پاس آگئی اور کہنے لگی۔ ”میرے ساتھ واپس چلو۔“

ہم خیمے کے باہر الاؤ کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔ ”کیا یہ نتالیا کا آسب تھا؟“

روہنی نے کہا۔ ”اس کے سوائے اور کون ہو سکتا ہے؟ وہ تمہاری تلاش میں آیا تھا مگر مجھے آس پاس دیکھ کر دفع ہو گیا۔“

میں نے پوچھا۔ ”سلطانہ! جب میرے بازو پر اللہ کے پاک نام کا تعویذ بندھا ہے اور میرے ہاتھ میں شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی ہے پھر تم میری اتنی فکر کیوں کرتی ہو؟ یہ آسب تو مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔“

روہنی نے کہا۔ ”شیروان! تم شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی پر اتنا بھروسہ نہ کرو۔ یہ مہرہ کسی بھی وقت تمہیں دھوکا دے سکتا ہے۔ اس آسب اور بدروحوں سے اگر کوئی طاقت تمہیں بچا سکتی ہے تو وہ اللہ کے پاک نام والا تعویذ ہی ہے۔ تم اس پر بھروسہ کر سکتے ہو۔ اس کے باوجود تمہیں غافل نہیں ہونا چاہئے۔ رگھو اور نتالیا کا آسب جمشید کے کسی نوکر کے ذہن کو اپنے قبضے میں کر کے اسے حکم دے سکتا ہے کہ وہ تمہارے بازو سے تعویذ اتار کر لے آئے۔“

مجھے تشویش سی لگ گئی۔ واقعی اگر ایسا ہو گیا اور سوتے میں کسی نے میرے بازو پر سے تعویذ اتار لیا یا میری انگلی سے انگوٹھی اتار لی تو میں کیا کروں گا۔ روہنی کا تو یہ بدروحیں کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی کیونکہ وہ ان کی منحوس دنیا سے نکل آئی ہے بلکہ بدروحیں تو اس کے قریب بھی نہیں آئیں گی لیکن میں روح نہیں ہوں۔ میں تو ایک عام کمزوریوں والا گناہ گار انسان ہوں مجھے تو یہ بدروحیں ایک سینکڑوں میں اپنے قبضے میں کر لیں گے۔ لیکن میں نے اللہ کے خیال اور اس پر ایمان کی طاقت سے اپنے دل کو مضبوط کیا اور روہنی سے کہا۔ ”سلطانہ! مجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے۔ میرا اپنے خدا پر ایمان ہے۔ بدی کی شیطانی طاقتیں مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتیں۔ اس کے باوجود میں تمہاری ہدایات پر عمل کروں گا اور ہر وقت اپنے دشمنوں سے ہوشیار رہوں گا۔“

عزائم کا سراغ لگا کر واپس آ جاؤں گی۔“
اور روہنی یعنی سلطانہ غائب ہو گئی۔

بہمنی میں مجھے اپنے دوست جمشید کے پاس رہتے ہوئے روہنی کے جانے کے بعد مزید ایک ہفتہ گزر گیا۔ ایک دن جمشید مجھے کہنے لگا۔ ”فیروز! تمہارے دیزے کی مدت ایک ماہ ہے۔ اس میں باقی دس گیارہ دن ہی رہ گئے ہیں۔ بہمنی میں کئی تاریخی مقامات ایسے ہیں جو تم نے ابھی تک نہیں دیکھے۔ ان میں ایلورا کے قدیم غار بھی ہیں۔

میں نے کہا۔ ”ہاں یار! میں نے ان کا نام تو سنا ہوا ہے۔ ان غاروں میں کیا ہے؟“
جمشید نے کہا۔ ”ان غاروں کی تاریخ یہ ہے کہ جب ہندوستان میں مہاتما گوتم بدھ کا بدھ مت بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا تو یہاں کے ہندو دھرم کے برہمنوں کو بڑی تشویش ہوئی کہ اگر بدھ مت اسی طرح پھیلتا چلا گیا تو ان کا ہندو مت ختم ہو کر رہ جائے گا۔ مگر برہمن کچھ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہندوستان میں راجہ اشوک کی حکومت تھی جو بدھ مت کا ماننے والا تھا اور جس کی وجہ سے بدھ مت کو بڑا فروغ مل رہا تھا۔ لیکن بادشاہ اور راجا ہمیشہ حکومت نہیں کرتے رہتے۔ ایک نہ ایک دن وہ مر جاتے ہیں۔ چنانچہ راجہ اشوک بھی انتقال کر گیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے برہمن سیناپتی نے تخت پر قبضہ کر لیا اور بدھ مت کی جگہ ہندو مت کو سرکاری مذہب بنالیا۔ اس کے ساتھ ہی برہمن ازم کو ایک بار پھر عروج حاصل ہونا شروع ہو گیا۔ برہمن نواز ہندو سیناپتی راجہ کے حکم سے ملک میں سے بدھ مت کی تمام نشانیاں مٹا دی گئیں۔ بدھ مت والوں کی تمام خانقاہیں اور عبادت گاہیں مسمار کر دی گئیں اور بدھ راہبوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ کئی راہبوں کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ سینکڑوں کی تعداد میں بدھ راہب جنہیں بھکشو کہتے ہیں ملک سے فراڑ ہو گئے اور انہوں نے سری لنکا اور ہند چینی اور تبت میں جا کر پناہ لی۔ کچھ بدھ راہب ایسے تھے کہ

ہم تین دن تک جنگل میں شکار کھیلتے رہے۔ اس دوران روہنی میرے ساتھ رہ کر میری حفاظت کرتی رہی۔ پھر ہم واپس بہمنی آ گئے۔ بہمنی آنے کے بعد روہنی نے مجھے کہا۔ ”شیردان! تمہیں اکیلا چھوڑ کر جانے کو میرا دل تو نہیں چاہتا لیکن میرا جانا بھی بڑا ضروری ہے۔ ہمارے دشمن پجاری رگھو اور نتالیا کا آسیب ہمارے خلاف ضرور کوئی خطرناک منصوبہ بندی کر رہے ہوں گے۔ ہمیں اُن سے بے خبر نہیں رہنا چاہئے۔ میں پتہ لگانا چاہتی ہوں کہ وہ ہمارے خلاف کیا سازشیں کر رہے ہیں اور کیا چال چلنے والے ہیں تاکہ ہم پہلے سے اس کا دفاع سوچ لیں۔“
”مگر تم کہاں جاؤ گی؟“ میں نے روہنی سے پوچھا۔

وہ کہنے لگی۔ ”یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔ لیکن اتنا تم یقین رکھو کہ مجھے کچھ نہیں ہو گا اور میں اپنے اور تمہارے دشمنوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر کے ہی آؤں گی۔“
میں نے اُس سے پوچھا۔ ”کیا میں اس جگہ تمہارا انتظار کروں؟“

اس نے کہا۔ ”اس سے محفوظ جگہ میرے خیال میں تمہارے لئے اور کوئی نہیں ہے۔ تم بالکل فکر نہ کرنا۔ میں درمیان میں آ کر تم سے ملتی رہوں گی اور تمہاری خیریت معلوم کرتی رہوں گی۔ لیکن ایک بات کا خاص خیال رکھنا اور وہ یہ کہ اپنے بازو سے اللہ کے پاک نام والا تعویذ کسی حالت میں بھی اپنے سے الگ نہ کرنا۔“
میں نے کہا۔ ”میں اسے کبھی اپنے سے جدا نہیں کروں گا۔ تم بے فکر ہو۔“
روہنی نے کہا۔ ”اب میں جا رہی ہوں۔ بہت جلد میں اپنے دشمنوں کے ناپاک

جن کے دل میں خیال آیا کہ انہیں ہندوستان سے فرار نہیں ہونا چاہئے۔ اس طرح سے تو ہندوستان میں بدھ مذہب کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا وہ سرعام اپنے مذہب کی اشاعت تو کر نہیں سکتے تھے انہوں نے کیا کیا کہ بہمنی کے قریب سمندر میں پہاڑی غاروں میں جا کر چھپ گئے۔ ان غاروں میں انہوں نے گوتم بدھ کی زندگی کے مختلف واقعات اور اس کے اصولوں کو غار کی دیواروں کے پتھروں پر تراش کر لکھنا شروع کر دیا۔ کہتے ہیں کہ مہاتما گوتم بدھ کے یہ جان نثار بھکشو گیارہ برس تک ان غاروں میں رہے اور اس دور ان انہوں نے غاروں کی دیواروں پر مہاتما بدھ کے کئی یادگار بت تراشے اور مہاتما بدھ کی تعلیمات کو غار کی پتھریلی دیواروں پر کندہ کر دیا۔ وقت گزر تا گیا۔ ہندوستان کی سرزمین سے مہاتما گوتم بدھ کا بدھ مت بالکل ختم کر دیا گیا اور ہندو مت کا راج ہو گیا۔ برہمنوں نے ایک طرح سے پھر عروج حاصل کر لیا۔ ان کا راجہ کے درباروں میں اس قدر زیادہ عمل دخل تھا کہ راجہ ان کی مرضی پوچھے بغیر کوئی حکم صادر نہیں کر سکتا تھا۔ ان برہمنوں کو پتہ چلا کہ بہمنی کے ایلیور غاروں میں کچھ بدھ راہبوں نے گوتم بدھ کی زندگی کے حالات اور اس کی تعلیمات کندہ کی ہیں تو وہ فوراً غاروں میں پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے بدھ مت کی کئی مورتیاں اور مجسمے اور کندہ کی ہوئی تعلیمات توڑ پھوڑ ڈالیں اور ان کی جگہ ہندو دھرم کی دیوی دیوتاؤں کے عریاں مجسمے بنادیے۔ بس یہ ہے ایلیور کے غاروں کی مختصر سی تاریخ... کیا اب تم ایلیور کے غار دیکھنا پسند نہیں کرو گے؟“

میں نے فوراً کہا۔ ”کیوں نہیں۔ میں ابھی تمہارے ساتھ ایلیور کے غاروں میں چلنے کو تیار ہوں۔“

جمشید بولا۔ ”ایسا کرتے ہیں کہ سورج غروب ہونے کے بعد چلیں گے۔ آج مجھے دن میں کاروبار کے سلسلے میں ایک جگہ جانا ہے۔“

چنانچہ ہمارا سورج غروب ہونے کے بعد کا ایلیور کے تاریخی غار دیکھنے کا پروگرام

بن گیا۔ دوپہر کو جمشید اپنے کاروباری سلسلے میں کسی سے ملنے چلا گیا۔ وہ سورج غروب ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے واپس آ گیا۔ کہنے لگا۔ ”بس ہم چائے پی کر چل پڑیں گے۔“

میں نہادھو کر تیار ہو گیا۔ جمشید بھی منہ ہاتھ دھو کر آ گیا۔ ہم چائے منگوا کر پینے لگے۔ میں نے جمشید سے پوچھا۔ ”یہ ایلیور کے غار یہاں سے کتنی دور کس جنگل میں ہیں؟“

جمشید بولا۔ ”یہ جنگل میں نہیں بلکہ سمندر میں ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

جمشید کہنے لگا۔ ”جن پہاڑیوں کے اندر یہ غار ہیں وہ پہاڑیاں بہمنی کے ساحل سے کچھ فاصلے پر سمندر میں واقع ہیں۔ وہاں تک سینئر چلتے رہتے ہیں۔ دوسرے ملکوں کے سیاح دور دور سے یہ عجیب و غریب غار دیکھنے آتے ہیں۔“

یہ جان کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ ہمیں کسی دور دراز جنگل میں نہیں جانا پڑے گا۔ چائے پینے کے بعد جمشید نے عبدل سے کہا۔ ”جیپ باہر نکالو اور ہمیں گیٹ وے آف انڈیا تک چھوڑ آؤ۔“

گیٹ وے آف انڈیا بہمنی کے شمال جنوب میں ساحل سمندر پر ایک بارہ دری ہے جسے انگریزوں نے بنایا تھا۔ چونکہ انگریز ہندوستان میں سمندر کے راستے سے آئے تھے اس لئے انہوں نے یادگار کے طور پر یہ بارہ دری تعمیر کرائی تھی۔ یہ انگریزی طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔ چاروں طرف اس کے چوکور ستون ہیں۔ عقب میں سیڑھیاں سمندر میں اترتی ہیں جہاں ایک گھاٹ بنا ہوا ہے۔ اس گھاٹ پر سے لوگ کشتیوں اور سمیروں میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کو جاتے ہیں۔ ایلیور کے غاروں کو بھی اسی جگہ سے سینئر چلتے ہیں۔

عبدل ہمیں گیٹ وے آف انڈیا کی بارہ دری ٹائپ کی تاریخی عمارت کے پاس

چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ ہم نے پیچھے گھاٹ پر آکر ٹکٹ لئے اور ایلورا کے غاروں کی طرف جانے والے سینئر میں سوار ہو گئے۔ سینئر میں کچھ غیر ملکی سیاح مرد اور عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔ سینئر سمندر میں روانہ ہو گیا۔ ایلورا کے غاروں والی پہاڑیاں ساحل سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ ہم دس پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔

ایلورا کے کئی تاریخی غار تھے جو پہاڑیوں کے اندر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ ایک جگہ سے ہم نے ٹکٹ لئے اور پہلے غار میں داخل ہو گئے۔ یہ غار واقعی بڑے پراسرار تھے۔ ان کی چھتیں بہت اونچی تھیں اور دیواروں کو کھود کر کہیں پتھروں میں مورتیاں تراشی ہوئی تھیں اور کہیں راجہ کو دربار لگائے دکھایا گیا تھا۔ اگرچہ برہمنوں نے اپنے دور اقتدار میں بدھ مت کی بے شمار نشانیوں کو مٹا دیا تھا مگر پھر بھی کچھ ان کے ہاتھوں سے بچ گئی تھیں۔ ان میں مہاتما بدھ کی پیدائش سے لے کر ان کے گیان حاصل کرنے تک کے خاص خاص واقعات جو دیواروں پر تراشے گئے تھے ابھی تک صحیح حالت میں موجود تھے۔ کئی جگہوں پر گوتم بدھ کے بڑے بڑے بت بنے ہوئے تھے۔ پتھر کی وہ سلیں بھی محفوظ تھیں جن پر پالی زبان میں بدھ مت کی خاص خاص تعلیمات کندہ کی ہوئی تھیں لیکن زیادہ مورتیاں ہندو مت کی دیو مالا کی دیوتاؤں کی تھیں۔ دیواروں پر راجہ کے دربار میں دیو داسیوں کو رقص کرتے ہوئے بھی دکھایا گیا تھا۔

ہم نے گھوم پھر کر تین چار غار دیکھے پھر ذرا سانس لینے کے لئے ایک جگہ بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک گائیڈ عورت جس نے گائیڈ کی وردی پہنی ہوئی تھی ہمارے پاس آئی۔ ہمیں نمستے کیا اور بولی۔ ”سر! آپ نے ابھی تک شاید متھر اولی کا غار نہیں دیکھا۔ سر! اگر آپ نے متھر اولی غار کو نہیں دیکھا تو یقین کریں کہ آپ نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس غار کو دیکھنے دنیا بھر کے سیاح آتے ہیں اور غار کی تصویریں اتار کر لے جاتے ہیں۔“

میں تھک گیا تھا۔ ویسے بھی مجھے ان بتوں اور مورتیوں والے غاروں سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ جتنا دیکھنا تھا بس دیکھ لیا تھا لیکن جمشید اس قسم کی تفریحات کا بڑا دلدادہ تھا۔ کہنے لگا۔ ”اچھا؟ یہ متھر اولی کا غار کہاں پر ہے؟“

گائیڈ عورت نے کہا۔ ”سر! ان ہی پہاڑیوں میں ہے۔ یہاں سے آگے تیسرا غار ہے۔ میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو اس غار میں بنی ہوئی تصویروں کی تاریخ بھی بتاتی جاؤں گی۔ میری فیس کی پردہ نہ کریں۔ میں آپ سے کچھ نہیں لوں گی۔“

جمشید بڑا کفایت شعار تھا۔ یہ سن کر کہ وہ مفت میں متھر اولی غار کی سیر کرے گا فوراً چلنے کو تیار ہو گیا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی کہ میرا اس غار کی طرف جانے کو دل نہیں مانتا تھا مگر جمشید مجھے کھینچ کر اپنے ساتھ لے گیا۔

متھر اولی کا غار دوسرے غاروں کی نسبت زیادہ کشادہ نہیں تھا بالکل تنگ گلی کی طرح تھا۔ چھت بھی زیادہ اونچی نہیں تھی۔ کہیں کہیں دھبی روشنی والے بجلی کے بلب جل رہے تھے۔ دیواروں پر ان کی مدھم روشنی میں عجیب و غریب ہندو دیوی دیوتاؤں کی ابھری ہوئی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ غار میں داخل ہوتے ہیں میرے دل پر ایک بوجھ سا پڑ گیا۔ میرا دل فوراً وہاں سے واپس چلے جانے کو چاہا مگر جمشید کے شوق کو دیکھ کر میں خاموش رہا۔ جمشید بڑے اشتیاق کے ساتھ دیوار پر کندہ مورتیوں اور تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ گائیڈ عورت ایک ایک مورتی اور تصویر کا تاریخی پس منظر بیان کر رہی تھی۔ غار کی فضا میں مجھے گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں بادل ٹواستہ جمشید کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

گائیڈ عورت ایک تصویر کے پاس جا کر رُک گئی۔ اس تصویر میں ایک ڈانس کرنے والی نرتکی یا بوداسی ایک سانپ کو اپنے جسم کے ساتھ لپیٹے رقص کے پوز میں دکھائی گئی تھی۔ دونوں جانب عجیب ڈراؤنی شکلوں والے لوگ زمین پر چوکڑیاں مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ گائیڈ عورت نے کہا۔ ”یہ متھر اولی نرتکی ہے۔ کہتے ہیں یہ راجہ

بکرماجیت کے دربار میں سانپ کا رقص کیا کرتی تھی۔ جب یہ رقص کرتی تھی تو زمین کے نیچے پاتال سے راکھشش اس کا رقص دیکھنے آ جاتے تھے۔ اس تصویر میں آپ کو دونوں جانب جو ڈراؤنی شکل والے بت نظر آرہے ہیں یہ پاتال کے راکھشش ہیں۔ راجہ بکرماجیت ان راکھششوں کی بڑی سیوا کرتا تھا اور اپنا تخت چھوڑ کر چلا جاتا تھا تاکہ پاتال کے راکھشش اکیلے بیٹھ کر مٹھراؤلی کا نرت دیکھیں۔ اس تصویر میں وہ سامنے ایک تخت خالی پڑا ہے یہ راجہ کا تخت ہے جو راکھششوں کے آنے کے بعد تخت چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

جشید نے پوچھا۔ ”یہ عورت جس کا نام تم نے مٹھراؤلی بتایا ہے، سانپ جسم کے گرد لپیٹ کر کیوں رقص کر رہی ہے؟ کیا یہ کوئی خاص ڈانس تھا؟“

گائیڈ عورت نے کہا۔ ”مٹھراؤلی نرتکی کے بارے میں پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ آگ کے دیوتا سے بیانی ہوئی تھی۔ مگر وہ راکھششوں سے بہت ڈرتی تھی اور ان کو اپنا رقص دکھانے ضرور ان کے پاس پاتال میں جایا کرتی تھی۔ اس کی خبر ناگ دیوتا کو ہو گئی۔ اس نے مٹھراؤلی نرتکی کو ڈس کر ہلاک کر دیا اور اس کی لاش پاتال کے ایک گہرے غار میں پھینک دی۔ پاتال کے راکھششوں کو جب پتہ چلا کہ ناگ دیوتا نے حسد میں آکر ان کی پسندیدہ نرتکی مٹھراؤلی کو ہلاک کر دیا ہے تو وہ اس غار میں پہنچ گئے جہاں مٹھراؤلی نرتکی کی لاش پڑی تھی۔

ہندو دیو بالاکی کتابوں میں لکھا ہے کہ راکھششوں نے اپنے جادو کے زور سے مٹھراؤلی کو پھر سے زندہ کر دیا اور اسے بکرماجیت کے دربار میں لے گئے اور راجہ سے کہا کہ یہ مٹھراؤلی نرتکی ہے۔ ہمیں اس کا نرت اچھا لگتا ہے ہم اس کا نرت دیکھنے تمہارے دربار میں آ جایا کریں گے۔ اس وقت دربار میں ہمارے اور نرتکی مٹھرا کے سو اور کوئی نہیں ہونا چاہئے۔ راجہ نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ مہان دیوتاؤ! ایسا ہی ہو گا۔ یہ میرے لئے بڑے سوبھاگ کی بات ہے کہ آپ میرے دربار میں پدھاریں گے۔

اس کے بعد مٹھراؤلی نرتکی صرف اس وقت ڈانس کرتی جب راکھششوں نے آنا ہوتا تھا۔“

جشید نے پوچھا۔ ”یہ سانپ جو اس عورت نے اپنے جسم پر لپیٹا ہوا ہے کیا یہ ناگ دیوتا ہے؟“

گائیڈ عورت نے کہا۔ ”نہیں۔ یہ ناگ دیوتا نہیں ہے بلکہ ناگ دیوتا کی طرف سے مٹھراؤلی کی نگرانی کرنے والا سانپ ہے۔ ناگ دیوتا پاتال کے راکھششوں کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی پتی مٹھراؤلی کو راکھشش اپنے ساتھ پاتال میں لے جائیں۔ چنانچہ اس نے خفیہ طور پر ایک زہریلا سانپ مٹھراؤلی کے جسم کے گرد لپیٹ دیا اور مٹھراؤلی کو خبردار کر دیا کہ اگر کبھی اس نے کسی راکھشش کے ساتھ پاتال میں جانے کا ارادہ کیا یا کسی راکھشش سے کوئی بات کی تو یہ سانپ اسی وقت اسے ڈس لے گا اور یہ سانپ اتنا زہریلا ہے کہ اس کے ڈستے ہی مٹھراؤلی کے جسم کو آگ لگ جائے گی اور وہ جل کر راکھ ہو جائے گی۔ اس وجہ سے مٹھراؤلی مجبور تھی کہ سانپ کو ہر وقت اپنے جسم کے ساتھ لگائے رکھے کیونکہ سانپ نے اسے کہہ دیا تھا کہ میں ہر وقت تمہارے جسم سے لپٹا رہوں گا۔ ایک لمحے کے لئے بھی تم سے الگ نہیں ہوں گا۔“

میں اس گائیڈ کی خرافات سنتے سنتے تنگ آ گیا تھا۔ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”تم یہ کیا کٹھا کہانی لے بیٹھی ہو۔ ہمیں ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ چلو جشید واپس چلو۔“

گائیڈ عورت نے میری طرف چونک کر دیکھا اور اس لمحے مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے اس نے پہلی بار مجھے دیکھا ہو اور مجھے اس جگہ دیکھ کر حیران ہو رہی ہو۔ اس کے چہرے پر مجھے حیرت کے ساتھ خوف کا غصہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مہاراج! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کو

پہچانا نہیں تھا۔“

اس کے ساتھ ہی ہندو گائیڈ عورت نے ہاتھ جوڑ کر میرے آگے سر جھکا لیا اور منہ ہی منہ میں سنسکرت کا کوئی اشلوک پڑھا۔ جمشید کو تو حیران ہونا ہی تھا میں خود حیران ہو کر اس عورت کو دیکھنے لگا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے لیکن میں نے اس کے عجیب سے جملے پر زیادہ غور نہ کیا اور جمشید کا بازو پکڑ کر واپس چل پڑا۔ جمشید میرے ساتھ چل پڑا۔ کہنے لگا۔ ”اس عورت نے تمہیں یہ کیا کہہ دیا کہ مہاراج مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ارے یہ سب ان لوگوں کی ڈرامہ بازی ہے۔ یہ اس طرح کی باتیں نہ کریں تو لوگ ان کی باتوں پر اعتبار کیسے کریں اور یہ ان سیاحوں سے پیسے کیسے بٹوریں؟“

جمشید بولا۔ ”لیکن اس نے تو ہم سے کچھ بھی نہیں مانگا تھا۔“

”یہ بھی اس کا ایک ڈھونگ تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

کہنے کو تو میں نے جمشید سے یہ کہہ دیا تھا لیکن دل میں سوچنے لگا تھا کہ اس عورت کو کہیں پتہ تو نہیں چل گیا کہ میرا تعلق بدروحوں اور آسیبوں کی دنیا سے کسی نے کسی صورت میں رہا ہے۔ یہ ہندو گائیڈ عورت ہندوؤں کی دیومالا کے ماحول میں رہنے والی عورت تھی۔ ہو سکتا ہے اس ماحول میں رہتے رہتے اس میں اتنا شعور پیدا ہو گیا ہو اور وہ ایسے لوگوں کو پہچان لیتی ہو جن کا تعلق دیومالائی ماحول سے وابستہ ہو یا وابستہ رہا ہو۔“

ہم ایلورا کے غاروں سے باہر نکل آئے۔

باہر آکر جمشید نے کہا۔ ”میرا خیال ہے اس عورت نے محض ڈرامہ بازی ہی کی ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”جمشید! ان لوگوں کا کاروبار ہی یہی ہے۔ یہ اس قسم کی باتیں

کریں تو ان کو کوئی نہ پوچھے اور سیاح خود ہی غاروں کی سیر کرتے رہیں۔“

ہم سینئر میں بیٹھ کر گیٹ وے آف انڈیا آگئے۔ یہاں سے ہم نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اپنے فلیٹ پر آگئے۔ اس وقت رات کا پہلا پہر شروع ہو چکا تھا۔ جمشید کا آٹو درکشاپ اور گیراج رات دس گیارہ بجے تک کھلا رہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد دس بجے تک میں درکشاپ میں ہی جمشید کے پاس بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میں نے جمشید سے کہا۔ ”میں تو سونے جا رہا ہوں۔ بڑی نیند آرہی ہے۔“

جمشید بولا۔ ”بس میں بھی تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔“

میں اوپر کمرے میں آکر پلنگ پر لیٹ گیا اور ایلورا کے غار کی گائیڈ عورت کے جملے پر غور کرنے لگا کہ اس نے مجھے جو کچھ کہا تھا اس میں واقعی کچھ حقیقت تھی کہ وہ محض ڈرامہ بازی کر رہی تھی۔ اصل میں میں ایسے ایسے حالات سے گزرا تھا بلکہ گزر رہا تھا کہ جس پر انسانی عقل مشکل ہی سے یقین کر سکتی تھی بلکہ عقل یقین کر ہی نہیں سکتی تھی۔ سوچنے لگا ہو سکتا ہے اس گائیڈ عورت نے میرے چہرے پر کسی بدروح کے سائے کو گزرتے دیکھ لیا ہو۔ آخر بدروحیں اور آسیب میرے پیچھے تو لگی ہوئی ہی تھیں۔ جب میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو میں نے ٹیبل لیپ بچھایا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ابھی میں بیداری اور نیند کی درمیانی حالت میں ہی تھا کہ اچانک مجھے روہنی کے جسم سے آنے والی خوشبو کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ٹیبل لیپ اپنے آپ روشن ہو گیا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ میرے سامنے روہنی کھڑی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور روہنی سے کہا۔ ”سلطانہ! اچھا ہوا تم آگئیں۔ اس وقت مجھے تمہاری ہی ضرورت تھی۔“

روہنی کے چہرے پر ایک پراسرار سا تبسم تھا۔ وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی

اور مجھے ٹکٹلی باندھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”آج میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا۔۔۔۔۔“

روہنی کے چہرے کا تبسم غائب ہو گیا۔ اُس نے سنجیدہ آواز میں کہا۔ ”شیروان! مجھے معلوم ہے تمہارے ساتھ کیا واقعہ ہوا ہے۔ تمہیں ایلورا کے غاروں میں نہیں جانا چاہئے تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم وہاں سے صحیح سلامت واپس آ گئے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”سلطانہ! میں وہاں نہیں جانا چاہتا تھا جشید مجھے زبردستی لے گیا تھا۔“

روہنی نے مجھے ہلکی سی ڈانٹ کے ساتھ کہا۔ ”تمہیں کوئی زبردستی موت کے منہ میں لے جائے گا تو کیا تم اس کے ساتھ چل پڑو گے؟ تم نے سخت غلطی کی تھی۔ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ تم وہاں سے بچ کر آ گئے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اس قسم کی جگہیں جہاں دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں اور بت ہوں منحوس ہوتی ہیں؟ اور تم خاص طور پر جس قسم کے حالات سے گزر رہے ہو تمہیں تو ایسی جگہوں میں جانے کا نام بھی نہیں لینا چاہئے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے معاف کر دو سلطانہ! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ وعدہ کرتا ہوں آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں ہوگی۔ اب میں اس کمرے سے باہر قدم بھی نہیں رکھوں گا۔“

روہنی خاموش ہو گئی۔ پھر کہنے لگی۔ ”مجھے تو جیسے ہی پتہ چلا کہ تم ایلورا کے غاروں میں گئے ہو میں اسی وقت واپس روانہ ہو پڑی تھی۔ مجھے بمبئی کی فضا میں داخل ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ تم خیریت کے ساتھ اس منحوس جگہ سے واپس اپنے فلیٹ پر پہنچ گئے ہو اور میں سیدھی تمہارے پاس آ گئی۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا بابا! اب مجھے معاف بھی کر دو۔ کہہ دیا ناں کہ میں آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا۔“

روہنی نے محبت بھری ناراضگی کے لہجے میں کہا۔ ”شیروان! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے تمہارا کس قدر خیال لگا رہتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں تمہیں ان حالات سے نکلانے کے لئے کتنی جدوجہد کر رہی ہوں۔ یقین کرو میں ایسے ایسے خطرات مول لے رہی ہو جن کا میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ صرف اور صرف تمہاری خاطر۔۔۔۔۔ میں تو ایک روح ہی ہوں۔ پہلے ایک بری روح تھی اب ایک ایسی روح ہوں جس کو معافی مل چکی ہے اور جس کے گناہ اُس سے الگ کر دیئے گئے ہیں۔ پھر بھی میں ایک روح ہی ہوں۔ تم ایک زندہ انسان ہو۔ میں تو ہر قسم کے حالات میں اپنا بچاؤ کر سکتی ہوں مگر تم بعض حالات میں اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے۔ آج تم ایسے ہی حالات میں پھنس گئے تھے کہ جہاں سے اپنا بچاؤ کرنا تمہاری طاقت سے باہر تھا۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ کسی غیبی طاقت نے تمہاری مدد کی ہے اور تم ان خطرناک اور منحوس غاروں سے زندہ بچ کر واپس آ گئے ہو۔“

پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بڑے درد کے ساتھ کہا۔ ”فیروز! میں جانتی ہوں تم حقیقت میں شیروان نہیں ہو۔ مگر تمہارا نقش ہو بہو شیروان کا ہے۔ مجھے تمہاری آواز میں، تمہاری آنکھوں میں اور تمہارے بات کرنے کے انداز میں شیروان ہی نظر آتا ہے۔ شیروان میرا محبوب بھی تھا اور میرا خاوند بھی تھا۔ اس نے مجھے اتنا پیار دیا تھا کہ میں اس کے پیار کو مرنے کے بعد بھی نہیں بھلا سکی ہوں۔ میں تم میں اپنے شیروان کو ہی دیکھ رہی ہوں اور نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو خدا جانے پھر میں تمہاری شکل بھی دیکھ سکوں یا نہ دیکھ سکوں۔“

روہنی کی آواز اتنی اداس ہو گئی کہ اسے تسلی دینا میرا فرض بن گیا۔ میں نے کہا۔ ”سلطانہ! میں تم سے ایک بار پھر وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ اگر تم کہو گی تو میں اس وقت تک اپنے آپ کو اس کمرے

میں بند کر لوں گا جب تک کہ تم ہمارے دشمنوں رگھو کی بدروح اور نتالیا کے آسیب کا کام ختم نہیں کر لیتیں۔“

روہنی کے چہرے پر تبسم نمودار ہو گیا۔ کہنے لگی۔ ”ٹھیک ہے۔ مجھے تم پر اعتبار آ گیا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم اس کمرے میں بند ہو کر رہ جاؤ۔ بے شک باہر نکل کر چلو پھرو۔ لیکن کسی خطرے والی جگہ پر مت جاؤ۔ خواہ وہ کوئی جنگل ہو، کوئی غار ہو، کوئی پرانی حویلی ہو، کوئی اجاڑ، دیران کھنڈر ہو یا کوئی ویران تاریخی قلعہ ہو۔ بمبئی میں بے شمار تفریحی جگہیں ہیں۔ پارک ہیں، ریستوران ہیں۔ تم جمشید کے ساتھ وہاں جا کر اپنا دل بہلا سکتے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”میں تمہاری ہدایات پر پورا عمل کروں گا۔ اب مجھے بتاؤ کہ تم نے دشمنوں کی کہاں تک سراغ رسانی کی ہے؟ کیا کچھ پتہ چلا کہ نتالیا اور رگھو کی بدروح ہمارے خلاف کیا سازش کر رہی ہیں؟“

روہنی بولی۔ ”مجھے کافی حد تک ان کی سازشوں کا پتہ لگ چکا ہے۔ میں دو ایک دن میں تمہارے پاس تمہیں اور زیادہ محتاط رہنے کی ہدایت کرنے آنے ہی والی تھی۔ یہ تو مجھے اچانک آنا پڑ گیا تاکہ تمہیں منع کروں کہ آئندہ ایلورا کے غاروں کی قسم کی کسی جگہ پر مت جانا۔“

”نتالیا اور رگھو ہمارے خلاف کیا سازش کر رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

روہنی نے کہا۔ ”وقت آنے پر میں تمہیں خبردار کر دوں گی بلکہ میں خود تمہاری حفاظت کے لئے تمہارے پاس آ جاؤں گی۔ ابھی میں تمہیں صرف یہی کہوں گی کہ وہ مجھے اور خاص طور پر تمہیں اپنے قبضے میں کرنے کے لئے بڑا خطرناک جال بچھانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”سلطانہ! کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی خطرناک سازشوں میں کامیاب ہو

جائیں۔“

روہنی بولی۔ ”جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ میں عین وقت پر تمہیں آنے والی مصیبت سے دور لے جاؤں گی۔ بس تم میری ہدایات پر عمل کرتے رہنا۔“

”وہ تو میں کرتا رہوں گا۔“ میں نے اس کی تسلی کرتے ہوئے کہا۔

روہنی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی۔ ”اب تم آرام سے سو جاؤ۔ میں پھر آؤں گی۔“

میں نے کہا۔ ”اب مجھے بالکل نیند نہیں آرہی۔“

اُس نے کہا۔ ”تو پھر چلو کسی جگہ چل کر تھوڑی سیر کرتے ہیں۔ میری بھی لفریح ہو جائے گی۔“

میں نے کہا۔ ”کہاں جائیں گے؟“

روہنی نے کہا۔ ”کہیں کسی باغ میں سمندر کے کنارے چلے چلتے ہیں۔ بمبئی میں بڑے باغ ہیں۔ چلو بال کیشر گارڈن چلتے ہیں وہاں سے سمندر کا منظر رات کے وقت بڑا خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔“

مجھے خود بال کیشر گارڈن بہت پسند تھے۔ یہ چوپاٹی کے شروع میں ایک بلند پہاڑی پر واقع تھے اور اوپر سے دور تک سمندر نظر آتا تھا۔ رات کے وقت میرین ڈرائیو کی قیوں اور فلیٹوں کی روشنیاں سمندر میں پڑتی تھیں تو وہ منظر اور زیادہ دلکش ہو جاتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”چلو وہیں چلتے ہیں۔“

پھر مجھے جمشید کا خیال آ گیا کہ وہ تو ابھی نیچے گیراج میں ہی ہے۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”میں نیچے جمشید کو کہہ دیتا ہوں کہ سمندر کی سیر کرنے جا رہا ہوں۔“

روہنی ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔ ”وہ کیا سوچے گا کہ تم رات کے گیارہ بجے سمندر پر کیا کرنے جا رہے ہو؟ اس کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم یہیں اس کھڑکی سے باہر نکل جاتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے۔ میں جی بھادیتا ہوں۔ دروازے کو اندر سے کنڈی لگی ہوئی ہے وہ یہی سمجھے گا کہ میں سو گیا ہوں۔“
روہنی نے کہا۔ ”میرا ہاتھ پکڑ لو۔“

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہاتھ پکڑتے ہی روہنی کے ساتھ میں بھی غائب ہو گیا۔ ہم نے کھڑکی میں سے باہر بڑے آرام سے چھلانگ لگا دی اور نیچے گرنے کی بجائے ہوا میں تیرتے ہوئے اوپر کی طرف بلند ہونے لگے۔ ایک خاص بلندی پر پہنچ کر روہنی مجھے ساتھ لے کر بال کیشر گارڈنز کی سمت پرواز کرنے لگی۔

O

ہم بال کیشر گارڈنز میں آکر اتر گئے۔
ایک جگہ جہاں سے نیچے سمندر میں میرین ڈرائیو کی روشنیوں کا جھللاتا ہوا عکس نظر آ رہا تھا ہم ایک بیچ پر بیٹھ گئے۔ بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ وہاں اترنے کے بعد ہم دونوں اپنی انسانی شکلوں میں واپس آ گئے۔

روہنی کہنے لگی۔ ”آج سے تین سو برس پہلے جس زمانے میں، میں زندہ تھی اور ہماری ریاست جھانسی کے قریب ہوا کرتی تھی بمبئی کا شہر ایسا نہیں تھا۔ تب یہ ایک ساحلی بستی تھی جہاں سے بصرہ اور ایران سے سمندری جہاز مال لے کر آیا کرتے تھے۔ اس وقت میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ یہ شہر کبھی ایسا بن جائے گا۔“
میں نے کہا۔ ”مجھے سمندر دیکھ کر اپنے وطن پاکستان کا سمندر اور کراچی کا روشنیوں والا شہر یاد آ گیا ہے۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”پاکستان بھی بڑا خوبصورت ملک ہے۔ وہاں کے لوگ بڑے بہادر اور غیرت مند لوگ ہیں۔ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے اور انشاء اللہ اسلام کے ساتھ ہی تاقیامت سلامت رہے گا۔ تم نے ٹھیک کہا۔ کراچی شہر بھی بڑا خوبصورت ہے۔ خاص طور پر رات کے وقت تو کلفٹن پر اس کی رونقیں دیکھنے والی ہوتی ہیں۔“
ہم اس قسم کی چھوٹی چھوٹی معصوم معصوم باتیں کرتے رہے۔ ایسی باتیں جن کا بدروحوں اور آسیہوں کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس سے میرے ذہن کو بھی کافی سکون مل رہا تھا۔ لیکن میری توقع کے خلاف روہنی نے اچانک موضوع بدل کر

نتالیا کے آسیب کی بات شروع کر دی۔

کہنے لگی۔ ”اس دفعہ نتالیا کا آسیب اپنی غلام بدروحوں کی مدد سے تمہیں اپنے قبضے میں کرنے کے لئے جو سازش کر رہا ہے وہ اتنی خفیہ رکھی جا رہی ہے کہ میں کوشش کے باوجود اس کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔“

میں نے کہا۔ ”تم تو ایک روح ہو۔ تم تو ان کے درمیان غائب ہو کر جاسکتی ہو۔“
روہنی کہنے لگی۔ ”یہی تو میرے لئے سب سے بڑی مشکل ہے کہ میں ایک ایسی روح ہوں جس پر نتالیا کا آسیب قریب دیکھ کر حملہ کر سکتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مگر سلطانہ! تم تو کہتی تھیں کہ کوئی بدروح اور آسیب تمہارے قریب نہیں آسکتا۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”میں نے تمہیں صحیح کہا تھا کہ کوئی بدروح اور آسیب ایک اچھی روح کے قریب آتے ہوئے ڈرتی ہے۔ لیکن مجھے ان بدروحوں کا خاتمہ کرنا ہے جس کے لئے مجھے ان پر وار کرنے کے لئے ان کے قریب جانا ہو گا۔ جب میں ان کے قریب جا کر ان پر وار کروں گی تو جواب میں وہ بھی مجھے نقصان پہنچا سکتی ہیں۔“

”پھر اس کا کیا علاج ہے؟“ میں نے پوچھا۔

روہنی نے ایک لمحے کے لئے توقف کیا اور بولی۔ ”ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ میں شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لوں۔ اگر یہ انگوٹھی میرے پاس ہوئی تو بدروح مجھ پر قریب سے بھی حملہ نہیں کر سکے گی۔“

میں نے کہا۔ ”اگر ایسا ہو سکتا ہے تو تم ابھی یہ انگوٹھی پہن لو۔“ اور میں نے شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی انگلی میں سے اتار کر روہنی کو دے دی۔ اس نے فوراً اپنی انگلی میں پہن لی اور کہا۔ ”شیر وان! تم نے انگوٹھی مجھے دے دی ہے، اب تمہاری دفاعی طاقت آدھی رہ جائے گی۔“

میں نے کہا۔ ”میرے بازو پر اللہ کے پاک نام کا جو تعویذ بندھا ہوا ہے میرے

لئے وہی کافی ہے۔“

روہنی کہنے لگی۔ ”بے شک وہ تمہیں بدروحوں کے ہاتھوں کوئی گزند نہیں پہنچے دے گا۔ لیکن ایک خیال میرے ذہن میں آ رہا ہے۔“
”کون سا خیال؟“ میں نے روہنی سے پوچھا۔

وہ بولی۔ ”کیوں نہ میں اس تعویذ پر ایک خفیہ دُعا پڑھ کر پھونک ماروں؟ اس طرح سے اس تعویذ کی طاقت میں زبردست اضافہ ہو جائے گا۔“

مجھے روہنی کی یہ بات پسند نہ آئی۔ میں نے کہا۔ ”نہیں نہیں سلطانہ! میرے لئے اللہ کا نام ہی کافی ہے۔ یہی میری حفاظت کرے گا اور پھر میں اسے کوئی تعویذ نہیں سمجھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے بازو پر اللہ کا پاک نام لکھا ہوا ہے اور وہی میرا حافظ و مددگار ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”تمہارے ایمان کی پختگی پر مجھے کبھی کبھی رشک آنے لگتا ہے۔ میں خود تمہارے خیالات کی حامی ہوں۔ لیکن ہمارا واسطہ بری روحوں اور ایک خطرناک آسیب سے ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ حالات کے مطابق دفاعی حکمت عملی میں رد و بدل کرتے رہیں۔ خدا نہ کرے کہ تم کسی لمحے غافل ہو جاؤ اور تمہیں غافل پا کر نتالیا کا آسیب تم پر وار کرنے میں کامیاب ہو جائے۔“
”پھر تم کیا چاہتی ہو؟“ میں نے روہنی سے سوال کیا۔

روہنی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ مجھے تعویذ پر خفیہ دُعا پڑھ کر پھونک مار ہی دینی چاہئے۔ اس سے تمہیں نقصان تو کچھ نہیں ہو گا لیکن وقت پڑنے پر فائدہ ضرور ہو گا۔“

میں نے کہا۔ ”اگر تم سمجھتی ہو کہ ایسا ضروری ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“ اور میں نے اپنے دائیں بازو پر سے تعویذ اتار کر روہنی کو دے دیا۔ شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی میں اسے پہلے ہی دے چکا تھا۔ اب تعویذ بھی اسے دے دیا تھا

اور میں نہتا ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن مجھے ذرا سی بھی فکر نہیں تھی۔ میری محافظ اور خیر خواہ روہنی میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی مجھے کوئی فکر ہونی ہی نہیں چاہئے تھی۔ روہنی نے تعویذ مجھ سے پلے لیا۔ جیسے ہی روہنی نے تعویذ اپنے ہاتھ میں لیا تعویذ بجلی کی چمک کے ساتھ غائب ہو گیا۔ میں نے حیران ہو کر روہنی سے پوچھا۔ ”سلطانہ! تعویذ غائب کیوں ہو گیا؟“

میرے دیکھتے دیکھتے روہنی کی شکل تبدیل ہو گئی۔ وہ چیخ مار کر کھڑی ہو گئی۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ میرے سامنے روہنی کی بجائے نتالیا کھڑی تھی۔ اُس نے ڈراؤنی آواز میں کہا۔ ”تعویذ اس لئے غائب ہو گیا کہ میں تمہاری سلطانہ نہیں ہوں بلکہ نتالیا ہوں۔ میں نے تمہیں کہا تھا فیروز تم مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جاسکو گے۔ تم جہاں بھی جاؤ گے میں تمہیں ڈھونڈ نکالوں گی اور تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گی۔ تم نے مجھ سے بچنے کے لئے اپنے ارد گرد بہت دیواریں کھڑی کر لی تھیں لیکن تم بھول گئے تھے کہ تمہارا مقابلہ کسی بدروح سے نہیں بلکہ ایک آسیب سے ہے اور آسیب تمہاری روہنی کا روپ بدل کر بھی تم پر حملہ کر سکتا ہے۔ میں نے یہی کیا اور اس وقت تم میرے قبضے میں ہو۔“

میں اتنا خوف زدہ نہیں تھا جتنا میاوس اور اپنے آپ کو شکست خوردہ اور بے یار و مددگار محسوس کر رہا تھا۔ یہ منحوس آسیب اُس کا بھیس بدل کر مجھ پر حملہ آور ہوا تھا جس نے مجھے اس آسیب سے بچانا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کاش! مجھے پہلے پتہ چل جاتا کہ میرے سامنے میری ساتھی اور مددگار روہنی نہیں بیٹھی بلکہ نتالیا کا منحوس آسیب بیٹھا ہے۔ میں حیران تھا کہ نتالیا نے کس عیاری کے ساتھ مجھ سے پہلے شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی لی اور پھر میرے دفاع کا سب سے طاقتور ہتھیار اللہ کے پاک نام والا تعویذ بھی مجھ سے چھین لیا۔ مجھے تو اسی وقت شک پڑ گیا تھا کہ یہ روہنی کی نیک روح نہیں ہے جب مقدس نام والا تعویذ اُس کے ہاتھ سے غائب ہو گیا تھا

کیونکہ پاک تعویذ کسی بھی نجس بدروح کے پاس نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر جو ہونا تھا ہو گیا تھا۔ میرے سارے ہتھیار جن سے میں اپنا دفاع کر سکتا تھا میرے دشمن نے مجھ سے چھین لئے تھے۔ میں نے نتالیا سے کہا۔ ”نتالیا! تم آخر مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

اُس نے کہا۔ ”وہی جو ایک چنی اپنے پتی سے چاہتی ہے۔ میری تم سے شادی ہو چکی ہے میں چاہتی ہوں کہ تم ساری زندگی میرے ساتھ رہو اور میرے سوا کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔“

میں نے کہا۔ ”مگر یہ شادی جھوٹی تھی۔ یہ میری رضامندی کے بغیر ہوئی تھی۔ تم نے زبردستی مجھ سے شادی کی تھی۔“

نتالیا کی آواز ایک دم مردانہ آواز بن گئی۔ اس نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔ ”تم کون ہوتے ہو اپنی مرضی جتانے والے؟ ہاں میں نے اپنی مرضی سے تم سے شادی کی تھی۔ مجھے تمہاری رضامندی کی پرواہ نہیں ہے۔ جب کوئی آسیب کسی مرد یا عورت کو پسند کر لیتا ہے تو پھر وہ اُسے ہمیشہ کے لئے اپنے پاس لے آتا ہے۔ اُسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ جس کو اُس نے پسند کیا ہے وہ اس کے پاس رہنا چاہتا ہے یا نہیں رہنا چاہتا۔“

میں بھی غصے میں آ گیا۔ میں نے کہا۔ ”یہ بات ہے تو پھر میں بھی اپنی مرضی کروں گا۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔“

نتالیا کی آواز عورت کی آواز میں بدل گئی۔ اُس نے ایک ہلکا سا ہتھکڑی لگایا اور بولی۔ ”فیروز! تم نے میری طاقت کو ابھی تک نہیں دیکھا۔ تم نے میرا صرف دلہن کا روپ دیکھا ہے۔ تم نے مجھے آسیب کی شکل میں نہیں دیکھا۔ لیکن میں اپنا آئینی روپ ابھی تمہیں دکھاؤں گی بھی نہیں کیونکہ تم ایک بے بس انسان ہو اور میں اپنے عورت کے روپ میں ہی تمہیں اٹھا کر لے جاسکتی ہوں۔“

میں نے ایک بار پھر غصیلی آواز میں کہا۔ ”میں نہیں جاؤں گا۔“

اور اس کے ساتھ ہی میں وہاں سے دوڑ پڑا۔ مجھے اپنے پیچھے نتالیا کے تہقہ کی آواز سنائی دی۔ رات کا وقت تھا۔ بال کیشر گارڈز خالی پڑا تھا۔ یہ باغ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں پہاڑی کے اوپر واقع ہے میں ڈھلان پر درختوں کے نیچے جھاڑیوں کو پھلانگتا جتنی تیزی سے بھاگ سکتا تھا بھاگ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں نتالیا کے آسیب سے دُور نکل آیا ہوں۔ لیکن یہ میرا خیال خام تھا۔

دوڑتے دوڑتے اچانک میرے پاؤں بھاری ہونا شروع ہو گئے۔ پھر میری ٹانگیں بھی بو جھل ہونا شروع ہو گئیں۔ میری رفتار اپنے آپ آہستہ ہو گئی۔ اب میں ایسے دوڑ رہا تھا جیسے فلموں میں کسی کو سلوموشن میں دوڑتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ پھر اچانک نتالیا میری بائیں جانب نمودار ہو گئی۔ وہ نہ دوڑ رہی تھی نہ چل رہی تھی۔ وہ زمین سے بلند ہو کر میرے ساتھ ساتھ فضا میں تیر رہی تھی۔ اُس نے کہا۔ ”فیروز! اس حالت میں تم کہاں تک دوڑو گے؟ کب تک دوڑو گے؟ تھک جاؤ گے اور میں تمہیں تھکانا نہیں چاہتی۔“

اور نتالیا نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ میرے بازو کو چھوا میرا جسم سن ہو گیا۔ پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں..... جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں ایک پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں۔ یہ پتھر کی دیواروں والا کمرہ ہے جس کی چھت کے ساتھ جلتی موم بتیوں والا فانوس روشن ہے۔ سامنے دیوار پر کسی انسان کی کھوپڑی لگی ہوئی ہے۔ کمرے کے کونوں میں اندھیرا ہے۔ نہ کوئی کھڑکی ہے نہ روشندان ہے۔ کوئی دروازہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے جسم کی نارمل توانائی واپس آچکی ہے۔

میں پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کمرے کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ بڑا پر اسرار ماحول تھا۔ خاموشی اتنی تھی کہ مجھے اپنی سانس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ جس مصیبت

سے میں بچتا پھر تا تھا وہ مجھ پر مسلط ہو گئی ہے۔ اب خدا ہی جس وقت چاہے گا مجھے اس مصیبت سے نکالے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت شاید ایسا نہ کر سکے۔ بال کیشر گارڈز میں بیٹھ کر روہنی کے ساتھ جو باتیں ہوئی تھیں وہ سب مجھے یاد آرہی تھیں۔ کاش مجھے علم ہو جاتا کہ یہ روہنی نہیں نتالیا ہے اور روہنی کا بھیس بدل کر مجھے اپنے قابو میں کرنے آئی ہے۔ مجھے اصلی روہنی یعنی سلطانہ کا خیال آنے لگا۔ خدا جانے وہ کہاں ہو گی اور جب واپس جمشید کے فلیٹ پر آئے گی تو مجھے وہاں نہ پا کر کیا سوچے گی کہ میں کہاں چلا گیا ہوں۔ کیا اُسے پتہ لگ سکے گا کہ مجھے نتالیا کا آسیب اغواء کر کے لے گیا ہوا ہے؟ شاید اسے پتہ چل جائے۔ شاید اسے پتہ نہ لگے۔ اگر اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ نتالیا کے آسیب نے مجھے کس جگہ قید کر رکھا ہے تو پھر میرا کیا ہو گا؟ میں یہاں سے کیسے فرار ہو سکوں گا؟ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ مجھے کسی بہت بڑی قبر میں بند کر دیا گیا ہے جس سے باہر نکلنے کے لئے کوئی دروازہ ہے، نہ روشندان ہے، نہ کوئی کھڑکی ہے۔

اتنے میں سامنے والی دیوار میں پھٹکی سی روشنی ہوئی اور میں نے نتالیا کو دیوار میں سے نکل کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ پلنگ پر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ مجھے اس کی مسکراہٹ کسی چڑیل کی مسکراہٹ معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”نتالیا! تم نے مجھے قید تو کر لیا ہے لیکن یاد رکھو میں یہاں سے ایک نہ ایک دن فرار ہونے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔“

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ تم یہاں سے بھاگ جانے کا خیال دل سے نکال دو۔ تم کچھ بھی کر لو گے میری قید سے آزاد نہ ہو سکو گے۔ تمہاری روہنی بھی اگر چاہے گی تو تمہاری مدد کو نہیں پہنچ سکے گی۔ اب تو وہ بدروح بھی نہیں رہی۔ اب تو اُس کے پاپ جھڑ گئے ہیں اور وہ ایک نیک آتما بن گئی ہے اور اچھی روحیں، نیک آتماں، بدروحوں اور آسیبوں کی دنیا میں کبھی داخل نہیں ہوتیں۔ وہ چاہیں بھی تو ایسا نہیں کر سکتیں۔“

میں نے کہا۔ ”روہنی نہ سہی لیکن میرا خدا تو میرے ساتھ ہے۔ وہ ضرور مجھے اس عذاب سے نکال دے گا۔“
 نتالیا کہنے لگی۔ ”مجھے نہیں امید کہ اب تمہارا خدا بھی تمہاری کوئی مدد کرے۔ کیونکہ تمہارے باپ، تمہارے گناہ تمہارے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ تم ایک کمزور اور گناہ گار انسان ہو۔ ہو سکتا ہے تمہیں تمہارے کسی گناہ کی سزا مل رہی ہو۔“
 میں نے کہا۔ ”خدا میرے گناہ ضرور معاف کر دے گا۔ میں نے تمہارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ کوئی گناہ نہیں کیا۔“

نتالیا کی مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی۔ اُس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”کیا تم نے روہنی کے ساتھ مل کر میری کھوپڑی کو زمین کے اندر سے نکال کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مجھے قتل کرنے کی کوشش نہیں کی؟ اس وقت تم مجھ سے بچ گئے تھے اس لئے کہ تمہارے ہاتھ میں شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی تھی اور تمہارے بازو پر وہ تعویذ بندھا ہوا تھا جس نے تمہیں بچالیا۔ مگر اب تمہارے پاس ان دونوں چیزوں میں سے ایک بھی نہیں ہے۔ اب تم میرے رحم و کرم پر ہو۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ اگر تمہیں پسند نہ کرتی ہوتی تو اس وقت میں تمہارا خون پی کر تمہارے جسم کے ٹکڑے کر کے کھا چکی ہوتی۔“

نتالیا کی آواز غضب ناک ہو کر مردانہ آواز میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”یاد رکھو! اگر تم یہاں سے بھاگنے کا خیال بھی دل میں لائے تو میری محبت، نفرت میں بدل جائے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح میری آواز بدل کر آسیب کی آواز بن گئی ہے اور اگر مجھے تم سے نفرت ہو گئی جو کسی وقت بھی ہو سکتی ہے تو تم زندہ نہیں رہو گے۔“

حقیقت یہ ہے کہ میں ڈر گیا۔ ایک تو نتالیا کی آواز بدل کر مردانہ آسیب کی آواز ہو گئی تھی۔ دوسرے اس آواز میں بڑی دہشت تھی اور اس نے مجھے میرا خون پی

جانے اور میرے جسم کے ٹکڑے کر کے کھا جانے کی دھمکی بھی دی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے ایسا کر سکتی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں علم تھا کہ اس کا تعلق جب وہ زندہ تھی تو افریقہ کے ایک آدم خور قبیلے سے تھا۔ اُس نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے بے گناہ انسانوں کو ہڑپ کیا تھا اور اُن کا خون پی کر انہیں موت کی نیند سلا دیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مرنے کے بعد اس کی روح نے ایک آسیب کی شکل اختیار کر لی تھی جو ایک روح کا سب سے کم تر اور عذاب والا درجہ بیان کیا جاتا ہے۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ نتالیا کے ساتھ مجھے محبت پیار سے ہی رہنا چاہئے تاکہ میں محبت پیار سے ہی یہ سراغ لگا سکوں کہ وہاں سے فرار ہونے کی کیا سبیل ہو سکتی ہے۔ پہلے بھی میں نے اسی حکمت عملی پر عمل کیا تھا اور انڈیا سے اسے ہنی مون منانے کے بہانے پاکستان کے شہر راولپنڈی لے گیا تھا اور پھر وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ اب بھی مجھے اسی حکمت عملی سے کام لینا چاہئے تھا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ یہ ظاہر کیا جیسے میں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ میں نے سر اٹھا کر نتالیا کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”نتالیا! آخر میں ایک زندہ انسان ہوں۔ کسی ایسی عورت کے ساتھ ساری زندگی کیسے گزار سکتا ہوں جس کے ساتھ مجھے محبت نہ ہو۔“

میرا تیر ٹھیک نشانے پر جا کر لگا تھا۔ نتالیا مسکرانے لگی۔ اُس کی آواز بھی عورت کی آواز میں تبدیل ہو گئی۔ اُس نے کہا۔ ”فیروز! تم مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتے؟ کیا میں خوبصورت نہیں ہوں؟ کیا میں تم سے محبت نہیں کرتی؟ اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ میں ہمیشہ جوان رہوں گی۔ مجھے نہ بڑھاپا آئے گا نہ موت ہی آئے گی۔ تمہیں اور کیا چاہئے؟“

میں نے کہا۔ ”لیکن میں تو بوڑھا ہو جاؤں گا اور ایک دن مجھے موت بھی آجائے گی۔ پھر تم کیا کرو گی؟“

نتالیا نے کہا۔ ”میں تمہیں بوڑھا نہیں ہونے دوں گی اور تمہیں موت سے بھی

ساتھ لائی ہو اور کیا میں تمہارے ساتھ ساری زندگی اسی بند کمرے میں گزار دوں گا؟

نتالیا نے بڑی لگاؤ کے ساتھ کہا۔ ”جب تم مجھ سے دل سے محبت کرنے لگو گے تو پھر تم یہاں سے باہر نکل کر اس دنیا کی سیر کر سکو گے جہاں میں تمہیں لے کر آئی ہوں۔ ابھی میرے ساتھ آؤ کم از کم میں تمہیں یہ ضرور دکھانا چاہتی ہوں کہ میں نے تمہیں کس جگہ رکھا ہوا ہے۔ آؤ۔“

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم دونوں پلنگ پر سے اتر کر سامنے والی دیوار کی طرف بڑھے۔ میں نے کہا۔ ”سامنے تو دیوار ہے۔ میں دیوار میں سے کیسے گزروں گا؟“

نتالیا نے کہا۔ ”تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے۔ تم میرے ساتھ ہی دیوار میں سے گزر جاؤ گے۔“

اور ایسا ہی ہوا۔ میں نتالیا کے ساتھ ہی دیوار میں سے گزر گیا۔ دیوار کی دوسری طرف آیا تو دیکھا کہ سامنے ایک تنگ زینہ ہے جو اوپر کو جاتا ہے۔ نتالیا مجھے ساتھ لے کر زینہ چڑھنے لگی۔ زینہ ختم ہوا تو سامنے پھر ایک دیوار آگئی۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر اس دیوار میں سے بھی نکل گئی۔ اب میں نے دیکھا کہ میں ایک شکستہ چبوترے کے پاس کھڑا ہوں جس کے اوپر درمیان میں ایک قبر بنی ہوئی ہے۔ قبر پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی ہے اور اس کے سرہانے کی جانب قبر کے اندر سے درخت کی ایک سوکھی ہوئی ٹہنی باہر نکلی ہوئی ہے اور ٹہنی کے اوپر ایک انسانی کھوپڑی ٹنگی ہوئی ہے۔

یہ دیکھ کر مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں کسی قبر کے اندر قید کر دیا گیا ہوں۔

میں نے نتالیا سے پوچھا۔ ”یہ کس کی قبر ہے؟“

نتالیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہاری قبر ہے۔“

بچالوں گی۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“

میں جانتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ ایسا کرنے کا اس کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے اور موت تو برحق ہے جس وقت میرا وقت پورا ہو جائے گا تو وہ ضرور آئے گی لیکن میں ایک خاص حکمت عملی پر چل رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا۔ ”اگر ایسی بات ہو سکتی ہے تو پھر مجھے اور کیا چاہئے۔ پھر تو میں ضرور تم سے محبت کرنے لگوں گا۔“

میں نے دیکھا کہ نتالیا کے چہرے پر ایک عجیب دلکشی سی آگئی۔ عورت آسیب ہو یا چڑیل ہو۔ محبت شاید اس کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ میں نے نتالیا کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیا۔

اُس کے ہونٹ ٹھنڈے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے ہاتھ پر برف کی ڈلی رکھ دی ہو۔ میں جلدی سے ہاتھ پیچھے کھینچنا چاہتا تھا مگر میں نے ایسا نہ کیا اور دل پر جبر کر کے کہا۔ ”نتالیا! کیا تم سچ مجھ سے اتنا ہی پیار کرتی ہو؟“

نتالیا کہنے لگی۔ ”تم میرے پیار کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ہم جب کسی انسان سے پیار کرتی ہیں تو ہمارا پیار اس انسان کی موت کے بعد بھی ختم نہیں ہوتا۔ ہم اس کی موت کے بعد بھی اسے اپنے پاس لے آتی ہیں۔“

میں نے اپنے دل میں کہا۔ خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا ہو۔ اوپر سے کہا۔ ”نتالیا! میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ ابھی مجھے تم سے اتنا پیار نہیں ہوا جتنا تمہیں مجھ سے ہے لیکن اگر ہو گیا تو میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھوں گا کیونکہ میرا پیار موت کے بعد بھی زندہ رہے گا۔“

یہ سن کر نتالیا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اُس نے بے اختیار ہو کر میرے ہاتھ کو ایک بار پھر چوم لیا اور میرا ہاتھ ایک بار پھر ٹھنڈا بن گیا۔

میں نے نتالیا سے پوچھا۔ ”نتالیا! یہ بتاؤ کہ یہ کون سی جگہ ہے جہاں تم مجھے اپنے

یہ سن کر میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ اس منحوس چڑیل نے یہ کیا کہہ دیا تھا۔ کیا واقعی یہ میری قبر تھی؟ مگر میں تو ابھی زندہ تھا۔ میں نے نتالیا سے کہا۔ ”مگر نتالیا میں تو ابھی زندہ ہوں پھر میری قبر کہاں سے آگئی؟“

نتالیا کہنے لگی۔ ”اگر تم نے اس بار مجھ سے بھاگنے کی کوشش کی تو میں تمہارا خون پینے اور تمہارے جسم کے ٹکڑوں کا گوشت کھانے کے بعد تمہاری ہڈیوں کو اسی جگہ دفن کر دوں گی۔ پھر یہی تمہاری قبر بن جائے گی۔“

نتالیا میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک خون منجمد کر دینے والی دہشت تھی۔ میرے بدن میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔

میں نے کہا۔ ”نہیں نتالیا نہیں۔ اگر مجھے تم سے محبت ہوگئی جو ضرور ہو جائے گی تو پھر مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں تم سے بھاگ کر جاؤں گا۔ پھر تو میں ساری زندگی تمہارے ساتھ ہی گزار دوں گا۔“

نتالیا نے خوش ہو کر کہا۔ ”میں بھی یہی چاہتی ہوں۔“ میں نے موقع مناسب جان کر نتالیا سے پوچھ لیا کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ اس نے کہا۔ ”ابھی میں تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ تم نے واقعی میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں تمہیں خود اس دنیا کی سیر کراؤں گی۔“

میں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نتالیا سے زبردست اظہار محبت شروع کر دیا۔ وقت کا مجھے وہاں کچھ پتہ نہیں تھا۔ پہلے دو چار دنوں تک مجھے یاد رہا پھر بھول گیا کہ اس قبر کے اندر رہتے مجھے کتنے دن گزر گئے ہیں۔ نتالیا کے ساتھ میں ہمیشہ ہنس کر اور محبت کے انداز میں بات کرتا۔ اسے یہی تاثر دیتا کہ میں اس کے ساتھ بڑا خوش ہوں۔

ایک روز وہ مجھے پوچھنے لگی۔ ”فیروز! کیا تم سچ مجھ سے محبت کرتے ہو یا محض یہ سب کچھ دکھاوے کی خاطر کر رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”نتالیا! میں پہلے تم سے محبت نہیں کرتا تھا۔ مگر تمہارے ساتھ رہتے ہوئے میں نے محسوس کیا ہے بلکہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اگر میں دنیا میں دوسری بار بھی آ جاؤں تو مجھے تم ایسی وفادار اور محبت کرنے والی بیوی نہیں ملے گی۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمہارے ساتھ رہ کر میں کبھی بوڑھا نہیں ہوں گا۔ ہمیشہ اسی حالت میں تندرست اور جوان رہوں گا۔ یہ دولت تو مجھے دنیا کی کسی عورت کے پاس نہیں مل سکتی سوائے تمہارے۔“

محبت واقعی عورت کی کمزوری ہوتی ہے۔ عورت کتنی ہوشیار، عیار اور سنگدل کیوں نہ ہو محبت کے دد بول اگر مسلسل اس کے کان میں پڑتے رہیں تو ایک بار تو وہ ساری سنگ دلی اور چالاکیاں بھول جاتی ہے۔

لیکن میں ابھی جلدی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں بڑے صبر سے کام لے رہا تھا۔ ایسا کرنا بہت ضروری تھا۔ نتالیا بھی اتنی جلدی میرے بدلے ہوئے رویے سے تبدیل ہونے والی جنس نہیں تھی۔ میں اس حقیقت سے آگاہ تھا اس لئے ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لے رہا تھا۔

میرا خیال ہے مجھے اس قبر نما کو ٹھڑی میں رہتے ہوئے شاید ڈیڑھ دو مہینے گزر گئے ہوں گے کہ ایک روز نتالیا نے خود ہی کہا۔ ”فیروز! چلو میں تمہیں باہر کی سیر کراؤں۔“

میں اس کے منہ سے یہی جملہ سننے کو ترس رہا تھا۔ پھر بھی میں نے اپنے اشتیاق کو ذرا سا بھی ظاہر نہ ہونے دیا الٹا کہہ دیا۔ ”نہیں نتالیا! اب میرا جی یہاں بڑا لگ گیا ہے۔ یہاں سے باہر نکلنے کو ذرا جی نہیں چاہتا۔“

وہ میرے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔ میں جانتی ہوں تمہارا یہاں سے نکلنے

کو جی نہیں چاہتا اور نہ تم خود مجھ سے اس خواہش کا اظہار کرتے۔ لیکن آج میرا بھی دل اپنی دنیا کی سیر کرنے کو چاہتا ہے اس لئے میں تمہیں بھی ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔“ اس وقت میں نے کہہ دیا۔ ”تم کہتی ہو تو میں چلتا ہوں۔“

نتالیا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم دیوار میں سے گزر کر اس بند قبر کے اندر سے باہر آ گئے۔ وہ جگہ کسی گھنے جنگل کے درمیان واقعی تھی۔ ارد گرد اونچے اونچے گنجان درخت ہی درخت تھے۔ درمیان میں گول دائرے کی شکل میں کچھ زمین خالی تھی جہاں نتالیا نے میری قبل از وقت قبر بنا کر مجھے اس کے نیچے کوٹھڑی میں قید کر رکھا تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ بڑی محبت سے پکڑا ہوا تھا۔ اس طرح نہیں پکڑا ہوا تھا جس طرح پولیس کسی مجرم کا ہاتھ پکڑ کر اسے لے جاتی ہے۔ ہم دونوں انسانی شکل و صورت میں چل رہے تھے۔ اونچے گھنے درختوں کے درمیان ایک چھوٹا سا راستہ بنا ہوا تھا جس پر ہلکا ہلکا اندھیرا چھا رہا تھا۔ ہم اس راستے پر سے گزرتے ہوئے ایک کھلے میدان میں آ گئے جہاں جنگلی جھاڑیاں اور گھاس اُگی ہوئی تھی۔ میدان کے آخری کنارے پر ایک بہت بڑی اور اونچی دیوار کھڑی تھی۔ یہ کسی قلعے کی دیوار لگتی تھی۔ میں نے نتالیا سے پوچھا۔ ”کیا آگے کوئی قلعہ ہے جس کی یہ دیوار ہے؟“

نتالیا نے کہا۔ ”یہ اس قلعے کی دیوار ہے جس کے اندر ہم اس وقت موجود ہیں۔ یہاں سے کوئی بھی اس دیوار کو پار کر کے دوسری طرف نہیں جاسکتا۔ اس دیوار پر میری غلام بدرو حیں چوبیس گھنٹے پہرہ دیتی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”مگر یہاں تو مجھے سوائے اپنے اور کوئی انسان نظر نہیں آیا۔ پھر یہاں سے بھاگ کر کون جائے گا؟“

نتالیا نے کہا۔ ”یہاں بھی ایک مخلوق رہتی ہے جو میرے قبضے میں ہے۔ اسے تم نہیں دیکھ سکتے۔“

میں نے پوچھا۔ ”اس دیوار کے پار کیا ہے؟“

نتالیا نے کہا۔ ”یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔ آؤ واپس چلتے ہیں۔“ میں اس کے ساتھ گھنے پراسرار اور خاموش جنگل کے تنگ و تاریک راستے میں سے ہوتا ہوا واپس اپنی قبر نما کوٹھڑی میں آ گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس کوٹھڑی میں اس آبی عورت نتالیا کے ساتھ رہتے ہوئے نہ تو مجھے بھوک لگتی تھی نہ پیاس لگتی تھی اور نہ میں کچھ کھاتا تھا، نہ پیتا تھا اور مجھے کسی قسم کمزوری بھی کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ تین چار دن کے بعد نتالیا مجھے وہاں سے نکال کر پیچھے درختوں کے جھنڈ میں لے جاتی تھی جہاں درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں کے درمیان ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ وہاں میں نہاتا اور نہانے کے بعد نتالیا کے ساتھ ہی اپنی کوٹھڑی بلکہ جیل میں آکر بند ہو جاتا۔

O

نتالیا پر میں اپنے رویے سے یہی ظاہر کر رہا تھا کہ میں وہاں بڑا خوش اور مطمئن ہوں۔ ایک بار میں نے اسے کہا۔ ”نتالیا! یقین کرو۔ میرا دل واپس اپنی دنیا میں جانے کو بالکل نہیں چاہتا۔ دنیا میں تو میرے ساتھ کئی غم فکر لگے رہتے تھے کھانے پینے کا فکر، یہ فکر کہ بیمار نہ پڑ جاؤں، روپے پیسے کا فکر۔ یہاں مجھے کوئی فکر نہیں۔ یہاں میں نہ کبھی بیمار ہی ہوا ہوں اور نہ کبھی معمولی سا سردی ہوا ہے۔“

نتالیا کہنے لگی۔ ”یہ جگہ تمہیں زمین پر اور کہیں نہیں ملے گی لیکن ایک بات بتاؤ کیا تم دل میں اب بھی میری دشمنی روہنی کو یاد کرتے ہو؟“

خواہ نتالیا ایک چڑیل ہی تھی مگر عورت تھی اور حسد کا جذبہ اس کے اندر بھی موجود تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یقین کرو نتالیا! تم نے مجھے اتنی محبت، اتنا پیار دیا ہے کہ میرے دل میں روہنی کا کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ روہنی سے میں نے کبھی محبت نہیں کی تھی۔ وہ ضرور مجھ سے کبھی کبھی محبت کا اظہار کرنے لگ جاتی تھی لیکن میرے دل میں اس کے لئے محبت کا ذرا سا خیال بھی کبھی نہیں آیا تھا بلکہ الٹا مجھے اس سے کوفت ہونے لگتی تھی کیونکہ اس کی وجہ سے میں خواہ مخواہ کی مصیبتوں میں پھنس گیا تھا۔ روہنی اور تم میں زمین، آسمان کا فرق ہے۔ وہ تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تم نے تو پہلے دن ہی مجھے دیکھتے ہی پسند کر لیا تھا اور جب میں نے تمہیں بھارت کے شہر میں پہلی بار ویران خانقاہ میں دیکھا تھا جہاں تم مجھے لے کر گئی تھیں تو مجھے تم بڑی اچھی لگی تھیں اور مجھے تم سے محبت ہو گئی تھی۔“

نتالیا کہنے لگی۔ ”تو پھر تم مجھے راولپنڈی شہر میں چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے؟“

میں نے فوراً کہا۔ ”میں تمہیں کیسے بتاؤں نتالیا کہ اس وقت مجھ پر اپنی دنیا، انسانوں کی دنیا کے لوگوں اور اپنے دوستوں اور رشتے داروں کے پاس واپس جانے کا خیال غالب آ گیا تھا۔ آخر میں انسان ہوں۔ یہ کمزوری تو ہر انسان میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے جیسے انسانوں کی دنیا میں ضرور واپس جانا چاہتا ہے۔“

نتالیا کہنے لگی۔ ”کیا اب بھی اگر تمہیں اپنے لوگوں کا خیال آ گیا تو تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟“

میں نے کہا۔ ”میں بڑا حقیق ہوں گا اگر اب تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں ذرا سوچو مجھے تم ایسی عورت، انسانوں کی دنیا میں کہاں ملے گی جو انتہائی حسین بھی ہو، جو مجھ سے بے پناہ پیار بھی کرتی ہو اور جس کے پاس رہ کر مجھ پر عمر کا اثر نہ ہوتا ہو اور میں سدا صحت مند اور جوان رہ سکتا ہوں۔ نہیں نہیں نتالیا! آئندہ مجھ پر اس قسم کا شک نہ کرنا۔ میں تم سے اب کبھی جدا نہیں ہوں گا بلکہ میں تم سے بھی یہی کہوں گا کہ تم بھی مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔“

نتالیا کا چہرہ ایک بار پھر خوشی سے کھل گیا۔ اُس نے کہا۔ ”فیروز! میں تم سے الگ ہونے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔“

میں نے جان بوجھ کر چہرے کو اداس بناتے ہوئے کہا۔ ”لیکن نتالیا مجھے ایک بات کبھی کبھی پریشان کرتی ہے۔“

”کون سی بات؟“ نتالیا نے بے قرار سی ہو کر پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”روہنی تمہاری دشمن ہے۔ وہ تمہیں مجھ سے جدا کرنے کی ضرور کوشش کرے گی۔“

نتالیا کہنے لگی۔ ”اس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ہمارے قریب بھی پھٹک سکے۔ وہ ہمیں کیا جدا کرے گی؟“

میں نے کہا۔ ”لیکن اُس نے تمہاری کھوپڑی کاراز کہیں سے معلوم کر لیا ہے۔ وہ جان گئی ہے کہ اگر کسی طرح تمہاری کھوپڑی تلاش کر کے اس کو توڑ دیا جائے تو تمہاری موت واقع ہو سکتی ہے۔“

نتالیا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہنے لگی۔ ”وہ بڑی بے وقوف ہے۔ اس کو کہیں سے میری کھوپڑی کاراز ضرور معلوم ہو گیا تھا اور اُس نے میری کھوپڑی کو توڑنے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنی کھوپڑی کو ایک ایسی خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھا ہوا ہے کہ جہاں روہنی ایک ہزار سال تک بھی کوشش کرتی رہے تو نہیں پہنچ سکتی۔“

میں نے نتالیا سے بالکل نہ پوچھا کہ وہ کون سی خفیہ جگہ ہے۔ مجھے معلوم تھا اگر میں نے پوچھا تو اُسے مجھ پر شک ہو سکتا ہے کہ آخر میں مجس لئے پوچھ رہا ہوں۔ میں نے کہا۔ ”بس۔ اب میری تسلی ہو گئی ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ روہنی ہم دونوں کو جدا کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوگی۔“

مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ نتالیا نے شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی مجھ سے چھین کر کہاں چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔ یہ انگوٹھی اس کی کسی بھی انگلی میں بھی مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ اس وقت موقع تھا۔ میں نے کہا۔ ”لیکن اگر روہنی کسی طریقے سے شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی تمہارے قبضے سے اڑا کر لے گئی تو پھر تو تمہارا جادو اس پر نہیں چل سکے گا۔ شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی کو ڈھال بنا کر روہنی تم پر کاری وار کر سکے گی۔“

نتالیا کے چہرے پر کرختگی سی آگئی۔ ایک دم اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس کی آواز بھی بدلی گئی۔ وہ بڑی ڈراؤنی مردانہ آواز میں بولی۔ ”روہنی میں اتنی طاقت نہیں کہ میرے قبضے سے شیش ناگن کی انگوٹھی اٹھا کر لے جاسکے۔ اگر اس دفعہ اس نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو میں اسے لاوا اگلنے والا مکھی میں جھونک دوں گی۔“

وہ کچھلا ہوا پتھر بن کر اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائے گی۔“ میں نے یہ پوچھنے کی بالکل جرات نہ کی کہ اس نے شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی کون سی خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔ میں نے صرف اتنا ہی کہا۔ ”نتالیا! روہنی کو ختم کرنے میں میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ وہ مجھے تم سے جدا کر دے۔“

محبت کے یہ الفاظ سن کر نتالیا کا چہرہ اور آواز اپنی اصلی حالت میں واپس آ گئے۔ اُس کے چہرے پر پہلے ایسی دلکشی آ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔ ”تم کیوں فکر کرتے ہو فیروز! جب میں نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ ہم دونوں کو دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکے گی تو بس سمجھ لو کہ ہم رہتی دنیا تک ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔“

میں نے فوراً جواب دیا۔ ”بس نتالیا! اب ہمیشہ کے لئے میں مطمئن ہو گیا ہوں۔ اب میں کبھی ایسی پریشانی کی بات زبان پر نہیں لاؤں گا۔“

نتالیا نے محبت کے جذبے سے مغلوب ہو کر میرا ہاتھ چوم لیا اور میرا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ اس طرح وہاں قبر نما کوٹھڑی میں رہتے رہتے کچھ اور وقت گزر گیا۔ یہ ایک مہینہ بھی ہو سکتا ہے اور ایک سال بھی ہو سکتا ہے۔ وقت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اس دوران میں نے اپنے رویے سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ میں دنیا میں اگر کسی سے محبت کرتا ہوں تو وہ صرف نتالیا ہی ہے۔ اسے بھی میری محبت کا یقین ہو گیا تھا چنانچہ اب وہ مجھے کبھی کبھی اپنے ساتھ باہر جنگل کی سیر کو لے جاتی تھی۔ اس کے ساتھ جنگل اور قلعے کے بلند اور مضبوط دیوار کے آس پاس پھرتے ہوئے میں ایک ایک چیز کو بڑے غور سے دیکھتا تھا اور انہیں اپنے ذہن میں نقش کر لیتا تھا کہ کوئی پتہ نہیں کب مجھے یہاں سے فرار ہونا پڑ جائے۔

میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میں زیادہ دن وہاں نہیں رہوں گا اور وہ

وقت آن پہنچا تھا جب مجھے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرنی ہوگی۔ ایک دن نتالیا مجھے قلعے کی دیوار کے اندر میدان کے مشرق کی جانب ایک پرانے کھنڈر کے قریب لے گئی یہ کھنڈر کسی قدیم مندر کا کھنڈر لگتا تھا۔ دیواریں شکستہ ہو رہی تھیں۔ مندر کا دروازہ غائب تھا اور جنگلی گھاس نے اندر جانے والے راستے کو آدھے سے زیادہ چھپا رکھا تھا۔ اس کھنڈر کے قریب سے گزرتے ہوئے نتالیا زک گئی۔ پھر اس کی طرف اشارہ کیا اور کہنے لگی۔ ”یہ ایک ہزار سال پرانا مندر ہے۔ کسی زمانے میں یہاں آدم خوروں کے دیوتا کی پوجا ہوتی تھی۔ ایک مدت سے یہ مندر ویران پڑا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کیا اب یہاں کوئی بدروح بھی نہیں رہتی؟“
نتالیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔ کوئی بدروح نہیں رہتی۔ لیکن ایک تمہاری دنیا کا انسان ضرور رہتا ہے۔“
”یہ انسان یہاں کیا کر رہا ہے؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

نتالیا نے کہا۔ ”یہ میری غلام بدروحوں کا شکار ہے۔ بدروحیں ہر مہینے زندہ انسانوں کی دنیا سے ایک انسان کو پکڑ کر لے آتی ہیں۔ اسے ایک مہینے تک یہاں قید میں رکھ کر اسے خوب کھلا پلا کر صحت مند کرتی ہیں۔ پھر ایک رات اس کا گلا کاٹ کر پہلے باری باری اس کا سارا خون پی جاتی ہیں۔ اس کے بعد اس کا گوشت نوچ کر کھا جاتی ہیں۔ بدروحیں یہ انسان کل ہی انسانوں کی دنیا سے شکار کر کے لائی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن اس کھنڈر کا تو کوئی دروازہ بھی نہیں ہے۔ پھر قیدی انسان نکل کر بھاگ کیوں نہیں جاتا؟“

نتالیا نے کہا۔ ”اسے اندر باندھ کر رکھا ہوا ہے۔ اور پھر وہ بھاگ کر جائے گا بھی کہاں۔ اس قلعے کی چار دیواری کے باہر اور اندر بدروحوں کا پہرہ ہے۔ وہ تو فوراً پکڑا جائے گا۔“

نتالیا میرا ہاتھ پکڑ کر آگے چل دی۔ میرا ذہن اس بد نصیب انسان کے بارے

میں سوچ رہا تھا جس نے ایک مہینے بعد یہاں کی آدم خور بدروحوں کی خوراک بن جانا تھا۔ یونہی میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اس بد نصیب انسان سے ملنا چاہئے۔ میں اس انسان کو بڑی آسانی سے مل سکتا تھا کیونکہ ایک تو ویران کھنڈر کے باہر کسی بدروح کا پہرہ نہیں تھا۔ دوسرے اب نتالیا کے خود اپنے اصرار پر میں کبھی کبھی اکیلا بھی قلعے کی چار دیواری کے اندر ادھر ادھر سیر کرنے نکل جایا کرتا تھا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ باہر نکل کر جائزہ لوں کہ وہاں سے فرار ہونا ممکن بھی ہے یا نہیں۔ جب مجھے نتالیا نے بتایا کہ کوٹھڑی میں ایک زندہ انسان قید ہے۔ جس کو ایک ماہ کے بعد قتل کر کے بدروحیں کھا جائیں گی تو میں نے اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ معلوم کروں کہ یہ آدمی کون ہے۔ اگر اس جنگلی علاقے کا ہوا تو اُسے ضرور اس جگہ کے اسرار و رموز کا علم ہوگا اور وہ خود بھی وہاں سے فرار ہونے کے لئے بے تاب ہوگا۔ اس سے مل کر میرے فرار کا بھی کوئی راستہ نکل سکتا تھا۔

میں نتالیا کی موجودگی میں اُس آدمی سے ملنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ نتالیا ہفتے میں ایک دو دن کے لئے کہیں چلی جایا کرتی تھی۔ میں اُس کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ آخر مجھے موقع مل گیا۔ نتالیا کہنے لگی۔ ”میں اپنے قبیلے کے سردار سے ملنے جا رہی ہوں۔ مجھے دو دن لگ جائیں گے۔ تمہارا باہر چلنے پھرنے کو دل چاہے تو یہاں سے زیادہ دور نہ جانا۔“

میں نے کہا۔ ”نتالیا! تمہارے بغیر تو میرا باہر ٹہلنے کو بھی جی نہیں کرتا۔“
”نہیں نہیں۔ باہر نکل کر ٹہل لیا کرنا۔“ نتالیا نے کہا۔ ”میں زیادہ سے زیادہ دو دنوں کے بعد آ جاؤں گی۔“

نتالیا چلی گئی۔ وہ جس وقت گئی شام ہو رہی تھی۔ میں رات کا اندھیزا ہو جانے کا انتظار کرنے لگا۔ جب رات گہری ہو گئی تو میں اپنی قبر نما کوٹھڑی سے نکل آیا اور اندھیرے میں درختوں کی آڑ لیتا اجاڑ مندر کے کھنڈر کے عقب میں آ گیا۔ کھنڈر میں

جو دیران کو ٹھڑی تھی اس پر گہری خاموشی اور اندھیرا چھایا ہوا۔ کو ٹھڑی کا کوئی دروازہ تو تھا نہیں۔ آگے اونچی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ میں دبے پاؤں چلتا گھاس کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے کو ٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ مجھے کسی انسان کے سانس لینے کی آواز آئی۔

میں نے کہا۔ ”کیا تم جاگ رہے ہو؟“

ایک نوجوان آدمی کی مدھم سی آواز ابھری۔ ”تم کون ہو؟ میرا خون پینے آئے ہو تو میں حاضر ہوں۔ میں چاہوں بھی تو اپنے بچاؤ کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔“

میں نے مدھم آواز میں جلدی سے کہا۔ ”میں بھی تمہاری طرح ان بدروحوں کی قید میں ہوں۔ تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ کیا یہاں سے فرار ہونے کی کوئی سبیل بن سکتی ہے؟“

اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ مجھے بد قسمت قیدی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک ایک ہاتھ میرے کندھے سے آگیا۔ پھر اس ہاتھ نے میرا بازو تھام لیا اور کہا۔ ”کیا تم واقعی انسان ہو؟ کوئی بدروح تو نہیں ہو؟“

میں اُس آدمی کے قریب بیٹھ گیا اور دھیمی آواز میں کہا۔ ”بھائی میں کوئی بدروح نہیں ہوں۔ تمہاری طرح قسمت کا مارا ایک بد نصیب انسان ہوں جو ان بدروحوں کے قبضے میں آ گیا ہے۔“

”مجھے یقین نہیں آتا۔“ اُس آدمی نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”بھائی ان باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ یہاں سے فرار کیسے ہوا جائے؟“

وہ بولا۔ ”اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یہ بتاؤ کہ یہ بدروحیں تمہیں کہاں سے پکڑ کر لے آئی ہیں؟“

اُس نے کہا۔ ”بس میری بد قسمتی کہ میں ان کے ہاتھ آ گیا۔ میرا نام شکالا ہے۔ یہاں سے بہت دور ہمارا قبیلہ ایک جنگل میں رہتا ہے۔ میرا باپ قبیلے کا سردار ہے۔“

میں نے کہا۔ ”شکالا! باقی باتیں بعد میں ہو جائیں گی۔ جلدی سے بتاؤ کہ ہم یہاں سے فرار کیسے ہو سکتے ہیں؟“

شکالا کہنے لگا۔ ”یہاں چاروں طرف قلعے کی اونچی فصیل ہے۔ اس فصیل پر بدروحوں کا پہرہ ہے۔ اگر ہم نے اس طرح وہاں سے دیوار پھانڈنے کی کوشش کی تو بدروحیں ہمیں پکڑ لیں گی اور میرے ساتھ تمہیں بھی اپنا ترنوالہ بنانے کے لئے قید میں ڈال دیں گی۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں کہ ہم جان بچا کر یہاں سے فرار ہو سکیں؟“

شکالا اندھیرے میں میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے اندھیرے میں اُس کا دھندلا سا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ وہ نوجوان تھا اور اس نے جسم پر صرف ایک نیکری پہن رکھی تھی۔ کہنے لگا۔ ”ان بدروحوں کی سرداری ایک آسیبی عورت ہے۔ اس کا نام نتالیا ہے۔ اگر ہمیں اس آسیبی عورت کے سر کے کچھ بال مل جائیں تو ہم آسانی سے فرار ہو سکتے ہیں اور ہمیں کوئی دیکھ بھی نہیں سکے گا۔“

مجھے یاد آ گیا کہ نتالیا صبح صبح کو ٹھڑی میں اپنے بالوں میں کنگھی کر کے اترے ہوئے بالوں کا گچھا بنا کر کو ٹھڑی کے ایک طاق میں رکھ دیا کرتی تھی۔ جب میں نے شکالا کو بتایا کہ میں آسیبی عورت کے سر کے بال لا سکتا ہوں تو بے اختیار اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بولا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ تم ایسا کر سکتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”یقین کی کیا بات ہے۔ میں ابھی جا کر آسیبی عورت کے بال لے آتا ہوں۔“

شکالا کو میں عالم حیرت میں ڈوبا چھوڑ کر کو ٹھڑی سے نکل گیا۔ اندھیرے میں

درختوں کے عقب میں تیز تیز چلتا میں اپنی قبر نما کو ٹھڑی میں آگیا۔ کونے والے طاق میں ہاتھ ڈالا تو نتالیا کے بالوں کا ایک گچھا میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں نے اُسے اپنے کپڑوں میں چھپایا اور جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے چلتا شکالا کے پاس آگیا۔ میں نے نتالیا کے بالوں کا گچھا اُسے دیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ”یقین کر، یہ آسبی عورت کے سر کے بال ہی ہیں۔“

شکالا کہنے لگا۔ ”ابھی پتہ چل جائے گا۔ میں ان بالوں کو جلا کر اس کی راکھ کو اپنے جسم پر اور تمہارے جسم پر ملوں گا۔ اگر ہم دونوں غائب ہو گئے تو یہ بال آسبی عورت کے ہی ہوں گے۔“

میں نے کہا۔ ”بالوں کو جلاؤ گے کیسے؟ کیا تمہارے پاس ماچس ہے؟“

شکالا نے کہا۔ ”ماچس نہیں ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو میں ابھی آتا ہوں۔“

شکالا مجھے کوٹھڑی میں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں درخت کی دو کٹی ہوئی ٹہنیاں تھیں۔ اُس نے نتالیا کے بالوں کا گچھا مجھ لے کر زمین پر اپنے پاؤں کے درمیان رکھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کے درخت کی شاخوں کو زور زور سے رگڑنے لگا۔ یہ آگ جلانے کا جنگلی طریقہ تھا۔ ایک دو منٹ تک وہ زور زور سے درخت کی شاخوں کو رگڑتا رہا۔ پھر اچانک ان میں سے چنگاریاں نکلنے لگیں اور بالوں کے گچھے نے آگ پکڑ لی اور وہ جل کر راکھ ہو گیا۔ شکالا نے راکھ اٹھا کر پہلے اپنے جسم پر ملی اور وہ میرے سامنے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں نے اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر شکالا کو چھونا چاہا مگر وہ میرے ہاتھ نہ آیا۔

لگا۔ ”یہ آسبی عورت کے ہی بال ہیں۔ اب میں تمہیں غائب کرنے لگا ہوں۔“

اس نے نتالیا کے بالوں کی راکھ میرے چہرے پر ملی تو میں بھی غائب ہو گیا۔ شکالا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگا۔ ”اپنا ہاتھ مت چھڑانا۔ چلو یہاں سے چلیں۔“

”ہم کس طرف جائیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

شکالا نے کہا۔ ”تم خاموشی سے دیکھتے چلو۔ بولنا بالکل نہیں۔“

کھنڈر کی کوٹھڑی سے غیبی حالت میں باہر نکلتے ہی شکالا نے قلعے کی اونچی فصیل کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ پھر وہ دوڑنے لگا اور میرا ہاتھ پکڑ کر ساتھ مجھے بھی دوڑا رہا تھا۔ ہم بہت جلد فصیل کے پاس پہنچ گئے۔ شکالا نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ اُس نے میرے کان کے قریب ہو کر سرگوشی کی۔ ”گھبراانا نہیں۔ ہم دیوار کے اندر سے گزر جائیں گے۔“

میں نے سرگوشی میں ہی کہا۔ ”شکالا! یہاں بدروحوں کا پہرہ ہے۔“

شکالا کہنے لگا۔ ”ہمارے جسموں پر ان بدروحوں کی سرداری کے بالوں کی راکھ ہے۔ یہ نہ ہمیں دیکھ سکتی ہیں نہ ہم پر ان کا کوئی جادو اثر کر سکتا ہے۔“

شکالا مجھے ساتھ لئے قلعے کی مضبوط چٹانی دیوار میں سے نکل گیا۔

میں اس قسم کے تجربوں سے پہلے کئی بار گزر چکا تھا اس لئے مجھے تعجب نہ ہوا۔ بس ایک ہی ڈر تھا کہ اگر کسی طرح سے نتالیا کو میرے فرار کا پتہ چل گیا تو وہ ایک سیکنڈ میں یہاں پہنچ جائے گی اور پھر مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ لیکن مجھے ایک نہ ایک دن یہ خطرہ تو مول لینا ہی تھا۔

جیسے ہی ہم قلعے کی فصیل سے باہر آئے شکالا نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور کہا۔ ”ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ جتنی تیز بھاگ سکتے ہو میرے ساتھ بھاگنا شروع کر دو۔“

میرا خیال تھا کہ شاید ہم ہوا میں اڑنے لگیں گے لیکن ایسا نہ ہوا۔ ہم اڑ نہیں سکتے تھے صرف دوڑ سکتے تھے۔ ہمارے جسم بالکل ہلکے نہیں ہوئے تھے۔ مجھے بھی اپنے جسم کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا لیکن یہ بوجھ نہ ہونے کے برابر تھا جس کی وجہ سے ہم معمول کی رفتار سے شاید دس گنا زیادہ تیزی کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔ باہر ستاروں کی

روشنی میں ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے مگر ہمیں کوئی دوسرا شخص نہیں دیکھ سکتا تھا۔ شکالا بڑی تیز رفتاری سے بھاگ رہا تھا۔ وہ جنگلی قبیلے کا نوجوان تھا اسے تیز دوڑنے کی عادت تھی۔ اوپر سے ہمارے جسموں کا بوجھ دس گنا کم ہو گیا تھا۔ اس اعتبار سے ہم طوفانی آندھی کی طرح دوڑ رہے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچ گئے تھے۔ آگے دریا آگیا۔

شکالا نے دوڑتے دوڑتے مجھ سے کہا۔ ”دریا میں چھلانگ لگا دو۔“

پہلے اُس نے دریا میں چھلانگ لگائی اور اس کے پیچھے میں بھی دریا میں کود گیا۔ ہم دریا میں کودنے کے بعد صرف گھٹنوں تک پانی میں ڈوبے اور پھر جس طرح کوئی گیند دریا کی سطح پر واپس آجاتا ہے ہمارے پاؤں بھی دریا کی سطح پر واپس آگئے۔ اب ہم دریا کے اوپر دوڑ رہے تھے۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ ہمارے پاؤں دریا کی لہروں پر دوڑتے ہوئے صرف ٹخنوں تک پانی میں جاتے تھے اور فوراً ابھر آتے تھے۔ ایسا صرف اس لئے ہو رہا تھا کہ ہمارا وزن دس گنا کم ہو چکا تھا اور دوسرے ہمارے دوڑنے کی رفتار بھی بڑی تیز تھی۔

جوشے تیزی سے حرکت کر رہی ہو سانس کے اصول کے مطابق ویسے بھی زمین کی کشش کی شعاعیں اسے بہت کم نیچے کی طرف کھینچتی ہیں۔ ہم ایک ڈیڑھ منٹ میں دریا عبور کر گئے۔ آگے جنگل شروع ہو گیا۔ ہم جنگل میں بھی دوڑتے چلے گئے۔ ہمارے سانس بھی زیادہ نہیں پھولے تھے۔ جنگل ختم ہوا تو آگے پہاڑیاں آئیں۔ پہاڑیوں کے درمیان گزرنے کے لئے تنگ قدرتی راستے بنے ہوئے تھے۔ ہم ان راستوں پر دوڑنے لگے۔ ہم نے پہاڑیاں بھی عبور کر لیں۔ پہاڑیوں کی دوسری طرف آکر شکالا نے کہا۔ ”یہاں بیٹھ جاتے ہیں۔“

ہم بیٹھ گئے۔ ہم اتنا ہی ہانپ رہے تھے جیسے کوئی شخص ایک فرلانگ دوڑ کر ہانپتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد ہمارے سانس معمول پر آگئے تو میں نے شکالا سے پوچھا۔ ”ہم

کس طرف جا رہے ہیں؟“

اُس نے کہا۔ ”میں اپنے قبیلے کی طرف جا رہا ہوں جو یہاں سے اب زیادہ دُور نہیں ہے۔ صرف ایک دریا راستے میں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تمہارے خیال میں بدروحوں کو تو ہمارا پتہ نہیں چلا ہو گا ناں؟“
شکالا بولا۔ ”تم آسپی عورت کے جو بال لے آئے تھے یہ تم نے ایک ناممکن بات کو ممکن کر دکھایا تھا۔ یہ سب آسپی عورت کے بالوں کی راکھ کا طلسم ہے کہ جس کی وجہ سے ہمارے فرار کا اس وقت تک کسی کو علم نہیں ہو سکتا جب تک کہ کوئی بدروح میری کوٹھڑی میں نہیں آتی۔“

مجھے اطمینان ضرور ہو گیا تھا لیکن ایک خطرے کا احساس ضرور تھا کہ نتالیا بڑی زبردست طلسمی طاقت رکھتی ہے لیکن چونکہ ابھی تک اس نے مجھ پر کوئی جوابی حملہ نہیں کیا تھا اس لئے مجھے کچھ تسلی بھی ہو رہی تھی کہ شکالا درست کہتا ہے نتالیا کے بالوں کی راکھ نے ہمیں ابھی تک نتالیا اور اس کی بدروحوں کے اثرات سے بچایا ہوا تھا۔

ہم نے ایک بار پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ کافی دیر تک دوڑتے رہے۔ ایک بہت بڑا میدان عبور کیا۔ ایک وادی میں سے آندھی کی طرح سے گزر گئے۔ آگے دوسرا دریا آگیا۔ شکالا نے دوڑتے دوڑتے کہا۔ ”دریا میں میرے ساتھ چھلانگ لگا دو۔“
ہم نے دریا میں چھلانگ لگادیں اور دریا کی سطح پر دوسرے کنارے کی طرف کسی تیز لہر سے بھی زیادہ رفتار کے ساتھ دوڑنے لگے۔ دو منٹ میں ہم نے وہ دریا بھی عبور کر لیا۔

دریا کے دوسرے کنارے پر ایک اونچا نیچا پتھر یا میدان تھا۔ ہم دوڑتے چلے گئے اور یہ میدان بھی پار کر گئے۔ اُس میدان کی دوسری طرف پھر ایک جنگل آگیا۔ یہ جنگل اتنا گھنا تھا کہ ہم اس کے اندر دوڑ نہیں سکتے تھے۔ ہم چلنے لگے۔

شکالا نے کہا۔ ”میں اپنے قبیلے کے جنگل میں آگیا ہوں۔ یہاں سے ہمارے قبیلے کا گاؤں زیادہ دور نہیں ہے۔“

میں نے شکالا سے کہا۔ ”تمہارے قبیلے کے لوگوں اور سردار کو کیسے پتہ چلے گا کہ ہم آگئے ہیں۔ وہ تو ہمیں دیکھ ہی نہیں سکیں گے۔“

شکالا نے کہا۔ ”قبیلے کا سردار میرا باپ ہے۔ اس نے اپنے پاس ہمیشہ سے ایک افریقی جادوگر رکھا ہوا ہے جو قبیلے کو جنگل کی بدروحوں کے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ اسے ہم کالا جادوگر کہتے ہیں۔ اس کے جادو سے ہم دوبارہ نظر آنے لگیں گے۔“

جنگل میں کچھ دیر چلنے کے بعد مجھے ایک تالاب کے کنارے بہت سے جھونپڑے دکھائی دیئے۔ ان جھونپڑوں کے درمیان الاؤروشن تھا۔ جس جھونپڑے کے آگے الاؤروشن تھا وہ جھونپڑا دوسرے جھونپڑوں سے کافی بڑا تھا اور اس کے باہر دو حبشی نیزے تھامے پہرہ بھی دے رہے تھے۔ شکالا نے دور سے مجھے بڑا جھونپڑا دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرے باپ کا جھونپڑا ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔ میرے ساتھ جھونپڑے میں آؤ۔“

ہم جھونپڑے کے بند دروازے میں سے اندر چلے گئے۔ چونکہ ہم غائب تھے اس لئے حبشی پہرے دار ہمیں نہ دیکھ سکے۔ جھونپڑے کے اندر ایک بہت بڑے تخت پوش پر بستر لگا تھا جس پر ایک بھاری بھر کم حبشی سوراہا تھا۔ شکالا سیدھا اس حبشی کے پاس چلا گیا اور اسے ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بابا! میں آگیا ہوں۔“

اس کا باپ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور چاروں طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ جھونپڑے میں ایک تیل کا بڑا لیمپ روشن تھا۔ اُس نے کہا۔ ”شکالا! تم مجھے نظر نہیں آ رہے۔ کیا تم شکالا کی روح ہو؟“

شکالا نے کہا۔ ”نہیں بابا! میں روح نہیں ہوں۔ میں شکالا ہوں۔ میرے ساتھ

میرا ایک دوست بھی ہے۔ ہم نے اپنے جسم پر ایک آبیسی عورت کے بالوں کی راکھ ملی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہم غائب ہو کر آبیسی عورت کی قید سے فرار ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔“

حبشی سردار نے کہا۔ ”فکر نہ کرو شکالا۔ میں ابھی کالے جادوگر کو بلا کر تمہیں انسانی شکل میں واپس لاتا ہوں۔ تم میرے پاس بیٹھ جاؤ اپنے دوست کو بھی کہو کہ وہ بھی یہاں بیٹھ جائے۔“

ہم تخت پوش پر بیٹھ گئے۔ شکالا کے باپ نے چلا کر پہرے دار حبشیوں کو آواز دی۔ دونوں گھبرائے ہوئے فوراً اندر آگئے۔ شکالا کے باپ نے کہا۔ ”کالے جادوگر کو بلاؤ۔ فوراً۔“

دونوں حبشی جلدی سے باہر چلے گئے۔ شکالا کے باپ نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ”شکالا! خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ سلامت میرے پاس واپس آگئے۔ ہم تو تمہاری طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟“

شکالا نے اپنی ساری داستان اپنے باپ کو بیان کر دی کہ کس طرح وہ رات کے وقت جنگل میں سے گزر رہا تھا کہ اچانک ایک بدروح نے درخت کے اوپر سے اس پر چھلانگ لگائی اور اسے اٹھا کر لے گئی۔ اس نے جب میرے بارے میں بتایا کہ بابا اگر یہ آدمی میری مدد نہ کرتا تو میں کبھی تمہارے پاس واپس نہیں آسکتا تھا۔ اس کے باپ کو میں نظر تو نہیں آ رہا تھا اس نے اندازے سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”بیٹا! تم نے مجھے ساری زندگی کے لئے خرید لیا ہے۔ میں تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ میں خود بھی ان بدروحوں کی قید سے فرار ہونا چاہتا تھا۔“

اتنے میں قبیلے کا کالا جادوگر آگیا۔ اُس نے جھک کر سردار کو سلام کیا اور زمین پر

چوکرڑی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کے کندھے پر ایک تھیلا لنگ رہا تھا۔ زمین پر بیٹھتے ہی کالے جادوگر نے فضا میں کچھ سوگتھتے ہوئے کہا۔ ”سردار! مجھے یہاں تمہارے بیٹے شکالا کی بو آرہی ہے۔ اس کے ساتھ کسی دوسرے آدمی کی بو بھی ہے۔“

سردار نے کہا۔ ”کالے جادوگر! تم نے بالکل صحیح کہا۔ شکالا اپنے ایک دوست کے ساتھ اس وقت میرے قریب ہی بیٹھا ہے۔ وہ بدروحوں کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر وہ اور اس کا دوست دونوں غائب ہیں۔ ہمیں نظر نہیں آ رہے کیونکہ انہوں نے کسی بدروح کے بالوں کی راکھ اپنے جسموں پر ملی ہوئی ہے۔“

شکالا نے کہا۔ ”یہ بدروح نہیں بلکہ ایک آسیبی عورت تھی جس کے بالوں کی راکھ میں نے اور میرے دوست نے اپنے جسم پر ملی ہوئی ہے اور ہم نظر نہیں آ رہے۔“

کالے جادوگر نے کہا۔ ”میں ابھی اس راکھ کا اثر زائل کئے دیتا ہوں۔ تم دونوں میرے سامنے آکر بیٹھ جاؤ۔“

میں اور شکالا تخت پوش پر سے اٹھ کر کالے جادوگر کے سامنے بیٹھ گئے۔ کالے جادوگر نے پٹاری میں سے کچھ ہڈیاں نکال کر زمین پر پھینکیں اور خدا جانے کس زبان میں منتر پڑھنے شروع کر دیئے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ اندازے سے ہم دونوں کی طرف منہ کر کے پھونکیں مارتا جاتا تھا۔ پھر اس نے ایک پیالے میں پانی ڈال کر اپنے ہاتھ میں اٹھالیا اور کچھ منتر پڑھ کر ہم پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ تیسرے چوتھے چھینٹے کے بعد ہم نظر آنے لگے اور اپنی انسانی شکل و صورت میں واپس آ گئے۔ حبشی سردار نے اپنے بیٹے کو گلے لگالیا۔ پھر مجھے بھی گلے لگایا اور کہنے لگا۔ ”سب لوگوں کو جگادو۔ ہم جشن منائیں گے۔“

اسی وقت باہر تخت بچھ گیا۔ قبیلے کے سارے حبشی جھوپڑیوں میں سے نکل آئے اور سردار کے بیٹے کو ایک ایک کر کے گلے لگانے لگے۔ الاؤ زیادہ تیز روشن کر دیا گیا۔

میں اور شکالا تخت پر سردار کے دائیں اور بائیں بیٹھ گئے۔ اسی وقت ایک بھینس کو ذبح کر کے اس کا گوشت بھونا جانے لگا اور حبشیوں نے ڈھول بجا کر رقص شروع کر دیا۔ یہ جشن صبح تک جاری رہا اس کے بعد میں نے شکالا کے باپ کو بتایا کہ جس آسیبی عورت کی قید سے ہم لوگ فرار ہو کر آئے ہیں وہ بڑی خطرناک جادوگرنی عورت ہے اور وہ ضرور شکالا کے ساتھ مجھے بھی دوبارہ اٹھا کر لے جانے کے لئے ضرور آئے گی۔ شکالا کا باپ پریشان سا ہو کر میرا منہ تکتے لگا۔

○

شکالا کے باپ نے اسی وقت جشن بند کر دیا اور مجھے شکالا اور کالے جادوگر کو لے کر اپنے شاہی جھونپڑے میں آگیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”شیروان! جو کچھ تم نے مجھ سے کہا ہے وہ کالے جادوگر کو بھی بتاؤ۔“

میں نے اپنا نام انہیں شیروان ہی بتایا تھا اور یہ کہا تھا کہ میں بھی بمبئی کے ایک جنگل میں شکار کھیل رہا تھا کہ ایک بدروح کا آسیب مجھے وہاں سے اغوا کر کے لے گیا تھا۔ کالے جادوگر نے پوچھا۔ ”شیروان! تم نے سردار کو کیا بتایا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”سنو کالے جادوگر! ہم لوگ بدروحوں کی قید سے فرار ہو کر تو آ گئے ہیں اور تم ہمیں غیبی حالت سے ہماری اصلی حالت میں واپس بھی لے آئے ہو لیکن ایک بات میں تمہیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں تو یہاں سے چلا جاؤں گا لیکن شکالا کو اپنے باپ کے پاس یہیں رہنا ہے۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان بدروحوں کی ایک سرداری ہے جس کا نام نتالیا ہے۔ نتالیا صرف ایک بدروح ہی نہیں ہے وہ ایک بڑا خطرناک آسیب ہے۔ ہم اس آئینی عورت نتالیا کے قیدی تھے۔ جس وقت ہم وہاں سے فرار ہوئے نتالیا وہاں پر موجود نہیں تھی۔ وہ آج نہیں توکل واپس آ جائے گی۔ جب اسے پتہ چلے گا کہ میں اور شکالا اس کی قید سے فرار ہو چکے ہیں تو وہ اپنے جادو کے زور سے شکالا کا اور میرا پتہ چلا لے گی اور یہاں پہنچ جائے گی۔ اس کی طاقت کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ وہ تمہیں بھی اور تمہارے ساتھ اس قبیلے کے سبھی آدمیوں اور عورتوں اور بچوں کو ہلاک کر کے ان کا خون پی جائے گی۔ بس میں

صرف یہی کہنا چاہتا تھا۔“

کالا جادوگر بڑے غور سے میری باتیں سن رہا تھا۔ جب میں چپ ہوا تو اس نے اپنے کالے جادو کی ڈینگیں مارنے یا اپنے جادو کے بڑے بڑے دعوے کرنے کی بجائے مجھ سے پوچھا۔ ”جس آئینی عورت کا تم ذکر کر رہے ہو اور جس نے تمہیں قید کیا ہوا تھا کیا کسی وقت اس کی آواز مردوں کی طرح ہو جاتی تھی؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں! بالکل ہو جاتی تھی۔ جب وہ غصے کی حالت میں ہوتی تو اس کی آواز بدل کر مرد کی آواز میں بدل جاتی تھی اور بڑی ڈراؤنی ہو جاتی تھی۔“

کالے جادوگر نے اپنے تھیلے میں سے ایک ہڈی نکال کر زمین پر رکھ دی۔ اس کے بعد دوسرا سوال پوچھا۔ ”کیا اس دنیا کی بدروحیں انسان کا خون پیتی تھیں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں..... خون بھی پیتی تھیں اور مردہ لاشوں کا گوشت بھی کھا جاتی تھیں۔“

کالے جادوگر نے تھیلے میں سے دوسری انسانی ہڈی نکال کر زمین پر رکھ دی۔ پھر مجھ سے پوچھا۔ ”کیا یہ بدروحیں رات کے اندھیرے میں چمگادڑیں بھی بن جاتی تھیں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں! ضرور بن جاتی ہوں گی۔ میں نے رات کے وقت اپنے ارد گرد چمگادڑوں کے غوطے لگانے کے شرانے اور ان کی باریک سیٹیوں کی آوازیں اکثر سنی تھیں۔“

کالے جادوگر نے کہا۔ ”وہ چمگادڑیں بدروحیں ہی تھیں۔“

اور اس نے تھیلے میں سے ایک اور ہڈی نکال کر رکھ دی۔ پھر شکالا کے باپ کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ ”سردار! یہ بڑی خونی بدروحیں ہیں۔ ان کی طاقت پاتال کی روجوں سے بھی بڑھ کر ہے۔“

سردار نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ ”تو کیا وہ میرے بیٹے کو دوبارہ اغوا کر کے بھی

لے جاسکتی ہیں؟“

کالے جادوگر نے کہا۔ ”ایسا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان بدروحوں کو ایک ہزار میل سے اپنے دشمن اور اپنے قیدی کی بو آ جاتی ہے اور وہ اس کی بو کا پیچھا کرتی کرتی اس کو جا کر دبوچ لیتی ہیں چاہے وہ اس سے دس ہزار میل کے فاصلے پر ہی کیوں نہ ہو۔“

شکالا اور اس کا باپ یہ سن کر بہت زیادہ گھبرائے۔ سردار نے کہا۔ ”تم بھی بہت بڑے جادوگر ہو۔ کیا تم ان بدروحوں کا کوئی توڑ نہیں کر سکتے؟“

میں خاموشی سے کالے جادوگر کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ بے چارہ ان بدروحوں اور خاص طور پر نتالیا کے آسیب کا بھلا کیا مقابلہ کر سکے گا۔

کالے جادوگر نے کہا۔ ”سردار! ان بدروحوں اور ان کی سرداری کی آئینی عورت کا جادو مردہ بدروحوں کا جادو ہے کیونکہ وہ سب مر چکی ہیں۔ میرا کالا جادو زندہ جادو ہے۔ میں ان کے جادو کا ایسا توڑ کروں گا کہ کوئی بدروح اور آسیب تمہارے بیٹے شکالا کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکے گا۔“

میں نے سوچا کہ یہ یونہی ڈینگیں مارنے لگا ہے۔ یہ سردار کے بیٹے شکالا کو بدروحوں سے نہیں بچا سکے گا اور اس کے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا اس لئے میرے لئے یہی بہتر ہے کہ میں دن نکلے ہی سردار سے اجازت لے کر یہاں سے بھی فرار ہو جاؤں کیونکہ کوئی پتہ نہیں کب اور کس وقت نتالیا کا آسیب اچانک مجھے آکر دبوچ لے۔ اس دفعہ اس نے مجھے اپنے قبضے میں کیا تو پھر وہ وہی کرے گی جو اس نے ایک بار مجھے کہا تھا۔

اس نے کہا تھا کہ۔ ”فیروز! اگر اس دفعہ تم نے مجھے دھوکا دیا اور مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے تو میں تمہیں کسی نہ کسی وقت ضرور پکڑ کر واپس لے آؤں گی۔ پھر میں تمہیں ہلاک کر کے تمہیں ایک بدروح بنا کر اپنی غلام بنالوں گی۔ ایک بار تم میری بدروح غلام بن گئے تو پھر جب تک یہ دنیا قائم ہے تم میرے ساتھ ہی رہو گے۔“

میں یہ سوچ کر ڈر گیا کہ اگر ایسا ہو گیا تو میں قیامت تک اس منحوس عورت کی قید سے آزاد نہ ہو سکوں گا۔ میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ کالے جادوگر نے جو تین انسانی ہڈیاں تھیلے میں سے نکال کر باہر رکھی تھیں ان کے گرد لکڑی سے ایک دائرہ کھینچ دیا اور کچھ پڑھ کر ان پر پھونکنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تینوں ہڈیاں جو بڑی چھوٹی چھوٹی تھیں اپنی جگہ پر حرکت کرنے لگیں۔ کبھی وہ آگے جاتیں، کبھی ذرا پیچھے آ جاتیں۔ پھر وہ دائرے کی شکل میں ایک دوسری کے پیچھے چلنے لگیں۔ کالا جادوگر تیز آواز میں منتر پڑھ پڑھ کر ان پر پھونکنے جارہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد تینوں ہڈیاں رُک گئیں۔

کالے جادوگر نے ایک منتر پڑھ کر ان پر زور سے پھونک ماری تو تینوں ہڈیاں زمین سے ایک فٹ بلند ہو کر ہوا میں لٹک گئیں۔ کالے جادوگر نے ایک ایک کر کے فضا میں ہی ہاتھ بڑھا کر انہیں پکڑا اور جلدی سے اپنے تھیلے میں ڈال دیا۔ پھر سردار کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”سردار! میں نے ان ہڈیوں پر سب سے زبردست جادو پھونک دیا ہے۔ اب کوئی بدروح کوئی برے سے برا آسیب جہاں یہ ہڈیاں ہوں گی قریب بھی نہیں پھٹک سکے گا۔“

کالے جادوگر نے اس کے بعد تینوں ہڈیاں تھیلے سے باہر نکال لیں۔ یہ شاید انسان کی چھوٹی انگلی کی ہڈیوں کے مہرے تھے۔ ان میں سوراخ بھی تھے۔ کالے جادوگر نے تینوں ہڈیوں میں کالا دھاگہ پرویا اور شکالا سے کہا۔ ”شکالا میرے پاس آؤ۔“

شکالا اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ کالے جادوگر نے ایک ہڈی کو تعویذ کی طرح شکالا کے بازو کے ساتھ باندھ دیا۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ ”اب تم میرے پاس آؤ۔“

میں بھی اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ کالے جادوگر نے دوسری ہڈی میں کال دھاگہ پرو کر اسے میرے بازو کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر اس نے تیسری ہڈی میں

سردار نے اپنے خاص باڈی گارڈ حبشی غلام کو اندر بلایا اور اس کے ہاتھ میں اپنی تلوار دے کر کہا۔ ”کالے جادوگر کے پاس کھڑے ہو جاؤ۔ جس وقت میں تمہیں حکم دوں تلوار سے اس کی گردن اڑا دینا۔“

حبشی غلام نے کہا۔ ”جو حکم سردار!“ اور وہ نگلی تلوار لے کر جادوگر کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ کالا جادوگر منتر پڑھتے پڑھتے رک گیا۔ سردار سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”سردار! بدروح آکر تم تینوں کو طرح طرح کی آوازیں نکال کر ڈرائے گی۔ تم پر پتھر پھینکے گی۔ لیکن ایک بھی پتھر تمہارے قریب نہیں آسکے گا۔ تم خود دیکھ لو گے کہ ایک بھی پتھر تمہیں نہیں لگے گا۔ جب میں تمہیں آواز دے کر کہوں کہ سردار بولو تو تم نے بدروح سے مخاطب ہو کر کہنا ہو گا۔ اے بدروح چڑیل! دفع ہو جا۔ نہیں تو میں تمہیں ابھی بھسم کر دوں گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہو گا تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔“

کالے جادوگر نے مجھے اور شکالا سے بھی یہی کہا کہ ڈرنا بالکل نہیں اور خاموشی سے بیٹھے رہنا ہے۔

سردار نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ ہم تمہاری ہدایات پر عمل کریں گے۔“ اس کے بعد کالے جادوگر نے دوبارہ منتر پڑھ پڑھ کر پھونکنے شروع کر دیئے۔ اس وقت رات کا پچھلا پہر تھا۔ باہر جنگل میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ میں سردار اور شکالا کے ساتھ تخت پر چوڑی مار کر بیٹھا جادوگر کو گردن ہلاہلا کر منتر پڑھتے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں جنگل کی جانب سے ایک چیخ کی آواز بلند ہوئی۔

کالے جادوگر نے کہا۔ ”ہوشیار! بدروح آرہی ہے۔ خبردار گھبرانا بالکل نہیں۔ تم خود دیکھ لو گے کہ بدروح تم میں سے کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکے گی اور اس کا سارا جادو بے اثر ہو جائے گا۔“

میں دل میں ڈر رہا تھا کہ اس کالے جادوگر پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ میرے

دھماکہ پرویا اور اٹھ کر سردار کے پاس جا کر کہنے لگا۔ ”سردار! یہ ہڈی میں تمہارے بازو کے ساتھ باندھنا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ سے تم بھی بدروحوں اور آسیب کے حملے سے محفوظ ہو جاؤ گے۔“

سردار نے اپنا بازو آگے کر دیا۔ کالے جادوگر نے تیسری ہڈی سردار کے بازو کے ساتھ باندھ دی۔ سردار نے پوچھا۔ ”کیا میرا بیٹا اب بدروحوں سے بالکل محفوظ ہو جائے گا؟“

کالے جادوگر نے کہا۔ ”سردار! اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو میں تمہیں تجربہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔“

سردار نے پوچھا۔ ”کس قسم کا تجربہ؟“ میں بھی کچھ تعجب کے ساتھ کالے جادوگر کو دیکھنے لگا کہ یہ کس قسم کا تجربہ کر کے دکھانے کی بات کر رہا ہے۔ کالے جادوگر نے کہا۔ ”سردار! میں ابھی اپنے کالے جادو کی طاقت سے اس جنگل کی ایک بدروح کو یہاں بلا لیتا ہوں۔ وہ تم پر حملہ کرنے کی سر توڑ کوشش کرے گی۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی اور آخر میں تم لوگوں سے خوف زدہ ہو کر بھاگ جائے گی۔“

مجھے کالے جادوگر کی بات کا یقین نہ آیا۔ سردار نے بھی شک کا اظہار کیا اور کہا۔ ”اور اگر اس بدروح نے ہمیں کوئی نقصان پہنچایا تو اس کا ذمہ دار کون ہو گا؟“

کالے جادوگر نے کہا۔ ”اس کا یہی علاج ہے۔ تم تلوار دے کر اپنے غلام کو میرے پاس کھڑا کر دو اور اسے حکم دے دو کہ اگر بدروح کے ہاتھوں تم تینوں میں سے کسی کو بھی نقصان پہنچا تو تمہارا غلام یہ تلوار مار کر میرا سر تن سے جدا کر دے۔“ سردار نے کہا۔ ”مجھے منظور ہے۔ تم بدروح کو بلانے کی تیاری کرو۔“

کالے جادوگر نے مجھے، شکالا اور اس کے باپ کو جھوپڑے میں جو تخت پوش تھا اس کے درمیان میں بٹھا دیا اور خود کونے میں بیٹھ کر منتر پڑھنے شروع کر دیئے۔

پاس تو شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی بھی نہیں ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ کہیں میں بھی نہ مارا جاؤں۔ مگر میں اب وہاں سے بھاگ نہیں سکتا تھا کیونکہ بدروح باہر جنگل میں آچکی تھی اور وہ مجھے راستے میں ہی دبوچ سکتی تھی۔ میں دل میں خدا سے دعائیں مانگتا رہا اور وہیں بیٹھا رہا۔

دوسری بار بدروح کی چیخ جنگل میں گونجی تو معلوم ہوا کہ وہ جھوپڑے کے بالکل قریب پہنچ چکی ہے۔ کالے جادوگر نے آہستہ سے کہا۔ ”سردار، شکالا، شیروان! گھبراہٹ نہیں۔ میں نے تمہارے بازوؤں پر جو چیز باندھ دی ہے وہ اتنی طاقتور ہے کہ کوئی بدروح تمہارے نزدیک نہیں آسکے گی۔“

کالا جادوگر جھوپڑی کے کونے میں بیٹھا تھا۔ اب وہ منتظر نہیں پڑھ رہا تھا۔ اس کے سر پر حبشی تنگی تلوار لئے بالکل تیار کھڑا تھا کہ سردار کا حکم ملے اور وہ کالے جادوگر کی گردن اڑا دے۔ کالے جادوگر نے اپنے اور غلام کے ارد گرد ایک دائرہ کھینچ دیا تھا تاکہ بدروح حبشی غلام کے اور خود اس کے قریب نہ آسکے۔

اتنے میں جھوپڑے کے اندر بدروح کی بھیانک چیخ کی آواز بلند ہوئی اور اس کے ساتھ ہی جھوپڑی میں تیز آندھی چلنے لگی۔ جھوپڑے کی دیواریں آندھی کے زور سے لرز رہی تھیں لیکن نہ ہم تینوں کو آندھی کی ہوا چھو رہی تھی نہ کالے جادوگر اور حبشی غلام پر آندھی کا اثر ہو رہا تھا۔ بدروح ہمیں نظر نہیں آرہی تھی مگر اس کے حلقے میں سے نکلتی غرغراہٹ کی آواز ضرور بلند ہو رہی تھی۔ آندھی چنچیں مار رہی تھی۔ اچانک آندھی رک گئی اور جھوپڑی کے اندر آسمانی بجلیاں چمکنے لگیں۔ ایک دھماکے کے ساتھ آسمانی بجلی ہمارے تخت کے ارد گرد گرتی اور زمین میں جذب ہو جاتی مگر ایک بار بھی بجلی ہمارے تخت پر نہیں گری تھی۔ ہم ان بجلیوں میں بالکل محفوظ تھے۔ چمکتی کڑکتی بجلیاں بھی غائب ہو گئیں۔

اس کے ساتھ ہی جھوپڑے میں پتھر گرنا شروع ہو گئے۔ پتھر چھوٹے بھی تھے

اور بڑے بھی تھے۔ پتھر زمین پر زور سے گرے اور گرتے ہی غائب ہو جاتے۔ میں خاموشی سے یہ خرافات دیکھ رہا تھا۔ مجھے ڈر یہی لگ رہا تھا کہ اگر ان میں سے ایک بھی پتھر میرے سر پر آکر لگا تو میرا زندہ بچنا ناممکن ہے لیکن کالے جادوگر کی ایک ایک بات سچ ثابت ہو رہی تھی۔ سارے پتھر دھماکوں کے ساتھ ہمارے تخت پوش کے ارد گرد ہی گر رہے تھے۔ تخت پر کوئی پتھر نہیں گر رہا تھا، اسی طرح جہاں کالا جادوگر اور حبشی غلام کھڑا تھا وہاں بھی کوئی پتھر نہیں گر رہا تھا۔

پتھروں کی یہ بارش ایک منٹ تک جاری رہی۔

پھر یہ بارش بھی رک گئی۔ اب بدروح نے ڈراؤنی آوازیں نکالنی شروع کر دیں۔ اپنی زبان میں خدا جانے وہ کیا بول رہی تھی۔ وہ شاید ہمیں ڈرا کر چاہتی تھی کہ ہم تخت پوش سے اٹھ کر باہر کو بھاگیں اور وہ ہم تینوں کو دبوچ لے۔

عین اس وقت کالے جادوگر نے چلا کر سردار سے کہا۔ ”سردار! بولو!“

سردار گرج دار آواز میں بولا۔ ”اے بدروح چڑیل! دفع ہو جا۔ نہیں تو میں تمہیں ابھی بھسم کر دوں گا۔“

سردار کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ بدروح کے جسم کو آگ لگ گئی اور وہ بھڑکتے شعلوں میں جینتی چلاتی چکراتی غائب ہو گئی۔ جھوپڑی میں خاموشی چھا گئی۔ کالا جادوگر اٹھ کر ہمارے پاس آیا اور سردار کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”سردار! اب تمہیں میری بات کا یقین آگیا ہو گا کہ میں نے تم تینوں کے بازوؤں پر جو طلسمی ہڈیوں کے مہرے باندھے ہیں وہ تم لوگوں کو بدروحوں سے محفوظ رکھیں گے۔ کوئی بدروح تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ ہو سکتا ہے جن بدروحوں کی قید سے یہ دونوں فرار ہو کر آئے ہیں وہ انہیں پکڑنے کے لئے ان پر حملہ کر دیں لیکن وہ ان کا بال بھی بیکانہ کر سکیں گی۔ اگر کوئی بدروح آجائے، پتھر پھینکے، کڑکتی بجلیاں چمکیں تمہیں نہ تو کوئی پتھر لگے گا اور نہ ہی تم پر کوئی بجلی گرے گی۔ جب تم بلند آواز میں کہو گے کہ دفع ہو جا

اے بدر روح چیل! نہیں تو میں تمہیں بھسم کر دوں گا تو بدر روح آگ کے شعلوں میں لپٹی چیختی چلاتی غائب ہو جائے گی۔“

میں دل میں بہت خوش ہوا۔ شیش ناگن کے مہرے والی انگوٹھی نتالیا نے مجھ سے چھین لی تھی لیکن اس کے بدلے کالے جادوگر نے جو انسانی ہڈی میرے بازو پر باندھی تھی مجھے اس کا تحفظ مل گیا تھا لیکن اب بھی میرے دل میں شک تھا کہ کالے جادوگر کی ہڈی مجھے بدر وحوں سے تو محفوظ رکھ سکتی تھی لیکن نتالیا کے آسیب کے حملے سے اپنا بچاؤ کرنے کے لئے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔

میں نے کالے جادوگر سے کہا۔ ”ماسٹر! تم نے ہمیں بدر وحوں سے تو بچا لیا ہے مگر میں اور شکالا ایک اور آسیب کے قیدی بھی تھے۔ وہ ایک عورت کا آسیب ہے اور یہ تم بھی جانتے ہو کہ آسیب بدر روح سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ اگر آسیب نے ہم پر حملہ کر دیا تو کیا تمہارا ہڈی کا تعویذ ہماری حفاظت کر سکے گا؟“

کالے جادوگر نے کہا۔ ”شیروان! میں نے ہڈی پر جو منتر پڑھ کر پھونکا ہے اس کے آگے خطرناک سے خطرناک آسیب کی کوئی حقیقت نہیں۔ آسیب تو معمولی چیز ہے اس کا باپ بھی تمہارے قریب آنے کی جرات نہیں کرے گا۔“

میری تسلی ہو گئی۔ اب میں ان لوگوں سے جدا ہو کر بڑی بے فکری سے سفر کر رہا ہوا کسی نہ کسی طرح اپنے دوست جمشید کے پاس بمبئی پہنچ سکوں گا۔ بمبئی جا کر سوچوں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے اور کیا بمبئی میں اپنے دوست کے پاس رہ کر روہنی کی واپسی کا انتظار کرنا چاہئے یا وہاں سے پاکستان جا کر ایک نئی زندگی کی ابتداء کرنی چاہئے۔

پاکستان میں اپنی نئی زندگی شروع کرنے کا تصور بڑا خوش آئند تھا۔ میں خود ان بدر وحوں کی خرافات سے تنگ آ گیا تھا اور چاہتا تھا کہ اس منحوس چکر سے نکل کر پارل انسانوں کی طرح زندگی گزارنی شروع کر دوں۔ میں تین دن شکالا کے قہقہے میں رہا۔ اب میں وہاں سے چلے جانا چاہتا تھا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کس طرح

بمبئی پہنچ سکوں گا۔ یہ مجھے شکالا کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ میں براعظم افریقہ کے مشرقی ساحل کے ایک چھوٹے سے ملک میں تھا۔ یہ کوئی الف لیلیٰ کا زمانہ نہیں تھا کہ سند باد جہاز کی طرح کسی بحری جہاز میں سوار ہو کر اپنے وطن پہنچ جاؤں۔ یہ بیسویں صدی تھی مجھے کسی بھی ملک میں داخل ہونے کے لئے پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت تھی، غیر ملکی کرنسی کی ضرورت تھی اور میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ روہنی میرے ساتھ ہوتی تھی تو مجھے ان میں سے کسی بھی چیز کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ غائب کر کے جس ملک میں چاہے لے جاتی تھی لیکن اب روہنی میرے ساتھ نہیں تھی اور میں غائب بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

جب میں نے اپنی اس پریشانی کا شکالا سے ذکر کیا تو وہ کہنے لگا۔ ”شیروان! مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس معاملے میں میرا باپ بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ ہم جنگلی قبیلے کے لوگ ہیں ہمیں کیا معلوم کہ پاسپورٹ کیا ہوتا ہے اور ویزا کیا ہوتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”پھر تو میرے لئے بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی۔ یہاں سے ملک انڈیا ہزاروں میل دور ہے۔ پاکستان اس سے بھی زیادہ دور ہے میں تو اپنے وطن کبھی نہیں پہنچ سکوں گا شکالا.....“

شکالا سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ میں اپنے بابا سے بات کرتا ہوں۔ اس کا دوسرے قبیلوں میں بھی بڑا اثر و رسوخ ہے۔ تمہارے لئے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آئے گا۔ چلو میں تمہیں بابا کے پاس لئے چلتا ہوں۔“

شکالا مجھے اپنے قبیلے کے سردار باپ کے پاس لے گیا۔ وہ مجھے بڑی خندہ پیشانی سے ملا اور بولا۔ ”شیروان! تمہارے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں کوئی بات پریشان کر رہی ہے۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟“

شکالا نے ساری بات اپنے باپ کو بیان کر دی اور کہا۔ ”بابا! اگر ہم شیروان کی

مدد نہ کر سکے تو مجھے بڑا دکھ ہو گا۔ شیروان نے میری جان بچائی ہے۔“

سردار نے کہا۔ ”شکالا! ہم شیروان کی ضرورت مدد کریں گے۔“

شکالا نے کہا۔ ”بابا ہم شیروان کو روپیہ پیسہ تو کہیں سے لا کر دے دیں گے لیکن اس کے لئے پاسپورٹ اور ویزا کہاں سے لائیں گے اور ان چیزوں کے بغیر شیروان کسی سمندری یا ہوائی جہاز میں سفر نہیں کر سکتا۔“

سردار کہنے لگا۔ ”مجھے تھوڑا سا موقع دو میں کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لوں گا۔“

اسی روز سردار کہیں چلا گیا۔ وہ دوسرے روز واپس آیا۔ آتے ہی اس نے مجھے اور شکالا کو اپنے جھونپڑے میں بلوایا۔ وہ اپنے بڑے تخت پوش پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہم اس کے قریب بیٹھ گئے۔

شکالا نے پوچھا۔ ”بابا! شیروان کے لئے کوئی انتظام ہوا؟“

سردار مسکرانے لگا۔ بولا۔ ”ایک راستہ نکل آیا ہے۔ اب شیروان کو نہ کسی پاسپورٹ کی ضرورت پڑے گی، نہ ویزے کی ضرورت ہو گی۔ میں اسے جن لوگوں کے سپرد کر دوں گا وہ اسے اس کی منزل پر حفاظت سے پہنچا دیں گے۔“

میں بڑا خوش ہوا۔ مگر دل میں حیران ضرور تھا کہ اس جنگلی سردار کے ذرائع ماڈرن زمانے کے مقابلے میں بڑے محدود ہیں اس نے کیا راستہ نکالا ہو گا۔ میں نے پوچھ ہی لیا۔ ”سردار! یہ کون لوگ ہیں آپ مجھے جن کے سپرد کریں گے؟“

سردار نے کہا۔ ”میرے ایک دوست کا اپنا بحری جہاز ہے۔ وہ مال لے کر ملک ملک کی بندرگاہوں پر جاتا ہے۔ اتفاق سے ان دنوں ہمارے ملک کی بندرگاہ کے قریب ہی اس کا جہاز لنگر انداز ہوا ہے۔ میں نے اس سے مل کر ساری بات طے کر لی ہے۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا اور میں اس ملک میں پہنچا دے گا جہاں تم جانا چاہتے ہو۔“

میں نے یہی سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ اس آدمی کا کوئی چھوٹا بار بردار جہاز ہو۔ بار بردار جہازوں کے کپتان کبھی کبھی کسی مسافر کو جس کے پاس پاسپورٹ وغیرہ نہ ہو جہاز میں بٹھالیتے ہیں۔ یہ شخص اسی طرح مجھے اپنے جہاز میں سوار کروا کر ہندوستان یا پاکستان پہنچا دے گا۔ مجھے بڑا اطمینان ہو گیا۔

میں نے سردار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”سردار! آپ کا دوست اپنا جہاز لے کر کب یہاں سے روانہ ہو گا؟“

سردار بولا۔ ”اسے تین چار دن لگ جائیں گے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم کل صبح ہی میرے ساتھ چلے چلو۔ میں خود تمہیں اپنے دوست کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔“ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”میں تیار ہوں۔“ دوسرے دن صبح شکالا نے مجھے جگادیا اور کہنے لگا۔ ”شیروان! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ بابا تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

میں نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر تھوڑا سا ناشتہ کیا اور شکالا کے ساتھ اس کے باپ کے پاس آ گیا۔ سردار کے جھونپڑے کے باہر تین گھوڑے بالکل تیار حالت میں کھڑے تھے۔ سردار نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ”شیروان! گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔ ہم اپنے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔“

ایک گھوڑے پر سردار، دوسرے پر میں اور تیسرے گھوڑے پر سردار کا باڈی گارڈ بیٹھ گیا اور گھوڑے جنگل میں اپنے سفر پر چل پڑے۔ دوپہر تک ہم مختلف جنگلی راستوں پر سفر کرتے رہے۔ دوپہر کے بعد ہم ایک قصبے میں پہنچے جو کافی بڑا تھا اور چند ایک ماڈرن طرز کی عمارتیں بھی نظر آرہی تھیں۔

سردار کہنے لگا۔ ”یہاں سے آگے ہم ریل گاڑی میں سفر کریں گے۔“ قصبے کا سٹیشن زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہاں ہم نے کھانا کھایا۔ کچھ دیر بعد ہمیں ایک

گاڑی مل گئی ہم اس میں سوار ہو کر اس ملک کے ایک ساحلی شہر میں آگئے۔ سردار نے اپنے باڈی گارڈ کو گھوڑوں سمیت ریلوے اسٹیشن ہی سے واپس بھیج دیا تھا۔ ساحلی شہر چھوٹا سا تھا۔ آبادی بھی بہت کم دکھائی دے رہی تھی۔ سردار ریلوے اسٹیشن سے نکل کر ایک طرف چل پڑا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ چلتے چلتے ہم شہر سے کافی دور نکل گئے۔

اب ہماری ایک جانب سمندر دکھائی دینے لگا تھا۔ ہم سمندر کے ساتھ ساتھ چلے گئے۔ آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ کوئی جھونپڑی تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں خاموشی سے چل رہا تھا۔

سردار کہنے لگا۔ ”میرے دوست کا جہاز سمندر میں فاصلے پر لنگر انداز ہے۔ ہم سیئر میں بیٹھ کر جہاز تک جائیں گے۔“

میں نے پوچھا۔ ”سردار! یہ سیئر ہمیں کہاں سے ملے گا؟“
سردار بولا۔ ”گھاٹ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں ہمیں سیئر مل جائے گا۔“

کچھ دور چلنے کے بعد ہم ایک چھوٹے سے گھاٹ پر پہنچ گئے۔ گھاٹ بڑا پر اسرار سا لگ رہا تھا۔ وہاں کوئی مسافر بھی نہیں تھا۔ دو تین چھوٹی کشتیاں اور ایک بوسیدہ چھت والا پرانا سیئر ایک طرف کھڑا تھا۔ کوئی آدمی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سردار نے مجھے ایک جگہ بیٹھنے کو کہا اور خود سیئر کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک آدمی تھا جس نے میلی کچیلی پتلون اور نیلے رنگ کی بنیان پہن رکھی تھی۔

سردار نے میری طرف اشارہ کر کے اُس آدمی سے کہا۔ ”ہنری! یہ میرا خاص آدمی ہے۔ اس کو جہاز پر کپتان زولو کے حوالے کر کے واپس آنا۔ میں نے کپتان سے ساری بات کر لی ہوئی ہے۔“

پھر سردار نے مجھ سے کہا۔ ”بے فکر ہو کر جاؤ۔ ہنری بھی میرا خاص آدمی ہے۔ یہ تمہیں جہاز پر پہنچا دے گا۔ کیپٹن زولو میرا جگڑی دوست ہے اس کا جہاز سمندر میں کچھ فاصلے پر لنگر انداز ہے۔“

سردار نے مجھے تین بار گلے لگایا اور بولا۔ ”تمہیں جس ملک کے روپے پیسے کی ضرورت ہو گی میرا دوست کیپٹن زولو تمہیں دے دے گا۔ اس کی تم بالکل فکر نہ کرو۔“

سردار مجھے میلے کپیلے سیاہ فام جھٹی جس کا نام ہنری تھا کے حوالے کر کے چلا گیا۔ ہنری نے سفید دانت نکالتے ہوئے کہا۔ ”آ جاؤ۔“

وہ مجھے سیئر میں لے گیا۔ سیئر کی حالت انتہائی خستہ ہو رہی تھی۔ فرش چرچر کر رہے تھے۔ سیئر میں اور کوئی آدمی نہیں تھا۔

ہنری نے کہا۔ ”وہاں بیٹھ جاؤ۔“

تھوڑی سیئر کی چھت کے نیچے عرشے کے چھوٹے سے گندے فرش پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ ہنری نے سیئر کا انجن شارٹ کیا تو انجن نے اتنا شور مچایا جیسے دس بارہ پرانے انجن ایک ساتھ شارٹ ہو گئے ہوں۔ سیئر آہستہ آہستہ ساحل کو چھوڑنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سمندر میں جا رہا تھا اور اس کا رخ سمندر کے جنوب مشرق کی طرف تھا۔ کافی دیر تک سیئر سمندر میں چلتا رہا۔ افریقہ کا ساحل دور پیچھے رہ گیا تھا۔ پھر ساحل نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ابھی تک مجھے سردار کے دوست زولو کا بار بار جہاز نظر نہیں آیا تھا۔ خدا جانے کیپٹن زولو نے اپنا جہاز سمندر میں اتنی دور کیوں لنگر انداز کیا ہوا تھا۔ یہ معمہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ آخر مجھے دور سے ایک سمندری جہاز کی چمنی نظر آئی جس میں سے دھوئیں کی باریک سی لکیر نکل رہی تھی۔

ہنری نے اونچی آواز میں کہا۔ ”وہ ہے کیپٹن زولو کا جہاز۔“
سیئر کا رخ جہاز کی طرف ہی تھا۔ جس وقت ہمارا سیئر جہاز کے قریب پہنچا تو میں

نے دیکھا کہ جہاز زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کے سارے بورڈ کارنگ پھیکا پڑ چکا تھا اور کہیں کہیں جہاز کی دیوار پر رنگ بھی لگا ہوا تھا۔ اوپر عرشے کے جنگلے پر تین چار نیگرو نیچے سینئر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سینئر کے ہنری نے دونوں بازو ہلاتے ہوئے اپنی زبان میں جہاز کے آدمیوں کو کچھ کہا۔ انہوں نے اوپر سے رے کی ایک سیٹر ہی نیچے لٹکا دی۔ ہنری نے سینئر سے سیٹر ہی کے پاس جا کر کھڑا کر دیا۔

ہنری نے سینئر کو سیٹر ہی کے ساتھ باندھا اور مجھے ساتھ لے کر رے کی سیٹر ہی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ بڑی مشکل سے ہم جہاز کے عرشے یعنی ڈیک پر پہنچے۔ تین نیگرو جنہوں نے میلی میلی پتلونیں اور بنیائیں پہنی ہوئی تھیں مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگے۔

ہنری نے ان سے کہا۔ ”یہ کیپٹن کا خاص آدمی ہے۔ اسے کہو کہ سردار نے جس آدمی کا کہا تھا اسے میں لے آیا ہوں۔“
دو نیگرو تو وہیں کھڑے مجھے گھور گھور کر دیکھتے رہے تیسرا ہنری کا پیغام لے کر عرشے پر سے نیچے جاتی سیٹر ہیاں اتر گیا۔ ہنری ان جشی خلاصیوں سے اپنی زبان میں باتیں کرنے لگ گیا۔ چند لمحوں کے بعد جو آدمی ہنری کا پیغام لے کر گیا تھا وہ واپس آ گیا۔ اس نے کہا ”کیپٹن نے کہا ہے اس آدمی کو نیچے بھیج دو۔“
ہنری نے میری طرف منہ کر کے کہا۔ ”جاؤ دوست! کیپٹن زولو تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

میں اس آدمی کے ساتھ عرشے کا زینہ اتر کر نیچے جہاز کی تنگ راہداری میں آ گیا جہاں دونوں جانب چھوٹے چھوٹے کیبن تھے جن کے دروازے بند تھے۔ ایک کیبن کا دروازہ کھلا تھا وہاں جہاز کا کیپٹن زولو میرا انتظار کر رہا تھا۔ پہلی نظر میں ہی وہ مجھے ایک بحری ڈاکو لگا۔ اس کی کمر میں گولیوں کی بیلٹ بندھی ہوئی تھی اور پستول لٹک رہا تھا۔ وہ دونوں ٹانگیں میز پر رکھے پرانے صوفے میں دھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔ بالکل سیاہ قام تھا

کانوں میں گولڈن رنگ پڑے ہوئے تھے ایک ہاتھ میں خنجر تھا جس سے وہ سیب چھیل رہا تھا۔ سر پر سرخ رد مال باندھا ہوا تھا۔ ایک نیگرو عورت اس کے پاس بیٹھی اس کے مک میں شاید کافی بنا رہی تھی۔ یہ تھا کیپٹن زولو مجھے جس کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

O

پھر میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ ”کیا تم انڈین ہو؟“
میں نے کہا۔ ”نہیں۔ میں پاکستانی ہوں۔“
کیپٹن زولو نے مگ اٹھالیا۔ اس کے دو تین گھونٹ پے اور بولا۔ ”تم پاکستان جانا
چاہتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں کیپٹن! سردار نے مجھے کہا تھا کہ میرا دوست کیپٹن زولو تمہیں
پاکستان پہنچادے گا۔“

کیپٹن زولو نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے مجھے گھورتے ہوئے رم کے
چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتا رہا۔ نیکرو عورت اسی طرح میری طرف دیکھ رہی تھی۔
کیبن میں بڑی تکلیف دہ خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ آخر اس خاموشی کے ظلم کو
توڑتے ہوئے کیپٹن زولو بولا۔ ”سردار میرا دوست ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی
ضرورت نہیں۔ ہم تمہیں پاکستان تو نہیں پہنچا سکتے لیکن انڈیا کے ساحل پر اتار دیں
گے۔ آگے تم خود پاکستان چلے جانا۔ چلے جاؤ گے؟“ کیپٹن زولو نے اونچی آواز میں مجھ
سے پوچھا۔

میں کیا جواب دیتا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”سر! اگر آپ مجھے پاکستان کے
ساحل کے قریب کہیں اتار دیں تو میرے لئے آسانی ہوگی۔ انڈیا کے ساحل پر اترا تو
ساحلی گارڈز مجھے گرفتار کر لیں گے۔ میرے پاس تو کوئی پاسپورٹ وغیرہ بھی نہیں
ہے۔“

کیپٹن زولو قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔ ”تم نہ انڈیا جاؤ، نہ پاکستان جاؤ۔ تم
ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ یہاں عیش کرو۔ ملک ملک کی سیر کرو۔ اچھا یہ بتاؤ کبھی تم
نے کسی کو قتل کیا ہے؟ میرا مطلب ہے پستول کی گولی یا خنجر سے ہلاک کیا ہے؟“

میں سمجھ گیا تھا کہ میں بحری ڈاکوؤں کے جہاز میں آگیا ہوں جہاں سے اب میں
قسمت اچھی ہوگی تو جان بچا کر اتر سکوں گا۔

میں کیبن میں داخل ہوتے ہی رُک گیا۔ کیپٹن زولو نے میری طرف دیکھ کر خنجر
سے اپنی طرف آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ڈرو نہیں۔ آ جاؤ۔“
میں ڈرتے ڈرتے اس کے سامنے جو لوہے کی کرسی پڑی تھی اس پر بیٹھ گیا۔ نیکرو
عورت مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ کیپٹن زولو نے سب کاٹ
کر میری طرف بڑھایا اور کہا۔ ”لو۔ کھاؤ۔“

میں نے سب کا ٹکڑا ہاتھ میں لے لیا اور دل میں سوچنے لگا کہ سردار نے مجھے کس
آدمی کے حوالے کر دیا ہے۔ کیپٹن زولو نے مجھ سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“
میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ اس نے خنجر میز پر رکھ کر ٹانگیں اکٹھی کر لیں اور نیکرو
عورت نے اس کے لئے جو کافی کا مگ بنایا تھا وہ میری طرف بڑھا کر کہا۔ ”اسے پی
جاؤ۔“

اس کے لہجے میں حکم دینے کا انداز تھا۔ میں نے مگ تھام لیا۔ میرا خیال تھا کہ اس
میں کافی ہوگی۔ میں نے مگ ہونٹوں کے قریب کیا تو مجھے اس میں سے بڑی تیز بو آئی
میں سمجھ گیا کہ یہ شراب ہے۔ میں نے مگ میز پر رکھ دیا۔ کیپٹن زولو حیران سا ہو گیا۔
کہنے لگا۔ ”کیا تمہیں ہماری رم پسند نہیں آئی؟“
رم بھی شراب کی ایک قسم ہوتی ہے۔

میں نے کہا۔ ”سوری کیپٹن! میں مسلمان ہوں۔ میں شراب نہیں پیتا۔“
کیپٹن زولو نے نیکرو عورت کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”یہ تو مسلمان ہے۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں کیپٹن! میں نے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا۔“
کیپٹن زولو نے پاس بیٹھی ننگرو عورت سے کہا۔ ”اس نے کبھی کسی آدمی کو قتل نہیں کیا۔ یہ ہمارے کام کا آدمی نہیں ہے۔“
ننگرو عورت نے کہا۔ ”اس سے دو تین آدمی قتل کرواؤ۔ پھر اسے ہم اپنے ساتھ شامل کر لیتے ہیں۔ یہ آدمی ہمارے لئے ٹھیک رہے گا۔“

کیپٹن زولو نے میری طرف منہ کر کے کہا۔ ”میری گرل فرینڈ نے تمہاری سفارش کر دی ہے۔ اب تم میرے گینگ میں شام ہو گئے ہو۔ میں تمہیں سکھا دوں گا کہ آدمیوں کو قتل کس طرح کیا جاتا ہے۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔“
میں ان دونوں کا منہ نکلنے لگا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ آخر ہمت کر کے میں نے کہہ دیا۔ ”سر! میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ پلیز آپ مجھے واپس بھجوا دیں۔“

کیپٹن زولو غصے میں آگیا۔ بولا۔ ”تم نے مجھے اور میرے آدمیوں کو دیکھ لیا ہے۔ اب تم کیسے جاسکتے ہو؟ اب تم ہمارے ساتھ ہی رہو گے۔ یہاں سے فرار ہونے کا کبھی خیال بھی دل میں نہ لانا ورنہ تمہاری لاش سمندر کی مچھلیوں کی خوراک بن جائے گی۔“

یہ ایک نئی مصیبت میرے اوپر آن پڑی تھی۔ میں نے اسی وقت دل میں سوچ لیا کہ ابھی تو جہاز ساحل کے قریب ہی کھڑا ہے۔ میں موقع پا کر سمندر میں کود جاؤں گا اور کسی نہ کسی طرح ساحل پر پہنچ جاؤں گا لیکن یہ میرا خیال خام تھا۔ جہاز کا جراثیم پیشہ کپتان زولو اتنا احمق نہیں تھا۔ اس نے دو آدمیوں کو بلوا کر اسی وقت مجھے ایک کیبن میں بند کروا کر باہر سے تالا لگوا دیا۔

دوسرے دن صبح صبح جہاز نے لنگر اٹھا دیا۔ اب میرے فرار کے تمام راستے مسدود ہو گئے تھے۔ خدا جانے یہ جہاز کس ملک کی طرف جائے گا، کہاں جا کر لنگر ڈالے گا۔ یہ سمگلر اور بحری قزاق قسم کے لوگ تھے۔ انہیں کون اپنے ملک کی

سمندری حدود میں داخل ہونے کی اجازت دے گا۔ ہر ملک کی سمندری حدود چالیس میل تک ہوتی ہے۔ چالیس میل کے بعد کھلا سمندر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ جہاز جس ملک میں بھی جائے گا اس کی چالیس میل سمندری حدود کے پاس ہی لنگر ڈالے گا۔ اگر وہاں سے مجھے چھلانگ لگا کر فرار ہونے کا موقع مل بھی جائے تو میں کیسے چالیس میل تک سمندر میں تیر سکوں گا۔

جب جہاز کو سمندر میں سفر کرتے ایک دن گزر گیا تو مجھے کپتان زولو کے حکم سے کیبن سے نکال کر جہاز کا عرشہ دھونے، کچن کے برتن صاف کرنے وغیرہ کے کاموں پر لگا دیا گیا۔ اُس وقت مجھے روہنی کا بار بار خیال آ رہا تھا۔ اگر وہ میرے ساتھ ہوتی تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ یہ بحری ڈاکو مجھے قید کرتے۔ وہ تو اگر چاہتی تو ان سب کو ایک ایک کر کے ختم کر کے خود جہاز پر قبضہ کر لیتی۔

مگر روہنی مجھ سے جدا ہو چکی تھی۔ وہ میری سچی ہمدرد اور دوست تھی۔ مجھے اس کا خیال آنے لگا کہ خدا جانے کہاں ہو گی، کس حال میں ہو گی اور اس پر کیا گزر رہی ہو گی۔ ان بحری ڈاکوؤں نے مجھے اپنا غلام بنا لیا تھا۔ مجھ سے صبح سے رات تک کام کراتے، کھانے کو جو بچا کھچا ہوتا دے دیتے۔ میں سخت عذاب میں پھنس گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں؟ کیسے ان لوگوں سے جان چھڑاؤں۔ یہ جس کسی ملک کے قریب کھڑے ہوتے تو اس ملک کی سمندری حدود سے باہر یعنی چالیس میل کے فاصلے پر لنگر ڈالتے اور مجھے ایک کیبن میں بند کر کے باہر پہرہ بٹھا دیتے۔ اتنا مجھے علم ہو گیا تھا کہ یہ جس ملک کے قریب کھڑے ہوتے ہیں وہاں سمگلنگ کا مال فروخت کرتے ہیں اور موقع ملنے پر سرکاری اور غیر سرکاری گوداموں کا مال بھی لوٹ کر لے آتے ہیں۔ یہ اپنے کام میں بے حد ماہر تھے اور ان کا ایک آدمی بھی کبھی نہیں پکڑا گیا تھا۔ اس کے علاوہ سمندر میں سفر کرنے والے کسی اکا کا مال بردار جہاز کو بھی لوٹ لیتے تھے۔ دوز سے ایسے جہاز کی نشان دہی کرتے پھر اپنے جہاز میں کسی خرابی کا انہیں

وائر لیس پر سگنل دیتے۔ جب وہ جہاز ان کے قریب آتا تو ان کے لٹیرے شین گئیں، رانقلیں اور بینڈ گرنڈ لے کر جہاز پر کود جاتے اور جو سامنے آتا اسے بے دریغ گولیوں سے چھلنی کر کے جہاز کا سارا مال اسباب لوٹ کر آگے روانہ ہو جاتے۔

اس طرح مجھے اس مصیبت میں پھنسے دو مہینے گزر گئے۔

اس دوران نتالیا کی بھیجی ہوئی کوئی بدروح بھی مجھے پکڑنے نہیں آئی تھی۔ نتالیا کو شاید معلوم ہو گیا تھا کہ میرے بازو پر ایک بڑی طاقت والا طلسمی تعویذ بندھا ہوا ہے جس کے جادو کے سامنے اس کی کوئی بھی بدروح زندہ نہیں بچے گی۔ اس لئے نہ اس نے خود میرے قریب آنے کا خطرہ مول لیا تھا اور نہ ابھی تک کسی بدروح کو مجھے اٹھا کر لے جانے کے لئے بھیجا تھا۔ شاید نتالیا اس وقت کا انتظار کر رہی تھی کہ میری غفلت سے میرے بازو پر بندھا کالے جادو گر کا ہڈی والا تعویذ مجھ سے گم ہو جائے تو وہ اچانک حملہ کر کے مجھے اٹھا کر لے جائے۔ لیکن میں اس طرف سے بھی غافل نہیں تھا اور ہر روز رات کو سوتے وقت اور صبح اٹھ کر تعویذ کو اپنے بازو پر دیکھ لیتا تھا۔ اگر اس کی ڈوری ڈھیلی ہو گئی ہوتی تھی تو اسے اتارے بغیر وہیں کس دیتا تھا۔ میں اسے ایک لمحے کے لئے بھی بازو سے اتارنے کا خطرہ مول نہیں لیتا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ نتالیا کا آسیب غافل نہیں ہو گا۔ خود نہیں تو اس نے کسی نہ کسی بدروح کو میرے پیچھے لگا دیا ہو گا کہ جیسے ہی میں ایک سیکنڈ کے لئے کسی وقت تعویذ اپنے بازو سے اتاروں وہ مجھے وہیں دبوچ لے۔

کپتان زولو کی جو گرل فرینڈ نیگرو عورت تھی وہ اس وقت جب میں کپتان کے کیبن کی صفائی کرنے جاتا تھا تو میری طرف کپتان کی نظریں بچا کر دیکھ لیا کرتی تھی۔ خدا جانے میں اُسے پسند آ گیا تھا یا اسے مجھ سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی لیکن اس نے کبھی مجھ سے اپنی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اسی طرح مزید دو مہینے گزر گئے۔

ایک رات میں جہاز کے عرشے کو دھو رہا تھا کہ کپتان زولو نے میرے قریب

سے گزرتے ہوئے حکم دیا کہ میں نیچے جا کر اس کے کیبن کی صفائی کروں۔ میں نے فوراً لیس سر کہا اور اس کے کیبن کی طرف چل دیا۔ اس کا کیبن کھلا تھا۔ میں کیبن میں داخل ہوا۔ میز پر جھوٹے برتن پڑے تھے اور فرش پر پھلوں کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے صفائی شروع کر دی۔ اتنے میں کیپٹن زولو کی گرل فرینڈ نیگرو عورت کیبن میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں زم کی دو بوتلیں تھیں۔ مجھے بلائے بغیر وہ دیوار کے شیلف کی طرف گئی اور دونوں بوتلیں شیلف میں لگا دیں۔

پھر کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سگالیا اور مجھے صفائی کرتے دیکھنے لگی۔ میں نے بھی اس سے کوئی بات کرنی مناسب نہ سمجھی۔ جب میں صفائی کرتے ہوئے اس کے قریب سے گزرنے لگا تو اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے کسی قدر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ نیگرو عورت میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی۔

کہنے لگی۔ ”تم یہاں سے بھاگنا چاہتے ہو؟“

میں نے غیر شعوری طور پر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔“

میں اسے کیسے کہہ سکتا تھا کہ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ وہ کیپٹن زولو کی گرل فرینڈ تھی۔ اگر میں کہہ دیتا کہ ہاں میں اس عذاب سے نکلنا چاہتا ہوں تو کچھ پتہ نہیں کہ وہ یہ بات زولو کو بتا دیتی اور وہ خدا معلوم میرا کیا حشر کرتا۔ نیگرو عورت نے اپنا چہرہ میرے قریب لاتے ہوئے کہا۔ ”ڈرو نہیں۔ میں کیپٹن سے کچھ نہیں کہوں گی۔ مجھے اپنے دل کی بات بتا دو۔ کیا تم یہاں سے بھاگنا چاہتے ہو؟“

میں چپ رہا۔ کوئی جواب نہ دیا۔ نیگرو عورت نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ”مجھے اپنی دوست سمجھو۔ تم مجھے پہلے دن ہی اچھے لگے تھے۔ اگر میں زولو کے قبضے میں نہ ہوتی تو تم سے شادی کر لیتی مگر اب میں ایسا نہیں کر سکتی لیکن تمہاری جو ذرگرت یہاں بن رہی ہے میں وہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے بتاؤ کیا تم سچ مجھ یہاں سے بھاگ جانا چاہتے ہو؟ کہیں ایسی بات تو نہیں ہے کہ تم بھی اس کام کے عادی ہو گئے ہو اور تمہیں

یہاں کی زندگی راس آگئی ہے؟ بولو۔“

میں نے زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن نفی میں سر ہلادیا۔ نیگرو عورت نے میرا بازو چھوڑ دیا اور کہنے لگی۔ ”ٹھیک ہے۔ جاؤ۔“

میں صفائی کر کے کیمبن سے نکل آیا۔ دل میں سوچنے لگا کہ یہ عورت دھوکے سے میرے دل کا حال تو معلوم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے فکر لگ گئی کہ اگر اس نے کیپٹن زولو کو اتنا بھی بتا دیا کہ میں یہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں سخت پچھتانے لگا کہ میں نے اس عورت کے سامنے اس بات کی حامی کیوں بھری کہ میں اس جہاز سے فرار ہونا چاہتا ہوں۔

ساری رات یہ سوچ سوچ کر میں پریشان رہا۔

دوسرے دن وہ نیگرو عورت مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ شاید اپنے کیمبن میں سو رہی تھی۔ کیپٹن زولو ایک بار عرشے پر میرے قریب سے گزرنے لگا تو میں ڈر گیا کہ اسے میرے دل کا حال نیگرو عورت نے بتا دیا ہے اور اب یہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا اور اسی جگہ مجھے اپنے پستول سے ہلاک کر کے میری لاش سمندر میں پھینک دے گا لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی اور زولو خاموشی سے آگے چل دیا۔

شام کے وقت نیگرو عورت سے بھی عرشے پر میرا آمناسا منا ہو گیا لیکن اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ ایک بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ نیگرو عورت نے کیپٹن زولو کے آگے میری شکایت نہیں لگائی اور اسے کچھ نہیں بتایا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس عورت کو واقعی مجھ سے محبت یا ہمدردی ہو گئی تھی اور وہ میری مدد کرنا چاہتی تھی اور شاید کسی موقع کا انتظار کر رہی تھی۔

آخر وہ موقع آ گیا۔

خدا معلوم کون سا ملک تھا کہ ہمارے جہاز نے اس کی سمندری حدود کے باہر کھل سمندر میں لنگر ڈال دیا۔ اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور سمندر پر اندھیرا چھا

ہوا تھا۔ کیپٹن زولو کا قریبی ملک میں کوئی گودام لوٹنے کا پروگرام تھا۔ جب اندھیرا اور گہرا ہو گیا تو اس نے اپنے مسلح ڈاکوؤں کو ساتھ لیا اور یہ لوگ تیز رفتار کشتیوں میں سوار ہو کر چالیس میل دور ساحل کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاز پر چند ایک ملازم پیشہ لوگ ہی رہ گئے تھے۔

میں اس وقت کچن کی صفائی کر رہا تھا۔ کام ختم کرنے کے بعد میں نیچے سونے کے لئے اپنے کیمبن میں آ گیا جہاں آلوؤں کی بوریوں کے پاس میں نے سونے کے لئے ایک دری بچھائی ہوئی تھی۔ میں وہیں رات کو سو جاتا تھا۔ سارے دن کا تھکا ہوا تھا لیکن اب مجھے نیند آگئی۔ مجھے نہیں معلوم مجھے سوئے کتنی دیر ہوئی ہو گی کہ کسی نے میرے بازو کو ہلایا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کیمبن میں ایک بہت ہی مدہم روشنی والا بالب ہر وقت جلتا رہتا تھا۔

میں نے اس کی مدہم روشنی میں دیکھا کہ نیگرو عورت مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر بولی۔ ”میرے ساتھ آ جاؤ۔“

میں نے سنبھلتے ہوئے پوچھا۔ ”کہاں؟“

نیگرو عورت نے دھیمی آواز میں سختی سے کہا۔ ”خاموش! میرے پیچھے چلے آؤ۔“

میں سمجھ گیا کہ اس نے میرے فرار کا بندوبست کر دیا ہے۔ میں اٹھ کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ مجھے آخری کیمبن کے پاس جو تنگ زینہ اوپر کو جاتا تھا وہاں لے آئی اور سرگوشی میں بولی۔ ”جہاز کے پیچھے سمندر میں ایک کشتی کھڑی ہے میں نے اس میں تمہارے لئے سب کچھ رکھ دیا ہے۔ اس میں بیٹھ کر یہاں سے نکل جاؤ۔“

وہ آگے آگے زینہ چڑھ کر اوپر جہاز کے عرشے پر آگئی۔ یہ جہاز کا عقبی حصہ تھا۔ اس طرف کوئی خلاصی سو نہیں رہا تھا یا شاید اس نیگرو عورت نے میری محبت یا ہمدردی کی وجہ سے کسی سے مل کر ایسا انتظام کر دیا تھا کہ اس وقت وہاں اس پاس کوئی

نہ ہو۔ عرشے کا عقبی حصہ خالی پڑا تھا۔ وہ مجھے جہاز کے کونے کی طرف لے گئی۔ وہاں رسی کی ایک سیڑھی لٹکی ہوئی تھی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اس سیڑھی کے ساتھ تمہاری کشتی بندھی ہوئی ہے۔ کشتی میں بیٹھتے ہی رسی کھول کر فرار ہو جاؤ۔ جلدی کرو۔“

میں جلدی میں نیگرو عورت کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکا اور جنگلے میں سے نکل کر نیچے لٹکتی ہوئی رسی کی سیڑھی کو پکڑا اور نیچے اترنے لگا۔ نیچے ایک کشتی سمندر کی لہروں پر ڈول رہی تھی۔ میں اس میں اتر گیا۔ اترنے کے فوراً بعد میں نے کشتی کی رسی کھول دی۔ چوسنبھالا اور تیزی سے کشتی کو جہاز سے دور لے جانے لگا۔

میں نے رات کے وقت زولو کے ساتھیوں کو جہاز سے جاتے وقت دیکھ لیا تھا کہ وہ کس طرف کو جا رہے تھے۔ جس طرف وہ جا رہے تھے اس طرف قریبی ملک کا ساحل تھا۔ میں نے بھی کشتی کا رخ اسی طرف کر دیا۔ میں پوری طاقت کے ساتھ دائیں بائیں چوچلا رہا تھا۔ میں کچھ ہی دیر میں جہاز سے کافی دور نکل آیا۔ میں نے پیچ مڑ کر دیکھا۔ جہاز کی ساری بتیاں گل کر دی گئی تھیں۔ صرف ایک مدھم سی جی جھل رہی تھی وہ مجھ سے کافی دور ہو گئی تھی۔

کشتی روک کر سانس لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اس منحوس جہاز سے جتنی دور نکل سکتا تھا نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ کشتی میں جو ایک تھیلا پڑا ہے اس میں نیگرو عورت نے میرے لئے کیا کچھ رکھ دیا ہوا ہے۔ کشتی بڑی ہلکی اور چھوٹی تھی اور بڑی تیزی سے ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک جگہ آکر میں واقعی تھک گیا۔ میں نے چپورکھ دیا اور سر جھکا کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ یہ کوئی دریا نہیں تھا کہ کشتی اپنے آپ پانی کے بہاؤ پر بہنے لگتی۔ یہ سمندر تھا اور سمندر بھی ساحل سے کئی میل کے فاصلے کا سمندر تھا جہاں سمندر کی موجیں کسی طرف بہنے کی بجائے اوپر نیچے ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی حالت میں صرف ایک ہی خطرہ ہوتا ہے کہ کشتی کا رخ

نہ بدل جائے یعنی آگے جانے کی بجائے اس کا رخ پیچھے کی طرف ہو جائے۔ رات کے اندھیرے اور کھلے سمندر میں اتنی چھوٹی کشتی میں سمت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ میں سانس بھی درست کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ کبھی کبھی کشتی کے رخ کو اور کبھی آسمان پر ستاروں کو دیکھ لیتا تھا تاکہ میری سمت ٹھیک رہے۔ پھر بھی میں نے زیادہ آرام کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کسی بھی وقت مجھے کوئی مغالطہ لگ سکتا تھا اور کشتی کا رخ کسی دوسری طرف ہو سکتا تھا چنانچہ میں دوبارہ چوچلانے لگا۔ کشتی مخصوص سمت کو آگے بڑھنے لگی۔ کافی دیر تک میں کشتی چلاتا رہا۔ درمیان میں تھوڑی دیر کے لئے ہاتھ روک لیتا اور سانس درست کرتے ہوئے سامنے کی سمت نظریں جمائے رکھتا کہ کشتی ادھر ادھر نہ ہو جائے۔

آخر قدرت نے میری مشکل آسان کر دی اور مجھے دور اُفق پر ایک روشنی کا نقطہ ٹٹماتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ ساحل کی روشنی تھی۔ اسے دیکھ کر میرے جسم میں ایک نئی توانائی آگئی اور میں پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ کشتی چلانے لگا۔ روشنی کا نقطہ قریب آتا جا رہا تھا۔ پھر دائیں بائیں جانب روشنی کے کچھ اور نقطے ٹٹماتے دکھائی دینے لگے۔ میں کسی ملک کے ساحل پر پہنچنے والا تھا۔ اب مجھے یہ پریشانی تھی کہ اگر ساحلی کوسٹ گارڈز کے سینئروں نے گشت لگاتے مجھے دیکھ لیا تو پکڑا جاؤں گا۔ کوسٹ گارڈز کے سینئروں پر سر جھکا کر نہیں لگی ہوتی ہیں جن کی روشنی کو جب سمندر میں پھینکا جاتا ہے تو سمندر دور دور تک روشن ہو جاتا ہے اور سمندر میں اگر کوئی آدمی تیر بھی رہا ہو تو وہ نظر آ جاتا ہے۔

لیکن قدرت میری مدد کر رہی تھی۔ ابھی تک کسی کشتی پارٹی کے سینئر کی نہ تو آواز سنائی دی تھی نہ اس کی روشنی ہی نظر آئی تھی۔ میں نے کشتی کا رخ اس طرف کر لیا جیسے طرف ساحل پر روشنی کا صرف ایک ہی نقطہ جھللا رہا تھا۔ یہ لائٹ ہاؤس کی روشنی نہیں تھی کیونکہ لائٹ ہاؤس کی روشنی بڑی تیز ہوتی ہے اور یہ چاروں طرف

گھومتی رہتی ہے۔ پانی میں تیرتی ہوئی کئی جھاڑیاں کشتی سے ٹکرائیں۔ اس کا مطلب تھا کہ میں ساحل کے پاس آگیا تھا اور یہ ساحل ریتلا نہیں بلکہ وہاں جھاڑیاں اور سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔ میں چپو چلائے جا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے اپنے سامنے سیاہ دھبے دکھائی دینے لگے۔ یہ ساحل کے درخت ہی ہو سکتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان سیاہ دھبوں نے ایک دیوار سی بنادی۔ میں دور ہی سے اس دیوار کو بائیں جانب چھوڑ کر جنوب کی طرف کشتی لے آیا جہاں مجھے نیم دائرے میں درختوں کی قطار دکھائی دی۔ رات تاریک تھی۔ سمندر کی طرف سے ہوا چل رہی تھی۔

میں کشتی کو درختوں کے نیم دائرے کے اندر لے گیا۔ یہ سمندر کی کوئی کھاڑی تھی۔ سمندر ساحل کو کاٹ کر یہاں داخل ہو گیا تھا اور اس نے وہاں ایک جھیل سی بنا دی ہوئی تھی۔ وہاں کسی طرف کوئی روشنی نہیں تھی۔ میں نے کشتی کھاڑی میں لے جا کر ایک طرف سرکنڈوں کے پیچھے لگا دی۔ کشتی سے اتر آیا۔ کھاڑی کا پانی میرے گھٹنوں تک آتا تھا۔ میں کشتی کو کھینچتے ہوئے ساحل پر لے گیا اور اسے ایک جگہ سرکنڈوں کے ساتھ باندھا اور کشتی میں بیٹھ کر غور سے ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ کھاڑی کے بائیں جانب دور بہت سی روشنیاں نظر آرہی تھیں مگر میرے دائیں جانب اور سامنے کی طرف کوئی روشنی نہیں تھی۔ میں اُس تھیلے کی طرف متوجہ ہوا جو نیگرو عورت نے میری کشتی میں رکھ دیا تھا۔ میں نے تھیلا کھول کر اس میں ہاتھ ڈالا۔ میرا ہاتھ ایک نارچ سے ٹکرایا۔ میں نے نارچ کو باہر نکال لیا۔ یہ چھوٹے سائز کی نارچ تھی۔ میں نے اس کا منہ تھیلے کی طرف کر کے نارچ کا بٹن دبایا اور اس کی روشنی میں تھیلے کی چیزوں کو دیکھنے لگا۔

تھیلے میں ایک پتلون، ایک بش شرٹ، ایک خنجر اور ایک ڈبے میں ابلے ہوئے چاول تھے۔ ایک لفافہ بھی تھا۔ میں نے اسے کھولا تو اس میں کرنسی نوٹ تھے۔ میں نے نارچ ڈالی تو وہ انڈیا کی کرنسی تھی۔ پچاس پچاس اور دس دس کے نوٹ تھے۔ میں

نے گئے۔ کل ڈھائی ہزار روپے تھے۔ نیگرو عورت کو معلوم تھا کہ ان کا جہاز انڈیا کے ساحل کے قریب لنگر انداز ہے چنانچہ اس نے تھیلے میں انڈین کرنسی نوٹ رکھ دیئے تھے۔ ان لوگوں کے پاس ہر ملک کی کرنسی ہر وقت موجود رہتی تھی۔

میں نے اسی وقت جہاز کے خلاصی کی وردی اتار کر پتلون اور بش شرٹ پہنی اور خنجر پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ وہیں بیٹھ کر تھوڑے سے چاول کھائے اور ستاروں کو دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ اگر یہ انڈیا کا ساحل ہے تو مشرقی ساحل ہے یا مغربی ساحل ہے۔ ستاروں کے مشاہدے سے میں کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔ اب وہاں سے آگے جا کر ہی پتہ چل سکتا تھا کہ میں انڈیا کے کون سے علاقے میں ہوں کیونکہ انڈیا کی تینوں جانب سمندر ہے۔

جس طرف روشنیاں زیادہ نہیں تھیں میں نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ کرنسی نوٹ میں نے پتلون کی اندرونی جیب میں سنبھال کر رکھ لئے تھے۔ ان کی مجھے آگے چل کر قدم قدم پر ضرورت تھی۔ رات ڈھلنے لگی تھی۔ کچھ دیر کے بعد آسمان پر سحر کا اُجالا پھیلنے لگا اور ساحل سمندر دور تک دکھائی دینے لگا۔ میں ساحل سمندر کو پیچھے چھوڑ کر چل رہا تھا۔ کچھ دور تک ساحل ریتلا تھا پھر ناریل کے جھنڈ نظر آنے لگے۔ ناریل کے درخت انڈیا کے مغربی ساحل پر بھی ہوتے ہیں اور مشرقی ساحل پر بھی ہوتے ہیں۔ جب سورج طلوع ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ میں انڈیا کے مشرقی ساحل پر ہوں۔ اب یہ دیکھنا تھا کہ یہ انڈیا کے صوبہ کیرالہ کا علاقہ ہے یا صوبہ کرناٹک کا ساحل ہے۔

آگے ناریل کے درختوں کے نیچے کچھ جھونپڑیاں تھیں۔ ایک عورت سل پر چاول پیس رہی تھی۔ اس کا دبلا پتلا مرد قریب ہی بیٹھا سوکھے ناریلوں کی چھال اُتار رہا تھا۔ میں نے ان کے پاس جا کر آدمی کو پرنام کیا اور اس علاقے کی ہندی زبان میں پوچھا کہ وہاں سے شہر کو سیدھا راستہ کون سا ہے۔

اس نے ہندی میں ہی اپنے پیچھے اشارہ کر کے کہا۔ ”ادھر کو آگے پال گھاٹ پہنچ جاؤ گے۔“

میں سمجھ گیا کہ میں بھارت کے صوبہ کیرالہ کے ساحل پر ہوں۔ پال گھاٹ کیرالہ کی اہم بندرگاہ اور ریلوے اسٹیشن بھی ہے جہاں سے وایا منگور، حویلی، بلگام، کولہاپور اور پونا بمبئی کو ٹرین جاتی ہے۔ میں خوش ہوا کہ میں منزل کے قریب پہنچ گیا ہوں اور بمبئی وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے بس ایک دن اور ایک رات کا ٹرین کا سفر تھا۔ خوشی مجھے اس بات کی بھی تھی کہ میں ساحلی حفاظتی گارڈز کی نگاہوں سے بچ کر انڈیا میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میں ناریل کے جنگل میں داخل ہو گیا۔ یہ جنگل بڑی دور تک پھیلا ہوا تھا۔ میں چلتا چلا گیا۔ آخر جنگل ختم ہو گیا اور چھوٹی چھوٹی جھوپڑیوں کی ایک بستی آگئی۔ میں اس سے دور رہ کر آگے نکل گیا۔ دن کافی نکل آیا تھا جب میں کیرالہ کے مشہور ساحلی شہر پال گھاٹ میں آگیا۔ اس زمانے میں یہ شہر زیادہ وسیع اور ماڈرن نہیں تھا۔ پرانی اونچی عمارتوں والے بازار تھے۔ ان بازاروں میں موٹر کاروں کے ساتھ بیل گاڑیاں بھی چل رہی تھیں۔ لوگ شہر کے ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک بیل گاڑیوں میں بھی سفر کرتے تھے۔ میں پانچ روپے دے کر ایک بیل میں سوار ہو کر پال گھاٹ کے ریلوے اسٹیشن پر آگیا۔ معلوم ہوا کہ کیرل ایکسپریس دو گھنٹے بعد بمبئی روانہ ہو گی۔ میں نے وہیں اسٹیشن پر تھوڑا بہت ناشتہ کیا اور ٹرین کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

ٹرین نے وہیں سے تیار ہونا تھا۔ اپنے وقت پر ٹرین پلیٹ فارم پر آکر لگ گئی۔ میں نے احتیاط کے طور پر سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لے رکھا تھا۔ سیکنڈ کلاس کپارٹمنٹ بالکل خالی تھا۔ میں کونے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹرین بمبئی کی طرف چل پڑی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں نے کیپٹن زدلو کی ظالمانہ قید سے اتنی جلدی چھٹکارا حاصل کر لیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ننگر و عورت میری مدد نہ کرتی تو میرا ان ڈاکوؤں کے جہاز

سے فرار ہونا ناممکن تھا۔ قدرت نے اس ننگر و عورت کو میری مدد کے لئے بھیج دیا تھا۔ میں دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا تھا۔

ٹرین کا نام تو کیرل ایکسپریس تھا مگر وہ ہر اسٹیشن پر کھڑی ہو جاتی تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا جب وہ منگور پہنچی۔ رات کے وقت حویلی کا اسٹیشن آیا۔ میں برتھ پر چڑھ کر سو گیا۔ میرے سوتے میں ہی بلگام اور کولہاپور کے اسٹیشن گزر گئے۔ دن کافی چڑھ آیا تھا جب ٹرین پونا پہنچی۔ اب بمبئی زیادہ دور نہیں تھا۔ آخر میں بمبئی پہنچ گیا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے مجھے نئی زندگی مل گئی ہو۔ نتالیا کے آسیب اور ان کی بدروحوں میں سے کسی نے ابھی تک مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کالے جادوگر کی دی ہوئی انسانی ہڈی اسی طرح میرے بازو کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ بمبئی کے اسٹیشن سے میں نے ٹیکسی پکڑی اور اپنے دوست کے گھرانے میں آگیا۔

جمشید مجھے دیکھ کر بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ کہنے لگا۔ ”فیروز! خدا کے لئے مجھے ایک ہی بار بتادو کہ تم کن چکروں میں پھنسے ہوئے ہو۔ اچانک غائب ہو جاتے ہو اور پھر اچانک کسی طرف سے نمودار ہو جاتے ہو۔ آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”جمشید! وقت آنے پر میں سب کچھ بتا دوں گا۔ اس وقت میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“

جمشید نے کہا۔ ”اوپر چلے جاؤ۔ میرا بیڈ روم خالی پڑا ہے۔ تم ناشتہ نہیں کرو گے؟“

”ناشتہ میں نے ٹرین میں ہی کر لیا تھا۔“ میں نے کہا اور جمشید کے بیڈ روم میں آتے ہی اپنے آپ کو بستر پر گرادیا اور گہری نیند سو گیا۔ جب سو کر اٹھا بلکہ جب عبدل نے مجھے اٹھایا تو دوپہر کے تین بج رہے تھے۔

جمشید بھی اوپر آگیا۔ کہنے لگا۔ ”تمہارے انتظار میں میں نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ چلو کھانا کھا لیتے ہیں۔“

دوسرے کمرے میں بیٹھ کر ہم دونوں نے کھانا کھایا۔ جمشید نے پوچھا۔ ”اس وقت تم کہاں سے آرہے ہو؟ اتنی مدت کہاں غائب رہے؟ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا ایک مہینے کا ویزا تھا اور تمہیں تھانے میں جا کر واپسی کی رپورٹ بھی کرنی تھی۔ وہ تو میں نے سارا معاملہ اس طرح سنبھالا کہ تھانیدار کھانڈیکر کو یہ کہہ دیا کہ تم بیمار ہو گئے ہو۔ اپنے اثر و رسوخ سے میں نے کھانڈیکر کو تمہارے خلاف رپورٹ اوپر نہیں بھجوانے دی۔ اب اسی وقت میرے ساتھ تھانے چل کر رپورٹ کرو اور کھانڈیکر تمہارے ویزے پر یہ تین چار مہینے کسی طرح بڑھا دے گا۔“

میں نے کہا۔ ”مگر میرے پاس تو پاسپورٹ نہیں ہے۔“

”تمہارا پاسپورٹ کہاں چلا گیا؟“ جمشید نے حیرانی سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”گم ہو گیا۔ کیا کروں چارپانچ مہینے عجیب حالات میں پھنسا رہا۔“

جمشید نے پوچھا۔ ”آخر وہ کون سے حالات ہیں؟ میں تمہارا دوست ہوں کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”جمشید! وقت آنے پر میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ اس وقت میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔“

جمشید بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں پولیس کا معاملہ جیسے بھی ہو اسنبھال لوں گا۔ لیکن یہ بتاؤ اب تم کب اچانک غائب ہو رہے ہو؟“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”کچھ پتہ نہیں۔ لیکن مجھے ایک دو دن کے لئے جے پور جانا ہو گا۔“

”جے پور کس لئے جا رہے ہو؟“ جمشید نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”یہ بھی میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔“

دراصل میں جے پور جا کر قدیم ویران محل میں دُرگاکا بدروح سے ملاقات کر کے اسے سارے حالات سے باخبر کرنا چاہتا تھا۔ اسے روہنی کی ایک بار پھر گشدگی کا

بتانا چاہتا تھا۔ صرف وہی مجھے بتا سکتی تھی کہ روہنی کس حال میں ہے اور کہاں ہے؟ اس کے علاوہ میں اپنے بارے میں اس سے مشورہ لینا چاہتا تھا کہ میں نتالیا کی قید سے تو فرار ہو کر آگیا ہوں اب مجھے اس آسیب سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔

O.

دروازے کی جگہ دیوار کھڑی کر دی ہے۔ روہنی اب وہاں سے نہیں نکل سکتی۔“
میں نے کہا۔ لیکن روہنی تو اب بدروح نہیں ہے۔ وہ ایک اچھی روح بن چکی ہے
اور اچھی روحیں کسی بھی چار دیواری میں بند نہیں کی جاسکتیں۔ وہ بند دیواروں میں
سے بھی گزر جاتی ہیں۔“

دُرگا بولی۔ ”تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ لیکن روہنی کی روح کے ساتھ اس کے کچھ
گناہوں کا بوجھ ابھی تک چمٹا ہوا ہے جس کو جھڑنے میں کافی وقت لگے گا۔“
میں نے کہا۔ ”آخر یہ کون سے گناہ ہیں؟“

دُرگانے کہا۔ ”اس کا صرف ایک ہی گناہ ہے کہ اُس نے اس مادی دنیا کی محبت کو
اپنے دل میں بہت زیادہ سار کھا تھا۔ وہ ابھی روح کی ترقی کی پہلی سیڑھی پر ہے۔ کچھ
وقت کے بعد اس کا یہ گناہ بھی اس کی روح سے جھڑ جائے گا۔ جب تک اس گناہ کا باقی
بچا ہوا تھوڑا بہت بوجھ اس کے ساتھ لگا ہے روہنی کی روح کے راستے میں رکاوٹیں
آتی رہیں گی۔“

میں نے کہا۔ ”مگر میں نے خود دیکھا ہے کہ روہنی کی روح بند دیواروں میں سے
گزر جاتی تھی۔“

دُرگا کہنے لگی۔ ”یہاں معاملہ اور ہے۔ وہ نتالیا کے طاقت ور اور خطرناک آسیب
کے قبضے میں ہے۔ نتالیا نے اسے جس تہہ خانے میں بند کر رکھا ہے اس کی دیواروں
میں ایسا طلسم پھونک دیا ہوا ہے کہ جب تک وہ طلسم موجود ہے روہنی اس چار دیواری
سے باہر نہیں نکل سکتی۔“

میں نے کہا۔ ”کیا میں روہنی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا؟“
دُرگانے کہا۔ ”بلکہ یوں کہو کہ صرف تم ہی اس وقت اس کی مدد کر سکتے ہو۔“
”مگر میں ایک عام انسان ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں کیسے اُس طلسمی چار دیواری
میں داخل ہو سکوں گا جہاں روہنی قید ہے۔“

میں صرف دو دن بمبئی ٹھہرا۔
تیسرے دن میں بے پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ بے پور، میں شام کے وقت
پہنچا۔ ایک ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور اٹھ کر ایک باغ میں آکر بیٹھ گیا اور رات
گہری ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب رات کے گیارہ بج گئے تو میں ویران محل کی
طرف چل پڑا۔ محل کے خفیہ راستے سے اندر داخل ہو گیا اور اس تہہ خانے میں آکر
دُرگا کی بدروح کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ آدمی رات کے بعد طوفانی ہواؤں اور
دُراؤنی آوازوں کے ساتھ دُرگا کی روح نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔
”شیروان! تم بڑی اچھی قسمت لے کر پیدا ہوئے ہو ورنہ اس بار تم نتالیا کی قید سے
آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”دُرگا! یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ اگر قسمت میرا ساتھ نہ دیتی تو
اس بار میرا فرار ہونا اتنا آسان نہیں تھا لیکن خدا کے لئے یہ بتاؤ کہ روہنی کہاں ہے
اور میں اس سے کہاں مل سکتا ہوں کیونکہ اس سے ملے بغیر میں اس منحوس چکر سے
باہر نہیں نکل سکتا۔“

دُرگا کی بدروح نے کہا۔ ”تمہارے بازو پر کالے جادوگر نے جو جادو کی ہڈی
باندھ رکھی ہے اس کی وجہ سے نتالیا کا آسیب اور اس کی بدروحیں تمہارا تو کچھ نہیں
بگاڑ سکتیں لیکن تمہارا انتقام وہ روہنی سے لے رہی ہے اور اس نے روہنی کو اپنے قبضے
میں کر کے اسے کرسچین قبرستان والی پرانی عمارت کے تہہ خانے میں بند کر کے

دُرگاکے بدروح کہنے لگی۔ ”یہی تم انسانوں کی بھول ہے۔ تم لوگوں کو معلوم ہی نہیں ہے کہ قدرت نے انسان کو کتنی زبردست طاقت دے رکھی ہے۔ جن لوگوں کو اپنی طاقت کا اندازہ ہو جاتا ہے وہ سب سے پہلا کام یہ کرتے ہیں کہ قدرت کی دی ہوئی غیر فانی طاقت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے آپ کو برائی سے بچاتے ہیں۔ اپنے دل میں سے اللہ کے خوف کے سوا باقی سارے خوف نکال کر باہر پھینک دیتے ہیں۔ جھوٹ نہیں بولتے، شراب نہیں پیتے، حلال کی روزی کما کر کھاتے ہیں۔ جب وہ اس راستے پر چل پڑتے ہیں تو پھر وہ خلق خدا کی بھلائی کے لئے ایسے کام کر جاتے ہیں کہ رہتی دنیا تک ان کا نام زندہ رہتا ہے اور اگلی دنیا میں بھی انہیں جنت کا اعلیٰ مقام عطا ہوتا ہے۔“

میں دُرگا بدروح کی زبانی یہ باتیں سن کر بڑا حیران ہوا۔ میں نے اُس سے کہا۔ ”میں نے پہلے کبھی تمہارے منہ سے ایسی باتیں نہیں سنیں۔ کیا تم ان باتوں پر یقین رکھتی ہو؟“

دُرگانے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ ”شیروان! مجھے مرنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ میری سب سے بڑی بد قسمتی یہ تھی کہ میں بتوں کی پوجا کرنے والوں کے گھر پیدا ہوئی۔ پھر میں بھی ساری زندگی بتوں کی پوجا کرتی رہی۔ کاش میں کسی مسلمان کے گھرانے میں جنم لیتی۔ صرف ایک خدا کی عبادت کرتی پھر میری بخشش ہو جاتی اور مرنے کے بعد میں بدروح کی شکل اختیار نہ کرتی۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھے بدروح بن کر اپنے برے کرموں کی سزا بھگتنی ہی پڑے گی۔“

دُرگاکے بدروح کچھ دیر تک بالکل خاموش رہی۔ تہہ خانے کی فضا میں ایک عجیب سا سکوت چھا گیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”میں تمہیں بتا رہی تھی کہ صرف تم ہی روہنی کی مدد کر سکتے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”کیا نتالیا کا طلسم مجھ پر اثر نہیں کرے گا؟“

دُرگانے کہا۔ ”اس سے بچنے کا طریقہ میں تمہیں بتا دوں گی۔“

”مگر میں بند چار دیواری میں کیسے داخل ہوں گا؟“ میں نے پوچھا۔

دُرگا بولی۔ ”یہ بھی میں تمہیں بتا دوں گی کہ تمہیں کیا کرنا ہو گا۔ اس مہم پر تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم بھی میرے ساتھ جاؤ گی؟“

دُرگا کہنے لگی۔ ”نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ میری ایک غلام بدروح تمہارے ساتھ جائے گی۔ اس کا نام پاتالی ہے۔ پاتالی ایک عورت کی شکل میں تمہارے ساتھ جائے گی۔ وہی تمہیں اپنے ساتھ اس جگہ لے جائے گی جہاں آئینی نتالیا نے روہنی کو قید کر رکھا ہے۔ بدروح پاتالی کو سب پتہ ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ وہ تمہیں جو کہے گی تمہیں اس پر عمل کرنا ہو گا۔ میں نے پاتالی کو سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ میں نے اس کے اندر اپنی طاقت بھی ڈال دی ہے۔ پاتالی میں اب اتنی طاقت آگئی ہے کہ وہ روہنی کو نتالیا کی قید سے ضرور نکال لائے گی۔ ہاں تم سے کوئی غلطی نہیں ہونی چاہئے۔ اگر تم سے کوئی غلطی ہو گئی تو پھر سارا کام خراب ہو سکتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں پاتالی کے کہنے پر چلوں گا۔ جیسے وہ مجھے کہے گی میں کرتا جاؤں گا اپنی مرضی سے کچھ نہیں کروں گا۔“

دُرگا بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ اب میں پاتالی کو یہاں بلاتی ہوں۔“

دُرگا کے حلق سے ایک عجیب چیخ نما آواز نکلی۔ اس کے ساتھ ہی سامنے والی دیوار میں سے سیاہ دھوئیں کا ایک مرغولہ نمودار ہوا اور دُرگا کے سامنے آکر رُک گیا۔

دُرگانے کہا۔ ”پاتالی! یہ شیروان ہے۔ تمہیں اس کو اپنے ساتھ لے کر جانا ہو گا۔ میں نے تمہیں سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ روہنی میری سہیلی ہے۔ وہ مجھے بہت پیاری ہے۔ اُس کو ہر حال میں نتالیا کے آسیب کی قید سے نکال کر لانا ہے۔“

پاتالی بدروح کے سیاہ مرغولے میں سے بھاری اور کسی حد تک ڈراؤنی آواز بلند ہوئی۔ ”دُرگامیا! تمہارے لئے پاتالی کی جان بھی حاضر ہے۔ میں روہنی کو بڑی جلدی تمہارے پاس لے آؤں گی۔“

دُرگامیا بدروح نے کہا۔ ”یہ شیروان ہے۔ اس کے بارے میں میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ یہ کون ہے اور روہنی کے ساتھ اس کا کیا رشتہ ہے۔ میں نے اسے بھی سمجھا دیا ہے۔ یہ تمہارے حکم کے مطابق چلے گا اور وہی کرے گا جو تم کہو گی۔“

پاتالی بدروح کے مرغولے کی آواز ابھری۔ ”دُرگامیا! آدمی کی ذات کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر اس سے کوئی غلطی ہو گئی تو پھر مجھے کچھ نہ کہنا۔“

دُرگانے کہا۔ ”نہیں۔ یہ کوئی غلطی نہیں کرے گا۔ اب تم اسے لے کر اپنی مہم پر روانہ ہو جاؤ۔“

پاتالی بدروح کے سیاہ مرغولے نے کہا۔ ”جو حکم دُرگامیا!“

اس کے بعد دھوئیں کا مرغولہ گھومنے اور چکر کھانے لگا۔ گھومتے گھومتے وہ رُک گیا اور اس کے بعد ہی ایک خوبصورت لڑکی کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ چہرے کے نقوش تیکھے تھے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ اس بدروح لڑکی نے کالج کی لڑکیوں کی طرح جیمز پہنی ہوئی تھی اور اس کے بال بھی کٹے ہوئے تھے۔ کندھے کے ساتھ پرس لٹک رہا تھا۔ دُرگانے مجھ سے کہا۔ ”شیروان! اس سے ملو۔ یہ پاتالی ہے۔“

پاتالی نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر انگریزی میں بولی۔ ”تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔“

میں پہلی بار ایک ایسی بدروح کو دیکھ رہا تھا جو انگریزی بولتی تھی۔ میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔ ”مجھے بھی تم سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔“

دُرگانے پاتالی سے کہا۔ ”پاتالی! اس مہم میں اگر کسی وقت میری مدد کی ضرورت

پڑ جائے تو فوراً میرا منتر پڑھ کر پھونکنا میں یہیں سے تمہیں بتا دوں گی کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے۔“

پاتالی نے کہا۔ ”جو حکم دُرگامیا!“

ایک سوال بار بار میرے دل میں اٹھ رہا تھا۔ میں نے آخر دُرگاسے پوچھ ہی لیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”دُرگا! میرے بازو پر کالے جادوگر نے جو ہڈی کا تعویذ باندھ رکھا ہے اس کے بارے میں اُس نے کہا تھا کہ کوئی بدروح میرے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی۔ لیکن اس بدروح پاتالی نے تو مجھ سے ہاتھ بھی ملایا ہے اور اسے کچھ نہیں ہوا۔ کیا کالے جادوگر کا تعویذ بے اثر ہو گیا ہے؟“

دُرگانے کہا۔ ”نہیں۔ کالے جادوگر کا دیا ہوا تعویذ بے اثر نہیں ہوا۔ اس کا طلسمی اثر قائم ہے۔ پاتالی پر اس کا اثر اس لئے نہیں ہوا کہ یہ بدروح اچھی نیت سے تمہارے پاس آئی ہے۔ یہ تمہیں نقصان پہنچانے کے لئے نہیں آئی۔ بلکہ تمہاری مدد کرنے کے لئے آئی ہے اس طرح یہ اب تمہارے لئے بدروح نہیں رہی۔ یہ تمہاری دوست اور ہمدرد بن چکی ہے اس لئے تعویذ کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اگر یہ بری نیت سے آتی تو تم سے ہاتھ ملاتے ہی جل کر راکھ ہو جاتی۔“

دُرگامیا بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ اُس نے پاتالی سے کہا۔ ”پاتالی! اپنی مہم پر شیروان کو لے کر روانہ ہو جاؤ۔“

اتنا کہہ کر دُرگامیا بدروح غائب ہو گئی۔ پاتالی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”چلو مائی ڈیر شیروان!“

پاتالی ماڈرن لڑکیوں کی طرح بات کرتی مجھے بڑی اچھی لگی مگر میں جانتا تھا کہ آخر یہ بھی بدروح ہی ہے۔ تہہ خانے سے نکلنے کے بعد میں محل کے پرانے خفیہ دروازے کی طرف بڑھا تو پاتالی نے کہا۔ ”ہم خفیہ دروازے سے نہیں جائیں گے۔ ہم اسی دروازے سے جائیں گے جس دروازے سے ٹورسٹ باہر جاتے ہیں۔“

جب میں نے پاتالی کو بتایا کہ یہ قدیم محل انڈیا کے محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں ہے اور گیٹ پر رات کو بھی چوکیدار موجود ہوتے ہیں تو اس نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے۔“

ہم محل کے بڑے ہال کمروں میں سے گزرتے ہوئے محل کے صحن میں آگئے۔ پاتالی وہاں رُک گئی۔ اُس نے اپنے پرس میں سے ایک سادہ سی انگوٹھی نکال کر مجھے دی اور کہا۔ ”اسے انگلی میں پہن لو۔“

میں نے انگوٹھی اپنی انگلی میں پہنی تو میں غائب ہو گیا۔ اب جو میں نے دیکھا تو پاتالی بھی غائب ہو چکی تھی مگر غائب ہونے کے باوجود مجھے اُس کا دھندلا دھندلا خاکہ سا نظر آرہا تھا۔ کہنے لگی۔ ”میں جتنا تمہیں نظر آرہی ہوں اتنا صرف تم ہی مجھے دیکھ سکو گے دوسرا کوئی انسان مجھے اتنا بھی نہیں دیکھ سکے گا۔“

ہم محل کے گیٹ کی طرف بڑھے۔ وہاں خوب روشنی ہو رہی تھی اور رات کو پہرہ دینے والے دو چوکیدار موجود تھے۔ ہم ان کے درمیان سے گزر گئے۔ ان میں سے کسی نے ہمیں نہ دیکھا۔

پاتالی نے کہا۔ ”ابھی کافی رات باقی ہے۔ میرا دل کافی پینے کو چاہ رہا ہے۔ بے پور کے ایک ہوٹل میں نورسٹوں کے لئے رات بھر کافی کی سروس کھلی ہوتی ہے۔ چلو وہاں چلتے ہیں۔“

شاید اسے میں غائب ہونے کے باوجود بھی دکھائی دے رہا تھا کیونکہ جب وہ مجھ سے بات کر رہی تھی تو اس کا چہرہ بالکل میرے چہرے کی سیدھ میں تھا اور اس کی نگاہیں میری آنکھوں پر مرکوز تھیں۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”یہ ہوٹل یہاں سے کتنی دُور ہو گا؟“ میں آخر زندہ انسان تھا غائب ہونے کے باوجود اس قسم کے سوال پوچھنے پر مجبور تھا۔

پاتالی نے مسکرا کر کہا۔ ”اپنا ہاتھ مجھے دو۔“

میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے کہا۔ ”آنکھیں بند کرو۔ جب تک میں نہ کہوں آنکھیں نہ کھولنا۔“

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی تیز ہوا کا جھونکا میرے جسم سے ٹکرا گیا۔ پاتالی نے کہا۔ ”آنکھیں کھول دو۔“

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک ماڈرن قسم کے عالی شان ہوٹل کی لابی میں کھڑا تھا اور پاتالی مجھے اپنے پورے جسم کے ساتھ بالکل صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ اب غائب نہیں تھی۔ اُس نے کہا۔ ”انگوٹھی اتار کر جیب میں رکھ لو۔“ میں نے انگوٹھی اتاری تو میں بھی غیبی حالت سے اپنی زندہ انسانی شکل میں واپس آ گیا۔ میں نے فوراً درگردہ دیکھا۔ کچھ غیر ملکی گورے سیاح تھوڑے فاصلے پر کرسیوں پر بیٹھے مشروب وغیرہ پی رہے تھے اور دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں گوری عورتیں بھی تھیں۔ ہم ایک میز کے گرد کھلی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ یہ بے پور کے راجہ کا محل تھا جس کو ریاست چھن جانے کے بعد راجہ نے ہوٹل میں تبدیل کر دیا تھا۔

ایک سرخ وردی والا بیرہ جس نے سرخ راجستھانی پگڑی باندھی ہوئی تھی ہماری میز پر آ گیا۔ پاتالی نے دو کافی کا آرڈر دے دیا۔ میز پر گلدان میں پھول لگے ہوئے تھے۔ گلابی رنگ کے ٹشو پیپر بھی ایک سنہری ڈبے میں نظر آرہے تھے۔ پاتالی نے ایک ٹشو پیپر نکال کر اپنے ہونٹوں پر آہستہ سے پھیرا پھر پرس میں سے اپنا چھوٹا سا وینٹینی کیس نکال کر چھوٹا سا گول آئینہ سامنے کر کے ہونٹوں پر لپ شک کی تہہ جمانے لگی۔ میں یہ سوچ کر دل میں ہنس پڑا کہ اگر مجھے معلوم نہ ہوتا کہ یہ ایک بدروح ہے تو میں اس کے عشق میں گرفتار ہو سکتا تھا۔

بیرا کافی کا ٹرے رکھ کر چلا گیا۔ میں نے کافی بنائی اور ہم کافی پینے لگے۔ میں نے پاتالی سے کہا۔ ”پاتالی! اس وقت ہم بڑے ماڈرن اور دوستانہ ماحول میں بیٹھے ہیں۔ کیا

میں تم سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟“

پاتالی نے اپنی طلسم زدہ نظروں سے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی۔ ”میں جانتی ہوں تم مجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ میں کون ہوں؟ کہاں پیدا ہوئی اور کہاں میری موت واقع ہوئی؟ یاد رکھو۔ مجھ سے اور سب کچھ پوچھ سکتے ہو مگر اس قسم کے سوال پوچھنے کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔“

میں وہیں سہم کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک ہم خاموشی سے کافی پیتے رہے۔ پھر میں نے کہا۔ ”آئی ایم سوری پاتالی!“

پاتالی مسکرائی۔ ”اٹ ازل رائٹ شیروان!“

میں نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے پاتالی سے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تمہیں معلوم ہو گا کہ ہمارا ٹارگٹ یہاں سے دُور انڈیا کے شمالی پہاڑی علاقے میں اس کرپشن قبرستان کا دیران کھنڈر ہے جس کے تہہ خنہ میں نتالیا کے آسب نے روہنی کو قید کر رکھا ہے۔“

پاتالی نے پرس میں سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ سلاگیا۔ میں پہلی بار کسی بدروح کو سگریٹ پیتے دیکھ رہا تھا۔ واقعی یہ ایک ماڈرن بدروح تھی اور اس سے کسی انسان کا بچنا ناممکن تھا۔ سگریٹ کا ہلکا سا کش لگا کر کہنے لگی۔ ”مجھے سب کچھ معلوم ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہمیں صبح کے وقت بے پور سے دلی جانے والی گاڑی مل جائے گی۔ دلی سے ہم پنجاب میل کے ذریعے چند ی گڑھ پہنچ جائیں گے۔ وہ کھنڈر چند ی گڑھ کی شمالی پہاڑیوں میں ایک جگہ ہے۔ میں نے وہ جگہ دیکھی ہوئی ہے۔“

پاتالی کہنے لگی۔ ”میں نے بھی دیکھی ہوئی ہے۔“

بیرا قریب سے گزرا تو پاتالی نے اسے اشارے سے پاس بلا کر کہا۔ ”دو کافی اور کچھ سینڈوچز لے آؤ۔“

بیرا ادب سے سر جھکا کر چلا گیا۔ پاتالی نے مجھ سے کہا۔ ”صبح ہونے تک ہمیں وقت تو گزارنا ہی ہے اور بے پور میں ٹائم پاس کرنے کے لئے اس سے اچھی جگہ کہیں نہیں ہے۔“

میں نے پاتالی سے کہا۔ ”ایک بار میں روہنی کے ساتھ پرانے کھنڈر کی طرف گیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ہوا میں اڑا کر لے گئی تھی۔“

پاتالی کے دلکش چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ کہنے لگی۔ ”یہ میں بھی بڑی آسانی سے کر سکتی ہوں لیکن ایک عرصہ سے میں نے ٹرین میں سفر نہیں کیا۔ جب میں زندہ تھی تو ٹرین میں سفر کرنا میری ہابی ہوا کرتی تھی۔ اب مجھے موقع ملا ہے تو میں اسے ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ ہم چند ی گڑھ تک ٹرین میں ہی سفر کریں گے۔“

پاتالی نے ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد سگریٹ کا ہلکا سا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ ”دُر گامیتا نے مجھے بتایا تھا کہ روہنی تم سے بڑی محبت کرتی ہے اور تم بھی اب اس سے محبت کرنے لگے ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟“

عورت چاہے بدروح بن جائے مگر محبت کے بارے میں باتیں کرنا اور دوسروں کی محبت کی سراغ رسانی کرنا کبھی فراموش نہیں کرتی۔

میں نے کہا۔ ”ہاں۔ تھوڑی تھوڑی محبت مجھے اس سے ہو گئی ہے۔“

پاتالی مجھے بڑی سنجیدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”تم زندہ انسانوں کو کیا معلوم کہ ہم بری روحوں کی محبت کیا ہوتی ہے۔ تمہاری محبت صرف تمہاری زندگی تک زندہ رہتی ہے۔ موت کے ساتھ ہی تم سب محبتیں وغیرہ بھلا دیتے ہو جبکہ ہم بدروحوں کی محبت مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ ایسی محبت کبھی نہیں مرتی۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ بہر حال مجھے زندگی سے پیار تھا اور مجھے زندہ انسانوں سے محبت کرنا ہی اچھا لگتا تھا۔ ان بدروحوں اور ان کی دنیا سے تو میں تنگ آچکا تھا۔ بیرا کافی اور سینڈوچز لے کر آگیا۔

پاتالی نے کہا۔ ”شیروان! تم بھی کچھ کھاؤ۔“

میں نے بھی دو ایک سینڈوچز کھائے۔ واقعی بڑے لذیذ تھے۔ پاتالی بھی بڑے سکون سے کھا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”یہ ڈشیں کھانے کا ہمیں کبھی کبھی ہی موقع ملتا ہے۔ ہم اکثر غیبی حالت میں رہتی ہیں اور تمہیں بھی اس کا تجربہ ہو گیا ہو گا کہ غیبی حالت میں بھوک پیاس نہیں لگتی چاہے ایک ماہ گزر جائے۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں۔ یہ تو ہے۔ لیکن پاتالی تم لوگ تو جب چاہو انسانی شکل میں آ کر یہ چیزیں کھا سکتی ہو۔“

پاتالی نے کافی بناتے ہوئے کہا۔ ”ہماری دنیا کے بھی کچھ قانون ہیں اور ہمارے قانون پر بڑی سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ ہمیں کبھی کبھار ہی انسانوں کی دنیا میں آنے کا موقع ملتا ہے۔“

لابی کے محلاتی طرز کے اونچے روشندانوں میں دن کا اُجالا جھلکنے لگا تھا۔ بیر ایک پلیٹ میں بل رکھ کر چلا گیا تھا۔ کافی کا گھونٹ بھرنے کے بعد پاتالی نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈال کر کہا۔ ”ساڑھے پانچ بج گئے ہیں۔ دلی کی ٹرین ٹھیک سوا چھ بجے پور سے روانہ ہوتی ہے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پاتالی! یہ تو ٹرین کے روانہ ہونے کا بالکل صحیح ٹائم تم نے بتایا۔“

پاتالی نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں بہت سی باتوں کا پہلے سے پتہ چل جاتا ہے۔“

اس نے بیرے کو اشارے سے بلایا اور کہا۔ ”میں نے پانچ سوکانوٹ بل کے نیچے رکھ دیا ہے۔“

بیرے نے بل ہٹا کر دیکھا نیچے واقعی پانچ سو روپے کا بالکل نیا نوٹ رکھا ہوا تھا حالانکہ میں نے پاتالی کو پرس میں سے نوٹ نکال کر بل کے نیچے رکھتے نہیں دیکھا تھا۔

روہنی عام طور پر اپنی مٹھی میں سے نوٹ نکال کر ادائیگی کیا کرتی تھی مگر پاتالی اس سے دو قدم آگے نکل گئی تھی۔ اُس نے بل کے نیچے ہی پانچ سوکانوٹ پیدا کر دیا تھا۔

پاتالی نے پرس اپنے کندھے سے لٹکا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ”چلو چلیں۔“
ہم محل نما ہوٹل کے باہر آ گئے۔ باہر صبح ہو چکی تھی۔ ایک طرف بیلو کیب ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ دوسری سمت پر ایویوٹ ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ پاتالی نے کہا۔ ”ہم پر ایویوٹ ٹیکسی میں بیٹھ کر سٹیشن جائیں گے۔“

وہ ایک نئے ماڈل کی ٹیکسی میں پیچھے میرے ساتھ بیٹھ گئی اور ٹیکسی سٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔ پاتالی نے مجھے انگریزی میں کہا۔ ”کبھی ٹیکسی میں ڈرائیور کی سیٹ کے ساتھ نہ بیٹھنا۔ یہ خاندانی روایات کے خلاف بات ہے۔“

میں نے سوچا کہ واقعی یہ بدروح کسی اعلیٰ ارسٹو کریٹ گھرانے کی لڑکی ہے جو خدا جانے اپنے کس گھناؤنے گناہ کی پاداش میں ہندو دھرم کے سنسکارتوں کے مطابق مرنے کے بعد ایک بدروح کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ دُرگانے اور خود پاتالی نے بھی مجھے اس قسم کے ذاتی سوال پوچھنے سے منع کیا ہوا تھا ورنہ میں اس سے ضرور پوچھتا کہ وہ کہاں پیدا ہوئی تھی اور اس نے کس کالج میں تعلیم حاصل کی تھی اور اس سے کون سا ایسا گناہ سرزد ہو گیا تھا جس کی وہ اتنی سخت سزا بھگت رہی ہے۔

جے پور کے سٹیشن پر پہنچنے کے بعد میں نے پاتالی سے کہا۔ ”تم یہیں ٹھہرو۔ میں ٹکٹ لے آتا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”ٹکٹ میرے پرس میں موجود ہیں۔“

تب مجھے خیال آیا کہ یہ تو بدروح ہے۔ یہ جو چیز چاہتی ہے مہیا کر لیتی ہے۔ ٹکٹ اس کے پاس فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کے تھے۔ ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ ابھی اس کے روانہ ہونے میں کچھ دیر تھی۔ وہ میرے آگے آگے جا رہی تھی۔ فرسٹ کلاس کی بوگی کے پہلے ڈبے میں داخل ہوتے ہی اسے جیسے کسی نے اندر سے دھکا دیا

اور پاتالی باہر پلیٹ فارم پر گر پڑی۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھایا۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ بولی۔ ”جلدی سے آگے چلو۔“

یہ کہہ کر وہ اگلے ڈبوں کی طرف دوڑ پڑی۔ میں نے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں نگاہ ڈالی کہ دیکھوں اس کو اندر سے کس نے دھکا دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کپار ٹمنٹ کی کونے والی سیٹ پر ایک سفید داڑھی والے صاحب بخسورہ دونوں ہاتھوں میں تھامے بڑے خضوع و خشوع سے قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ جہاں کلام الہی کی تلاوت ہو رہی ہو وہاں بری روح کا گزرنا ممکن ہے۔ میں دوڑ کر آگے گیا۔ دیکھا کہ پاتالی ٹرین سے کچھ فاصلے پر پلیٹ فارم کے ایک ستون کے پیچھے چھپ کر کھڑی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ”ہم اس ٹرین میں سفر نہیں کریں گے۔ سٹیشن سے باہر آ جاؤ۔“

ہم پلیٹ فارم کا پل عبور کر کے دوسرے پلیٹ فارم سے ہو کر سٹیشن سے باہر آ کر فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں بیٹھ گئے۔ نہ میں نے پوچھا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ ہوا تھا اور نہ پاتالی نے ہی مجھے کچھ بتایا۔ کہنے لگی۔ ”دوسری ٹرین تین بجے چلے گی۔ ہم تب تک اسی ویٹنگ روم میں انتظار کریں گے۔“

ہم نے وہیں دوپہر کا کھانا منگو کر کھایا۔ میں نے محسوس کیا کہ بدروح پاتالی پلیٹ فارم پر اس وقت جانا چاہتی تھی جب دلی جانے والی ٹرین وہاں آچکی ہو۔ تین بجے ٹرین کا ٹائم تھا جو ایک گھنٹہ لیٹ ہو گئی اور چار بجے آئی۔ پاتالی نے مجھے ساتھ لیا اور تیز تیز قدموں سے چلتی فرسٹ کلاس بوگی کے ایک کپار ٹمنٹ کے دروازے پر آئی۔ اندر جھانک کر دیکھا جب اس نے دیکھا کہ سب ٹھیک ہے تو وہ ڈبے میں داخل ہو گئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ڈبے میں صرف ایک غیر ملکی ادھیڑ عمر گوری عورت اپنے سامان کے پاس سیٹ پر بیٹھی ٹھنڈا جوس پی رہی تھی۔ اس نے ہمیں ایک نظر دیکھا اور پھر جوس پیتے ہوئے باہر پلیٹ فارم کی طرف دیکھنے لگی۔ ہم نے سامنے والی سیٹ پر

ڈیرہ جمالیہ۔ سامان ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ بے پور کے سٹیشن پر گرمی تھی۔ فرسٹ کلاس کا وہ کپار ٹمنٹ ایئر کنڈیشنڈ نہیں تھا۔ غیر ملکی عورت نے ہماری طرف دیکھ کر انگریزی میں کہا۔ ”کپار ٹمنٹ کا ایئر کنڈیشنڈ خراب ہے۔ میں نے گارڈ کو رپورٹ لکھوا دی ہے مگر یہ لوگ کچھ نہیں کر رہے۔“

پاتالی کو گرمی نہیں لگ رہی تھی۔ بدروحوں کو نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس، نہ گرمی لگتی ہے نہ سردی۔ میں نے غیر ملکی عورت کو انگریزی میں ہی جواب دیا۔ ”آج گرمی بھی زیادہ ہے۔“

غیر ملکی عورت نے پاتالی کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ ”تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟“

پاتالی نے کہا۔ ”ہم دلی جا رہے ہیں۔“

غیر ملکی عورت بولی۔ ”میں بھی دلی جا رہی ہوں۔ میرا نام مارگریٹ ہے۔ میں دلی کے ایک گرلز کالج میں انگریزی پڑھاتی ہوں۔ تم کوئی جاب کرتی ہو؟“

پاتالی نے یونہی کہہ دیا۔ ”نہیں۔“ غیر ملکی عورت سمجھ گئی کہ پاتالی اس سے زیادہ بات چیت نہیں کرنا چاہتی۔ چنانچہ وہ تھیلے میں سے ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگی۔

کچھ دیر بعد ٹرین چل پڑی۔ رات ہو گئی تھی جب ٹرین دلی پہنچی۔ میں اور پاتالی فرسٹ کلاس ریفریشن ٹمنٹ روم میں جا کر بیٹھ گئے کیونکہ مجھے کھانا کھانا تھا۔ پاتالی یونہی میرے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئی تھی حالانکہ اسے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے پاتالی سے کہا۔ ”یہاں سے اب ہمیں صبح کو ہی چند ہی گز کے لئے کوئی ٹرین مل سکے گی۔“

اس نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ ہم ویٹنگ روم میں ٹرین کا انتظار کریں گے۔“ باقی رات ہم نے ویٹنگ روم میں گزار دی۔ معلوم ہوا کہ پنجاب میل دن کے نو بجے روانہ ہوتی ہے۔ ہمیں ٹکٹ خریدنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پاتالی کے پرس

میں اپنے آپ دلی سے چند ی گڑھ کے دو فرسٹ کلاس کے ٹکٹ آگئے تھے۔ بہر حال ہم چند ی گڑھ پہنچ گئے۔ اس وقت وہاں رات کے دس بج رہے تھے۔ وہاں سے ہم نے ایک پرائیویٹ ٹیکسی لی اور شمالی پہاڑی علاقے کے ایک چھوٹے ہل سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ اس ہل سٹیشن سے وہ قبرستان والا کھنڈر چند فرلانگ کے فاصلے پر ہی تھا جہاں بقول دُرگاکے روہنی کوتالیا کے آسیب نے بند کر رکھا تھا۔ ایک گھنٹے میں ہم ہل سٹیشن پہنچ گئے۔ ہم نے اپنے آپ کو میاں بیوی ظاہر کر کے ہوٹل کا ایک کمرہ لے لیا اور آدھی رات ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جب رات آدھی گزر گئی تو پاتالی نے پرس میں سے انگوٹھی نکال کر مجھے دی اور کہا۔ ”اسے پہن لو۔“

میں نے انگوٹھی پہن لی۔ اس کے ساتھ ہی میں غائب ہو گیا مگر میں اس حالت میں بھی پاتالی کے پاس موجود تھا اور صرف پاتالی ہی مجھے دیکھ سکتی تھی۔ اس نے پرس میں سے کسی درندے کا نوکیلے ناخنوں والا پنچہ نکالا اور کہنے لگی۔ ”یہ ریچھ کا پنچہ ہے۔ میں نے اس پر ایک خاص منتر پھونکا ہوا ہے۔“ اس کے بعد اچانک پاتالی بھی غائب ہو گئی۔ میں اسے غائب ہونے کے بعد بھی دیکھ رہا تھا۔ ریچھ کا نوکیلا پنچہ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ کہنے لگی۔ ”میرے ساتھ آ جاؤ۔“ ہم نے کمرے کے دروازے کو بند کر کے اندر سے چٹنی لگا رکھی تھی۔ ہم بند دروازے میں سے گزر گئے۔ ہوٹل کے باہر دو تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ روشنی ہو رہی تھی۔ ایک پہاڑیا چوکیدار بندوق لئے سٹول پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ ہم اس کے قریب سے گزر گئے۔ اُس نے ہم میں سے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ ہوٹل سے ذرا آگے پہاڑی کی ہلکی سی چڑھائی تھی۔ آگے تھوڑی سی اترائی تھی۔ پھر چیڑھ کے اونچے اونچے درختوں میں سے ایک راستہ قبرستان والے کھنڈر کی طرف جاتا تھا۔ ہم خاموشی سے اس راستے پر چل رہے تھے۔ چاروں طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ رات سرد تھی مگر ہمیں سردی بالکل نہیں لگ رہی تھی۔

پاتالی صحیح راستے پر جا رہی تھی۔

ڈیڑھ دو فرلانگ کا پہاڑی راستہ طے کرنے کے بعد ہم قبرستان کے شکستہ گیٹ پر آگئے۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں یہ دو تین سو سال پرانا ایک کر سچین قبرستان تھا جس کی قبریں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی تھیں۔ قبرستان میں موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے قبرستان کو پہچان لیا تھا۔ جہاں قبرستان کی ٹوٹی پھوٹی دیوار تھی اس کے قریب ہی وہ کھنڈر تھا جس کے تہہ خانے میں روہنی قید تھی اور جہاں نتالیا مجھے اغواء کر کے لائی تھی اور اس نے زبردستی مجھ سے شادی کی تھی۔

کھنڈر کو دیکھ کر مجھ پر ایک ہول سا طاری ہو گیا۔ اگرچہ میں غائب تھا اور میرے بازو پر کالے جادوگر کی دی ہوئی طلسم زدہ ہڈی کا تعویذ بندھا ہوا تھا اس کے باوجود مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ نتالیا کی طاقت آسپی تھی جس کا مقابلہ کوئی بدروح نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کالے جادوگر کا تعویذ بھی نتالیا کی آسپی طاقت کے آگے شکست کھا جائے اور روہنی کے ساتھ میں بھی دوبارہ نتالیا کی قید میں چلا جاؤں۔

پاتالی قبرستان کی دیوار کے پاس آکر رُک گئی۔ میں اسے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ اندھیرے میں مجھے اس کی شکل صورت اور جسم صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے مجھے دیوار کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میرے پاس ہی وہ بھی بیٹھ گئی۔

مروائے گی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نتالیا کی طاقت سے واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ بدروحیں آسیبوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو روہنی اب تک نتالیا کے چنگل سے نکل کر واپس آگئی ہوتی۔ کسی وقت محسوس ہوتا کہ نہیں یہ پاتالی بدروح خاص طاقت دُرگا بدروح سے لے کر آئی ہے اور اس کے پاس نتالیا کے آسیب پر غالب آنے کا طلسمی منتر موجود ہے۔

دو تین منٹ گزر گئے۔ خاموشی اور زیادہ گہری اور ڈراؤنی محسوس ہونے لگی تھی۔ کوئی آواز، کوئی آہٹ تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ مجھے جہاں میں بیٹھا تھا وہاں زمین کے اندر سے آتی ایک گونج سنائی دی جیسے زمین کی گہرائیوں میں کوئی بہت بڑی چٹان ٹوٹ کر کھولتے ہوئے لاوے میں گری ہو۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور زمین کی طرف دیکھنے لگا۔ ریچھ کا پنچہ اسی طرح زمین میں دھنسا ہوا تھا۔

ایک دم سے مجھے لگا جیسے میرے پاؤں کے نیچے زمین سخت گرم ہو گئی ہے۔ میرے پاؤں جلنے لگے۔ میں اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسی لمحے دیران آسیبی کھنڈر کی طرف سے ایسی دہشت ناک آواز سنائی دی جیسے کوئی بہت بڑی، ریچھ سے بھی بڑی بلی رو رہی ہو۔ یہ آواز اتنی ڈراؤنی تھی کہ مجھے یقین ہے اس کے خوف سے سردرات کی خاموشی بھی لرزاٹھی ہوگی۔ میرے پاؤں کے نیچے زمین زیادہ گرم ہوتی جا رہی تھی۔ میں غائب ضرور تھا لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ پاتالی کی انگوٹھی پہننے سے میں اس طرح غائب ہوا تھا کہ میرے جسم کا بوجھ بالکل ہلکا نہیں ہوا تھا تھوڑے تھوڑے میرے پاؤں زمین کے ساتھ ضرور لگ رہے تھے۔

میں قبرستان کی شکستہ دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

میں ایک سینڈ کے بعد ریچھ کے پنچے کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ وہ ابھی تک زمین میں دھنسا ہوا موجود تھا۔ پاتالی نے کہا تھا کہ اگر پنچہ غائب ہو جائے تو تم فوراً وہاں سے بھاگ جانا۔ میں دیران کھنڈر کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ فضا ایک بار پھر ساکت ہو گئی

وہ مسلسل کھنڈر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ وہ منہ ہی منہ میں کوئی خفیہ منتر پڑھ رہی تھی۔ پہاڑی علاقے کی رات سرد اور پرسرار تھی۔ دھند کی ایک لہر نے دیران کھنڈر کے گرد لپٹ کر اسے اور زیادہ پرسرار بنادیا ہوا تھا۔ اچانک ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایک ایسی گڑگڑاہٹ کی تھی جیسے زمین کے اندر سے آرہی ہو۔ میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے ہر لمحے نتالیا کے آسیب کا خطرہ لگا ہوا تھا اور اس وقت تو مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں موت کے منہ میں بیٹھا ہوا ہوں۔

اس گڑگڑاہٹ کا پاتالی پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

وہ اسی طرح بت بنی بیٹھی دیران کھنڈر کی طرف مسلسل تک رہی تھی اور خفیہ منتر پڑھ رہی تھی۔ دوسری بار گڑگڑاہٹ کی آواز بڑی دور سے آتی لگی۔ اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ پاتالی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”یہ پنچہ یہاں زمین میں گاڑ دو۔“

میں نے ریچھ کا پنچہ اس کے ہاتھ سے لے کر اسے زمین میں گاڑ دیا۔ گیلی نرم زمین میں پنچے کے ناخن دھنس گئے تھے۔ پاتالی نے میرے کان میں کہا۔ ”روہنی اندر موجود ہے۔ میں اسے لینے جا رہی ہوں۔ تم یہاں سے مت ہلنا اگر یہ پنچہ زمین سے اچھل کر فضا میں غائب ہو جائے تو فوراً یہاں سے فرار ہو جانا۔ ایک منٹ کی بھی دیر کی تو مارے جاؤ گے۔“

یہ کہہ کر پاتالی اٹھی اور بالکل سیدھی ہو کر جیسے کوئی نیند میں چلتا ہو کھنڈر کی طرف چل پڑی۔ میں قبرستان کی شکستہ دیوار کی اوٹ میں بیٹھا اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کھنڈر کے قریب پہنچی تو دھند کی لہر نے اسے اپنے اندر چھپا لیا اور وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اب میں اس منحوس آسیبی فضا میں غیبی حالت میں اکیلا رہ گیا تھا۔ کسی وقت مجھے لگتا تھا کہ یہ بدروح پاتالی ماری جائے گی اور روہنی کو بھی اپنے ساتھ

میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے دُرگا کے پاس واپس جانا چاہئے اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کرنا چاہئے۔ وہی مجھے بتا سکتی ہے کہ اب مجھے کیا کرنا ہوگا۔

کچھ دیر کے بعد نیچے کسی نیم پہاڑی شہر کی بے شمار چھوٹی بڑی جھلملاتی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ چندی گڑھ ہی ہے۔ اس کے آگے مجھے معلوم نہیں تھا کہ جے پور جانے کے لئے مجھے فضا میں اپنے آپ کو کس رخ پر رکھنا ہوگا۔ یہ میرے لئے بڑا مشکل کام تھا۔ میں اکیلا کبھی فضا میں پرواز کرتے ہوئے کسی شہر کی طرف نہیں گیا تھا۔

میں نے یہی مناسب سمجھا کہ چندی گڑھ اتر جاتا ہوں اور وہاں سے بذریعہ ٹرین جے پور جاؤں گا۔ میں نے نیچے روشنیوں کی طرف غوطہ لگایا اور تیزی سے نیچے آنے لگا۔ میں ایک چھوٹے سے پارک میں اتر گیا۔ رات کا وقت تھا۔ پارک میں مرکری لیپ روشن تھے۔ کوئی انسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں غیبی حالت میں آہستہ آہستہ چلتا پارک کے گیٹ سے باہر نکل کر سڑک پر آ گیا۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ سڑک دور تک سنسان پڑی تھی۔ میں اور پاتالی جالندھر تک ٹرین میں آئے تھے اس کے بعد ہم نے ایک پرائیویٹ ٹیکسی میں چندی گڑھ تک سفر کیا تھا۔ پاتالی تو جتنے پیسے چاہے کرنسی نوٹوں کی شکل میں پیدا کر لیتی تھی مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میرے پاس تو کوئی پیسہ نہیں تھا۔ میں نے چلتے چلتے اپنی پتلون کی جیبوں کو ٹٹولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری پتلون کی کچھلی جیب میں ایک بوٹہ پڑا تھا۔ میں نے کبھی بوٹہ نہیں رکھا تھا۔ میں نے بوٹے کو کھول کر دیکھا اس میں کافی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ پاتالی نے میری جیب میں رکھ دیئے ہوں گے۔

چندی گڑھ بھارتی پنجاب کا دارالحکومت ہے اور بڑا خوبصورت اور ماڈرن شہر ہے۔ وہاں بڑے بڑے ہوٹل ہیں جو ساری رات کھلے رہتے ہیں۔ میں نے دور سے ایک ہوٹل کا چمکتا ہوا نیون سائن بورڈ بڑھا تو اس طرف بڑھا۔ قریب آکر میں ایک

تھی۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے دیران کھنڈر میں سے ایک چیخ کی آواز آئی۔ اس کے بعد دوسری چیخ کی آواز بلند ہوئی۔ ان آوازوں نے میرے روٹے کھڑے کر دیئے۔ پھر ایک ایسی آواز کے ساتھ کہ جیسے راکٹ فائر ہوا اور پچھ کا پنچہ زمین میں سے نکل کر اوپر کی طرف اٹھا اور غائب ہو گیا۔ دیران کھنڈر میں سے چیخیں ہی چیخیں بلند ہونے لگی تھیں۔ میں تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگا۔

ایک دم دوڑنے سے مجھے ایک دھکا لگا اور میں زمین سے غبارے کی طرح چار فٹ بلند ہو کر فضا میں اڑتا چلا گیا۔ میں اپنے بازو اس طرح چلانے لگا جیسے کوئی تیراک تیراکی کے مقابلے میں سمندر میں پوری طاقت سے تیرتا جا رہا ہو۔ میں اڑتے اڑتے درختوں کے اوپر آ گیا اور جس طرف کو میرا رخ تھا میں اسی سمت کو پرواز کرنے لگا۔ بازوؤں کو چلانے سے اتنا فرق ضرور پڑا کہ میری رفتار ایک دم تیز ہو گئی اور پھر میں اسی رفتار کے ساتھ پرواز کرنے لگا۔

ہل سٹیشن کی پہاڑی ہوٹل اور مکانوں کی روشنیاں میرے نیچے سے گزر گئیں۔ میں نے ان کو ذہن میں رکھ کر اپنا رخ بدل کر چندی گڑھ شہر کی طرف کر لیا۔ اب میں پہاڑی علاقے میں پہاڑیوں کے اوپر زمین سے دوڑھائی سو فٹ کی بلندی پر اڑتا چلا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ پاتالی کو بھی بتالیا کہ آسیب نے پکڑ لیا ہے۔ وہ شاید زندہ نہیں بچی ہوگی۔ مجھے پہلے ہی ڈر تھا کہ یہ بدروح بتالیا کہ آسیب کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ خدا جانے پاتالی کی حماقت کی وجہ سے روہنی کے ساتھ بتالیا کہ آسیب نے کیا سلوک کیا ہوگا۔ شاید میں کالے جادوگر کے طلسمی ہڈی والے تعویذ کی وجہ سے بتالیا کے حملے سے بچ گیا تھا ورنہ وہ مجھے وہاں سے کبھی نہ بھاگنے دیتی۔ بہر حال میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ میری جان بچ گئی۔

مگر اب میرا کیا ہوگا؟ میں کہاں جاؤں گا؟ یہی سوال مجھے پریشان کر رہا تھا۔ آخر

طرف اندھیرے میں ہو گیا اور میں نے پاتالی کی انگوٹھی اپنی انگلی سے اتار کر جیب میں رکھ لی۔ انگوٹھی کے اترتے ہی میں اپنی انسانی شکل میں واپس آ گیا۔ میں نے ہوٹل کے کاؤنٹر پر آکر کاؤنٹر بوائے سے پوچھا کہ یہاں سے جالندھر کی طرف بسیں کہاں سے جاتی ہیں۔

اس نے کہا۔ ”آپ کو کہاں جانا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”میں دلی جانا چاہتا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”پھر آپ کے لئے یہی مناسب رہے گا کہ چند گڑھ سے انبالہ جانے والی کو سٹر میں بیٹھ جائیں۔ وہ آپ کو بڑے آرام سے انبالہ پہنچا دے گی۔ وہاں سے آپ دلی کی ٹرین پکڑ سکتے ہیں۔“

جب میں نے اس سے پوچھا کہ انبالہ جانے والے کو سٹر کوچ کب مل سکے گی تو اس نے کہا۔ ”ابھی رات کے دو بجنے والے ہیں۔ کو سٹر صبح چھ بجے چلنا شروع ہوتی ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا میں یہاں آپ کے ہوٹل کی لابی میں بیٹھ کر یہ وقت گزار سکتا ہوں؟“

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”نو پر ابلیم سر! ضرور بیٹھ جائیں۔“

میں لابی میں آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک بیر آ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”سر کیا پیئیں گے؟“

میں نے کہا۔ ”چائے لے آؤ۔“

بیر اچلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے کے برتن میرے آگے رکھ گیا۔ میں چائے بنانے لگا۔ میں نے چائے بناتے ہوئے لابی کا جائزہ لیا۔ لابی تقریباً خالی پڑی تھی۔ تین صوفے چھوڑ کر ایک نیلی ساڑھی والی عورت بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ پہلے ہی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے

نظریں دوسری طرف کر لیں۔ چائے بنائی اور خاموشی سے پینے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دلی سے بھی میں ٹرین کے ذریعے ہی جے پور ڈرگا کے پاس جاؤں گا۔ اب مجھے ہوا میں اڑ کر کسی جگہ جانے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس کافی پیسے آگئے ہیں۔ میں ٹرین میں سفر کر سکتا ہوں۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ وہی نیلی ساڑھی والی عورت اپنے صوفے سے اٹھ کر میرے سامنے والے صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔ وہ جوان تھی اور خوبصورت بھی تھی۔ مگر مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے پوچھتا کہ وہ کس لئے میرے پاس آئی ہے۔ اس عورت نے کہا۔

”میں ایک عجیب مصیبت میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ پلیز میری مدد کیجئے۔“

وہ بڑی صاف اردو زبان میں بول رہی تھی۔ میں نے اس عورت کو غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر معصومیت کے ساتھ کچھ گھبراہٹ بھی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”میں خود یہاں اجنبی ہوں۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

عورت نے کہا۔ ”مجھ سے ایک بڑی بھول ہو گئی ہے۔ ایک پاپ ہو گیا ہے۔ بھگوان نے مجھے اس کی سزا دی ہے۔“

مجھے پوچھنا ہی پڑا کہ اس سے کیا گناہ ہو گیا؟ اس عورت نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ”میرا نام انجلی ہے۔ میں دلی میں اپنے خاوند کے ساتھ رہتی تھی کہ ایک آدمی سے مجھے محبت ہو گئی۔ وہ بھی مجھ سے بڑا پریم کرنے لگا۔ اس نے کہا چلو دلی سے بھاگ کر چند گڑھ چلے جاتے ہیں۔ وہاں ہم شادی کر لیں گے۔ میں اس کی باتوں میں آگئی اور اپنے خاوند کو چھوڑ کر اپنے پریمی کے ساتھ یہاں چند گڑھ بھاگ آئی۔ وہ آدمی بڑا دھوکے باز نکلا۔ اس نے مجھے اس ہوٹل میں اپنے ساتھ بیوی ظاہر کر کے رکھا مگر اس نے مجھ سے شادی نہ کی۔ میں اپنے ساتھ جو زیور اور پیسے لائی تھی وہ جب ختم ہو گئے تو وہ دھوکے باز مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اب میں یہاں پریشان حال بیٹھی ہوں۔ میرے پاس ہوٹل کا بل ادا کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا

”کروں۔“

میں نے کہا۔ ”آپ ٹیلی فون کر کے اپنے خاوند کو یہاں کیوں نہیں بلواتیں؟“
اس نے کہا۔ ”میں نے اپنے خاوند کو فون کیا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ میں اسے آئندہ فون نہ کروں۔ وہ میری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتا۔ اب میں دلی اپنے ماتا پتا کے پاس جانا چاہتی ہوں مگر میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ ہوٹل کا بل بھی ادا کرنا ہے۔ پلیز آپ میری مدد کیجئے۔ آپ مجھے اچھے آدمی لگے ہیں۔“
میں نے کہا۔ ”شریستی جی! میں آپ کا ہوٹل کا بل بھی ادا کر دیتا ہوں اور آپ دلی تک کاریل گاڑی کا کرایہ بھی دے دیتا ہوں۔ آپ اپنے گھر چلی جائیں۔“
عورت نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اکیلی جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ آپ مجھے دلی تک چھوڑ آئیں۔ میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھلاؤں گی۔“
میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ مجھے بھی دلی جانا ہے۔ آپ میرے ساتھ جاسکتی ہیں۔ آپ کا ہوٹل کا بل کتنا ہے؟“

اس نے پرس میں سے بل نکال کر مجھے دیا۔ یہ ایک ہزار دو سو پچاس روپے کا تھا۔ میں نے بٹوے میں سے پوری رقم نکال کر اسے دی اور کہا۔ ”آپ یہ بل ادا کر دیں۔“

عورت نے کہا۔ ”آپ نے میری زندگی کو تباہ ہونے سے بچا لیا ہے۔ آپ انسان نہیں دیوتا ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”بی بی! میں کوئی دیوتا وغیرہ نہیں ہوں۔ معمولی انسان ہوں۔ میرے پاس پیسے تھے آپ کو ضرورت تھی میں نے آپ کی ضرورت پوری کر دی۔ انسان اگر کسی ضرورت مند کی مدد کر سکے تو اسے ضرور مدد کرنی چاہئے۔ جائیں بل ادا کر دیں۔“

عورت اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔ میں نے سوچا کہ بے چاری مجبور عورت

ہے۔ ایک بد معاش کے جھانے میں آگئی ہے۔ اچھا ہوا میرے پاس پیسے تھے اور میں نے اسے مصیبت سے نکال دیا۔ میں اسے اپنے ساتھ دلی لئے چلتا ہوں وہاں اسے ٹیکسی میں بٹھا دوں گا کہ جاؤ بی بی اپنے ماتا پتا کے گھر جاؤ اور پھر کبھی گھر سے قدم باہر نہ نکالنا۔

عورت بل ادا کر کے میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور بار بار میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”بی بی میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ایک انسانی فرض ادا کیا ہے اور میں اتفاق سے یہ فرض ادا کرنے کی پوزیشن میں تھا۔“
”آپ مجھے مسلمان لگتے ہیں۔“ عورت نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”جی ہاں! الحمد للہ کہ میں مسلمان ہوں۔“

”آپ دلی میں کہیں ملازم ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”بی بی! اس قسم کے کسی سوال کا جواب دینا، میں پسند نہیں کروں گا۔ آپ کو دلی جانا ہے میں آپ کو دلی پہنچا دوں گا۔“

عورت خاموش ہو گئی۔ اتنی دیر میں باہر صبح کا اجالا نمودار ہو چکا تھا۔ میں نے عورت سے کہا۔ ”ہم یہاں سے ایک کوچ میں بیٹھ کر انبالے تک جائیں گے۔ انبالے سے ہم دلی کے لئے ٹرین پکڑیں گے۔“

وہ بولی۔ ”جیسے آپ کی مرضی۔“

وہ میری طرف اس طرح دیکھتی تھی جیسے کوئی پجاری عورت، اپنے کسی دیوتا کی مورتی کی طرف دیکھتی ہے۔

میں نے کہا۔ ”تھوڑا سناشتہ یہیں کر لیتے ہیں۔ راستے میں شاید کہیں موقع نہ ملے۔“

میں نے اپنے اور اس عورت کے لئے ناشتے کا آرڈر دے دیا۔ ہم ناشتہ کرنے لگے۔ عورت کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ یہ گھریلو قسم کی سیدھی سادھی عورت

ہے۔ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں لگتی تھی۔ ایسی عورتیں بڑی جلدی بد معاش قسم کے مردوں کے جھانے میں آ جاتی ہیں۔

ناشتہ کرتے کرتے ہمیں پانچ بج گئے۔

وہیں سے ہم بسوں کے اڈے پر آ گئے۔ وہاں سے ایئر کنڈیشنڈ بسیں اور کوسٹرز چلتی تھیں۔ میں نے انبالے کے دو ٹکٹ لئے اور ہم ایک آرام دہ ایئر کنڈیشنڈ کوسٹر میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد کوسٹر انبالے کی طرف روانہ ہو گئی۔ لمبا سفر تھا مگر بڑا آرام دہ تھا۔ ہم انبالے پہنچ گئے۔ وہاں ایک ہوٹل میں ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا اور ریلوے اسٹیشن پر آ گئے۔ وہاں سے ہم دلی جانے والی گاڑی میں سوار ہو کر دلی روانہ ہو گئے۔ ٹرین دلی رات کے ایک بجے پہنچی۔

اس عورت نے کہا۔ ”اتنی رات گئے میں ماتا پتا کے گھر نہیں جانا چاہتی۔ پلیز مجھے صبح پہنچا دینا۔“

بے پور کی گاڑی بھی مجھے دن کے وقت ہی مل سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ صبح اسے اس کے گھر روانہ کر کے خود بے پور چل دوں گا۔

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ صبح چلے جانا۔ لیکن اتنا وقت ہمیں ویننگ روم میں ہی گزارنا پڑے گا۔“

وہ بولی۔ ”کوئی بات نہیں۔ ہم ویننگ روم میں بیٹھ جائیں گے۔“
ہم سیکنڈ کلاس کے ویننگ روم میں آ گئے۔ عورت کہنے لگی۔ ”میرا سر درد کر رہا ہے۔ پلیز میرے ساتھ ریفریشمنٹ روم تک آ جائیں۔ میں چائے پینا چاہتی ہوں۔“
مجھے خود چائے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں اسے لے کر سیکنڈ کلاس کے ریفریشمنٹ روم میں آ گیا۔ رات کے ایک بجے ریفریشمنٹ روم خالی پڑا تھا۔ میں نے چائے منگوالی۔ عورت کہنے لگی۔ ”آپ کے لئے میں چائے بناؤں گی۔“

اس نے بڑے اہتمام سے چائے کی خالی پیالیاں اپنے سامنے رکھ لیں اور مجھ سے

چینی پوچھی۔ میں نے کہا۔ ”ایک چمچ۔“

میری پیالی میں اس نے چینی کا ایک چمچ ڈالا۔ پھر قہوہ ڈالا اور دودھ ڈالنے کے بعد چمچ ہلاتے ہوئے بولی۔ ”آپ سچ مجھ میرے لئے دیوتا بن کر آ گئے تھے۔ آپ نہ آتے تو خدا جانے میرا کیا حال ہوتا۔“

وہ اسی طرح کی باتیں کرتی رہی اور ساتھ ساتھ میری پیالی میں چمچ بھی ہلاتی گئی۔ میں نے کہا۔ ”اتنا نہ ہلاؤ۔ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

”شما کیجئے گا۔ مجھے خیال نہیں رہا۔“ یہ کہہ کر اس نے پیالی میرے آگے کر دی۔ پھر اپنی چائے بنانے لگی۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ پیا۔ مجھے چائے پھینکی لگی مگر میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میری طرف بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ یونہی دیکھ رہی ہو گی۔ چائے کے تین چار گھونٹ پینے کے بعد مجھے چکر سا آ گیا۔ میں نے پیالی میز پر رکھ دی اور سر کو ایک ہاتھ سے دبائے لگا۔

عورت نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

میں نے کہا۔ ”یونہی چکر سا آ گیا تھا۔“

وہ بولی۔ ”پلیز آپ لیٹ جائیں۔“

اور وہ اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے بازوؤں کو تھام لیا۔ اس وقت میرا جسم تقریباً سن ہو چکا تھا۔ میں نے کچھ بولنا چاہا مگر میری زبان جیسے پتھر بن چکی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ عورت میرے اس بازو کو ٹٹول رہی تھی جس بازو پر میں نے کالے جادوگر کا دیا ہوا ہڈی کا تعویذ باندھ رکھا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ عورت بدروح ہے جسے نتالیا نے میرا تعویذ چرانے کے لئے بھیجا ہے۔

اس خیال کے آتے ہی میں نے کلمہ پاک کا دل میں ورد کیا اور پورے جوش اور جذبے کے ساتھ اپنے جسم اور اپنی روح کی پوری طاقت کو ایک جگہ مرکوز کرتے ہوئے گرج کر کہا۔ ”دفع ہو جادو روح! دفع ہو جادو روح!“

ہے۔ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں لگتی تھی۔ ایسی عورتیں بڑی جلدی بد معاش قسم کے مردوں کے جھانے میں آ جاتی ہیں۔

ناشتہ کرتے کرتے ہمیں پانچ بج گئے۔

وہیں سے ہم بسوں کے اڈے پر آ گئے۔ وہاں سے ایئر کنڈیشنڈ بسیں اور کوسٹرز چلتی تھیں۔ میں نے انبالے کے دو ٹکٹ لئے اور ہم ایک آرام دہ ایئر کنڈیشنڈ کوسٹر میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد کوسٹر انبالے کی طرف روانہ ہو گئی۔ لمبا سفر تھا مگر بڑا آرام دہ تھا۔ ہم انبالے پہنچ گئے۔ وہاں ایک ہوٹل میں ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا اور ریلوے اسٹیشن پر آ گئے۔ وہاں سے ہم دلی جانے والی گاڑی میں سوار ہو کر دلی روانہ ہو گئے۔ ٹرین دلی رات کے ایک بجے پہنچی۔

اس عورت نے کہا۔ ”اتنی رات گئے میں ماتا پتا کے گھر نہیں جانا چاہتی۔ پلیز مجھے صبح صبح پہنچا دینا۔“

جے پور کی گاڑی بھی مجھے دن کے وقت ہی مل سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ صبح اسے اس کے گھر روانہ کر کے خود جے پور چل دوں گا۔

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ صبح چلے جانا۔ لیکن اتنا وقت ہمیں ویننگ روم میں ہی گزارنا پڑے گا۔“

وہ بولی۔ ”کوئی بات نہیں۔ ہم ویننگ روم میں بیٹھ جائیں گے۔“

ہم سیکنڈ کلاس کے ویننگ روم میں آ گئے۔ عورت کہنے لگی۔ ”میرا سر درد کر رہا ہے۔ پلیز میرے ساتھ ریفریشمنٹ روم تک آ جائیں۔ میں چائے پینا چاہتی ہوں۔“

مجھے خود چائے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں اسے لے کر سیکنڈ کلاس کے ریفریشمنٹ روم میں آ گیا۔ رات کے ایک بجے ریفریشمنٹ روم خالی پڑا تھا۔ میں نے

چائے منگوائی۔ عورت کہنے لگی۔ ”آپ کے لئے میں چائے بناؤں گی۔“

اس نے بڑے اہتمام سے چائے کی خالی پیالیاں اپنے سامنے رکھ لیں اور مجھ سے

چینی پوچھی۔ میں نے کہا۔ ”ایک چمچ۔“

میری پیالی میں اس نے چینی کا ایک چمچ ڈالا۔ پھر قہوہ ڈالا اور دودھ ڈالنے کے بعد چمچ ہلاتے ہوئے بولی۔ ”آپ سچ میرے لئے دیو تا بن کر آ گئے تھے۔ آپ نہ آتے تو خدا جانے میرا کیا حال ہوتا۔“

وہ اسی طرح کی باتیں کرتی رہی اور ساتھ ساتھ میری پیالی میں چمچ بھی ہلاتی گئی۔ میں نے کہا۔ ”اتنا نہ ہلاؤ۔ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

”شما کیجئے گا۔ مجھے خیال نہیں رہا۔“ یہ کہہ کر اس نے پیالی میرے آگے کر دی۔ پھر اپنی چائے بنانے لگی۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ پیا۔ مجھے چائے پھینکی لگی مگر میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میری طرف بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ یونہی دیکھ رہی ہو گی۔ چائے کے تین چار گھونٹ پینے کے بعد مجھے چکر سا آ گیا۔ میں نے پیالی میز پر رکھ دی اور سر کو ایک ہاتھ سے دبائے لگا۔

عورت نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

میں نے کہا۔ ”یونہی چکر سا آ گیا تھا۔“

وہ بولی۔ ”پلیز آپ لیٹ جائیں۔“

اور وہ اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے بازوؤں کو تھام لیا۔ اس وقت میرا جسم تقریباً سن ہو چکا تھا۔ میں نے کچھ بولنا چاہا مگر میری زبان جیسے پتھر بن چکی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ عورت میرے اس بازو کو ٹٹول رہی تھی جس بازو پر میں نے کالے جادوگر کا دیا ہوا ہڈی کا تعویذ باندھ رکھا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ عورت بدروح ہے جسے نتالیا نے میرا تعویذ چرانے کے لئے بھیجا ہے۔

اس خیال کے آتے ہی میں نے کلمہ پاک کا دل میں ورد کیا اور پورے جوش اور جذبے کے ساتھ اپنے جسم اور اپنی روح کی پوری طاقت کو ایک جگہ مرکوز کرتے ہوئے گرج کر کہا۔ ”دفع ہو جابد روح! دفع ہو جابد روح!“

میرے منہ سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ عورت کی شکل ایک دم بدروح کی شکل بن گئی۔ وہ چیخ مار کر مجھ سے الگ ہوئی۔ اس کا جسم شعلوں میں بھڑکا اور وہ چیختی چلاتی غائب ہو گئی۔ اگر ریفریشمنٹ روم خالی نہ ہوتا تو وہاں نہ جانے کیسا ماحول پیدا ہو جاتا۔ ریفریشمنٹ روم خالی تھا اور اس بدروح کی چیخوں کی آواز بھی شاید کسی نے نہیں سنی تھی کیونکہ دوسرے کمرے میں سے نہ کوئی ملازم باہر نکلا تھا اور نہ باہر سے کوئی آدمی یہ معلوم کرنے اندر آیا تھا کہ یہ چیخوں کی آواز کیسی ہے؟

بدروح کے غائب ہوتے ہی میرے جسم کی طاقت واپس آگئی اور میرے سر کے چکر بھی غائب ہو گئے۔ میں نے بازو کو ٹٹول کر دیکھا۔ تعویذ اسی طرح میرے بازو کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بدروح کے حملے سے بچالیا تھا۔

اتنے میں بیرا آگیا۔ ”سر! کچھ اور چاہئے؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”نہیں۔ کتنا بل ہے؟“

اس نے بل نکال کر میرے آگے پلیٹ میں رکھ دیا۔ میں نے بنوے میں سے بچاس روپے کا انڈین نوٹ نکال کر پلیٹ میں رکھا اور باہر آگیا۔

میرا دل اپنے رب کا شکر ادا کرتے نہیں تھک رہا تھا۔ اگر اللہ پاک کی مدد میرے شامل حال نہ ہوتی تو نتالیا کی بدروح کے اس حملے سے میرا بچنا ناممکن تھا۔ اس بدروح نے میری پیالی میں چیخ ہلاتے ہوئے کوئی منتر چائے میں پھونک دیا تھا جس کا مجھے احساس نہیں ہوا تھا۔ اس وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں کسی اجنبی عورت یا اجنبی مرد کا اعتبار نہیں کروں گا خواہ وہ کسی بھی قابل رحم حالت میں میرے پاس کیوں نہ آجائے۔

میں صبح تک ویٹنگ روم میں ہی بیٹھا رہا۔

جے پور جانے والی گاڑی مجھے صبح سوا آٹھ بجے ملی۔ میں اس میں بیٹھ کر بے پور پہنچ گیا۔ جے پور میں ادھر ادھر پھرنے یا کسی باغ میں بیٹھنے کی بجائے میں نے اسی

وقت ایک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا اور کمرے میں آکر دروازہ بند کر کے انتظار کرنے لگا کہ کب آدھی رات ہو اور میں دُرگا کی بدروح سے ملاقات کرنے پرانے محل میں جاؤں۔ میں نے کمرے میں ہی رات کا کھانا کھایا۔ جب رات کے ساڑھے گیارہ بجے کا وقت ہوا تو میں نے جیب سے پاتالی کی انگوٹھی نکال کر انگلی میں پہن لی۔ انگوٹھی کے پہنتے ہی میں غائب ہو گیا۔ اب مجھے دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں بند دروازے میں سے ہی باہر نکل گیا۔

وہاں سے سیدھا دیران تاریخی محل میں آگیا اور تہہ خانے میں بیٹھ کر دُرگا کی بدروح کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ دُرگا کی بدروح ٹھیک آدھی رات کو نمودار ہوئی۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ کہنے لگی۔ ”پاتالی نے تمہیں نتالیا کے آسیب سے بچالیا لیکن خود پھنس گئی۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا اسے بھی نتالیا نے روہنی کے ساتھ قید کر لیا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”نہیں۔ نتالیا میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ پاتالی کے داؤچ کا مقابلہ کر سکے۔ پاتالی میری تمام غلام بدروحوں سے زیادہ ہوشیار اور طاقتور بدروح ہے۔ اسے عین وقت پر نتالیا کے آسیب کے حملے کا پتہ چل گیا اور اس نے وہ منتر پڑھ کر اپنے اوپر پھونکا جو بدروحیں اس وقت پھونکتی ہیں جب انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ اگر انہوں نے منتر نہ پھونکا تو دشمن انہیں مار ڈالے گا۔ پاتالی نے بھی ایسا ہی کیا اور اس کی جان بچ گئی۔“

میں نے پوچھا۔ ”لیکن پھر وہ مجھے ملی کیوں نہیں؟ کیا وہ تمہارے پاس بھی نہیں آئی؟“

دُرگانے کہا۔ ”وہ اس حالت میں ہے کہ نہ تمہارے پاس آسکتی ہے اور نہ میرے پاس آسکتی ہے۔“

میں نے حیران ہو کر کہا۔ ”ایسی کون سی انہونی بات ہو گئی ہے۔ کیا مجھے نہیں بتاؤ

گی؟

دُرگاکے بدروح نے کہا۔ ”وہی انہونی بات بتانے کے لئے تو میں یہاں تمہارے پاس آئی ہوں۔ کیونکہ اس وقت پاتالی کی صرف تم ہی مدد کر سکتے ہو اور اسے اس مصیبت سے نکال سکتے ہو جس میں وہ اپنے اوپر منتر پھونکنے کے بعد پھنس گئی ہے۔“

میں نے دُرگاکے کہا۔ ”آخر بات کیا ہوئی ہے۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔“

دُرگاکے بدروح کہنے لگی۔ ”شیروان! تمہیں یاد ہے روہنی ایک بار تمہیں بدروحوں کی دنیا میں اپنی سہیلی مالینی کے پاس لے گئی تھی؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں! مجھے یاد ہے۔“

دُرگابولی۔ ”اور تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ مالینی نے تمہیں ایک خطرناک منتر بتایا تھا جس کے صرف چار لفظ تھے۔“

مجھے یاد آگیا۔ میں نے کہا۔ ”ہاں مجھے وہ چار لفظی منتر اس وقت بھی یاد ہے۔ میں یہی چار لفظوں والا منتر پڑھ کر چگاڈ بن گیا تھا اور چگاڈ بن کر وہاں گیا تھا جہاں مالینی مجھے بھیجنا چاہتی تھی۔“

”تم نے بالکل ٹھیک کہا۔“ دُرگابولی۔ ”اور تمہیں یہ بھی ضرور یاد ہوگا کہ مالینی نے تمہیں کہا تھا کہ یہ چار لفظوں والا منتر صرف اس وقت پڑھ کر اپنے اوپر پھونکنا جب موت تمہارے سامنے کھڑی ہو اور بچنے کا کوئی راستہ نہ ہو کیونکہ یہ منتر پڑھنے کے بعد تم صرف غائب نہیں ہو گے بلکہ غائب ہوتے ہی کسی بھی جانور کی شکل اختیار کر سکتے ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم کسی دوسرے انسان کی شکل اختیار کر لو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم کوئی جنگلی درندہ بن جاؤ۔ اس کے بعد ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں منتر بھول جائے اور تمہیں ساری زندگی جنگلی درندہ بن کر ہی گزارنی پڑے۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن جب میں یہ منتر اپنے اوپر پھونک کر چگاڈ بن گیا تھا تو مجھے منتر یاد تھا اور میں اسے دوبارہ اپنے اوپر پھونک کر ہی اپنی انسانی شکل میں واپس آ گیا

تھا۔“

دُرگانے کہا۔ ”تمہیں اس حالت میں یہ منتر اس وجہ سے یاد آ گیا تھا کہ تمہارے پیچھے مالینی کا ہاتھ تھا جو بدروحوں کی سردارنی ہے اگر اس کا ہاتھ تمہارے پیچھے نہ ہوتا تو ممکن ہے تمہیں منتر یاد نہ آتا اور تم اس وقت تک چگاڈ ہی بنے رہتے جب تک کہ دوبارہ تمہیں منتر یاد نہ آتا۔ یہ بدروحوں کی سردارنی کا سب سے خطرناک منتر ہے۔ اس کی یہی ایک بات خطرناک ہے کہ اگر یہ منتر شکل بدلنے کے بعد یاد نہ آئے تو وہ عورت یا مرد یا بدروح جس شکل میں ظاہر ہوئی ہوگی کچھ پتہ نہیں کب تک اسے اسی شکل میں زندہ رہنا پڑے۔“

میں کچھ کچھ سمجھ گیا تھا کہ دُرگامجھے پاتالی کے بارے میں کیا بتانے والی ہے۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا پاتالی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ ہوا ہے؟“

دُرگانے کہا۔ ”ہاں! اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ جب وہ تمہیں قبرستان کی دیوار کے پاس چھوڑ کر روہنی کو قید سے نکالنے ویران کھنڈر کے تہہ خانے کی بند دیوار کے پاس آئی تو تنالیا کا آسب وہیں گھات لگائے اس کے انتظار میں تھا۔ اس نے فوراً اس پر حملہ کر دیا۔ مگر پاتالی بڑی ہوشیار تھی۔ اسے ایک سیکنڈ پہلے احساس ہو گیا کہ اس پر حملہ ہونے والا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ حملہ کسی بدروح کا نہیں بلکہ ایک خطرناک آسب کا حملہ ہے جس سے وہ اپنا بچاؤ نہیں کر سکے گی۔ چنانچہ اس نے فوراً چار لفظی منتر پڑھ کر پھونکا اور پھر.....“

دُرگا خاموش ہو گئی۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”اور پھر کیا ہوا؟“

دُرگابولی۔ ”چار لفظوں والا خطرناک منتر پڑھنے کے بعد پاتالی غائب ہو کر ایک ایسی عورت کے جسم میں داخل ہو گئی ہے جس کی جان ہر وقت خطرے میں رہتی ہے۔ چوبیس گھنٹے جس کے پیچھے پولیس بندوقیں، رائفلیں لے کر اسے ہلاک کرنے کے لئے لگی رہتی ہے۔ اس طرح وہ کسی بھی وقت پولیس کی گولیوں سے چھلنی ہو کر ہلاک ہو

سکتی ہے یا پھر پولیس اسے پکڑ کر پھانسی کے تختے پر پہنچا سکتی ہے جہاں اس کے گلے میں پھند اڈال کر اسے ایک سیکنڈ میں ہلاک کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اب متالیا کے آسیب نے پاتالی کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا ہے کیونکہ وہ جان گیا ہے کہ پاتالی اپنے آپ موت کے منہ میں چلی گئی ہے جہاں کسی بھی وقت موت اسے نگل جائے گی۔“

O

میرے ذہن میں خود بخود ایک سوال آگیا۔ میں نے دُرگاسے کہا۔ ”اگر پاتالی کو مارنا ہی تھا تو کیا متالیا کا آسیب خود اسے نہیں مار سکتا تھا؟“

دُرگا کہنے لگی۔ ”متالیا کے آسیب نے پاتالی کو ہلاک کرنے کے لئے ہی اس پر حملہ کیا تھا۔ لیکن جب پاتالی بدروحوں کی سردارنی مالینی کا چار لفظی منتر پڑھ کر غائب ہو گئی تو وہ متالیا کے آسیب کے ہاتھ سے نکل گئی تھی لیکن یہ دیکھ کر متالیا کے آسیب نے پاتالی کو خود ہلاک کرنے کا خیال چھوڑ دیا تھا کہ وہ خود بخود ایک ایسی عورت کے جسم میں داخل ہو گئی ہے جس کو کسی بھی وقت پولیس گولیوں سے چھپنی کر سکتی ہے یا پھانسی کا پھندا اس کی گردن میں ڈال سکتی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”پاتالی تو تمہاری خاص بدروح ہے۔ پھر اسے مالینی کا خطرناک منتر یاد کیوں نہ رہا۔ وہ اسے پڑھ کر اپنی شکل میں واپس آسکتی تھی۔“

دُرگا کی بدروح کہنے لگی۔ ”تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گے۔ یہ بدروحوں کی دنیا کی باتیں ہیں اور تم انسانوں کی دنیا میں رہنے والے ایک سیدھے سادھے انسان ہو۔ پاتالی اگرچہ میری خاص بدروح ہے اور سب سے زیادہ چالاک اور خطرناک ہے لیکن اس کے باوجود اسے بدروحوں کی سردارنی مالینی کا آشیر باد یعنی اس کی توجہ حاصل نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پاتالی کو غائب ہونے کے بعد منتر یاد رہتا جس طرح تمہیں چمکا دڑ بننے کے بعد منتر یاد رہا تھا۔ اب کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ پاتالی کو منتر یاد آئے یا نہ آئے۔ جہاں تک میرا خیال ہے اسے یہ منتر یاد نہیں آئے گا اور وہ بہت جلد یا تو پولیس

مقابلے میں ماری جائے گی اور یا پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو کر پھانسی چڑھ جائے گی۔

میں نے کہا۔ ”تم نے مجھے تجسس میں ڈال دیا ہے۔ یہ عورت کون ہے جس کے جسم میں پاتالی کی بدروح داخل ہو گئی ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟ وہ کہاں رہتی ہے؟“

دُر گا بولی۔ ”اس کا نام خنجری ہے۔ خنجری بھارت کی سب سے خونخوار ڈاکو ہے۔ لوگ اس کا نام سن کر ڈر جاتے ہیں۔ اس وقت تک وہ سینکڑوں انسانوں کا خون کر چکی ہے۔ اس کی رائفل جس بد نصیب کی طرف اٹھ جائے گولی اس کا سینہ پھاڑ ڈالتی ہے۔“

خنجری ڈاکو کا نام میں نے بھی سنا ہوا تھا اور اس کی کچھ خونی ورداتوں کا حال بھی سن رکھا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اگر پاتالی اس خنجری ڈاکو کے جسم میں داخل ہو گئی ہے تو یہ ڈاکو عورت تو بدروح بن کر بدروحوں کی دنیا میں چلی گئی ہوگی۔“

”نہیں۔ ایسا نہیں ہوا۔“ دُر گانے کہا۔ ”پاتالی بدروح کے اس کے جسم میں داخل ہونے کے بعد خنجری پہلے سے زیادہ خونخوار ہو گئی ہے۔“

”کیا اسے علم نہیں ہوا کہ اس کے جسم میں کسی عورت کی بدروح داخل ہو گئی ہے؟“

میرے سوال پر دُر گانے کہا۔ ”نہیں۔ خنجری کو اس کا احساس تک نہیں ہے۔ وہ یہی سمجھ رہی ہے کہ وہ پہلے ایسی ڈاکو خنجری ہے اور دیوتاؤں نے اس کی طاقت میں اضافہ کر دیا ہے۔“

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”لیکن میں اس سلسلے میں پاتالی کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

دُر گانے کہا۔ ”تم اس کے ڈاکوؤں کے گردہ میں شامل ہو جاؤ گے اور پھر اس کے جسم میں ایک خاص طریقے سے مالینی کا خطرناک چار لفظی منتر داخل کرنے کی کوشش

کر دو گے تاکہ پاتالی کو جو خنجری کے جسم میں ہے منتر یاد آجائے اور وہ اسے دوبارہ پڑھ کر اپنی اصلی حالت میں واپس آجائے۔“

میں نے کہا۔ ”اس کے جسم میں منتر داخل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اس کے پاس جا کر اس کو چار لفظوں والا منتر بتا دوں گا۔ وہ فوراً اسے پڑھ کر اپنی اصلی شکل میں واپس آجائے گی۔“

دُر گانے کہا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ پاتالی، ڈاکو خنجری کے روپ میں تمہیں بالکل نہیں پہچانے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم زبانی اگر اسے منتر بتاؤ گے تو وہ اس کے کانوں میں منتر کی شکل میں نہیں پڑے گا بلکہ اس کے کانوں تک جاتے جاتے بدل جائے گا۔ لفظ بدل جائیں گے۔ ہو سکتا ہے تم وہ منتر خنجری کے سامنے پڑھو اور وہ یہ سمجھے کہ تم اس سے کہہ رہے ہو خنجری آج بڑا اچھا موسم ہے۔ یادہ سنے کہ خنجری تم بڑی خوبصورت ہو۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ چار لفظی منتر ایک گالی بن کر خنجری ڈاکو کے کان میں داخل ہو جائے۔ اس کے بعد وہ تمہیں کبھی زندہ نہیں چھوڑے گی۔ اس لئے خنجری کے سامنے اپنی زبان سے یہ منتر پڑھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔“

میں نے پوچھا۔ ”تو پھر میں اس کے جسم میں منتر کیسے داخل کروں گا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔“

دُر گانے بدروح بولی۔ ”وہ میں تمہیں بتاؤں گی کہ تمہیں کیا کرنا ہو گا۔ پاتالی میری سب سے چھیتی غلام بدروح ہے۔ میں اسے اس حالت میں اکیلی نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر اس پر مالینی کے منتر کا اثر نہ ہو چکا ہو تا تو میں خود اسے اس مصیبت سے نکال لیتی۔ لیکن مالینی بدروحوں کی سرداری ہے۔ اس کے منتر کا توڑ میرے پاس بھی نہیں ہے۔ اس کے منتر کے توڑ کے لئے کسی زندہ انسان کی مدد لینی ضروری ہے اور زندہ انسانوں میں سے تم ہی ایک ایسے انسان ہو جو اتفاق سے اس وقت میرے پاس موجود ہے اور جس پر میں پورا بھروسہ کر سکتی ہوں۔ اب سنو! سب سے پہلے تم خنجری ڈاکو کا

اعتماد حاصل کر کے اس کے گروہ میں شامل ہو گئے اس کے بعد تم اسے اپنا گرویدہ بناؤ گے۔“

”میں ایک خونخوار فی ڈاکو کو اپنا گرویدہ کیسے بنا سکتا ہوں؟“ میں نے کہا۔

دُرگا بولی۔ ”اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں اس مہم میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ جہاں جہاں تمہیں مدد کی ضرورت ہو گی تمہاری مدد بھی کروں گی اور تمہیں کیا کرنا ہے یہ بھی بتاتی رہوں گی۔“

میں نے ایک اور سوال پوچھا جو بہت ضروری تھا۔ میں نے کہا۔ ”یہ خونخوار ڈاکو خنجری ہوتی کہاں ہے؟“

دُرگا کہنے لگی۔ ”بھارت کے صوبہ مدھیہ پردیش کے گھنے جنگلوں کو اس عورت نے اپنا مسکن بنایا ہوا ہے۔ وہ اپنے گروہ کے ساتھ انہی جنگلوں میں ہوتی ہے مگر اس کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن میں تمہیں جنگل کے اس حصے میں پہنچا دوں گی جہاں ان دنوں اس ڈاکو عورت نے ڈیرہ ڈالا ہوا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تو کیا میں وہاں پہنچ کر اپنے آپ خنجری ڈاکو کے سامنے حاضر ہو جاؤں گا اور کہوں گا کہ مجھے اپنے گروہ میں شامل کر لو۔“

دُرگا کہنے لگی۔ ”نہیں۔ اس طرح جا کر کہو گے تو وہ تمہیں پولیس کا جاسوس سمجھ کر وہیں گولی مار دے گی۔“

”پھر مجھے کیا کرنا ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔

دُرگانے کہا۔ ”میں تمہیں اس وقت جنگل میں خنجری ڈاکو کے ڈیرے کے قریب پہنچاؤں گی جب وہ درختوں کے درمیان بہنے والی ایک ندی میں نہا رہی ہو گی۔ اس وقت میں ایک شیر کو اس کی طرف بھیج دوں گی۔ یہ شیر اس وقت میرے جادو کے اثر میں ہو گا۔ تم یوں سمجھ لو کہ میں شیر کے سر پر بیٹھی ہوں گی۔ تم قریب ہی ایک جھاڑی میں چھپے ہوئے ہو گی۔ جیسے ہی وہ خنجری ندی سے نہا کر باہر نکلے گی۔ شیر میرے جادو

کے اثر سے اس پر حملہ کر دے گا۔ عین اسی وقت تم جھاڑی میں سے نکل کر خنجر سے شیر پر حملہ کر دو گے۔ عام حالات میں کوئی بھی انسان شیر کو خنجر سے ہلاک کرنے کی بھول کر بھی جرات نہیں کر سکتا لیکن تم ایسا ہی کرو گے۔ شیر تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ وہ اس وقت میرے کنٹرول میں ہو گا۔ تم اس کی گردن میں خنجر پیوست کر دو گے اور شیر زخمی ہو کر بھاگ جائے گا۔ خنجری ڈاکو تمہاری بہادری پر حیران رہ جائے گی۔ اس کے گروہ کے آدمی بھی را کفلیں لے کر آجائیں گے۔ وہ تم سے پوچھے گی کہ تم کون ہو اور اس جنگل میں کیا کر رہے ہو؟ تم کہو گے کہ میں نے اپنے دشمن کو مار ڈالا تھا۔ پولیس مجھے پکڑ کر لے گئی تھی۔ میں فرار ہو کر آ گیا ہوں۔ اس کے بعد وہ جو کہے گی اس کے جواب میں تمہیں کیا کہنا ہو گا وہ میں تمہیں ساتھ ساتھ بتاتی جاؤں گی کیونکہ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ اب خنجری ڈاکو کے جنگل میں جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی تو رات کا اندھیرا ہے۔ اس وقت وہ ندی پر کہاں نہا رہی ہو گی؟“

دُرگانے کہا۔ ”میں تمہیں ابھی اٹھا کر نہیں لے جا رہی۔ تمہیں صبح کی پہلی گاڑی سے بھوپال روانہ ہو جانا ہو گا۔ بھوپال کے سٹیشن سے جب تم باہر نکلو گے تو میں تمہیں بتاتی جاؤں گی کہ آگے تمہیں کس طرف جانا ہے۔ اب جاؤ اور ریلوے سٹیشن پر جا کر بھوپال جانے والی گاڑی کا انتظار کرو۔“

اس کے ساتھ ہی دُرگا کی بدروح غائب ہو گئی۔

یہ مصیبت کے اندر ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔ ابھی روہنی کو بھی میں نتالیا کی قید سے نہیں چھڑا سکا تھا اور پہلے پاتالی کو خنجری ڈاکو کے جسم سے باہر نکالنے کی مشکل آن پڑی تھی۔ لیکن یہ بھی بہت ضروری تھا کیونکہ دُرگانے بتا دیا تھا کہ صرف پاتالی ہی ایک ایسی بدروح ہے جو روہنی کو نتالیا کی قید سے آزاد کر سکتی ہے اور

روہنی وہ عورت تھی جس کی مدد سے مجھے متالیا کی قید سے ہمیشہ کے لئے نجات پانی تھی اس لئے سب سے پہلے پاتالی کو واپس اپنی اصلی حالت میں لانا ضروری ہو گیا تھا۔

میں اس وقت غیبی حالت میں تھا۔ میں نے پاتالی کی انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ اسی حالت میں میں تاریخی دیران محل سے نکل کر بے پور کے ریلوے سٹیشن پر آ گیا اور بھوپال جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ سٹیشن میں داخل ہونے سے پہلے میں نے پاتالی کی انگوٹھی اپنی انگلی سے اتار کر جیب میں رکھ لی تھی اور زندہ انسانی حالت میں تھا۔ پیسے میرے پاس کافی تھے۔ میں نے بھوپال تک کاٹرین کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے لیا تھا۔ میرے کون سے اپنے پیسے تھے کہ مجھے یہ خیال ہوتا کہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لوں۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں مجھے یہ سکون بھی ملتا تھا کہ ڈبے میں ایک دو مسافر ہی ہوتے تھے اور میں آرام سے سوچ بچار کرتا اپنی منزل پر پہنچ جاتا تھا۔

صبح منہ اندھیرے دلی کی طرف سے ایک ٹرین آگئی۔

یہ ٹرین بھوپال سے ہوتی ہوئی بمبئی جاتی تھی۔ میں اس کے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بیٹھ گیا۔ بے پور سے بھوپال کافی دور واقع ہے۔ ڈبے میں ایک لالہ جی بھی سوار تھے۔ میں نے انہیں کہہ دیا کہ بھوپال کا سٹیشن آئے تو مجھے جگادینا اور خود آرام دہ سیٹ پر لیٹ گیا۔ ساری رات کا جاگا ہوا تھا لیٹنے ہی سو گیا۔ راستے میں ایک دو جگہ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ابھی بھوپال نہیں آیا تھا۔ ایک جگہ مجھے لالہ جی نے جگادیا۔ کہنے لگے۔

”مہاراج! بھوپال آگیا ہے۔“

میں اٹھ بیٹھا۔ ٹرین بھوپال کے سٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے سٹیشن پر کھانا کھایا اور یہ انتظار کرنے لگا کہ کب ڈرگا کی بدروح آکر مجھے یہ بتاتی ہے کہ مجھے آگے کس طرف جانا ہے۔ کیونکہ بھوپال مدھیہ پردیش کا شہر ہے اور اس کے ارد گرد گھنے جنگل پھیلے ہوئے ہیں۔ یہی وہ جنگل تھے جن کے اندر کسی جگہ خونخوار ڈاکو خجری نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ میں پلیٹ فارم پر چائے کے سٹال پر کھڑا چائے پی رہا تھا۔ اس

وقت میرے قریب دوسرا کوئی گاہک نہیں تھا۔ جب ڈرگا کی طرف سے اس کی موجودگی کا کوئی اشارہ نہ ملا تو میں نے آہستہ سے سرگوشی میں کہا۔ ”ڈرگا کیا تم آگئی ہو؟“

میرے کان میں ڈرگا بدروح کی سرگوشی سنائی دی۔ ”میں آگئی ہوں شیردان!“

”مجھے یہاں سے کس طرف جانا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

ڈرگانے کہا۔ ”سٹیشن سے باہر ایک ٹیکسی سٹینڈ ہے۔ وہاں آکر ایک ٹیکسی لو اور اسے کہو دھارادائی لے چلے۔ آگے میں تمہیں وہاں پہنچ کر بتاؤں گی۔ میں ٹیکسی میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔“

میں نے چائے کے پیسے ادا کئے اور سٹیشن سے باہر آکر ٹیکسی سٹینڈ کی طرف آ گیا۔ ایک اچھی حالت کی ٹیکسی نظر آگئی۔ میں ڈرائیور کے پاس گیا تو اس نے پوچھا۔

”کہاں جاؤ گے بابو؟“

میں نے کہا۔ ”دھارادائی لے چلو گے؟“

وہ بولا۔ ”بابو! وہ تو جنگل کے کنارے گاؤں ہے۔ کیا تم شکاری ہو؟“

میں نے کہا۔ ”بھائی! وہاں میرا دوست شکار کی پارٹی لے کر گیا ہوا ہے۔ میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔“

ڈرائیور نے کہا۔ ”پچاس روپے لوں گا۔“

اُس زمانے میں پچاس روپے آج کے پانچ سو روپے کے برابر ہوتے تھے۔ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں سو روپیہ دوں گا۔ مگر مجھے جلدی پہنچنا ہے۔“

ڈرائیور گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”بابو! بڑی جلدی پہنچا دوں گا۔ بیٹھ جاؤ۔“

میں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرگانے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”دھارادائی کے گاؤں پہنچ کر میں تمہیں ایک خجری دوں گی۔ تم اس خجری کو شیر کی گردن پر مارو گے۔“

میں نے دل میں کہا۔ یا اللہ! اس نئی مشکل سے خیر و عافیت سے نکال لینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شیر پر دُرگاہ بدروح کا جادو اچھی طرح سے اثر نہ کرے اور شیر مجھے ہڑپ کر جائے۔ ٹیکسی دھار اوئی کی طرف جارہی تھی۔ کچھ وقت کے بعد بھوپال کا شہر پیچھے رہ گیا اور اونچے نیچے کھیت اور پہاڑی میلے شروع ہو گئے۔ ڈیڑھ دو گھنٹوں کے بعد ہماری ٹیکسی ایک جنگلاتی سلسلے میں داخل ہو گئی۔ سڑک کی دونوں جانب درخت ہی درخت تھے۔ کہیں کھلا ہوا میدان آ جاتا، کہیں چڑھائی اترائی شروع ہو جاتی۔ دُرگانے اس دوران مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی شاید وہ میرے پاس نہیں تھی۔ وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ ٹیکسی کے آگے آگے جارہی ہو یا ہو سکتا ہے وہ غیبی حالت میں ٹیکسی کے اندر ہی بیٹھی ہو۔

میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرے کانوں میں دُرگانے سرگوشی کی۔ ”دھار اوئی کا گاؤں آرہا ہے۔“

اس کی تصدیق ٹیکسی ڈرائیور نے بھی کر دی۔ کہنے لگا۔ ”بابو جی! آپ کا گاؤں آ گیا ہے۔“

جنگل میں سڑک کے کنارے یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میں ٹیکسی سے اتر کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ دُرگانے میرے کان میں کہا۔ ”اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالو۔ وہاں میں نے ایک خنجر رکھ دیا ہے۔“

میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ جیب میں ہاتھ ڈالا اور خنجر باہر نکال لیا۔ یہ ایک درمیانے سائز کا خنجر تھا جس کا پھل بالکل سیدھا اور دو دھاری تھا۔

میں نے کہا۔ ”یہ تو بڑا تیز خنجر ہے دُرگا!“

دُرگانے کہا۔ ”تمہیں ایسے ہی خنجر کی ضرورت تھی۔ اسے سنبھال کر رکھ لو۔“

میں نے خنجر پتلون کی پچھلی جیب میں رکھ لیا۔

”اب مجھے کس طرف جانا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

دُرگانے کہا۔ ”آگے سڑک میں سے ایک پگ ڈنڈی جنگل کی طرف نکلتی ہے اس پر چل پڑو۔ یہ تمہیں وہاں پہنچا دے گی جہاں میں تمہیں لے جانا چاہتی ہوں۔“ میں نے دُرگاہ سے کہا۔ ”تم خواخواہ تجھے پیدل کیوں چلا رہی ہو؟ تم مجھے غائب کر کے بھی وہاں پہنچا سکتی ہو۔“

دُرگانے جواب دیا۔ ”میں ایسا کر سکتی ہوں لیکن میرا اپنا دل بے پور سے بھوپال تک ٹرین میں سفر کرنے اور پھر ان جنگلوں میں پیدل چل کر سیر کرنے کو چاہ رہا تھا۔ ایک لمبے عرصے بعد مجھے ویران محل سے نکل کر ان علاقوں میں آنے کا موقع ملا ہے۔ میں اسی علاقے کی رہنے والی ہوں۔ اگر تم یہی چاہتے ہو تو آنکھیں بند کرو۔ میں تمہیں اس جگہ لئے چلتی ہوں جہاں تھوڑی دیر بعد خنجر کی ڈاکو نہانے آئے گی۔“

میں نے کہا۔ ”میں جنگلوں میں پیدل پھر پھر کر تنگ آ گیا ہوں۔ تم مجھے جلدی سے غائب کر کے پہنچا دو۔“

دُرگانے کہا۔ ”آنکھیں بند کرو۔ جب تک میں نہ کہوں آنکھیں نہ کھولنا۔“

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے ہلکا سا دھچکا لگا اور پھر تیز ہوا میرے جسم کو چھونے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد دُرگاہ کی آواز آئی۔ ”آنکھیں کھول دو۔“

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ میں گھنے جنگل میں گنجان درختوں کے نیچے ایک ندی کے کنارے کھڑا ہوں۔ دُرگاہ کی آواز آئی۔ ”یہی وہ ندی ہے جہاں تھوڑی دیر بعد خنجر کی ڈاکو نہانے کے لئے آرہی ہے۔ اسی جگہ کھڑے رہنا۔ میں تمہارے پاس ہی ہوں۔“

جنگل میں دن کا وقت تھا مگر درخت اتنے گھنے تھے کہ ندی پردن کی روشنی بہت دھیمی پڑ رہی تھی بلکہ ہلکا ہلکا اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ میں ایک درخت کی اوٹ میں خاموشی سے کھڑا تھا اور جس طرف سے ندی بہتی ہوئی آرہی تھی اس طرف دیکھ رہا تھا۔ دُرگانے کہا تھا کہ خنجر کی ڈاکو اسی طرف سے آئے گی۔

دُرگاکا دھیمی آواز آئی۔ ”خجری اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ آتی ہے مگر باڈی گارڈ پیچھے ایک جگہ پہرہ دیتے ہیں اور خجری یہاں آکر ندی میں نہاتی ہے۔“
میں نے آہستہ سے پوچھا۔ ”اور وہ میری جان کا دشمن شیر کس طرف سے نمودار ہوگا؟“

دُرگانے کہا۔ ”میں خود اسے لے کر آؤں گی اور وہ میرے کنٹرول میں ہوگا۔ تم کیوں فکر کرتے ہو؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ تمہیں کچھ کہے۔“
میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس دل میں خدا سے دعائیں مانگنے لگا کہ یا خدا تو اپنی میری حفاظت کرنا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے ندی کے اس کنارے پر جہاں میں کھڑا تھا ایک عورت درختوں میں آتی نظر آئی۔

دُرگانے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”یہی ڈاکو خجری ہے۔ درخت کے پیچھے ہو جاؤ۔ میں شیر کو لینے جا رہی ہوں۔ ڈرنا بالکل نہیں۔ شیر تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ میں جا رہی ہوں اور وہی کرنا جیسا میں نے تمہیں کہا ہے۔“

میں ہکا بکا سا ہو کر اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ میں نے جنگل میں چھوٹے جانوروں کا شکار ضرور کیا تھا مگر آج تک کسی شیر سے پالا نہیں پڑا تھا اور وہ بھی اس طرح سے کہ خجری سے اس پر حملہ کرنا پڑ جائے۔ ایسا تو بس کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ خجری ڈاکو قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ ایک دراز قد مضبوط جسم کی عورت تھی۔ اس نے فوجی کمانڈو ٹائپ کی بش شرٹ اور اسی طرز کی پتلون پہن رکھی تھی۔ ایک کندھے سے میگزین بیلٹ اور دوسرے کندھے پر رائل لنگی ہوئی تھی۔ سر کے بالوں کا جوڑا بنا کر پیچھے گردن پر سیاہ رومال سے باندھا ہوا تھا۔ رنگ سانولا تھا اور اس کی چال میں بڑی خود اعتمادی اور وقار تھا۔ میں اس عورت سے واقعی بڑا متاثر ہوا۔ اس عورت کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے جسم میں پاتالی بدروح نے قبضہ کیا ہوا ہے اور میں اس کے جسم سے پاتالی کو نکالنے کے لئے آیا ہوں۔ پاتالی کی وجہ سے خجری ڈاکو پر تو کوئی

خاص اثر نہیں پڑا تھا صرف اس کی طاقت میں تھوڑا اضافہ ہو گیا تھا مگر پاتالی اس کے جسم میں قیدی بن کر رہ گئی تھی اور بقول دُرگابدروح کے میری مدد کے بغیر باہر نہیں نکل سکتی تھی اور اس کو باہر نکالنا بے حد ضروری تھا۔

میں ڈر رہا تھا کہ اگر اس خونخوار عورت کی مجھ پر نظر پڑ گئی تو وہ مجھے فوراً گولی مار دے گی۔ یہ عورت سینکڑوں انسانوں کا خون کر چکی ہے۔ اس وقت تو دُرگابھی میرے پاس موجود نہیں تھی کہ میری کوئی مدد کر سکتی۔ بس یہی ہو سکتا تھا کہ میں جلدی سے انگوٹھی نکال کر پہن لوں اور غائب ہو جاؤں مگر خجری ڈاکو کی مدد کی شاید مجھے اتنی مہلت نہیں دے گی۔

اتنے میں میرے کان میں دُرگاکا سرگوشی سنائی دی۔ ”شیر وان! میں نے ایک شیر پر اپنا منتر پڑھ کر پھونک دیا ہے۔ وہ اس طرف آ رہا ہے۔“
میں نے کہا۔ ”میری ماما! اگر تمہارے منتر نے کام نہ کیا تو میں غریب تو مارا جاؤں گا۔“

دُرگانے سرگوشی کی۔ ”میں کتنی بار تمہیں کہوں گی کہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا۔ اگر نہیں لو گے تو نہ تم پاتالی کو آزاد کر اسکو گے اور نہ پاتالی تمہاری روہنی کو آزاد کر سکے گی اور نہ روہنی تمہیں اس بدروحوں کے چکر سے نکال سکے گی۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں اب کچھ نہیں کہوں گا۔“

دُرگانے سرگوشی کی۔ ”خجری نکال کر ہاتھ میں پکڑ لو۔“

میں نے ایسا ہی کیا اور خجری پتلون کی پچھلی جیب سے نکال کر سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس دوران خجری ڈاکو میگزین بیلٹ، جوتے اور رائل لنگی کے کنارے رکھنے کے بعد پکڑوں سمیت ندی میں اتر چکی تھی اور ندی میں بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے پانی اپنے اوپر ڈال رہی تھی۔

دُرگانے میرے کان میں کہا۔ ”شیر اس وقت درخت کی بائیں طرف سے آئے گا۔ جس وقت میں تمہیں کہوں فوراً خنجر سے شیر پر حملہ کر دینا۔ یہ یقین رکھنا کہ اس وقت میں شیر کے سر پر موجود ہوں گی اور وہ میرے کنٹرول میں ہوگا۔“

ابھی دُرگاہ کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ جنگل شیر کی دھاڑ سے گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ ایک زرد رنگ کا شیر خنجر کی ڈاکو کی طرف دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ دُرگانے کہا۔ ”شیر پر حملہ کر دو۔“

میں خنجر لے کر شیر کی طرف دوڑ پڑا۔ اس دوران خنجر کی ڈاکو ندی میں سے کنارے کی طرف بڑی تیزی سے بڑھی۔ شیر نے مجھے دیکھا تو مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر خنجر اس کی گردن میں پھنسا کر دیا۔ شیر جنگل کی طرف بھاگ گیا۔ اتنے میں خنجر کی ڈاکو کے باڈی گارڈ نے تین چار فائر کر دیئے اور دوڑ کر جہاں خنجر نہار ہی تھی وہاں آئے۔ میں اسی طرح ندی کے کنارے کھڑا تھا۔ خنجر کی ڈاکو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ میں نے اس کی جان شیر سے بچائی تھی۔ اس کے باڈی گارڈز میں سے ایک نے رائفل مجھ پر تان دی۔ خنجر نے بلند آواز میں کہا۔ ”اسے کچھ نہ کہنا۔ اس نے میری جان بچائی ہے۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔“

میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ باڈی گارڈ ڈاکو پیچھے ہٹ گئے۔ خنجر اپنی کمر کے گرد میگزین کی بیلٹ باندھتے ہوئے میرے پاس آگئی۔ اس نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”تم کون ہو؟ ادھر کیا کر رہے ہو؟“

ایک ڈاکو بول پڑا۔ ”بائی! یہ پولیس کا جاسوس معلوم ہوتا ہے۔“

خنجر نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ ”تم چپ رہو۔“

وہ میری طرف متوجہ ہوئی اور اپنا سوال دہرایا۔ ”تم کون ہو؟ ادھر کیا کر رہے تھے؟“

میں نے کہا۔ ”بھوپال میں اپنے دشمن کا خون کر کے بھاگا ہوں۔ اگر تم ہی خنجر

ڈکیت ہو تو مجھے پناہ دے دو۔ پولیس مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔“

خنجر نے سٹین گن کندھے سے لٹکائی اور اپنے ایک آدمی سے کہا۔ ”گوپی! اسے ڈیرے پر لے جا کر اس کی تلاشی لو اور اسے کہیں مت جانے دو۔“

گوپی نے مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ”چلو۔“

یہ لوگ مجھے اپنے ڈیرے پر لے گئے۔ یہ ان کا عارضی ڈیرہ تھا۔ جنگل میں ایک جگہ درختوں کے نیچے انہوں نے ڈیرہ جمایا ہوا تھا۔ ایک طرف ان کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ایک گھنے درخت کے نیچے جھونپڑی تھی جس کے باہر ایک ڈاکو رائفل لئے پہرہ دے رہا تھا۔ دوسری جانب ایک اور جھونپڑی تھی۔ مجھے اس جھونپڑی میں بند کر کے پہرہ لگا دیا گیا۔ میں جھونپڑی میں چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اتنے میں میرے کان میں دُرگاہ کی سرگوشی سنائی دی۔ ”گھبرانا بالکل نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم خنجر کے سامنے اس خواہش کا اظہار کرنا کہ تم اس کے گردہ میں شامل ہونا چاہتے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“

”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ دُرگاہ بولی۔

باہر جو ڈاکو پہرہ دے رہا تھا شاید اس نے میری آواز سن لی تھی۔ اس نے جھونپڑی میں جھانک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”کس سے باتیں کر رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میں کس سے باتیں کروں گا؟ یہاں تو میرے سوا کوئی نہیں ہے۔“

ڈاکو نے جھونپڑی کا بھرپور جائزہ لیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد مجھے خنجر کی ڈاکو کے آگے پیش کیا گیا۔ ڈاکو خنجر کی کورانی کے لقب سے پکارتے تھے۔ وہ بڑی جھونپڑی میں چارپائی پر بیٹھی تھی سٹین گن اس کے گھٹنوں پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ یہ ڈاکو عورت واقعی بڑی دلکش شخصیت رکھتی تھی۔ صرف

کے جسم سے باہر آنے میں ہماری مدد کر سکے گی۔“
میں نے پوچھا۔ ”لیکن میں یہ منتر کب اس خونی بلا کے جسم میں داخل کروں گا
اور کیسے داخل کروں گا؟“

دُرگانے دھیمی آواز میں کہا۔ ”دھیرج رکھو شیر وان دھیرج رکھو۔ یہ کام بڑا
ضروری بھی ہے اور بڑا نازک بھی ہے۔ جیسے میں کہتی ہوں ویسے کرتے رہو۔ باقی
میں سنبھال لوں گی۔“

میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”لیکن اس خونی رانی بائی نے تو مجھے قید میں ڈال دیا
ہے۔ میں نے شیر سے اس کی جان بچائی ہے مگر اس پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔“
دُرگانے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔ ”یہ لوگ یونہی کسی پر اعتبار نہیں کرتے اور
خنجری ڈاکو تو وہ قاتل عورت ہے کہ جس کے پیچھے مدھیہ پردیش کے علاوہ مہاراشٹر
کی ساری پولیس بھی لگی ہوئی ہے۔ اس عورت کو تو کسی اجنبی کو اپنے گروہ میں شامل
کرنے سے پہلے ایک ہزار بار سوچنا پڑتا ہے۔ اگر تم نے شیر سے اس کی جان نہ بچائی
ہوتی تو وہ تمہیں نڈی کنارے دیکھتے ہی گولی مار دیتی۔“

میں نے تنگ آکر کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟“
دُرگانے دھیمی آواز میں کہا۔ ”مجھے صرف آج اور کل کا دن دے دو۔ اس کے
بعد تم خود دیکھ لو گے کہ تمہارے بارے میں خنجری ڈاکو کا ذہن کیسے بدل جاتا ہے۔“
میں اپنی ایک حماقت کی وجہ سے ان بدروحوں کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ مجھے
چار ونا چار صبر کرنا ہی تھا۔ جھوپڑی میں قید وہ دن بھی گزر گیا۔ دوسرے دن دوپہر
کے وقت اچانک جھوپڑی کے باہر مجھے شور سنائی دیا۔ ڈاکو ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔
میں سمجھا کہ پولیس آگئی ہے۔ میں اٹھ کر باہر دیکھنے ہی لگا تھا کہ دُرگا کی آواز آئی۔
”تمہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا ہے میں تمہیں بتاتی ہوں۔“
دُرگانے مجھے بتایا کہ خنجری ڈاکو کو ایک سانپ نے ڈس لیا ہے اور وہ موت و

مجھے ایک جھوپڑی میں یہ کہہ کر بٹھا دیا گیا کہ تم ابھی یہاں سے بغیر اجازت باہر
نہیں نکلو گے۔ جس چیز کی ضرورت ہو باہر ہمارا آدمی موجود ہوگا۔ اسے بتا دینا۔
میں اس جھوپڑی میں ایک طرح سے قید کر دیا گیا تھا۔ جب میں جھوپڑی میں
اکیلا رہ گیا تو میں نے اس خیال سے کہ دُرگا میرے پاس ہی ہوگی آہستہ سے کہا۔
”دُرگا۔“

دُرگا کی سرگوشی سنائی دی۔ ”میں سب کچھ دیکھ رہی ہوں۔ سب کچھ سن رہی
ہوں۔ وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”دُرگا! مجھے تو اس ڈاکو عورت میں پاتالی کی ایک چیز
بھی نظر نہیں آرہی۔ کہیں تمہیں غلطی تو نہیں لگی؟“

دُرگانے کہا۔ ”تم اس ڈاکو عورت کا صرف جسم دیکھ رہے ہو میں اس عورت کے
جسم کے اندر پاتالی کو دیکھ رہی ہوں۔ تمہیں پاتالی کی کوئی نشانی اس لئے دکھائی نہیں
دیتی کہ پاتالی اس عورت کے جسم میں داخل ہونے کے بعد بے ہوشی کی حالت میں
ہے۔ نتالیا کے آسیب نے پاتالی سے یہی انتقام لیا ہے کہ اسے اس ڈاکو عورت کے جسم
میں داخل کر کے بے ہوش کر دیا ہے تاکہ اگر خنجری ڈاکو کا پولیس سے مقابلہ ہو جائے
اور خنجری پولیس مقابلے میں ماری جائے تو پاتالی اپنا بچاؤ نہ کر سکے اور خنجری کے
ساتھ ہی مر جائے۔ جب تم اس عورت کے جسم میں مالیتی کا چار لفظی منتر داخل کرو
گے تو اس کے اثر سے سب سے پہلے پاتالی کو ہوش آجائے گا اور وہ اس ڈاکو عورت

حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

میں نے کہا۔ ”وہ مر گئی تو پاتالی بھی اس کے ساتھ ہی چٹاکی آگ میں جل جائے گی۔“

دُرگانے کہا۔ ”تم دوسرے کی بات سننے سے پہلے ہی بول پڑتے ہو۔ سانپ نے میرے جادو کے اثر سے خجری کو ڈسا ہے اور اس نے اس کے جسم میں صرف اتنا زہر داخل کیا ہے جس کے اثر سے وہ بے ہوشی کی حالت میں ہی رہے گی مرے گی نہیں۔ میں نے تمہارے لئے اس ڈاکو عورت کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے ایک کارگر موقع فراہم کیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں کیا کر سکتا ہوں؟“

دُرگانہ بولی۔ ”تم فوراً خجری کی جھونپڑی میں جاؤ اور کہو کہ میں خجری کو ٹھیک کر دوں گا۔“

”میں کیسے ٹھیک کروں گا؟“ میں نے کہا۔

دُرگانے ترش لہجے میں کہا۔ ”تم کہاں اسے ٹھیک کرو گے؟ اسے میں ٹھیک کروں گی۔ تم صرف وہی کرو گے جو میں تمہیں بتاؤں گی۔“

اس کے بعد دُرگانہ بدروح نے مجھے سب کچھ بتا دیا کہ مجھے خجری کے پاس جا کر کیا کرنا ہوگا۔ جب وہ پوری تفصیل بیان کر چکی تو میں نے کہا۔ ”دیکھ لینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سانپ الٹا مجھے ڈس دے۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔ اب فوراً جھونپڑی سے باہر نکلو۔“

میں اُٹھ کر جھونپڑی سے باہر آ گیا۔ جھونپڑی کے باہر جو ڈاکو پہرہ دیا کرتا تھا وہ بھی نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ خجری ڈاکو کی جھونپڑی کے باہر ڈاکو سخت افراتفری کی حالت میں کھڑے تھے۔ ایک ڈاکو اندر جاتا تو دوسرا اندر سے باہر نکل آتا تھا۔ مجھے وہاں گوی نظر آ گیا۔ میں دوڑ کر اس کے پاس گیا اور اس سے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے

گوی؟“

گوی نے کہا۔ ”رانی بائی کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ وہ مر رہی ہے۔“
میں نے کہا۔ ”گوی! مجھے رانی بائی کے پاس لے چلو۔ مجھے سانپ کے کانٹے کا منتر آتا ہے۔“

اس نے ایک لمحہ کے لئے میری طرف حیرانی سے دیکھا اور بولا۔ ”بھگوان کے لئے جلدی سے آ جاؤ۔“

اور وہ مجھے بازو سے پکڑ کر جھونپڑی کے اندر لے گیا۔ اندر نقشہ یہ تھا کہ خجری ڈاکو کو ذرا ہوش آچکا تھا مگر اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ جسم کا رنگ نیلا پڑ گیا تھا۔ وہ چارپائی پر بے حال پڑی تھی اور ایک بوڑھا ڈاکو اس کی پنڈلی پر جہاں سانپ نے کاٹا تھا کسی تیل کی مالش کر رہا تھا۔ دو ڈاکو چارپائی کے پیچھے سر جھکائے کھڑے تھے۔ خجری نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ بوڑھے ڈاکو نے کہا۔ ”اسے یہاں کیوں لے آئے ہو گوی؟“

گوی نے کہا۔ ”کاکا! یہ کہتا ہے مجھے سانپ کے کانٹے کا منتر آتا ہے۔“
خجری نے یہ جملہ سن لیا تھا۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں رحم کی التجا تھی۔

بوڑھا ڈاکو کہنے لگا۔ یہ تو مسلمان ہے۔ مسلمان منتروں کو نہیں مانتے۔ پھر اسے ناگ کے کانٹے کا منتر کہاں سے معلوم ہو گیا ہے؟“

گوی نے کہا۔ ”کاکا! یہ وقت باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ تم پیچھے ہٹ جاؤ اور اسے اپنا کام کرنے دو۔“

بوڑھا ڈاکو ایک طرف ہٹ گیا۔ میں ڈاکو عورت خجری کی چارپائی کے قریب سٹول پر بیٹھ گیا اور جو دُرگانے مجھے بتایا تھا اس پر عمل شروع کر دیا۔ میں نے کہا۔ ”تم سب لوگ پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔“

گوئی، دونوں ڈاکو اور بوڑھا ڈاکو خاموشی سے جھوپڑی کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ خجری کو ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ میں نے خجری کی پنڈلی پر وہاں انگلی رکھ دی جہاں سانپ کے کاٹنے کا نشان پڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ ہلانے شروع کر دیئے۔ میں کوئی متر و متر نہیں پڑھ رہا تھا۔ میری بلا جانے کہ سانپ کے کاٹنے کا کیا متر ہوتا ہے۔ بس دُرگاکا ہدایت کے مطابق اپنے ہونٹ ہلا رہا تھا۔ تھوڑی دیر ہونٹ ہلانے کے بعد میں نے اُوچی آواز میں کہا۔ اے مرگ ناگ! جس نے رانی بانی کو کاٹا ہے۔ تم جہاں بھی ہو فوراً حاضر ہو جاؤ۔“

ڈاکو حیران ہو کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ خجری نے بھی اپنی بو جھل پلکیں اٹھا کر ایک دو بار مجھے دیکھا۔ میں نے جو کچھ کہا تھا اُس نے سن لیا تھا۔ میں دل میں دُعا مانگنے لگا کہ یا خدا! اب میری لاج رکھ لینا۔ اس دُرگادرواح کا مجھے کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اتنے میں جھوپڑی کے باہر کسی سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ یہ آواز سن کر میں بھی اندر سے کانپ اٹھا۔ ڈاکو جلدی سے ایک طرف ہو گئے۔ جھوپڑی کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ باہر سے دن کی روشنی اندر آرہی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سیاہ رنگ کا پانچ فٹ لمبا سانپ پھن پھیلانے بل کھاتا جھوپڑی میں داخل ہو رہا ہے۔

یقین کریں اس وقت میرے دل نے مجھ سے کہا کہ فیروز! بھاگ جاؤ۔ یہ سانپ خجری کا کچھ کرے یا نہ کرے لیکن تمہیں ضرور ڈس لے گا۔ کافی خوفناک سانپ تھا اور اس نے پھن کھول رکھا تھا اور بار بار اپنی دو شاخہ زبان باہر نکال کر پھنکاریں مار رہا تھا۔

دُرگانے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”خبردار! اپنی جگہ سے مت ہلنا۔“ میں اپنے اوپر جبر کر کے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ سانپ قریب آکر چارپائی پر چڑھ گیا۔ سب ڈاکو حیرت زدہ ہو کر سانپ کو دیکھ رہے تھے۔ خجری بھی نیم بے ہوشی کی حالت میں یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ سانپ چارپائی کی پانچائی کی طرف سے ہوتا ہوا ڈاکو

عورت کی پنڈلی کے پاس آکر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ دُرگاکا ہدایت کے مطابق میں نے سانپ کو حکم دیا۔ ”مرگ ناگ! جو ہر تم نے رانی بانی کے بدن میں داخل کیا ہے اسے واپس کھینچ لو۔“

سانپ نے اپنا منہ خجری کی پنڈلی پر اس جگہ پر رکھ دیا جہاں اُس نے خجری کو کاٹا تھا۔ مجھے خود اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ سانپ خجری کے جسم میں داخل کیا ہوا زہر چوس رہا تھا۔ سانپ میرا خیال ہے ایک منٹ تک زہر چوستا رہا۔ جب اُس نے اپنا پھن ہٹایا تو خجری نے پوری آنکھیں کھول دیں تھیں۔

میں نے سانپ سے کہا۔ ”مرگ ناگ! اب یہاں سے دفع ہو جا اور آئندہ کبھی اس طرف کا رخ نہ کرنا۔“

سانپ جس طرف سے آیا تھا چارپائی سے اتر کر اسی طرف چلا گیا۔ سانپ کے جانے کے بعد بوڑھا ڈاکو اور دوسرے ڈاکو جلدی سے خجری کے پاس آ گئے۔ ڈاکو عورت کا نیلا رنگ معمول پر آ رہا تھا۔ بوڑھے ڈاکو نے کہا۔ ”رانی بانی! بھگوان نے بڑی کرپاکی ہے۔“

خجری نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہوں میں تشکر کے تاثرات تھے۔ میں نے بھی آگے ہو کر خجری سے پوچھا۔ ”رانی بانی! اب طبیعت کیسی ہے؟“

خجری ڈاکو نے کمزور آواز میں کہا۔ ”اچھی ہے۔“ اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دیکھتے دیکھتے خجری ڈاکو کا چہرہ بالکل نارمل حالت میں واپس آ گیا۔ اس کے منہ کا جھاگ بھی خشک ہو گیا۔ بوڑھے ڈاکو نے کپڑے سے اس کا منہ صاف کیا اور بولا۔ ”بھگوان نے میری پرار تھنا سن لی۔“

خجری نے بوڑھے ڈاکو کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے میری طرف دیکھتے

ہوئے کمزور آواز میں کہا۔ ”شیر وان! تم نے دوسری بار میری جان بچائی ہے۔“
اور اس نے نقاہت کئے باعث آنکھیں بند کر لیں۔ گوپی ڈاکو مجھے باہر لے گیا۔
کہنے لگا۔ ”اس وقت اگر تم یہاں نہ ہوتے تو رانی بائی کا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ اسے بڑے
موذی سانپ نے کاٹا تھا۔“

رات بھر آرام کرنے کے بعد اگلے روز خجری ڈاکو کو بالکل آرام آگیا۔ اُس نے
مجھے اپنی جھوپڑی میں بلایا۔ اس کا خاص باڈی گارڈ گوپی میرے ساتھ تھا۔ خجری
چارپائی پر ایک تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ میں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔
اُس نے کہا۔ ”میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“

میں سٹول پر بیٹھنے لگا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس چارپائی پر بٹھالیا۔
کہنے لگی۔ ”شیر وان! مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ تم کتنی خوبیوں والے آدمی ہو۔ یہ منتر
تم نے کہاں سے سیکھا تھا؟“

میں نے یونہی کہہ دیا کہ سندر بن کے ایک سپیرے نے مجھے بتایا تھا۔ وہ بولی۔ ”تم
نے دوسری بار مجھے موت کے منہ سے نکال کر مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ میں
ساری زندگی اسے نہ بھلا سکوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”میں نے کوئی احسان نہیں کیا رانی بائی! یہ تو میرا انسانی فرض
تھا۔“

اس واقعے کے بعد میں اس ڈاکو عورت کے بہت قریب ہو گیا۔ تیسرے روز
انہوں نے وہاں سے ڈیرہ اٹھایا اور جنگل میں کسی دوسری طرف چل دیئے۔ مجھے بھی
ایک ٹین گن دے دی گئی تھی اور خجری مجھے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ ان
ڈاکوؤں نے راستے میں ایک گاؤں میں ڈاکہ ڈالا۔ گاؤں کے دو بڑے ساہوکاروں کو
قتل کر کے ان کے گھر کا سارا سونا چاندی لوٹا اور آگے چل دیئے۔ میں ان کے ساتھ
تھا مگر میں نے کسی پر گولی نہیں چلائی تھی نہ کوئی مال لوٹا تھا۔ دو دن تک یہ لوگ جنگل

جنگل پھرتے رہے۔ آخر ایک ٹیلے کے دامن میں انہوں نے ڈیرہ ڈال دیا۔
جس دن ڈاکو نے جنگل میں آئے اس رات دُرگا مجھ سے ہم کلام ہوئی۔ میں نے
اس سے کہا۔ ”تم اتنے دن کہاں رہیں دُرگا؟“

کیونکہ اس دوران دُرگا سے میری کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔
”میں ایک خاص کام سے اپنی بدروحوں کی دنیا میں گئی ہوئی تھی۔ وہاں سے سیدھی
تمہارے پاس آ رہی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”میں نے خجری ڈاکو کا اعتماد تو حاصل کر لیا ہے اور اس نے مجھے اپنا
خاص باڈی گارڈ بھی بنا لیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ اب مجھے اس کے جسم میں چار لفظی خفیہ منتر
کس طرح اور کب داخل کرنا ہوگا؟“

دُرگا کہنے لگی۔ ”تم نے دیکھ لیا ہوگا کہ منگل کی شام کو خجری ڈاکو دیوی دیوتاؤں
کی پوجا پٹھ کرتی ہے اور ناریل کا پانی پیتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں! میں نے دیکھا ہے۔“
دُرگا بولی۔ ”پرسوں منگل وار ہے۔ شام کو پوجا پٹھ کرنے کے بعد وہ تمہارے
ہاتھ سے ناریل کا پانی پئے گی کیونکہ اُسے تم سے عقیدت ہو گئی ہے۔ بس یہی موقع ہو
گا جب تم چار لفظی خفیہ منتر اس کے جسم میں داخل کرو گے۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے پوچھا۔
دُرگا کہنے لگی۔ ”وہ ایسے کہ ناریل کا گلاس جب خجری تمہارے ہاتھ سے پینے لگے
گی تو تم اس کی نظر بچا کر منہ ہی منہ میں منتر پڑھ کر ناریل کے پانی میں پھونک مارو
گے۔ بس اس کے بعد جو کچھ کرنا ہو گا وہ یہ چار لفظی منتر خجری کے جسم میں پہنچنے کے
بعد اپنے آپ کر دے گا۔“

میں بے چینی سے منگل کی شام کا انتظار کرنے لگا۔
آخر منگل کی شام بھی آگئی۔ خجری ڈاکو نے اپنی جھوپڑی کے اندر پوجا پٹھ کا

انتظام کیا اور مجھے بھی اپنے پاس بلا لیا۔ کہنے لگی۔ ”شیروان! تم مسلمان ہو۔ میں جانتی ہوں تمہارے دھرم میں یہ چیزیں منع ہیں مگر میں تم سے صرف ایک خواہش کروں گی کہ اس بار تم اپنے ہاتھ سے مجھے ناریل کا پانی پلاؤ۔“

میں جانتا تھا کہ یہ خیال اس کے ذہن میں ڈر گانے والا ہے۔ میں نے کہا۔ ”رانی بائی! اگر تم چاہتی ہو اور یہ تمہاری خواہش ہے تو میں اپنے ہاتھ سے تمہیں ناریل کا پانی پلاؤں گا۔“

خنجری ڈاکو بڑی خوش ہوئی۔ میں نے کہا۔ ”مگر میں تمہاری پوجا پاٹھ کی محفل میں شریک نہیں ہوں گا۔ میں باہر رہوں گا۔ جب تم ناریل کا پانی پینے لگو تو مجھے بلا لینا۔“

یہ کہہ کر میں جھونپڑی سے نکل کر باہر درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اندر پوجا پاٹھ شروع ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد بوڑھے ڈاکو نے باہر آ کر مجھ سے کہا۔ ”بیٹا! رانی بائی نے تمہیں بلایا ہے۔“

میں فوراً اندر چلا گیا۔ خنجری ڈاکو ایک چوکی پر بیٹھی تھی۔ گگے میں پھولوں کی مالا تھی۔ سامنے چوکی پر خدا جانے کیا کیا رکھا ہوا تھا۔ دو ناریل بھی پڑے تھے۔ دیا جل رہا تھا۔ خنجری نے ناریل کے پانی والے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ بوڑھے ڈاکو نے گلاس اٹھا کر مجھے دیا اور کہا۔ ”بیٹا! اب یہ ناریل کا پانی تم رانی بائی کو دے دو۔“

جیسے ہی ناریل کے پانی کا گلاس میرے ہاتھ میں آیا میں نے منہ ہی منہ میں مالینی کا چار لفظی خطرناک خفیہ منتر پڑھ کر آہستہ سے گلاس میں پھونک دیا اور گلاس خنجری کو تھما دیا۔ خنجری ڈاکو نے گلاس منہ سے لگایا اور سارا ناریل کا پانی پی گئی۔

میں بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ خفیہ منتر اس کے جسم میں چلا گیا ہے۔ اب خنجری ڈاکو کے اندر سے پاتالی باہر نکل کر میرے سامنے آن کھڑی ہوگی۔ مگر ایک منٹ، دو منٹ گزر گئے اور کچھ بھی نہ ہوا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے خنجری

ڈاکو پر اس منتر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں سخت مایوس ہوا۔ سب کے سامنے ڈر گانے سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے خنجری سے کہا۔ ”رانی بائی! میں باہر چلتا ہوں۔“ اور میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ چند قدموں کے فاصلے پر ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ میں نے اس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ڈر گا!“

ڈر گانے فوراً جواب دیا۔ ”میں تمہارے پاس ہی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”میں نے منتر پھونک کر اُسے پانی پلا دیا ہے۔“

”میں دیکھ رہی تھی۔“ ڈر گانے جواب دیا۔

”مگر ڈر گا! اس پر تو کوئی اثر نہیں ہوا۔“ میں نے کہا۔ ”نہ ہی پاتالی اس کے اندر

سے باہر نکلی ہے۔“

ڈر گا کہنے لگی۔ ”یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ جو کچھ ہو گا اپنے طریقے سے ہو

گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”پاتالی اس کے اندر سے آزاد ہو کر نکل آئے گی نا؟“

ڈر گا بولی۔ ”تم دیکھتے جاؤ۔ ایک خاص بات کا دھیان رکھنا اگر پاتالی کسی روپ میں

آکر تم سے کوئی بات کرے گی تو میں وہاں پر موجود ہوں گی مگر نہ میں تم سے کوئی بات

کروں گی نہ تم مجھ سے کوئی بات کرنا۔“

”ایسا کیوں؟“ میں نے سوال کیا۔

ڈر گا بولی۔ ”تم سوال بہت کرتے ہو۔ تم ہم بدروحوں کی دنیا کے اصول قانون

نہیں جانتے۔ جیسا میں کہتی ہوں بس تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے آگے کوئی سوال نہ

کیا کرو۔ میں کچھ دیر کے لئے یہاں سے جا رہی ہوں۔“

اور ہوا کا ایک جھونکا مجھے چھو تا ہوا گزر گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ڈر گا چلی گئی ہے۔

کبھی کبھی آتے یا جاتے ہوئے وہ مجھے اپنی نشانی بتا دیا کرتی تھی۔ جب رات ہو گئی تو

ڈاکوؤں کے ڈیرے میں دھیمی روشنیوں والی تین چار لالٹینیں روشن کر دی گئیں۔ یہ

لوگ جنگل میں جہاں جا کر ڈیرہ ڈالتے تھے وہاں ایک چھوٹی سی جھونپڑی خجری ڈاکو کے لئے بنادی جاتی تھی۔ جب سے اس ڈاکو عورت کو مجھ سے عقیدت ہوئی تھی وہ خاص طور پر میرے لئے بھی ایک الگ جھونپڑی بنوادی کرتی تھی۔ اس ڈیرے پر بھی میری چھوٹی سی کنیا بنادی گئی تھی۔ رات کو گوی اور خجری ڈاکو کے ساتھ میں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں نظریں بچا کر خجری ڈاکو کو دیکھتا رہا کہ اس پر منتر کا کوئی اثر ہوا ہے یا نہیں مگر ابھی تک مجھے یہی لگتا تھا کہ کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بالکل ویسی کی ویسی تھی۔ اس کے چہرے پر یا اس کی باتوں میں پاتالی کی کوئی نشانی ظاہر نہیں ہوئی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد میں اپنی کنیا میں آکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ میں چارپائی پر لیٹا پہلو بدل رہا تھا اور یہی سوچ رہا تھا کہ خدا جانے مجھے ان ڈاکوؤں کے ساتھ ابھی کتنے دن اور گزارنے پڑیں گے۔ اتنے میں مجھے کسی کے لباس کی سرسراہٹ سی سنائی دی۔ میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر مجھے کسی کے سانس لینے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ”دُرگا! کیا یہ تم ہو؟“

مجھے پاتالی کی آواز آئی۔ ”نہیں شیروان! میں ہوں۔ پاتالی۔“

میں نے بے تاب ہو کر کہا۔ ”تم کہاں ہو پاتالی! تم میرے سامنے کیوں نہیں آ رہی ہو۔ کیا تم آزاد ہو گئی ہو؟“

پاتالی نے کہا۔ ”نہیں۔ میں ابھی آزاد نہیں ہوں۔ میں ابھی تک اس ڈاکو عورت کے جسم میں ہی قید ہوں۔“

”پھر تم اس کے جسم سے نکل کر یہاں کیسے آ گئی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

پاتالی نے کہا۔ ”یہ میں نہیں ہوں۔ یہ میرا سایہ ہے۔ میرا جسم ابھی تک ڈاکو عورت کے جسم کے اندر ہی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”لیکن میں نے تو مالینی کا منتر خجری کے جسم میں داخل کر دیا تھا کیا اس نے کوئی اثر نہیں کیا؟“

پاتالی نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ ”شیروان! مالینی کے منتر کا اثر آہستہ آہستہ ہو گا۔ میں تمہیں صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ تم یہ سوچ کر اس عورت کو چھوڑ کر نہ چلے جانا کہ مالینی کے منتر نے کوئی اثر نہیں کیا۔ یہ سوچ لینا کہ تم اس ڈاکو عورت کو نہیں بلکہ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے اور اگر تم چلے گئے تو میں کبھی اس عورت کے جسم سے نہیں نکل سکوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ میں اس عورت کے ساتھ ہی رہوں گا۔ لیکن آخر تمہیں آزاد ہونے میں اب کیا رکاوٹ ہے؟“

پاتالی نے کہا۔ ”شیروان! تم کو نتالیا کے آسیب کی طاقت کا کچھ اندازہ نہیں ہے۔ مجھے بھی اندازہ نہیں تھا۔ ایک عام انسان یہ چار لفظی منتر پڑھ کر پھونکے تو اس کا اثر کچھ اور ہوتا ہے لیکن جب ایک آسیبی عورت یہ منتر پڑھ کر پھونکتی ہے تو اس کی طاقت چار گنا بڑھ جاتی ہے۔ نتالیا کے آسیب نے اس منتر کے ذریعے مجھے اس زبردست طریقے سے اس ڈاکو عورت کے جسم میں داخل کر دیا ہوا ہے کہ میں اس کے خون میں شامل ہو گئی ہوں۔ اور ہر لمحے اس کے جسم کے اندر میرا دم گھٹتا ہے۔ تمہارے منتر پھونکنے کے بعد جب ناریل کا پانی اس عورت کے جسم میں داخل ہوا تو مجھے پہلی بار یہ موقع ملا ہے کہ میں سایہ بن کر اس کے جسم سے باہر آ سکتی ہوں۔ اس عورت کے ساتھ رہنا۔ بس اب میں جاتی ہوں۔ میرا جسم جو ڈاکو عورت کے جسم کے اندر ہے مجھے بلارہا ہے۔۔۔۔۔“

مجھے پاتالی کے گہرے سانس لینے کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ دوسرے لمحے دُرگا کی آواز آئی۔ ”تم نے دیکھ لیا ہے کہ تمہارا پھونکا ہوا مالینی کا منتر اپنا کام کر رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن اس طرح تو خدا جانے پاتالی کو آزاد ہوتے کتنی دیر لگ جائے گی۔“

دُرگا کی آواز آئی۔ ”ہاں شیروان! کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ میری مجبوری تھی کہ اس منتر کو کوئی عام انسان ہی ڈاکو خجری کے جسم میں پھونک سکتا تھا اور یہ اس انسان کی مجبوری تھی کہ اس کے پھونکنے سے منتر کی طاقت چار گنا کم ہو گئی تھی۔ اب جو کچھ ہو گا کم رفتار کے ساتھ ہو گا۔ بس ہمیں دھیرج سے کام لینا پڑے گا۔“

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ دھیرج یعنی صبر مجھے کب تک برداشت کرنا پڑے گا۔ میں نے دُرگا سے کہا۔ ”دُرگا! تم اتنی جادوئی طاقت رکھتی ہو اور پاتالی تمہاری جیتی بدروح ہے۔ میں نے مالیکی کا منتر بھی ڈاکو عورت کے جسم میں داخل کر دیا ہے۔ کیا اب تم پاتالی کو باہر نہیں نکال سکتیں؟“

دُرگانے کہا۔ ”میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ یہ کام کسی عام انسان کے ہاتھوں ہی ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ منتر جب کسی پر پھونکا جاتا ہے تو وہ بد نصیب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک نہ ختم ہونے والی قید میں پھنس جاتا ہے کیونکہ نہ کسی عام انسان کو اس منتر کا پتہ ہے اور نہ وہ اس منتر کو پھونکنے کا گر جانتا ہے۔ یہ تو پاتالی کی خوش قسمتی تھی کہ تم ایک عام انسان ہوتے ہوئے بھی ہماری دنیا میں چل پھر رہے ہو اور میں نے یہ کام تمہیں سونپ دیا۔ اب کم از کم یہ یقین تو ہے کہ پاتالی آج نہیں توکل اپنے آپ اس منتر کے اثر سے ڈاکو عورت کے جسم سے آزاد ہو کر ہمارے پاس واپس آجائے گی۔“

دُرگا چلی گئی۔ اس کے بعد میں بھی گہری نیند سو گیا۔

جنگل کے اس نئے ڈیرے میں ہمیں تیسرا دن گزر رہا تھا کہ دوپہر کے بعد اچانک جنگل کے ارد گرد فائرنگ کے دھماکے گونجنے لگے۔ ڈاکوؤں کے ڈیرے میں افراتفری سی مچ گئی۔ خجری ڈاکو فوراً اپنی جھونپڑی سے نکل آئی۔ اُس نے شین گن

پکڑی ہوئی تھی۔ چیخ کر بولی۔ ”گھبراؤ نہیں۔ پولیس کے سپاہی ہیں۔ ہم ان کی لاشیں گرا دیں گے۔“

لیکن یہ صرف پولیس ہی نہیں تھی پولیس کے ساتھ پیرا ملٹری ٹروپس کے تربیت یافتہ فوجی بھی تھے اور انہوں نے پوری سکیم بنا کر مشین گنوں اور دستی بموں سے حملہ کیا تھا۔ جب دستی بموں کے دھماکے بھی سنائی دیئے تو گوپی نے خجری سے کہا۔ ”رانی بائی! پولیس کے ساتھ فوج بھی ہے۔“

خجری ڈاکو نے چلا کر کہا۔ ”گوپی! فوج ہے تو کیا ہوا۔ ہم فوج کا بھی مقابلہ کریں گے۔ اپنے آدمیوں کو چاروں طرف پھیلا دو۔“

اس وقت ڈاکوؤں نے اپنے ڈیرے کے ارد گرد پوزیشنیں سنبھال لیں مگر پولیس اور فوج نے ڈاکوؤں کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا اور مشین گنوں کی فائرنگ اور دستی بموں کے دھماکوں میں سے گھیرا تنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ میں بھی شین گن لے کر پوزیشن سنبھالنے کے لئے ایک طرف کو دوڑا تو دُرگا کی آواز آئی۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟ چاروں طرف گولیاں چل رہی ہیں۔ مارے جاؤ گے۔“

میں نے کہا۔ ”تو پھر میں کیا کروں؟“

دُرگانے کہا۔ ”فوراً پاتالی کی انگوٹھی پہن کر غائب ہو جاؤ اس طرح کم از کم تمہیں گولی نہیں لگے گی۔“

میں نے ایسا ہی کیا۔ جیب سے انگوٹھی نکالی اور پہن لی۔ انگوٹھی پہنتے ہی میں غائب ہو گیا۔ دُرگانے کہا۔ ”خاموشی سے اپنی جھونپڑی کے اندر جا کر بیٹھ جاؤ۔“

میں جھونپڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ جنگل گولیوں اور دستی بموں کے دھماکوں سے گونج رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے باہر جنگ لگی ہوئی ہے۔ میں نے ایک لمحے کے لئے جھونپڑے کے باہر نکل کر دیکھا۔ ڈاکوؤں کے پاؤں اکھڑ چکے تھے اور وہ بھاگ رہے تھے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی فوج اور پولیس گولیوں کا مینہ برساتی وہاں پہنچ گئی۔

ڈاکوؤں کی لاشیں گرنے لگیں۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر کوئی پولیس کا سپاہی یا فوجی مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرے سامنے فوجیوں اور پولیس نے ایک پوزیشن پر حملہ کر کے گولی اور خنجر ڈاکو کو پکڑ لیا۔ گولی نے دونوں ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔ خنجر ڈاکو نے ہاتھ اوپر نہیں اٹھائے تھے۔ مگر اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ فوج اور پولیس کی بھاری نفری اور اس کے جدید اسلحہ کے سامنے ان ڈاکوؤں کو شکست ہو گئی تھی۔

پولیس خنجر ڈاکو اور گولی ڈاکو کو الٹی ہتھکڑیاں لگا کر لے گئی۔ باقی ڈاکوؤں میں سے اکثر مارے گئے تھے اور ان کی لاشیں جگہ جگہ بکھری پڑی تھیں۔ کچھ جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میں نے آہستہ سے ڈرگا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ڈرگا! کیا تم میرے پاس ہی ہو؟“

ڈرگا کی آواز سنائی دی۔ ”میں تمہارے پاس ہی ہوں۔“

”یہ کیا ہو گیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

ڈرگا بولی۔ ”ایسا ہونا نہیں چاہئے تھا۔ مگر ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا۔“

میں نے پوچھا۔ ”یہ لوگ تو خنجر ڈاکو کے ساتھ پاتالی کو بھی پکڑ کر لے گئے ہیں۔ ہمیں پاتالی کو بچانا ہوگا۔“

ڈرگانے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ ہم پاتالی کو بچالیں گے۔ تم اس

جھوپڑی میں بیٹھو میں پتہ کرتی ہوں کہ پولیس خنجر ڈاکو کو کہاں لے گئی ہے۔“

ڈرگا چلی گئی اور میں جھوپڑی کے باہر ایک الٹی ہوئی چارپائی کو سیدھا کر کے اُس

پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ میں کون تھا کیا ہو گیا ہوں؟ کہاں تھا اور کہاں آ گیا ہوں؟ یا

اللہ! میرے گناہ معاف فرمادے!

○

کافی دیر کے بعد مجھے ڈرگا کی آواز سنائی دی۔ ”شیروان! جلدی سے میرے ساتھ چلو۔ صورت حال خراب ہو گئی ہے۔“

”کیا ہوا ہے ڈرگا؟“ میں نے پوچھا۔

ڈرگانے کہا۔ ”باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ پاتالی کی زندگی خطرے میں ہے۔

اگر ہم نے ذرا دیر کر دی تو خنجر ڈاکو کو تو مرنا ہی ہے مگر اس کے ساتھ پاتالی بھی مر

جائے گی۔ انگوٹھی نکال کر پہنو۔“

میں نے فوراً جیب سے انگوٹھی نکال کر پہن لی۔ میں غائب ہو گیا۔ ڈرگانے میرا

ہاتھ پکڑ لیا اور پھر مجھے کسی نے بڑی تیزی سے اٹھا کر اوپر کو اچھال دیا۔ اس کے بعد

مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا کہ میں اور ڈرگا جہاں کھڑے ہیں وہاں

اُرد گرد چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ ان پہاڑیوں کے درمیان درختوں میں گھری ہوئی

ایک عمارت ہے۔

ڈرگانے کہا۔ ”یہ خفیہ پولیس کا ٹارچر سیل ہے۔ خنجر ڈاکو کو گرفتار کر کے یہاں

لایا گیا ہے۔ پولیس اس خونخوار ڈاکو عورت کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔ وہ اس پر مقدمہ

چلانے اور گواہیاں بھگتانے کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتی۔ اسے مار کر لاش جنگل میں

ڈال دی جائے گی اور اعلان کیا جائے گا کہ مدھیہ پردیش کی خونخوار خنجر ڈاکو پولیس

مقابلے میں ہلاک ہو گئی ہے۔ میرے ساتھ آجاؤ۔“

میں اور ڈرگا عمارت کی طرف بڑھے۔ ہم دونوں غیبی حالت میں تھے اور ہمیں

کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ عمارت کے باہر پولیس کا زبردست پہرہ تھا مگر ہم بے فکر ہو کر پولیس کے سپاہیوں کے درمیان سے گزر گئے۔ ڈرگا مجھے عمارت کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں لے گئی۔

کمرے میں ایک سٹریچر پر خجری ڈاکو کو چڑے کے تسموں سے اس طرح باندھا ہوا تھا کہ وہ کوئی حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ تین مسلح سپاہی ایک طرف کھڑے تھے۔ ایک ہندو ایس پی اور ایک ڈی ایس پی سٹریچر کے پاس بیٹھے خجری سے ضروری پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ ایس پی نے پوچھا۔ ”تمہارے گروہ کے کچھ آدمی فرار ہو گئے ہیں۔ اگر تم ہمیں یہ بتا دو کہ وہ کہاں چھپے ہوئے ہوں گے تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے صرف قید میں ڈال دیں گے تمہیں جان سے نہیں ماریں گے۔“

خجری نے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم وہ کہاں گئے ہیں۔“

ڈی ایس پی نے ایس پی کو انگریزی میں کہا۔ ”یہ عورت کچھ نہیں بتائے گی۔ بہتر یہی ہے کہ اس سے جتنی جلدی ہو سکے چھکارا حاصل کر لیا جائے۔ اس بات کا خطرہ ہے کہ اس کے ساتھی کسی وقت شب خون مار کر اسے چھڑا کر لے جائیں گے۔“

ایس پی نے انگریزی میں جواب دیا۔ ”تو تم کس بات کا انتظار کر رہے ہو؟“

”سر! مجھے آپ کے آرڈر چاہئیں۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔

ایس پی بولا۔ ”میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔“

اچانک ڈی ایس پی نے پستول نکالا اور خجری ڈاکو کے دل کا نشانہ لے کر اوپر تلے چار فائر کر دیے۔ خجری ڈاکو کے سینے میں سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ میں حیران تھا کہ ڈرگانے اس پولیس آفیسر کے ہاتھ سے پستول کیوں نہیں چھینا اور اسے خجری ڈاکو کو ہلاک کرنے کا موقع کیوں دیا۔ خجری ڈاکو کا چہرہ سفید پڑنے لگا تھا کیونکہ اس کا جسم چڑے کے تسموں سے سٹریچر کے ساتھ بندھا ہوا تھا اس لئے وہ تڑپ نہیں سکتی تھی۔ اس کے بدن سے بے تحاشا خون نکل رہا تھا۔

میں نے ڈرگا کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے غور سے خجری ڈاکو کے خون میں لتھڑے جسم کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے ڈرگا کے کان میں سرگوشی کی۔ ”ڈرگا! کیا سوچ رہی ہو۔ پاتالی تو اس کے ساتھ ہی مر جائے گی۔“

ڈرگانے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔ ”خاموش رہو۔“

ایس پی نے سپاہیوں سے کہا۔ ”اس کی لاش لے جا کر جنگل میں پھینک دو۔“

سپاہیوں نے فوراً نیم مردہ خجری کو سٹریچر سے اٹھایا اور ٹانگوں اور بازوؤں سے پکڑ کر ڈولی ڈنڈا کر کے باہر لے گئے۔ ڈرگانے مجھے آہستہ سے کہا۔ ”ان کے پیچھے چلو۔“

سپاہیوں نے خجری کے نیم مردہ جسم کو ایک جیب میں ڈالا اور جیب تیزی کے ساتھ ٹارچر سیل کی عمارت سے نکل کر جنگل کی طرف چل پڑی۔ ڈرگا اور میں جیب کے ساتھ ساتھ پرواز کرتے جا رہے تھے۔

یہ سارا علاقہ جنگل کا تھا۔ دو تین میل دور جا کر جیب سڑک سے اتر کر جنگل کے گھنے درختوں کے نیچے ایک جگہ آکر رُک گئی۔ سپاہیوں نے خجری کی لاش کو جیب سے اٹھایا اور جیب تیزی کے ساتھ سڑک واپس چلی گئی۔ ڈرگا لپک کر خجری ڈاکو کی لاش کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اُس نے مجھے کہا۔ ”اس کے قریب آکر بیٹھ جاؤ۔“

میں خجری ڈاکو کی لاش کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ڈرگانے خجری ڈاکو کے سینے پر اس جگہ انگلی رکھ دی جہاں سے ابھی تک خون ابل ابل کر نکل رہا تھا۔ کہنے لگی۔ ”خجری ابھی زندہ ہے۔ میں یہی چاہتی تھی۔“

اُس نے مجھ سے کہا۔ ”انگوٹھی انگلی سے اُتار کر جیب میں رکھ لو۔“

میں نے ایسا ہی کیا۔ انگوٹھی اتارنے کے بعد میں اپنی جسمانی حالت میں نظر آنے لگا۔ ڈرگانے کہا۔ ”اپنا ہاتھ آگے کر دو۔“

میں نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ ڈرگانے اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ کے اوپر رکھ

دیا۔ اس کے ہاتھ پر خنجر کی جسم سے نکلنے والا خون لگا ہوا تھا۔ وہی خون میرے ہاتھ کو بھی لگ گیا۔

دُرگابولی۔ ”میں دو قدم پیچھے ہٹ رہی ہوں۔ اب جو کچھ کرنا ہے تمہیں ہی کرنا ہو گا۔“

میں نے اپنی تسلی کی خاطر پوچھا۔ ”کیا پاتالی اس مردہ جسم کے اندر زندہ ہے؟“
دُرگانے غصے میں کہا۔ ”فالتو بات نہ کرو۔ جو میں کہتی ہوں وہ کرو۔“

میں چپ ہو گیا۔ کیا کرتا۔ یہ میری بھی زندگی، موت کا سوال تھا۔ یہ ایک نکتہ نئی بن گئی تھی۔ پاتالی اگر زندہ رہتی ہے تو روہنی بھی زندہ بچ سکتی تھی۔ اگر روہنی زندہ رہتی ہے تو میں بھی زندہ رہ سکتا تھا اور وہ اس طرح کہ صرف روہنی ہی بقول دُرگا مجھے نتالیا کے منحوس آسب اور پجاری رگھو کے شیطانی جادو سے چھٹکارا دلا سکتی تھی۔

میری ہتھیلی پر خنجر کی ڈاکو کی لاش کا خون لگا ہوا تھا۔ دُرگانے مجھے لاش کے بالکل قریب بٹھایا ہوا تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ کہنے لگی۔ ”اپنی ہتھیلی لاش کے ماتھے کے ساتھ چپکا دو۔“

میں نے خون آلود ہتھیلی خنجر کی لاش کے ماتھے کے ساتھ چپکا دی۔ میں نے محسوس کیا کہ خنجر کی لاش کے ماتھے میں اس کا یا خدا جانے کس کا دل دھڑک رہا تھا۔ مجھے اس کی دھڑکن اپنی ہتھیلی پر محسوس ہو رہی تھی۔

دُرگانے حکم دیا۔ ”ہتھیلی اٹھا لو۔“

میں نے ہتھیلی اُپر اٹھائی۔ دُرگانے حکم دیا۔ ”لاش کے سینے میں گولی نے سوراخ کر دیا ہوا ہے اپنا منہ اس سوراخ کے پاس لے جاؤ۔“

میں اپنا منہ لاش کے سینے پر جو سوراخ تھا اس کے قریب لے گیا۔ گولی نے خنجر کی کاسینہ پھاڑ دیا تھا۔ گولی اس کے دل کے پار ہو گئی تھی۔ سینے میں گولیوں کے اور

سوراخ بھی تھے مگر جو گولی اس کے دل میں لگی تھی اس کا سوراخ چوڑا تھا۔

دُرگانے حکم دیا۔ ”اب مالینی کا بتایا ہوا چار لفظوں والا منتر پڑھ کر پھونکو اور دل میں کہنا کہ یہ منتر میں پاتالی کے لئے پھونک رہا ہوں۔“
مجھے وہ منتر یاد تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ ”یہ منتر میں پاتالی کے لئے پھونک رہا ہوں۔“

دُرگانے مجھ سے یہ اس لئے کہلوا یا تھا کہ اگر میں یہ نہ کہتا تو وہ منتر مجھ سے منسوب ہو جاتا کہ جیسے یہ منتر میں نے اپنے لئے پڑھا ہے اور پھر میں خود غائب ہو کر خدا جانے کس جانور کا روپ دھار لیتا۔ میں نے منتر کو پاتالی سے منسوب کرتے ہوئے اسے پڑھ کر خنجر کی ڈاکو کی لاش کے خون آلود سوراخ پر پھونک دیا۔
دُرگابولی۔ ”دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔“

میں جلدی سے دو قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ رات کا وقت تھا۔ جنگل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خدا جانے چاند کی وہ کون سی تاریخ تھی۔ درختوں کے اوپر چاند نکلا ہوا تھا اور اس کی اداس چاندنی میں خنجر کی ڈاکو کی لاش صاف نظر آرہی تھی۔ اچانک لاش کانپنے لگی۔ پہلے وہ آہستہ آہستہ کانپ رہی تھی پھر وہ زیادہ شدت سے کانپنے لگی۔ دو تین منٹ تک لاش لرزتی رہی پھر خنجر کی لاش کے حلق سے ایک دل کو ہلا دینے والی چیخ بلند ہوئی۔ جنگل اس چیخ کی آواز سے کانپ گیا۔

اس کے بعد لاش ساکت ہو گئی اور لاش کے سینے کے خون آلود شگاف میں سے سفید دھواں نکلتا شروع ہو گیا۔ یہ دھواں اُپر اٹھنے کے بعد ایک انسانی شکل میں بدل گیا۔ اُس وقت دُرگانے کہا۔ ”پاتالی! کیا یہ تم ہو؟“

پاتالی کی آواز سنائی دی۔ ”دُرگامی! یہ میں ہی ہوں۔ پاتالی! تمہاری سیویکا۔“
دُرگانے کہا۔ ”پاتالی! اسی شکل میں واپس آ جاؤ جس شکل میں تم مجھ سے جدا ہو کر شیروان کے ساتھ گئی تھیں۔“

میں ٹٹکی باندھے لاش کے زخم کے شکاف میں سے نکلے ہوئے پاتالی کے سفید لباس کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک دھواں غائب ہو گیا اور دوسرے لمحے پاتالی میرے سامنے کھڑی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس نے دُرگاہ کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور سر جھکا کر کہا۔ ”دُرگامیا! تم شیروان کو اپنے ساتھ نہ لاتیں تو میں زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ میں بھی اس ڈاکو عورت کی لاش کے ساتھ ہی مر چکی ہوتی۔“

دُرگانے کہا۔ ”پاتالی! تمہیں شیروان کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ اگر اسے مالینی کا منتر یاد نہ ہو تا تو یہ ہمت اور جرات سے کام نہ لیتا تو تم زندہ حالت میں ہمارے پاس واپس نہ آتیں۔“

مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی کیونکہ پاتالی اپنے اسی ماڈرن لباس میں تھی جس لباس میں وہ بے پور کے قدیم محل میں سے دُرگاہ کی اجازت لے کر میرے ساتھ چلی تھی یعنی اس نے بش شرٹ کے ساتھ جینز پہنی ہوئی تھی پرس اسی طرح اس کے کندھے سے لٹک رہا تھا۔

پاتالی نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور بولی۔ ”شیروان! میں اپنے دل سے تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ تم نے میرے لئے وہ کام کیا ہے جو سوائے تمہارے اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”اب کسی طرح روہنی، نتالیہ کے آسیب کی قید سے رہا ہو جائے۔ بس مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔“

پاتالی نے کہا۔ ”دُرگامیا! آشیر واد ہمارے ساتھ ہوگی تو ہم روہنی کو بھی آزاد کرالیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔“

دُرگاہ کہنے لگی۔ ”پاتالی! ہمیں یہاں سے اپنے محل میں بے پور چلنا ہوگا۔ وہاں جا کر ہم روہنی کو آسپی قید سے نکالنے کے بارے میں کوئی دوسرا منتر سوچیں گے۔“

پاتالی نے کہا۔ ”جیسے آپ کا حکم دُرگامیا!“

”تو پھر چلو۔ اپنے محل میں چلتے ہیں۔“ دُرگانے یہ کہہ کر مجھے ہدایت کی۔ ”شیروان! پاتالی کی انگوٹھی پہن لو۔“

میں نے جیب سے انگوٹھی نکال کر پہن لی اور میں غائب ہو گیا۔ دُرگاہ پہلے ہی سے غائب تھی۔ صرف پاتالی غائب نہیں تھی۔ دُرگانے اسے کہا۔ ”پاتالی تم بھی غائب ہو جاؤ اور شیروان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا مت بھولنا ورنہ یہ اڑتے ہوئے ادھر ادھر ہو جائے گا۔“

پاتالی نے کوئی منتر پڑھ کر پھونکا اور غائب ہو گئی۔ یہ دونوں بدروہیں غائب ہو جانے کے بعد بھی مجھے دکھائی دے رہی تھیں۔ پاتالی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ جیسے ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑا کسی نے مجھے زمین سے اٹھا کر اوپر فضا میں اچھال دیا اس کے بعد وہی حالت ہوئی یعنی مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ جب ہوش میں آیا تو دیکھا کہ میں، پاتالی اور دُرگاہ بے پور والے قدیم تاریخی محل کے تہہ خانے میں ستونوں کے درمیان تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔

دُرگاہ کہنے لگی۔ ”اب ہمیں پرانے قبرستان والے نتالیا کے تہہ خانے میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اگر ہم وہاں نہیں جائیں گے تو روہنی کو کیسے نکال کر لاسکیں گے کیونکہ اسے نتالیا نے اسی تہہ خانے میں بند کر رکھا ہے۔“

دُرگاہ بولی۔ ”شیروان! تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گے۔ بہتر یہی ہے کہ تم ان میں دخل نہ دو۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تم نے ٹھیک کہا۔ میں خاموش ہوں۔“

پاتالی نے دُرگاہ سے پوچھا۔ ”دُرگامیا! نتالیا کے آسیب کی جان نتالیا کی کھوپڑی میں ہے۔ اب بھی جانتی ہیں کہ نتالیا افریقہ کے ایک آدم خور قبیلے کی خونخوار عورت تھی جس نے کئی بے گناہ انسانوں کا خون کر کے ان کو ہڑپ کیا ہے جس کی سزا وہ ایک

آسیبی بدروح کی شکل میں بھگت رہی ہے۔ جب وہ مر گئی تھی تو اسے جلا دیا گیا تھا لیکن اس کی بدروح آسیب بن کر اس کی کھوپڑی میں بند ہو گئی تھی جہاں ایک برس بند رہنے کے بعد وہ باہر نکل آئی تھی اور آسیبی بدروح کی شکل میں در بدر بھٹکنے لگی تھی۔

دُرگانے کہا۔ ”یہ سارے راز مجھے معلوم ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس کھوپڑی میں نتالیا کے آسیب کی جان ہے۔ اگر کسی طرح اس کھوپڑی کو توڑ دیا جائے تو نتالیا اور اس کا آسیب اپنے آپ مر جائے گا اور ہمیشہ کے لئے نرک کی اگنی میں جا کر بھسم ہو جائے گا۔“

پاتالی نے کہا۔ ”دُرگامیا! یہ کھوپڑی نتالیا نے کہاں رکھی ہوئی ہے؟“
دُرگانے کہا۔ ”پہلے یہ کھوپڑی جنگل میں اس جگہ زمین میں دفن تھی جہاں نتالیا کی لاش کو آگ میں جلایا گیا تھا۔ مگر جب روہنی نے میری ہدایت پر وہاں پہنچ کر نتالیا کی کھوپڑی کو توڑنا چاہا تو نتالیا کے آسیب کو اس کا پتہ چل گیا اور اس نے عین وقت پر پہنچ کر نہ صرف اپنی کھوپڑی کو غائب کر دیا بلکہ روہنی کو بھی پکڑ کر لے گئی۔ اب اس نے اپنی کھوپڑی کہاں چھپا کر رکھی ہوئی ہے؟ اس کا کھوج لگانا پڑے گا۔ یہ میں کھوج لگا لوں گی۔ لیکن ہمیں اس بار بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہو گا۔ اگر ہم اس دفعہ بھی نتالیا کی کھوپڑی کا طلسم توڑنے میں ناکام رہے تو پھر ہم روہنی کو نتالیا کی قید سے اور بے گناہ لوگوں کو نتالیا کے آسیب کی شیطانی مصیبتوں سے کبھی نجات نہیں دلا سکیں گے۔“

پاتالی نے کہا۔ ”دُرگامیا! پہلے یہ پتہ چلنا چاہئے کہ یہ کھوپڑی جس میں نتالیا کی جان ہے اس نے کس جگہ پر چھپائی ہوئی ہے اس کے بعد ہم اس تک پہنچنے اور اسے برباد کرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر لیں گے۔“

دُرگانے کہا۔ ”اس کا کھوج لگانے کے لئے مجھے بدروحوں کی دُنیا میں جا کر بدروحوں کی سردارنی مالینی سے ملاقات کرنی پڑے گی۔ صرف وہی مجھے بتا سکتی ہے کہ

نتالیا کے آسیب نے کھوپڑی کس جگہ چھپائی ہوئی ہے۔ میں اسی وقت بدروحوں کی دُنیا کی طرف روانہ ہو جانا چاہتی ہوں۔ تم دونوں چاہو تو اسی محل میں رہو، چاہو تو بے پور کے کسی ہوٹل میں جا کر رہ سکتے ہو۔ کیونکہ شیروان انسان ہے۔ پاتالی! تم تو ویران کھنڈروں میں رہ سکتی ہو مگر شیروان تمہارے ساتھ وہاں نہیں رہ سکتا۔“

پاتالی نے پوچھا۔ ”دُرگامیا! آپ کو وہاں کتنی دیر لگ سکتی ہے؟“
دُرگانے کہا۔ ”میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ہو سکتا ہے مالینی مجھے وہاں سے کسی دوسری جگہ بھیج دے۔ اس طرح ایک دن بھی لگ سکتا ہے اور ایک ہفتہ بھی لگ سکتا ہے۔“

پاتالی نے کہا۔ ”ٹھیک ہے دُرگامیا! ہم جے پور یا کسی دوسرے شہر میں جا کر ہوٹل میں رہ لیں گے۔“

دُرگابولی۔ ”تم جہاں بھی ہو گے مجھے علم ہو جائے گا اور میں تمہیں آکر وہاں مل لوں گی۔ اب تم شیروان کو لے کر جہاں جانا چاہتی ہو چلی جاؤ مگر شیروان کا خیال رکھنا۔ اسے اپنے سے الگ مت ہونے دینا کیونکہ صرف نتالیا ہی نہیں اس کے پیچھے رگھوپجاری کی بدروح بھی لگی ہوئی ہے۔“

پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”شیروان! تمہارے بازو پر کالے جادوگر نے ہڈی کا جو تعویذ باندھا ہوا ہے اس کی حفاظت کرنا اور کوئی کسی بھی روپ میں آکر تمہارا تعویذ حائل کرنے کی کوشش کرے سمجھ لینا کہ وہ نتالیا کی بھیجی ہوئی بدروح ہے۔ فوراً بلند آواز سے کہنا: دفع ہو جادو روح! دفع ہو جادو روح!....! تم سمجھ گئے ہو ناں؟“

میں نے کہا۔ ”میں سمجھ گیا ہوں دُرگا! میں تمہاری ہدایتوں پر پوری طرح عمل کروں گا۔“

دُرگانے پاتالی سے کہا۔ ”اب تم اسے لے کر چلی جاؤ۔“

دُر گایہ کہہ کر غائب ہو گئی۔ پاتالی نے مجھ سے کہا۔ ”چلو یہاں سے باہر نکلتے ہیں۔ پھر سوچیں گے کہ ہمیں کہاں جا کر ایک ہفتہ گزارنا چاہئے۔“

ہم دونوں غائب تھے چنانچہ ہم بڑی آسانی کے ساتھ ویران محل سے باہر نکل آئے اور محکمہ آثار قدیمہ کے چوکیداروں میں سے کوئی بھی ہمیں نہ دیکھ سکا۔ باہر آئے تو رات ڈھل رہی تھی۔ آسمان پر مشرق کی جانب صبح کا اولین اُجالا جھلکنے لگا تھا۔ اندھیرا چھٹ رہا تھا اور جے پور شہر کی عمارتیں اندھیرے میں سے ابھر رہی تھیں۔

پاتالی نے کہا۔ ”شیروان! تم کہاں جانا چاہتے ہو؟“ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”بھارت کی راجدھانی دلی کے کسی الٹرا ماڈرن ہوٹل میں چل کر ٹھہرتے ہیں۔ میں دو چار دن بڑے اعلیٰ ترین ماحول میں آرام کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔“

پاتالی مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”روپے کی مجھے کوئی پر اہم نہیں ہے۔ چلو دلی کے کسی الٹرا ماڈرن ہوٹل میں ہی چلتے ہیں۔ اپنا ہاتھ مجھے پکڑ دو۔“

میں نے اپنا ہاتھ پاتالی کے ہاتھ میں دے دیا۔ ہم دونوں اسی وقت زمین سے بڑی تیزی کے ساتھ اوپر کی طرف اٹھتے چلے گئے پھر بڑی تیز ہوا کا ایک جھونکا میرے جسم سے ٹکرایا اور پھر مجھے حسب معمول کچھ ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں اور پاتالی زندہ عورت اور مرد کی شکل میں ایک شاندار ماڈرن ہوٹل کی لابی میں کھڑے ہیں۔

پاتالی نے کہا۔ ”جانتے ہو اس ہوٹل میں ایک دن اور رات گزارنے کا کرایہ پانچ ہزار روپے ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم نے روپوں کا انتظام کر لیا ہے نا؟“ وہ ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔ ”اس وقت انڈیا کے سٹیٹ بینک کی ساری دولت میرے سامنے ہے۔ میں جتنی رقم چاہوں وہاں سے لاسکتی ہوں۔ بلکہ ایک اشارے سے وہ رقم

میرے پرس میں آجائے گی۔“

ہم نے ایک ڈبل بیڈ کمرہ میاں بیوی ظاہر کر کے لے لیا۔ میں نے کہا۔ ”میں تو زندہ انسان ہوں مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔ میں سب سے پہلے ناشتہ کروں گا۔“ پاتالی نے کہا۔ ”ناشتہ یہاں صبح سات بجے شروع ہو جاتا ہے۔ اتنی دیر میں تم نہا کر تازہ دم ہو جاؤ اس کے بعد میں بھی نہالوں گی۔“

پہلے میں نے غسل کیا۔ اس کے بعد پاتالی نے غسل کیا۔ ہم جب تیار ہو کر نیچے بریک فاسٹ روم میں آئے تو ناشتہ شروع ہو چکا تھا۔ ہم نے خوب مزے کا ناشتہ کیا اور پھر کافی منگوا کر پینے اور باتیں کرنے لگے۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم دلی کی سیر کو نکل گئے۔ پاتالی نے اپنے لئے بھی ایک نئی جینز اور شرٹ خریدی۔ میرے لئے بھی ایک نئی پتلون اور بش شرٹ خریدی اور پھر ہم ٹیکسی لے کر دوپہر تک شہر کی سیر کرتے رہے۔ ہوٹل میں آکر دوپہر کا کھانا کھایا۔ میں تو سو گیا پاتالی ایک بار پھر شہر کی سیر کو نکل گئی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم ہوٹل کے ڈسکوروم میں آکر بیٹھ گئے۔ لڑکیاں لڑکے تو ڈانس کر رہے تھے۔ رنگ برنگی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ میوزک بج رہا تھا۔ ہمیں تو ڈانس کرنا نہیں تھا۔ میں اور پاتالی ایک میز پر بیٹھے کافی سے دل بہلا رہے تھے۔

اتنے میں دو باڈی بلڈر ٹائپ کے آدمی جنہوں نے جنگ جینز پہن رکھی تھیں ہمارے پاس آکر خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مجھے بڑا عجیب لگا۔ میں نے انہیں کہہ دیا۔ ”آپ کو یہاں بیٹھنے سے پہلے ہماری اجازت لینا چاہئے تھی۔ یہ ٹیبل ہم نے ریزرو کروایا ہوا ہے۔“

ان میں سے ایک آدمی نے بڑے سخت لہجے میں کہا۔ ”ہمیں کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم جہاں چاہیں بیٹھ سکتے ہیں۔“ پھر وہ پاتالی کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا اور بولا۔ ”ڈارلنگ! آؤ ڈانس کرتے

ہیں۔“

پاتالی نے کہا۔ ”میں ڈانس نہیں کیا کرتی۔“
دوسرے باڈی بلڈر نے کہا۔ ”ہم جس کو اپنے ساتھ ڈانس کرنے کے لئے کہتے ہیں وہ انکار نہیں کر سکتی۔“

پاتالی نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ ”مسٹر! میں نے کہہ دیا کہ میں ڈانس نہیں کیا کرتی۔“

یہ دونوں آدمی غنڈے معلوم ہوتے تھے۔ میں چپ ہو گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ پاتالی ان دونوں کو سنبھال لے گی۔ یہ ان دونوں کی بد قسمتی تھی کہ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کس عورت سے الجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

ایک غنڈے نے دوسرے سے کہا۔ ”دارا! یہ تو بڑی آنکھیں دکھا رہی ہے۔“
دوسرے غنڈے نے کہا۔ ”ابھی اس کو ٹھیک کئے دیتا ہوں۔ یہ کیا اس کا باپ بھی میرے ساتھ ڈانس کرے گا۔“

پاتالی بڑے تحمل کا ثبوت دے رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ابھی تک پاتالی کے چہرے پر غیض و غضب کے ذرا سے بھی اثرات نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔ ”دیکھو مسٹر! میں ایک بار پھر آپ لوگوں کو کہتی ہوں کہ ہمیں پریشان نہ کرو۔ نقصان اٹھاؤ گے۔“

جو غنڈہ زیادہ بد معاشی دکھانے کی کوشش کر رہا تھا اس نے کہا۔ ”دیکھتا ہوں کیسے ڈانس نہیں کرو گی۔“ اور اس کے ساتھ ہی اس نے پاتالی کو بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ جیسے ہی پاتالی کو اس نے اپنی طرف کھینچا پاتالی کے سر کے بالوں میں سے ایک سنہری رنگ کا سانپ نکل کر غنڈے کی گردن سے لپٹ گیا اور اس نے اس کی گردن کو دبانا شروع کر دیا۔ غنڈہ دونوں ہاتھوں سے سانپ کو چھڑاتے ہوئے چیخنے چلانے لگا اور نیچے گر پڑا۔ دوسرا غنڈہ ڈر کر بھاگ گیا۔

وہاں شور مچ گیا۔ لڑکے لڑکیاں جمع ہو گئے۔ کیا ہوا کیا ہوا۔ لڑکیاں لڑکے کے خوف زدہ نگاہوں سے غنڈے کے گلے میں سانپ کو لپٹا دیکھ کر ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔

پاتالی نے کہا۔ ”معلوم نہیں کیا ہوا؟ یہ آدمی یہاں آکر بیٹھ گیا تھا کہ نیچے سے ایک سانپ نکل آیا جو اس کی گردن سے لپٹ گیا ہے۔“

غنڈے کے حلق سے غبراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں باہر کو اُبل آئی تھیں۔ ڈر کے مارے کوئی اس کے قریب نہیں جاتا تھا۔ سانپ نے دیکھتے ہی دیکھتے غنڈے کے ماتھے پر ڈس دیا اور اس کی گردن سے اتر کر ایک طرف کو بھاگا۔ لڑکیاں لڑکے چیخنے ہوئے ادھر ادھر ہو گئے مگر میں نے دیکھ لیا تھا کہ سانپ غائب ہو گیا تھا۔

پاتالی نے مجھے کہا۔ ”چلو اُپر چلتے ہیں۔“

ہم اُپر اپنے کمرے میں آ گئے۔ پاتالی اُپر آ کر کہنے لگی۔ ”بعض لوگ اپنے آپ کو دیوتا سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ بڑا بد تمیز تھا۔ میں نے بڑا صبر کیا مگر آخر اسے سبق سکھانا ہی پڑا۔“

میں نے پاتالی سے کہا۔ ”یہ سنہری سانپ تمہارے بالوں میں کہاں سے آ گیا تھا پاتالی؟“

میں نے یونہی پوچھ لیا تھا حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک بد روح ہے وہ بہت کچھ کر سکتی ہے۔ کہنے لگی۔ ”یہ سانپ تو ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔“
”مگر وہ تو اب غائب ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ”غائب ہو کر وہ واپس میرے پاس آ گیا ہے۔“ اور اس نے اپنے بالوں کی لٹ ہٹا کر مجھے دکھائی تو سانپ اس کے بالوں میں موجود تھا۔ مجھے اس سے اور زیادہ خوف محسوس ہونے لگا مگر وہ میرے لئے بے ضرر تھی۔ وہ میری ساتھی تھی اور ہم

ایک دوسرے کے دوست بن چکے تھے۔ ہمیں کمرے میں آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دروازے کی کھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ باہر ایک پولیس انسپٹر، دو سپاہی اور ان کے ساتھ ہوٹل کا منیجر کھڑا تھا۔

پاتالی بھی دروازے میں آگئی۔ ”کیا بات ہے؟“ اُس نے پوچھا۔
انسپٹر پولیس نے کہا۔ ”پولیس کو رپورٹ لکھوائی گئی ہے کہ ڈسکوروم میں جو آدمی سانپ کے ڈسنے سے مر گیا ہے وہ سانپ تم نے نکال کر اُس پر پھینکا تھا۔“
پاتالی نے کہا۔ ”اندر آجائیں۔“

سپاہی، منیجر اور پولیس انسپٹر کمرے میں آگئے۔ پاتالی نے انہیں بٹھایا اور کہا۔ ”یہ رپورٹ کس نے لکھوائی ہے؟“

پولیس انسپٹر نے کہا۔ ”اس آدمی نے لکھوائی ہے جس نے اپنی آنکھوں سے تمہیں اپنے سر سے سانپ نکال کر اس شخص پر پھینکتے دیکھا ہے۔“

پاتالی نے کہا۔ ”انسپٹر صاحب! یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میں کوئی جادوگر فی نہیں ہوں کہ میرے بالوں میں سانپ لپٹا ہوا ہے۔“

پولیس انسپٹر نے کہا۔ ”شری می جی! تین اور آدمیوں نے آپ کے خلاف گواہی دی ہے۔ آپ کو ہمارے ساتھ پولیس سٹیشن چلنا ہوگا۔“

پاتالی نے کہا۔ ”مجھے پولیس سٹیشن جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ تشریف لے جائیں۔“

پولیس انسپٹر کو غصہ آگیا۔ اُس نے کہا۔ ”ایسی بات ہے تو ہم آپ کو گرفتار کر کے لے جائیں گے۔“

پاتالی مسکرائی۔ کہنے لگی۔ ”انسپٹر صاحب! ابھی تک اس دنیا میں ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا جو مجھے گرفتار کر کے تھانے لے جائے۔“

میں یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں بھی کوئی ڈرامہ ضرور ہو

گا۔ آخر وہی ہوا۔ پولیس انسپٹر نے کہا۔ ”تو پھر میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں۔“

اُس نے ایک سپاہی کو حکم دیا۔ ”گنگارام! شری می جی کو جھکڑی لگا دو۔“
میں پاتالی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پاتالی بڑے سکون کے ساتھ صوفے پر بیٹھی اس سپاہی کو دیکھ رہی تھی جس کو اسے جھکڑی لگانے کے لئے کہا گیا تھا۔ سپاہی اپنی پیٹی کو ادھر ادھر ٹٹولنے لگا۔

پولیس انسپٹر نے پوچھا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

سپاہی نے کہا۔ ”سر! جھکڑی نہیں مل رہی۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ پولیس انسپٹر نے کہا۔ ”تم لے کر نہیں آئے تھے؟“

”سر لے کر آیا تھا مگر اب نہیں مل رہی۔“ سپاہی نے کہا۔

انسپٹر نے دوسرے سپاہی کو حکم دیا کہ شری می جی کو جھکڑی لگا دو۔ دوسرے سپاہی نے بھی اپنی بیٹ کو دیکھا تو اس کی جھکڑی بھی غائب تھی۔ پولیس انسپٹر نے غصے میں کہا۔ ”تمہاری جھکڑی کہاں چلی گئی ہے؟“

دوسرا سپاہی بولا۔ ”سر! میں نے خود جھکڑی بیٹ کے ساتھ باندھی تھی۔ پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہے۔“

انسپٹر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پاتالی سے کہا۔ ”آپ خاموشی سے ہمارے ساتھ پولیس سٹیشن چلے چلیں۔ ورنہ ہمیں آپ کو اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔“

پاتالی نے کہا۔ ”اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ جہاں آپ کے سپاہیوں کی جھکڑیاں غائب ہوئی ہیں وہاں آپ بھی غائب ہو جائیں تو بے شک مجھے اٹھا کر لے چلیں۔“

پولیس انسپٹر سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ پاتالی کیا کہہ رہی ہے۔ اس کی ہوٹل کے منیجر کے سامنے سبکی ہو جائے یہ بھلا وہ کیسے گوارا کر سکتا تھا اور وہ بھی ایک عورت اس کی بے عزتی کر دے۔

انسپٹر نے آگے بڑھ کر پاتالی کا بازو پکڑنا چاہا تو اس نے انسپٹر کے بازو کو پیچھے

جھٹک دیا۔ جیسے ہی اس نے انپکٹر کا بازو جھٹکا انپکٹر غائب ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ہوٹل مینجر اور دونوں سپاہی پتھر کے بت سے بن کر رہ گئے۔ اُن کی آنکھوں میں دہشت ہی دہشت تھی۔ پاتالی غضب ناک ہو چکی تھی۔ اس نے دونوں سپاہیوں کو بھی ہاتھ کے اشارے سے غائب کر دیا۔ اب وہاں صرف مینجر رہ گیا تھا۔

وہ پاتالی کے قدموں میں گر پڑا اور گڑ گڑا کر بولا۔ ”دیوی! مجھے شاکر دو۔ میں نہیں آنا چاہتا تھا تھانیدار مجھے زبردستی ساتھ لے آیا تھا۔“

پاتالی نے کہا۔ ”اُٹھو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔“

مینجر بے چارہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اُس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ پاتالی نے کہا۔ ”جاؤ۔“

مینجر کا پتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

O

پاتالی نے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ”یہ پولیس والے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں؟ میں ان کی خصلت کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ کمزور کو دیکھ کر اس پر ظلم کرنے لگتے ہیں۔ اب یہ انپکٹر کبھی کسی کمزور پر ظلم نہیں کر سکے گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”یہ سپاہی اور انپکٹر غائب ہو کر کہاں گئے ہیں؟“

پاتالی نے کہا۔ ”یہاں سے سینکڑوں میل دور اس وقت راجستھان کے صحراؤں میں بھٹکتے پھر رہے ہوں گے۔“ پھر کہنے لگی۔ ”اب میرا یہاں سے دل بیزار ہو گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میرا بھی یہاں رہنے کو دل نہیں چاہتا۔ میرا خیال ہے ہمیں کسی دوسرے ہوٹل میں چلے جانا چاہئے۔“

ہم اسی وقت ہوٹل چھوڑ کر باہر آ گئے۔ مینجر وغیرہ کی جرات نہ ہوئی کہ ہم سے پوچھتا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں کیوں جا رہے ہیں۔ ہم نے ٹیکسی لی اور ایک دوسرے بڑے ہوٹل میں آ گئے۔

اس ہوٹل میں ہم نے ابھی ایک دن ہی گزارا تھا کہ سورج غروب ہونے کے بعد دُرگاکا بدروح ظاہر ہو گئی۔ ہم اس وقت ہوٹل کے سوئمنگ پول کے پاس ایک طرف آرام کر سیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ دُرگاکا بدروح کو دیکھتے ہی پاتالی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ”دُرگامیا!“

دُرگانے کہا۔ ”میں جس چیز کا سراغ لگانے گئی تھی اس کا سراغ لگ لیا ہے۔“

پھر وہ بھی ہمارے پاس آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔ ”مجھے بدروحوں کی سردارنی مالینی نے وہ جگہ بتادی ہے جہاں نتالیا نے اپنی کھوپڑی چھپائی ہوئی ہے۔ اب ہمیں وہاں جانا ہوگا۔“

پاتالی نے پوچھا۔ ”وہ جگہ کون سی ہے دُرگامیا؟“

دُرگامیا نے کہنے لگی۔ ”یہاں سے جنوب کی طرف لنکا کا ملک ہے۔ لنکا کے ملک میں کرونا پلی کا گھنا جنگل ہے۔ اس جنگل میں ایک بودھ مندر ہے جہاں بھکشو لوگ دن رات تپسیا کرتے ہیں۔ اس بودھ مندر کے پاس ایک نیلہ ہے۔ اس نیلے میں ایک غار ہے۔ اس غار میں تین اندھیری کوٹھڑیاں ہیں۔ تیسری کوٹھڑی میں ایک لوہے کا صندوق پڑا ہے۔ نتالیا کی کھوپڑی اس صندوق کے اندر ہے۔“

پاتالی نے پوچھا۔ ”دُرگامیا! وہاں کون کون سی بدروحیں پہرہ دیتی ہیں؟“

دُرگامیا نے کہا۔ ”وہاں تین بدروحیں ہر وقت پہرے پر موجود رہتی ہیں۔ وہ غار کے دہانے پر بیٹھی رہتی ہیں۔ یہ نتالیا کی سب سے خطرناک بدروحیں ہیں۔ ان پر قابو پانا ہمارے بس میں نہیں ہے۔“

”تو پھر ہم کیسے غار میں داخل ہوں گے؟“ پاتالی نے پوچھا۔

دُرگامیا نے جواب میں کہا۔ ”ان بدروحوں کا توڑ میں مالینی سے لے آئی ہوں۔“

”وہ کیا ہے دُرگامیا!“ پاتالی نے سوال کیا۔

دُرگامیا نے کہا۔ ”وہ میں تمہیں اس وقت بتاؤں گی جب ہم غار کے قریب جنگل میں پہنچ جائیں گے۔“

پاتالی کہنے لگی۔ ”ہمیں اسی وقت ملک لنکا کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے۔“

دُرگامیا نے کہا۔ ”نہیں۔ ہم شام کے وقت چلے تو رات کو وہاں پہنچیں گے۔ ہم کل صبح کے وقت یہاں سے نکلیں گے۔ میں صبح آؤں گی تم تیار رہنا۔“

اس کے بعد دُرگامیا چلی گئی۔

دوسرے دن صبح کے وقت وہ ہمارے کمرے میں پہنچ گئی۔ کہنے لگی۔ ”کیا تم لوگ تیار ہو؟“

پاتالی نے کہا۔ ”میں تیار ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”میں بھی تیار ہوں۔“

دُرگامیا نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم انگوٹھی نکال کر پہن لو۔“

میں اسی وقت ہوٹل بوائے ناشتے کے بل پر میرے دستخط کروانے کے لئے کمرے میں آ گیا۔ دُرگامیا بدروح کو وہ نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ وہ غائب تھی۔ میں اور پاتالی ابھی غائب نہیں ہوئے تھے۔ پاتالی نے بل پر دستخط کرنے کی بجائے پرس میں سے ایک ہزار روپے کا نوٹ نکال کر بل کے ساتھ رکھ دیا اور ہوٹل بوائے سے کہا۔ ”ہم جا رہے ہیں۔ یہ کل کے ناشتے، رات کے کھانے اور دوپہر کے کھانے اور آج صبح کے ناشتے کا بل ہے۔“

ہوٹل بوائے نے کہا۔ ”میں ابھی باقی پیسے لے کر آتا ہوں۔“

پاتالی نے کہا۔ ”باقی کے پیسے تم رکھ لینا۔ یہ تمہاری ٹپ ہے۔“

ہوٹل بوائے حیران سا ہو کر رہ گیا کیونکہ اسے کافی ٹپ مل رہی تھی۔ وہ آرام آرام سے ناشتے کے برتن اٹھا اٹھا کر ٹرے میں رکھنے لگا۔

دُرگامیا نے کہا۔ ”پاتالی اور شیروان! دیر نہ کرو نکل چلو۔“

اس کی آواز ہوٹل بوائے نہیں سن سکتا تھا۔ پاتالی نے مجھ سے کہا۔ ”انگوٹھی پہن لو۔“

میں نے انگوٹھی نکال کر پہن لی اور ایک دم غائب ہو گیا۔ ہوٹل بوائے کی ہماری طرف پیٹھ تھی اس کے ساتھ پاتالی بھی غائب ہو گئی۔ اسی لمحے ہوٹل بوائے نے پیچھے مڑ کر کہا۔ ”بیگم صاحبہ.....“

وہ کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ ہم دونوں میں سے کمرے میں کوئی

نہیں ہے تو وہ صرف حیران ہی نہیں دہشت زدہ بھی ہو گیا تھا۔ ہم کمرے سے نکل گئے۔

میں دُرگا کو بھی دیکھ رہا تھا اور پاتالی کو بھی غیبی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے غیبی حالت میں دیکھ رہی تھی۔ دُرگا ہمیں ہوٹل کی چھت پر لے آئی۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ دُرگانے کہا۔ ”تم دونوں میرے پیچھے پیچھے پرواز کرو گے۔“

اور دُرگا فضا میں بلند ہو گئی۔ اس کے بعد پاتالی فضا میں بلند ہوئی اور اس کے پیچھے میں بھی فضا میں اوپر کو اٹھ گیا۔ پاتالی نے میرا ہاتھ نہیں پکڑ رکھا تھا۔ اس نے کہا۔ ”اب تم میرے ساتھ میرا ہاتھ پکڑے بغیر بھی اڑ سکو گے۔“

ہماری رفتار اتنی نہیں تھی جتنی روہنی کی پرواز کرتے وقت ہو کرتی تھی۔ اس کے باوجود ہم کافی تیز رفتاری سے پرواز کر رہے تھے۔ ہمارا رخ ہندوستان کے جنوب کی طرف تھا۔ سری لنکا کا ملک ہندوستان کے جنوب میں واقع ہے۔ ہم آہستہ آہستہ فضا میں کافی بلندی پر آ کر پرواز کر رہے تھے۔ نیچے سے ہندوستان کے شہر، دریا، پہاڑ اور جنگل آتے اور گزر جاتے تھے۔ ہندوستان کی ٹکون کے قریب پہنچے تو بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ہندوستان کے جنوب میں بڑی بارشیں ہوتی ہیں اور اکثر بادل چھائے رہتے ہیں۔ ایک جگہ ہم بادلوں کے ذرا نیچے ہو کر جا رہے تھے کہ ہم پر بارش کی بوندیں پڑنے لگیں۔

پاتالی نے کہا۔ ”بارش ہو رہی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں بھی بھیگ رہا ہوں۔“

پاتالی نے کہا۔ ”دُرگامیا! ہم بادلوں کے اوپر جا رہے ہیں۔“ اور ہم غوطے لگا کر آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھتے چلے گئے اور پھر بادلوں کے اوپر آ گئے۔ بادلوں کے اندر سے گزرتے ہوئے مجھے دھچکے بھی لگے اور بادلوں کے اوپر دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ اسی طرح ہم بھارت کی جنوبی ٹکون کو عبور کر گئے۔ سری لنکا اور انڈیا کے درمیان سمندر

ہے جس کی لمبائی تقریباً پچیس تیس میل ہوگی۔ جب ہندوستان اور لنکا انگریزوں کے قبضے میں تھا تو مسافر در اس سے ہندوستان کی ٹکون کے آخری ساحلی شہر دھنش کوڑی تک ٹرین میں سفر کرتے تھے۔ دھنش کوڑی سے وہ ایک چھوٹے سمندری جہاز میں سوار ہو کر لنکا کے شمالی ساحل کی چھوٹی سی بندرگاہ ٹالی منار پہنچتے تھے۔ وہاں ایک ٹرین کو لمبو جانے کے لئے تیار ہوتی تھی۔ مسافر اس ٹرین میں بیٹھ جاتے تھے اور وہ ٹرین ایک رات اور تقریباً ایک دن کے سفر کے بعد کو لمبو پہنچ جاتی تھی۔

مگر ہمیں نہ تو ٹرین میں بیٹھنے کی ضرورت تھی اور نہ سمندری جہاز میں سوار ہونے کی مجبوری تھی۔ ہم تو بونگ جہاز کی طرح ہوائیں پرواز کر رہے تھے اور ہماری رفتار بونگ جہاز سے دو گنا زیادہ تھی چنانچہ ہم دوپہر ہونے سے پہلے پہلے سری لنکا کے ملک کی سرحد عبور کر گئے۔

پاتالی نے دُرگا سے پوچھا۔ ”دُرگامیا! کرونا پلی کا جنگل کس طرف کو ہے؟“

دُرگانے جواب دیا۔ ”میں اسی طرف جا رہی ہوں۔“

کرونا پلی کا جنگل سری لنکا کے مشرقی ساحل پر واقع تھا۔ سری لنکا کا ملک ایک بہت بڑا جزیرہ ہے اور اس کے چاروں طرف سمندر ہے۔ یہ گرم مرطوب ملک ہے اور یہاں بارشیں بہت ہوتی ہیں جس کی وجہ سے یہ ملک گھنے جنگلوں سے بھرا ہوا ہے۔ سری لنکا کا مذہب بدھ مت ہے اور اس ملک میں بدھ مت کے بہت عالیشان مندر ہیں۔ ان کو مندر نہیں کہا جاتا بلکہ گیوڈا کہا جاتا ہے۔ بدھ مت کے پجاریوں کو بھی پجاری نہیں بلکہ بھکشو کہا جاتا ہے۔

جس وقت ہم سری لنکا کے ملک کی فضا میں داخل ہوئے تو آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ چونکہ بارش نہیں ہو رہی تھی اس لئے ہم بادلوں کے اوپر پرواز کرنے کی بجائے بادلوں کے نیچے زمین سے کافی بلندی پر اڑ رہے تھے۔ مجھے نیچے ناریلوں کے جھنڈوں کے جھنڈ دکھائی دے رہے تھے۔ ان جنوبی علاقوں میں ناریل کا درخت بہت

پایا جاتا ہے۔ ہمارے نیچے سے جنگل ہی جنگل گزر رہے تھے۔ اتنے گھنے جنگل میں نے ہندوستان میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ سیاہ بادلوں نے ان پر سایہ ڈال کر اندھیرا سا کر رکھا تھا۔

ہمارے آگے آگے دُرگا بدروح پرواز کر رہی تھی۔ اس کے پیچھے میں اور پاتالی اُڑ رہے تھے۔ کافی دیر تک جنگلوں کے اوپر پرواز کرنے کے بعد دُرگا ایک جگہ بیٹھنے کے بعد نیچے آنا شروع ہو گئی۔ ہم بھی اس کے ساتھ ہی نیچے آنے لگے۔ ہم اتنا نیچے آ گئے کہ مجھے درختوں کے اوپر والی شاخیں صاف نظر آرہی تھیں۔ کچھ دور تک ہم اسی طرح درختوں سے ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے چلے گئے۔ دُرگا اور نیچے آ گئی۔ ایک جگہ اُس نے جنگل کے اوپر گول دائرے میں چکر لگایا اور فضا میں ساکت کھڑی ہو گئی جس طرح کہ ہیلی کاپٹر ہوا میں معلق ہو جاتا ہے۔ ہم بھی اسی طرح اس کے ساتھ فضا میں کھڑے ہو گئے۔

دُرگانے نیچے اشارہ کرتے ہوئے پاتالی سے کہا۔ ”اس وقت ہم کرونا پلی کے جنگل کے عین اوپر ہیں۔ یہاں سے کرونا پلی کا جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک دریا بہتا ہے۔ ہم دریا کے دوسرے کنارے پر اتر جائیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ مشرق کی جانب اُڑنے لگی۔ درخت ہمارے نیچے سے تیزی کے ساتھ پیچھے کو جا رہے تھے۔ پھر نیچے ایک دریا دکھائی دینے لگا۔ دریا کی چوڑائی زیادہ نہیں تھی مگر صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کے پانی کی رفتار کافی تیز ہے۔ دریا میں کئی چٹانیں بھی تھیں جن کے ساتھ دریا کی موجیں ٹکرا کر تیزی سے آگے نکل رہی تھیں۔

دُرگا دریا کے دوسرے کنارے پر درختوں کے درمیان اُتر گئی۔ ہم بھی اس کے ساتھ ہی اُتر گئے۔ بڑا گھنا جنگل تھا۔ چاروں طرف درخت ہی درخت تھے۔ سیاہ بادلوں کی وجہ سے وہاں اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ دُرگا ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ایک

طرف دیکھ کر بولی۔ ”بودھ بھکشوؤں کا منہ اس طرف ہے۔ چلو اس طرف چلتے ہیں۔“

ہم دُرگا کے پیچھے چلنے لگے۔ ہم غائب تھے مگر اس طرح چل رہے تھے جس طرح عام انسان چلا کرتے ہیں لیکن وزن کم ہو جانے کی وجہ سے میرے پاؤں جیسے اپنے آپ اُٹھ رہے تھے اور زمین پر اچھی طرح ٹکتے نہیں تھے۔ یہ بھی عجیب قسم کا تجربہ تھا۔ اس طرح آدمی خواب میں چلا کرتا ہے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا اور آدمی چل رہا ہوتا ہے۔

راتے میں ایک چھوٹا سا پہاڑی نالہ آیا۔ ہم اس کے اوپر سے گزر گئے۔ اس کے بعد درختوں کے جھنڈ آ گئے۔

ان کے آگے زمین سے باہر نکلی ہوئی تین چار چٹانیں تھیں جن پر بارش نے سبز رنگارنگ دیا ہوا تھا۔ یہ چٹانیں جنگل میں ایسے بھوتوں کی مانند کھڑی تھیں جو کسی طلسم کے اثر سے پتھر بن گئے ہوں۔ دُرگا ہمیں لے کر ان چٹانوں میں سے بھی گزر گئی۔ اس کے آگے مجھے ناریل اور کیلے کے درختوں کے جھنڈ میں ذرا اونچائی پر ایک بودھی مٹھ کا کس دکھائی دیا۔ دُرگانے پاتالی کو وہ کس دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہے وہ بودھی مٹھ جس کے پیچھے وہ ٹیلہ ہے جس کے غار میں نتالیا نے اپنی کھوپڑی چھپائی ہوئی ہے۔“

ہم مٹھ کے پہلو سے ہو کر گزر گئے۔ مٹھ پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مٹھ کے پیچھے کچھ فاصلے پر ایک ٹیلہ نظر آیا جو جنگلی جھاڑیوں اور درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دُرگا وہیں رُک گئی۔ کہنے لگی۔ ”پاتالی! یہاں سے آگے نتالیا کی ان بدروحوں کی سرحد شروع ہو جاتی ہے جو اس کی کھوپڑی کی حفاظت کر رہی ہیں۔“

یہ کہہ کر دُرگا ہمیں اور پیچھے اس جگہ لے آئی جہاں مٹھ میں تپسیا کرنے والے بودھ بھکشوؤں نے ایک جھونپڑی بنا رکھی تھی۔ جھونپڑی کے پیچھے گھنا جنگل تھا جہاں

ایک چھوٹا سا پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ اس نالے کے کنارے ایک جگہ سیاہ چٹان نالے کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ دُرگامیاں اس چٹان کے پاس لے آئی۔ چٹان کے نیچے ایک قدرتی شکاف بنا ہوا تھا۔ یہ چھوٹے سے غار کی طرح تھا۔

دُرگانے کہا۔ ”یہاں بیٹھ جاتے ہیں۔“

ہم چٹان کے نیچے دس بارہ فٹ اندر کو بنے ہوئے شکاف میں بیٹھ گئے۔

پاتالی کہنے لگی۔ ”دُرگامیا! کیا آپ بتائیں گی کہ آپ مالینی سے ان بدروحوں کے ظلم کو توڑنے کے لئے کون سا منتر لائی ہیں؟“

دُرگانے ایک منٹ تک کوئی جواب نہ دیا۔ پھر بولی۔ ”پاتالی! اب جو کچھ کرنا ہے تمہیں ہی کرنا ہے۔ یہ کس قدر خطرناک ہے اور تمہیں کس قدر احتیاط سے یہ کام کرنا ہو گا اس کا تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا۔“

پاتالی نے کہا۔ ”دُرگامیا! میں آپ کی ہدایت کے مطابق کام کروں گی۔ اگر اس میں میری جان بھی چلی جائے تو پرواہ نہیں کروں گی۔“

آپ ضرور یہ سوچ رہے ہوں گے کہ بدروحیں تو پہلے ہی مر چکی ہوتی ہیں۔ یعنی مرے ہوئے کافروں کی بدروحیں ہوتی ہیں پھر یہ دوبارہ کیسے مر سکتی ہیں۔ یہ فلسفہ مجھے ایک بار روہنی نے سمجھایا تھا۔ ان بت پرست ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اگر اپنے برے کرموں کی وجہ سے کوئی بت پرست عورت یا مرد مرنے کے بعد بدروح بن جاتا ہے تو وہ آدھا زندہ ہوتا ہے۔ اگر کسی طاقتور بدروح کے حملے سے کمزور بدروح آگ میں جل کر راکھ ہو جاتی ہے تو اس بدروح کی راکھ ایک ہزار سال تک جنگلوں، میدانوں، دریاؤں اور سمندروں میں جہاں جہاں اس کے ذرے جاتے ہیں بھگتی رہتی ہے۔ ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد وہی راکھ ایک بار پھر اکٹھی ہو کر بدروح کی شکل میں جنم لیتی ہے اور دوبارہ بھگنے لگتی ہے۔

عجیب مضحکہ خیز اور خرافات کا فلسفہ ہے۔ مگر بتوں کو پوجنے والے کافر اس فلسفے

پر یقین رکھتے ہیں۔

پاتالی کاجرات آموز بیان سن کر دُرگامیاں بدروح نے اسے کہا۔ ”پاتالی! تمہارے مرنے سے کچھ نہیں ہو گا! انا ہمیں نقصان پہنچے گا۔ تمہیں مرنا نہیں ہو گا تمہیں بدروح کی حالت میں غار میں داخل ہو کر اپنی تمام شیطانی عقل اور شیطانی طاقت سے کام لے کر غار کے اندر تیسری کو ٹھڑی میں داخل ہو کر نتالیا کے آسیب کی کھوپڑی کے دو ٹکڑے کرنے ہوں گے اور کھوپڑی کے دونوں ٹکڑے لے کر تم یہاں میرے پاس آؤ گی۔ یہ میرا تمہیں حکم ہے۔“

پاتالی نے کہا۔ ”دُرگامیا! میں مردوں کی نہیں۔ اگر مرنا ہی پڑ گیا تو مجھ پر وشواش رکھو۔ میں نتالیا کی کھوپڑی کے دو ٹکڑے کر کے دونوں ٹکڑے آپ کو دے کر مردوں کی۔“

دُرگانے کہا۔ ”شاباش! میں یہی چاہتی ہوں۔ اب جو منتر میں تمہیں بتانے والی ہوں اس کو غور سے سنو۔ میرے سامنے آکر بیٹھ جاؤ۔“

پاتالی دُرگا کے سامنے بیٹھ گئی۔ دُرگانے اس کے ماتھے پر اپنی انگلیاں رکھ دیں اور کہا۔ ”میں جو منتر اپنے دل میں پڑھوں گی تم اسے اپنے دل میں دہراتی جانا۔“

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں دُرگامیاں بدروح کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں کوئی خاص منتر پڑھ رہی تھی جو پاتالی کے دماغ میں دُرگا کی انگلیوں کے ذریعے منتقل ہو رہا تھا۔

دُرگانے انگلیاں پیچھے ہٹالیں اور پاتالی سے پوچھا۔ ”کیا تم نے منتر کو سن لیا ہے؟“

پاتالی نے کہا۔ ”سن لیا ہے دُرگامیا!“

”اسے اچھی طرح سے یاد کر لو۔“ دُرگانے کہا۔

پاتالی نے کہا۔ ”دُرگامیا! مجھے منتر پورا یاد ہو گیا ہے۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں

گی۔“

دُرگاہ بدروح کہنے لگی۔ ”آج آدھی رات کے وقت تم یہاں سے نکل کر ٹیلے کی طرف جاؤ گی اور اس منتر کو پڑھ کر دائیں بائیں اور آگے پھونکتی جاؤ گی۔ اس منتر کا یہ اثر ہو گا کہ بدروحیں نہ تمہیں دیکھ سکیں گی، نہ تمہارے سانس کی آواز سن سکیں گی اور نہ تمہارے جسم سے نکلنے والی بدبو سونگھ سکیں گی۔ یہ بدروحوں کی مہارانی کا خاص منتر ہے جو مالینی نے مجھے خاص طور پر دیا ہے۔ اس طرح تم غار میں داخل ہو جاؤ گی۔ غار کے اندر تم تیسری کو ٹھڑی کے پاس جا کر اس کے دروازے کے دائیں بائیں یہی منتر پڑھ کر پھونکو گی۔ پھر تم کو ٹھڑی میں داخل ہو جاؤ گی۔ کو ٹھڑی کے اندر کونے میں وہ صندوق پڑا ہے جس میں نتالیا کی کھوپڑی بند ہے۔ تم صندوق پر بھی یہی منتر پڑھ کر پھونکو گی اور بند صندوق میں ہاتھ ڈال کر اندر سے نتالیا کی کھوپڑی نکال لو گی۔۔۔۔۔ یہ بڑا نازک لمحہ ہو گا۔ اگر تم سے ذرا سی بھی غلطی ہو گئی، اگر تم ذرا سی بھی لڑکھڑا گئیں تو یاد رکھو تمہیں تو جل کر راکھ ہونا ہی ہو گا لیکن اس کے ساتھ ہم نتالیا کے آسیب کی قید سے روہنی کو کبھی نہ چھڑا سکیں گے۔“

پاتالی نے کہا۔ ”دُرگامیا! آپ بے فکر رہیں۔ میں نہ لڑکھڑاؤں گی اور نہ کوئی غلطی کروں گی۔“

دُرگاہ کہنے لگی۔ ”تمہیں کھوپڑی کو صندوق میں سے نکالنے کے بعد ایک لمحے کا انتظار کئے بغیر فوراً اس کو دو ٹکڑے کر دینا ہو گا۔ کھوپڑی کے ٹوٹتے ہی تمہیں آسیبی بدروحوں کی ڈراؤنی آوازیں سنائی دیں گی۔ ہر طرف چیخ و پکار مچ جائے گی۔ ڈراؤنی شکل والی بدروحیں تم پر حملہ کر دیں گی مگر تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ تم مالینی کا منتر پڑھ کر پھونکتی جاؤ گی اور کھوپڑی کے ٹکڑے لے کر غار سے باہر آ جاؤ گی اور سیدھی یہاں ہمارے پاس پہنچو گی۔ یہاں آ جانے کے بعد سب چیخ و پکار اور ڈراؤنی آوازیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گی۔“

پاتالی بڑے غور سے دُرگاہ بدروح کی باتیں سن رہی تھی۔ جب دُرگانے اپنی بات ختم کی تو وہ کہنے لگی۔ ”ایسا ہی ہو گا دُرگامیا۔“

میں دل میں سوچ رہا تھا کہ کاش ایسا ہی ہو اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر کیا ہو گا۔ روہنی کو نتالیا کے آسیب سے تو پھر کوئی نہیں چھڑا سکے گا اور اگر وہ آزاد نہ ہوئی تو میں نتالیا کے آسیب کی زد میں ہی رہوں گا۔ وہ مجھے اکیلا پا کر کسی بھی وقت مکاری سے میرا تعویذ حاصل کر کے مجھے اٹھا کر لے جاسکے گی اور اس بار میں اس کی قید میں چلا گیا تو پھر سوائے خدا کی ذات کے مجھے کوئی اس کی قید سے نہیں نکال سکے گا۔

ہم سارا دن غیبی حالت میں چٹان کے شکاف یا کھوکھلے اندر بیٹھے رہے۔ سورج غروب ہو گیا۔ جنگل میں شام کا اندھیرا چھا گیا۔ اس کے بعد یہ اندھیرا رات کی تاریکی میں بدل گیا۔ جنگل پر ایسی خاموشی چھا گئی کہ مجھے اس خاموشی سے خوف محسوس ہونے لگا۔ میں ان دو خطرناک بدروحوں میں گھرا ہوا خاموش بیٹھا رہا اور سوچنے لگا کہ فیروز! تمہارے ساتھ یہ کیا ہو گیا ہے۔ نہ تم ویران محل میں آسیبی مرتبان کو کھولنے کی حماقت کرتے اور نہ آج اس حالت کو پہنچتے اور نہ ان بدروحوں کے چنگل میں پھنستے۔ مگر مجھ سے یہ حماقت سرزد ہو گئی تھی اور اب میں اس کی سزا بھگت رہا تھا۔

جب رات کافی گہری ہو گئی تو دُرگانے پاتالی سے کہا۔ ”جو منتر میں نے تمہارے دل میں ڈالا ہے اس کو اپنے دل میں دہراؤ۔“

پاتالی ایک دو سیکنڈ خاموش رہی۔ پھر کہا۔ ”دُرگامیا! میں نے منتر تین بار دہرایا ہے۔“

دُرگاہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پاتالی کے ساتھ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ دُرگانے مجھ سے کہا۔ ”شیروان! تم بیٹھے رہو۔“

میں بیٹھ گیا۔ ”دُرگانے پاتالی کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور کچھ پڑھ کر اس کے چہرے پر پھونک ماری اور کہا۔ ”جاؤ۔“

پاتالی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر دُرگا کے آگے اپنا سر جھکایا اور رات کے اندھیرے میں چٹان کے شکاف میں سے نکل کر جنگل کے درختوں کی طرف چل دی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دُرگا سے پوچھا۔ ”اگر فرض کر لیا کہ پاتالی سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے اور یہ کام اس سے نہ ہوا تو پھر کیا ہو گا؟“

دُرگانے کہا۔ ”یہ اس وقت سوچوں گی۔ ابھی تم خاموشی سے بیٹھے رہو۔“ پھر جانے دُرگا کے دل میں کیا خیال آیا۔ وہ مجھ سے کوئی بات کئے بغیر درختوں کی طرف چل پڑی۔ دو تین قدم چلنے کے بعد دُرک کر میری طرف دیکھا اور میرے پاس آکر کہنے لگی۔ ”اس جگہ سے باہر مت آنا۔“

اُس نے چٹان کے شکاف کے آگے نصف دائرے کی شکل میں پاؤں سے ایک لکیر ڈال دی اور کہا۔ ”جب تک تم اس لکیر کے اندر ہو تمہیں کسی بدروح کا آسیب نہیں چھو سکے گا۔ اگر دُرک اس لکیر سے باہر آگئے تو پھر میں ذمہ دار نہیں ہوں گی۔“ یہ کہہ اوروہ جنگل کی تاریکی میں اس طرف چل پڑی جس طرف پاتالی گئی تھی۔ میں وہاں اکیلا بیٹھا رہا۔ دل میں طرح طرح کے خیال آرہے تھے کہ ابھی جنگل میں نہ جانے کیا کچھ نہیں ہو گا۔ خدا جانے کیسی کیسی چیخیں بلند ہوں گی۔ کیسی کیسی ڈراؤنی آوازیں آنے لگیں گی۔ آخر یہ بدروحوں کی جنگ تھی۔ دو بیلیوں کی لڑائی ہوتی ہے تو وہ آسمان سر پر اٹھا لیتی ہیں اور یہ تو ایک بدروح اور ایک خطرناک بدروح کے آسیب کی جنگ ہے۔“

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ گھڑی میرے پاس نہیں تھی۔ جنگل پر ایک دہشت ناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اچانک اندھیرے میں میں نے دُرگا کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے نہیں بلکہ زمین سے دو فٹ بلند ہو کر اندھیرے میں تیرتی ہوئی میری طرف آرہی تھی۔ چٹان کے شکاف میں آکر وہ میرے پاس شکاف کے کنارے کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی۔ ”میں نے پاتالی کو بدروحوں کے علاقے میں

داخل ہوتے دیکھ لیا ہے۔ وہ بالکل ٹھیک کام کر رہی ہے۔ مالینی کے منتر نے پورا اثر دکھایا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”دُرگا! تمہیں پاتالی کے ساتھ جانا چاہئے تھا۔“ اُس نے کہا۔ ”ہم بدروحوں کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ہم اس حد کے اندر نہیں جاسکتیں۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن اگر پاتالی تمہاری غلام بدروح جاسکتی ہے تو تم کیوں نہیں جاسکتیں؟“

دُرگانے کہا۔ ”یہ تم نہیں سمجھ سکو گے۔ اس کو سمجھنے کے لئے تمہیں خود بدروح کی شکل میں جنم لینا ہو گا۔“

میں نے بے اختیار کہا۔ ”خدا اس عذاب سے اپنی پناہ میں رکھے۔“ دُرگا کہنے لگی۔ ”تم مسلمانوں کی یہ بات بھی مجھے پسند ہے کہ تم ہر لمحے اپنے خدا کو یاد رکھتے ہو اور اس کی پناہ مانگتے ہو۔“

میں کچھ کہنے لگا تو دُرگانے سرگوشی کی۔ ”شی! خاموش!“ میں کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ دُرگانے کوئی آواز سنی تھی جو میں نہیں سن سکا تھا لیکن اس کے بعد جو آواز آئی وہ میں نے ضرور سنی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی جوالا کبھی پھٹ پڑا ہو۔ ایک دھماکہ تھا۔ ایسا دھماکہ جس نے اس چٹان کو ایسے ہلا دیا جیسے بھیاک زلزلہ آگیا ہو۔

دُرگانے کہا۔ ”گھبرانا مت شیردان! پاتالی نے نتالیا کے آسیب پر حملہ کر دیا ہے۔“

میں بھی اپنی جگہ سے ہل گیا تھا۔ مگر اپنے حواس کو پوری طرح سے قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ خوفناک دھماکے کے بعد جنگل میں ایک سانا چھا گیا۔ پھر اچانک جنگل ایک بھیاک چیخ کی آواز سے گونج اٹھا۔ دُرگانے اونچی آواز میں کوئی منتر پڑھ کر پھونکا اور

کہا۔ ”پاتالی! پیچھے مت ہٹنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

اس چیخ کے بعد ایک بار پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ چند سیکنڈ کے بعد جنگل میں سے پاتالی کی آواز سنائی دی۔ ”دُرگامیا! میں نے کام کر دیا ہے۔“

دُرگا کے حلق سے خوشی کی چیخ بلند ہوئی۔ اُس نے کہا۔ ”پاتالی! پاتالی!“

دوسرے لمحے پاتالی ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں وحشت برس رہی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھ دُرگا کے آگے کر دیئے۔ اس کے ایک ہاتھ میں کھوپڑی کا ایک ٹکڑا تھا اور دوسرے ہاتھ میں کھوپڑی کا دوسرا ٹکڑا تھا۔ کہنے لگی۔ ”دُرگامیا! یہ بتالیا بدروح کی کھوپڑی ہے۔“

دُرگانے خوش ہو کر پاتالی کا منہ چوم لیا۔ یہ سن کر کہ یہ بتالیا بدروح کی کھوپڑی ہے میری جان میں جان آگئی۔ دُرگانے کہا۔ ”شیروان! تمہیں مبارک ہو۔ بتالیا بدروح کی لعنت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہیں چھٹکارا مل گیا ہے۔“

میں نے پاتالی اور دُرگادونوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھا۔ ”مگر وہی کہاں ہے؟“

دُرگانے کہا۔ ”اس کی فکر نہ کرو۔ وہ بھی بہت جلد تمہارے پاس آجائے گی۔“

پھر دُرگامجھے اور پاتالی کو لے کر چٹان کے شکاف سے باہر آگئی۔ اُس نے پاتالی سے کہا۔ ”بتالیا کی کھوپڑی کے ٹکڑے زمین پر رکھ دو۔“

پاتالی نے کھوپڑی کے دونوں ٹکڑے زمین پر رکھ دیئے۔ دُرگانے کوئی منتر پڑھ کر اُس پر پھونکا۔ اچانک کھوپڑی کے دونوں ٹکڑوں کو آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے کھوپڑی کے دونوں ٹکڑے راکھ بن گئے۔

دُرگانے پاتالی سے کہا۔ ”اس راکھ کے اوپر مٹی ڈال دو۔“

پاتالی نے راکھ پر مٹی ڈال دی۔ دُرگانے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”شیروان! تم بڑے خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایک بدروح سے ہی نہیں بلکہ بدروح کے خطرناک

آسب سے نجات مل گئی ہے۔ ایک مصیبت سے ہمیشہ کے لئے تمہارا اور روہنی کا پیچھا چھوٹ گیا ہے۔ اب تمہارا صرف ایک ہی دشمن باقی ہے اور وہ ہے پجاری رگھو کی بدروح۔۔۔۔۔ جو روہنی کو اس لئے دوبارہ اپنے قبضے میں کرنا چاہتا ہے کہ وہ اس کی بدروح ہے اور چونکہ تم نے اس کی غلام بدروح کو آزاد کر دیا تھا اس لئے وہ تمہیں ہلاک کر کے تم سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کیا پجاری رگھو کی بدروح سے چھٹکارا پانے کے لئے تم ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتیں؟“

دُرگانے کہا۔ ”پجاری رگھو کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ اسے تم نہیں سمجھ سکو گے۔ یہ میں روہنی کو بتاؤں گی۔“

میں نے کہا۔ ”مگر وہی کہاں ہے؟“

”دیران محل میں چل کر بتاتی ہوں۔“ دُرگانے کہا۔

O

اسی رات ہم سری لنکا کے کرونا پلی کے جنگلوں سے نکل کر بے پور کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم واپس بھی اسی طرح آئے جس طرح گئے تھے یعنی ہم ہوا میں پرواز کر رہے تھے۔ دُرگا بدروح آگے آگے تھی۔ میں اور پاتالی پیچھے تھے۔ رات کے اندھیرے نے چھٹنا شروع کر دیا تھا کہ ہم بے پور کے دیران محل میں پہنچ گئے۔

دُرگا ہمیں اپنے آسبی تہہ خانے میں لے آئی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”شیروان! یہاں سے ہمارا اور تمہارا ساتھ ہمیشہ کے لئے ختم ہوتا ہے۔ آج کے بعد ہماری ملاقات نہیں ہوگی۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن ابھی تو مجھے روہنی سے بھی ملنا ہے اور رگھوپجاری سے بھی نجات حاصل کرنی ہے۔“

دُرگانے کہا۔ ”اس بارے میں، میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتیں۔“

”تو پھر کون مدد کرے گا؟“ میں نے کہا۔

دُرگا کہنے لگی۔ ”روہنی تمہاری مدد کرے گی۔ تمہارا خدا تمہاری مدد کرے گا۔ اب معاملہ روہنی اور تمہارے خدا کے ہاتھ میں ہے۔“

میں چپ ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”مگر روہنی کہاں ہے؟ وہ یہاں کیوں نہیں آئی۔ وہ تو اب نتالیا کے آسیب کی قید سے آزاد ہو چکی ہے۔“

دُرگانے کہا۔ ”تم بھول گئے ہو کہ روہنی اب بدروح نہیں رہی۔ اس کے وہ

برے کرم جو اس کے زندگی میں گناہوں سے اس کی روح کے ساتھ چٹ گئے تھے اب اس کی روح سے جھڑ کر الگ ہو چکے ہیں۔ جتنی سزا اس نے بھگتی تھی بدروح کی شکل میں اُس نے بھگت لی ہے۔ وہ پہلے بھی اتنی گھناؤنی بدروح نہیں تھی اور ہماری طرح اس نے مرنے کے بعد بدروح کی حیثیت سے جہنم نہیں لیا تھا کیونکہ وہ مرنے سے پہلے مسلمان ہو چکی تھی اور مسلمانوں میں دوسرا جہنم نہیں ہوتا۔ ہاں ایک روح کو اس کے برے اعمال کی سزا ضرور ملتی ہے۔ روہنی یعنی سلطانہ کی روح کو بھی اتنی ہی سزا مل رہی تھی لیکن ایک خاص مدت گزر جانے کے بعد اس کی روح کے گناہ دھل گئے ہیں اور اب وہ ایک نیک روح بن چکی ہے۔ چونکہ وہ نیک روح بن چکی ہے اس لئے نہ وہ ہمارے قریب آسکتی ہے اور نہ ہم اس کے قریب جاسکتے ہیں۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ جہاں روشنی ہو جاتی ہے وہاں اندھیرا نہیں ٹھہر سکتا۔ روہنی سلطانہ اب روشنی ہے اور ہم اندھیرے ہیں۔ ہم اس کے پاس نہیں جاسکتیں۔ اندھیرا روشنی کے پاس نہیں جاسکتا اور روشنی ہمارے پاس آئی تو ہم غائب ہو جائیں گی کیونکہ ہم اندھیرے کی مخلوق ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب تم میری بات اچھی طرح سے سمجھ گئے ہو گے۔“

دُرگانے مجھے اتنی وضاحت کے ساتھ کھول کر سمجھایا تھا کہ ساری حقیقت میری سمجھ میں آگئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ مجھے خود ہی روہنی سے جا کر ملنا ہوگا۔“

”ہاں۔“ دُرگانے کہا۔

”وہ مجھے کہاں ملے گی؟“ میں نے پوچھا۔

دُرگانے کہا۔ ”یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی کہ روہنی تمہیں کہاں ملے گی۔ ابھی میں تمہیں ایک ایسی چیز دینا چاہتی ہوں جو تمہارے دشمن پجاری رگھو کا ناش کرنے میں تمہاری مدد کرے گی۔ تمہارے پاس پاتالی کی انگوٹھی بھی ہے جس کو پہن کر تم

غائب ہو سکتے ہو۔ تمہارے بازو پر کالے جادوگر کا تعویذ بھی بندھا ہوا ہے۔ اب میں تمہیں ایک شہد بتاتی ہوں۔ یہ ایک لفظ کا شہد ہے۔ اس کو تم اس وقت پڑھو گے جب تمہیں روہنی کہے گی۔ اب میں تمہیں وہ شہد بتاتی ہوں۔ اپنا کان میرے قریب کرو۔“

میں نے اپنا کان دُرگا کے منہ کے قریب کیا تو اس نے مجھے ایک لفظ کا شہد بتایا۔ یہ لفظ، یہ شہد مجھے اُس وقت یاد تھا مگر عجیب بات ہے کہ اب بالکل یاد نہیں رہا۔ اس کے بعد دُرگا کہنے لگی۔ ”اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ روہنی تمہیں کہاں ملے گی۔“

اُس نے کہا۔ ”روہنی سلطانہ کی نیک روح کہاں رہتی ہے؟ یہ مجھے نہ معلوم ہے نہ میں معلوم کر سکتی ہوں۔ مگر میں تمہیں اتنا بتا سکتی ہوں کہ وہ تمہیں کہاں ملے گی۔ یہاں سے تم بھارت کی راجدھانی دلی جاؤ گے۔ دلی میں شہر کے شمال کی جانب مغلیہ زمانے کی ایک قدیم مسجد ہے۔ اسے بڑی مسجد کہا جاتا ہے۔ بڑی مسجد کے قریب ہی ایک ندی بہتی ہے۔ ندی کے کنارے سنگ مرمر کی ایک پرانی بارہ دری ہے۔ رات کے وقت تم اُس بارہ دری میں جا کر بیٹھ جاؤ گے۔ روہنی سلطانہ تمہیں وہیں آکر ملے گی۔۔۔۔۔“

میں نے کہا۔ ”کیا میں غائب حالت میں دلی جاؤں گا یا انگوٹھی اتار کر جانا ہو گا۔ کیونکہ میں غائب ہو کر خود نہیں اڑ سکتا۔“

دُرگانے کہا۔ ”اگر تم اڑ کر جانا چاہتے ہو تو اڑ کر بھی جا سکتے ہو۔ تمہیں صرف یہ کہنا ہو گا مجھے دلی لے چل، اور پاتالی کی انگوٹھی کا طلسم تمہیں ہوا میں اڑاتا ہوا دلی پہنچا دے گا۔ راستے میں اگر تم کسی جگہ اترنا چاہو تو تمہیں صرف یہ کہنا ہو گا میں نیچے اترنا چاہتا ہوں، اور تم اپنے آپ نیچے اتر آؤ گے۔ اگر تم زندہ انسانی شکل میں ریل گاڑی کے ذریعے سفر کرنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں ریل گاڑی میں کیسے سفر کر سکتا ہوں۔ میرے پاس تو ایک

پیسہ بھی نہیں ہے اور میں پاتالی کی طرح پرس میں سے کرنسی نوٹ بھی نہیں نکال سکتا۔“

دُرگا کہنے لگی۔ ”یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ جب تم یہاں سے جاؤ گے تو تمہاری جیب میں سب کچھ ہو گا۔ تم جتنے پیسے نکالنا چاہو گے جیب میں ہاتھ ڈال کر نکال سکو گے۔“

میں نے کہا۔ ”پھر میں ٹرین کے ذریعے ہی سفر کروں گا۔“
دُرگانے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ تم ریل گاڑی میں ہی سفر کرنا۔ اب صبح ہونے والی ہے۔ میرا واپس جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ پاتالی بھی میرے ساتھ ہی جائے گی۔“
دُرگانے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ کہنے لگی۔ ”میں تمہارے زندہ انسانوں کے طریقے سے ہی تم سے جدا ہونا چاہتی ہوں۔“

پاتالی نے بھی مجھ سے ہاتھ ملایا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”شیروان! تمہارے ساتھ میرے بڑے اچھے دن گزر رہے ہیں۔ خاص طور پر ماڈرن ہوٹلوں میں گزارے ہوئے لمحے مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پاتالی! یہ دن مجھے بھی یاد آیا کریں گے۔“
میں کچھ اور کہنے لگا تو دُرگا اور پاتالی دونوں ایک ساتھ غائب ہو گئیں۔ میں تہہ خانے سے باہر نکل آیا۔ پاتالی کی انگوٹھی میری انگلی میں ہی تھی اور میں غیبی حالت میں تھا۔ دُرگا کا بتایا ہوا شہد بھی مجھے یاد تھا۔ یہ شہد مجھے روہنی سلطانہ کو جا کر بتانا تھا اور اس نے اس سلسلے میں میری راہ نمائی کرنی تھی۔ پاتالی کی انگوٹھی کے طلسمی اثر سے میں غیبی حالت میں چل بھی سکتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ چلتے ہوئے میرے جسم کا بوجھ آٹھ گنا کم ہوتا تھا اور زمین پر چلتے ہوئے میرے پاؤں ذرا سی کوشش کے ساتھ ہی اوپر کواٹھ جاتے تھے اور پھر بڑے آرام سے زمین پر پڑتے تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ اسی طرح چلتے ہوئے سٹیشن تک جاتا ہوں لیکن پھر خیال آیا کہ سٹیشن کافی دور ہے مجھے

جلدی پہنچنا چاہئے ہو سکتا ہے اس وقت دلی جانے والی کوئی گاڑی مل جائے۔

چنانچہ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”میں اڑنا چاہتا ہوں۔“

اس کے ساتھ میں اپنے آپ زمین سے بلند ہونا شروع ہو گیا۔ جب میں زمین سے چھ سات منزلہ بلند ہو گیا تو میں نے کہا۔ ”بس میں اسی بلندی پر اڑنا چاہتا ہوں۔“ میں وہاں قائم ہو گیا اور آگے کی طرف اڑنے لگا۔ اڑتے ہوئے رخ بدلنے کی خاطر مجھے بازوؤں کو دائیں یا بائیں کرنا پڑتا تھا۔ سٹیشن کا راستہ مجھے معلوم تھا۔ اس وقت صبح ہو چکی تھی۔ اچانک مجھے خیال آ گیا کہ دیکھنا چاہئے درگاہ کے میری جیب میں اپنے طلسم کے زور سے کتنے پیسے ڈالے ہیں۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو مجھے اپنا بوٹہ پھولا ہوا لگا۔ کھول کر دیکھا تو اُس میں سو، سو کے کتنے ہی نوٹ تھے۔ میں نے بوٹہ بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ میں بڑی جلدی بے پور ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ معلوم ہوا دلی جانے والی گاڑی دو گھنٹے بعد چلے گی۔ یہ میں نے گاڑیوں کی آمد و رفت کے بورڈ پر پڑھا تھا۔

میں نے سوچا کہ ناشتہ کر لینا چاہئے۔ اس کے لئے میرا اصلی حالت میں واپس آنا ضروری تھا۔ سٹیشن پر کافی لوگ تھے۔ میں ان کے سامنے ظاہر نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں ویننگ روم کے ہاتھ روم میں چلا گیا۔ ابھی میں ہاتھ روم میں داخل ہوا ہی تھا کہ ایک مسافر اندر آ گیا اور اُس نے ہاتھ روم کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ یہی سمجھا کہ ہاتھ روم خالی ہے کیونکہ میں اُسے دکھائی تو دے نہیں رہا تھا۔ میں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اُس مسافر نے جیب سے پستول نکالا اور اس میں گولیاں بھرنے لگا۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا کہ یہ تو کسی کو قتل کرنے والا ہے۔

گولیاں بھر کر اُس نے پستول جیکٹ کی اندر والی جیب میں رکھا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا اور دھیمی آواز میں اپنے آپ سے کہا۔ ”ست پرکاش! تم نے میری محبت پر ڈاکہ ڈالا ہے اور میری محبوبہ سے شادی کر کے اب ہنی مون

منانے جا رہے ہو۔ مگر میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

اتنا کہہ کر وہ دروازہ کھول کر غسل خانے سے نکل گیا۔ نہ جانے کیوں میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں اس شخص کو کسی نئی نویلی دلہن کا سہاگ اجاڑنے نہیں دوں گا۔ میں اسی غیبی حالت میں ہاتھ روم سے نکل کر اس آدمی کے پیچھے چل پڑا۔ یہ سانولے رنگ کا گھنگریالے بالوں والا آدمی تھا۔ عمر تیس پینتیس کے درمیان ہو گی شکل ہی سے جرائم پیشہ لگتا تھا۔ یہ آدمی پلیٹ فارم پر ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میں بھی اس کے پاس آ گیا۔ وہ بڑے غور سے مسلسل پلیٹ فارم کے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے مسافر داخل ہو رہے تھے۔

ایسے لگتا تھا کہ اسے کسی کا انتظار ہے۔ میں بھی گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں گیٹ پر ایک ریشمی ساڑھی میں ملبوس لڑکی ایک سوئڈ بوٹڈ نوجوان کے ساتھ داخل ہوئی۔ ایک ملازم اُن کے ساتھ تھا جس نے دو سوٹ کیس اٹھا رکھے تھے۔ یہ نوبیا تھا جوڑا لگتا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی پستول والا آدمی جلدی سے آڑ میں ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے اس جوڑے کا انتظار تھا۔ پلیٹ فارم پر آکر ملازم نے سوٹ کیس رکھ دیئے۔ لڑکی نے زیور پہن رکھے تھے۔ اُس کے خاوند نے اس کو کچھ کہا اور ملازم کو ساتھ لے کر گیٹ سے باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی پستول والا آدمی تیز تیز چل کر لڑکی کی طرف بڑھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی گیا۔

اُس آدمی کو دیکھ کر نوبیا ہتلاہن پریشان ہو گئی۔ کہنے لگی۔ ”راکش! تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ ست پرکاش ریزرویشن کر دے گا تو اس نے دیکھ لیا تو بہت برا ہو گا۔“

پستول والے آدمی نے کہا۔ ”گوری! تم نے میری محبت کو دھوکا دیا ہے اور مجھے چھوڑ کر ست پرکاش سے شادی رچالی ہے۔“

لڑکی نے کہا۔ ”اب کچھ نہیں ہو سکتا راکش! بھگوان کے لئے چلے جاؤ۔ میری

زندگی برباد نہ کرو۔“

پستول والے آدمی کا نام راکیش تھا۔ وہ کہنے لگا۔ ”گوری! اب بھی وقت ہے میرے ساتھ بھاگ چلو۔ ہم بمبئی جا کر نئی زندگی شروع کریں گے۔“
لڑکی سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس نے کہا۔ ”راکیش! میں تیرے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ بات ختم ہو چکی ہے۔“
راکیش نے غصے میں آکر کہا۔ ”بات کو تو میں ختم کروں گا۔“

اور یہ کہہ کر وہاں سے واپس چل پڑا۔ میں اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا کہ اگر اس نے پستول نکال کر لڑکی کو گولی مارنی چاہی تو میں اس کے ہاتھ سے پستول چھین لوں گا اور اُسے ایسا سبق سکھاؤں گا کہ پھر کبھی اس نو بیاہتا جوڑے کو پریشان نہ کر سکے گا۔ مگر اُس نے ایسی کوئی حرکت نہ کی۔ حقیقت میں وہ یہاں اس لڑکی کے خاوند کو قتل کرنے کا ارادہ لے کر آیا تھا۔ اب مجھے نو بیاہتا دلہن کے خاوند کو اس بد معاش سے بچانا تھا۔

یہ شخص پلیٹ فارم پر لوہے کے ایک ستون کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ میں اُس کے سر پر موجود تھا۔

لڑکی کا خاوند ست پرکاش آگیا تھا اور اسے ٹکٹ نکال کر دکھا رہا تھا۔ شاید اس نے سیٹوں کی ریزرویشن کروالی تھی۔ میرا ست پرکاش کو جا کر یہ کہنا کہ ایک آدمی اس کو قتل کرنے والا ہے اور وہ پولیس کو اطلاع کر دے بیکار تھا۔ اول تو میں غیبی حالت میں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ست پرکاش میری آواز سن کر ڈر جاتا۔ میں پستول والے راکیش کی جیب سے پستول چھین کر اسے مار کر وہاں سے بھگا سکتا تھا مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ پھر کسی وقت ست پرکاش کو ہلاک کر سکتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں اس وقت تک اس پستول والے شخص کے خلاف کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا جب تک مجھے یقین نہیں ہو جاتا کہ وہ ست پرکاش پر قاتلانہ حملہ کرنے والا ہے۔

وقت گزرنا گیا۔ اتنے میں دلی جانے والی ٹرین آکر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئی۔ مسافر ٹرین کی طرف لپکے۔ نو بیاہتا جوڑا بھی ایک بوگی میں سوار ہو گیا۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی اس بوگی میں چڑھ گیا۔ یہ کارڈور والی ٹرین تھی۔ چھوٹے چھوٹے کپار ٹمنٹس تھے جن کے آگے راہ داری تھی۔ نو بیاہتا جوڑا ایک کپار ٹمنٹ کے باہر لکھا ہوا نمبر پڑھ کر اس میں داخل ہو گیا۔ میں باہر کارڈور میں کھڑکی کے پاس کھڑا رہا۔ میاں بیوی نے اپنے کیمین میں داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر دیا تھا۔ قاتل مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ راہ داری ایسی تھی کہ ٹرین کے پہلے ڈبے سے لے کر انجن تک چلی گئی تھی۔ قاتل نہ باہر پلیٹ فارم پر تھا اور نہ راہ داری میں نظر آ رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد انجن نے سیٹی دی اور پھر ٹرین چل پڑی۔

مجھے یقین تھا کہ قاتل ٹرین میں سوار ہو چکا ہے۔ اب مجھے اس کے نمودار ہونے کا انتظار تھا۔ غائب ہونے کے بعد میری یہ حالت ہو جاتی تھی کہ نہ مجھے تھکان محسوس ہوتی تھی، نہ بھوک لگتی تھی، نہ پیاس لگتی تھی۔ میں ایک ہی جگہ گھنٹوں کھڑا رہ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نو بیاہتا جوڑے کے کیمین کے باہر راہ داری میں ٹرین کی کھڑکی کے پاس کھڑا تھا اور قاتل کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا کوئی حرج نہیں ہو رہا تھا۔ یہ ٹرین دلی جا رہی تھی اور مجھے بھی دلی جانا تھا۔

جے پور سے دلی ٹرین میں سفر کرتے ہوئے راستے میں الور اور ریواڑی دو بڑے سٹیشن آتے ہیں۔ ریواڑی کے بعد دلی آ جاتا ہے۔ یہ کوئی زیادہ لمبا فاصلہ نہیں ہے۔ مجھے احساس تھا کہ اگر قاتل نے ست پرکاش کو قتل کرنا ہے تو وہ کچھ دیر کے بعد آ جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دور سے مجھے قاتل آتا دکھائی دیا۔ وہ راہ داری میں ٹرین کی کھڑکیوں کے قریب ہو کر اس کیمین کی طرف آ رہا تھا جو نو بیاہتا جوڑے کا کیمین تھا اور جو اس وقت کیمین میں موجود تھے۔ قاتل نے دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال

رکھے تھے۔ مجھے معلوم تھا اس کے ایک ہاتھ میں جیب کے اندر پستول ہے۔

وہ میرے قریب آکر رُک گیا۔ مجھے تو وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میرے سوا کارڈور میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ ٹرین پورٹی رفتار سے جا رہی تھی۔ وہ یہی سمجھا کہ کارڈور خالی ہے۔ پھر بھی قاتل نے دائیں بائیں دیکھا اور اسی طرح جیب میں ہاتھ ڈالے نوبیا ہوتا جوڑے کے کیبن کی طرف بڑھا۔ میں بھی اس کے ساتھ آگے ہو گیا۔ اس نے کیبن کے دروازے پر دستک دی۔ دوسری بار دستک دینے پر ست پرکاش نے دروازہ کھول کر قاتل کو دیکھا تو حیران ہو کر بولا۔ ”تم؟“

اس کا مطلب تھا کہ وہ راکیش کو جانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ اس کی بیوی سے محبت کی پیٹنگیں بڑھایا کرتا تھا۔

قاتل نے کہا۔ ”ہاں! میں۔“

اس کے ساتھ ہی قاتل نے جیب سے پستول نکال لیا اور ست پرکاش کو اندر کی طرف دھکا دیا۔ وہ اس پر فائر کرنے ہی والا تھا کہ پستول اس کے ہاتھ سے اچھل کر غائب ہو گیا۔ ست پرکاش نے فوراً کیبن کا دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی۔ قاتل ہکا بکا سا کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ پستول کہاں چلا گیا۔

میں نے اُسے کہا۔ ”راکیش! تمہارا پستول میرے پاس ہے۔“

قاتل نے حیرت زدہ ہو کر دائیں بائیں دیکھا۔ اسے کوئی آدمی نظر نہ آیا تو وہ گھبرا گیا۔ میں نے کہا۔ ”میں تمہارے پاس ہی کھڑا ہوں مگر تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔“ قاتل گھبرا کر راہداری میں آگے کی طرف بھاگ اُٹھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی گیا۔ میں اس کے بالکل ساتھ لگا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟ تم جہاں جاؤ گے میں وہاں موجود ہوں گا۔“

وہ رُک گیا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ لرزتے ہونٹوں کے ساتھ بولا۔ ”تم.... تم کون ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میں یم دُوت ہوں۔“

یم دُوت ہندی بلکہ سنکرت میں موت کے ایلچی کو کہتے ہیں۔ یہی یم دُوت ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق موت کے وقت جان نکالنے آتا ہے۔ یم دُوت کا نام سن کر قاتل انجن کی طرف دوڑ پڑا۔ میں اس کے ساتھ ہی تھا۔ میں نے کہا۔ ”میں تمہاری جان نکالنے آیا ہوں۔ تم یم دُوت سے بھاگ کر کہاں جاسکتے ہو؟“

اُس آدمی کو اور تو کچھ نہ سوچھا اُس نے کھڑکی میں سے باہر چھلانگ لگا دی۔ اس وقت آگے کوئی سٹیشن آ رہا تھا اور ٹرین کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی۔ باہر ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ وہ اُن پر جا کر گر ڈا۔ میں بھی کھڑکی سے نکل کر ہوا میں اڑتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ قاتل ریت پر سے اُٹھا اور لنگڑاتا ہوا ایک طرف کو بھاگا۔ میں نے اُس کی گردن دبوچ کر اسے نیچے گرا دیا اور کہا۔ ”اب میں تمہاری جان نکالنے لگا ہوں۔“

قاتل رونے لگا۔ ”ہاتھ جوڑ کر گر گڑا تے ہوئے بولا۔ ”یم دُوت مہاراج! میری جان نہ نکالیں۔ میں ابھی نہیں مرنا چاہتا۔“

میں نے کہا۔ ”تم قاتل ہو۔ اگر میں وقت پر نہ آ جاتا تو تم نے ست پرکاش کو قتل کر دینا تھا۔ تم قاتل ہو۔ تمہاری سزا موت ہے۔“

وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ ”مجھے نہ ماریں یم دُوت مہاراج! مجھے نہ ماریں۔ میں ست پرکاش کے پاؤں پڑ کر اُس سے معافی مانگ لوں گا۔ میری جان بخشی کر دیں۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم دل سے وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی ست پرکاش کو قتل کرنے کا خیال دل میں نہیں لاؤ گے تو میں یم دیوتا کے آگے سفارش کر کے تمہاری جان بخشی کروادوں گا۔“

قاتل راکیش کو میں دکھائی تو دے نہیں رہا تھا اُس نے میری آواز کے رُخ پر زمین پر سجدہ کر دیا اور پھر سر اٹھا کر بولا۔ ”یم دُوت مہاراج! میں دل سے وعدہ کرتا

ہوں کہ کبھی بھول کر بھی میں ست پرکاش یا اس کی بیوی کو نقصان پہنچانے کا خیال بھی دل میں نہیں لاؤں گا۔“

میں نے کہا۔ ”تم ان کے سامنے بھی کبھی نہیں جاؤ گے۔“

قاتل نے گڑگڑا کر کہا۔ ”میں ان کے سامنے بھی کبھی نہیں جاؤں گا۔“

میں نے کہا۔ ”یاد رکھو! اگر تم اپنے وعدے سے پھر گئے تو میں اسی وقت تمہارے سر پر پہنچ کر تمہارا گلا گھونٹ کر تمہاری جان نکال کر لے جاؤں گا اور تمہارا اگلا جنم کنکھجورے کا ہو گا۔“

قاتل تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ”نہیں نہیں مہاراج! میں ایسا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں ایسا کبھی نہیں کروں گا۔“

میں نے اُس کی گردن پر زور سے ایک مکارا۔ وہ زمین پر گر پڑا اور ہاتھ جوڑ کر تھر تھر کانپنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”میں تمہاری سفارش کرنے میں دیوتا کے پاس جا رہا ہوں۔ اگر تم دیوتا نے تمہاری جان بخشی کر دی تو میں تمہاری جان نکالنے نہیں آؤں گا لیکن اگر تم نے اس نوبیا ہتا جوڑے گوری اور ست پرکاش کو نقصان پہنچانے کا سوچا تو میں اسی وقت آکر تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔“

ریت پر پڑے پڑے ہاتھ جوڑے کانپتے کپکپاتے ہوئے قاتل نے کہا۔ ”نہیں نہیں۔ میں ایسا نہیں کروں گا۔ اگلے جنم میں بھی ایسا نہیں کروں گا۔“

میں نے قاتل کی ٹانگیں بچا کر ریت پر پستول سے دو فائر کئے اور کہا۔ ”یہ میری نشانی ہے کہ میں جا رہا ہوں۔“

میں وہاں سے پرواز کر گیا۔ اب مجھے دلی کی طرف جاتی ہوئی ٹرین کو پکڑنا تھا کیونکہ مجھے دلی کا فضائی راستہ معلوم نہیں تھا۔ میں فضا میں راستے سے بھٹک سکتا تھا۔ میں نے ریلوے لائن کے اوپر پرواز شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے ٹرین نظر آ گئی۔ میں ایک کھڑکی میں سے ٹرین میں داخل ہو کر راہ داری کے آخری ڈبے کی

کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے نوبیا ہتا جوڑے کے کیمن میں جا کر انہیں تسلی دینے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اب قاتل راکیش اس جوڑے کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔

میں دلی پہنچ گیا۔ دُرگانے کہا تھا کہ ”دلی کے شمال کی جانب مغلیہ زمانے کی ایک قدیم مسجد ہے۔ اسے بڑی مسجد کہا جاتا ہے۔ بڑی مسجد کے قریب ہی ایک ندی بہتی ہے۔ ندی کے کنارے سنگ مرمر کی ایک پرانی بارہ دری ہے۔ تم اس بارہ دری میں جا کر بیٹھ جاؤ گے۔ مگر تم رات کے وقت جاؤ گے۔ روہنی تمہیں وہیں آکر ملے گی۔“

اس کی ہدایت کے مطابق میں دلی شہر کے شمال کی جانب پرواز کرتا آ گیا۔ یہاں مجھے مغلیہ طرز تعمیر کی ایک قدیم مسجد کا گنبد دکھائی دیا۔ میں نیچے اتر آیا۔ مسجد کے صحن میں ایک بزرگ بیٹھے قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ میں سر جھکائے خاموشی سے گزرتا ہوا مسجد کے عقب میں آ گیا۔ دیکھا کہ نیم کے گھنے درختوں کے درمیان ایک ندی بہہ رہی تھی۔ ندی کے کنارے کچھ فاصلے پر ایک بارہ دری پر نظر پڑی۔ میں قریب چلا گیا۔ یہ سنگ مرمر کی بارہ دری تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ اُس کی حالت شکستہ ہو رہی تھی۔

اسی بارہ دری میں رات کے وقت روہنی نے مجھ سے ملنا تھا۔ میں نے بارہ دری دیکھ لی تھی۔ وہاں سے پرواز کرتا ہوا شہر کی طرف آ گیا۔ مجھے سارا دن کسی جگہ گزارنا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ وقت کسی اچھے سے ہوٹل میں بیٹھ کر گزارنا چاہئے۔ دلی کے ہوٹلوں سے اب میں اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ میں ایک ماڈرن ہوٹل کے احاطے میں موقع دیکھ کر اتر گیا اور انگوٹھی اتار کر جیب میں رکھ لی اور ظاہر ہو گیا۔ میں پارکنگ میں گاڑیوں کے پیچھے ظاہر ہوا تھا۔ کسی نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اس ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا۔ سب سے پہلے اعلیٰ قسم کا کھانا منگوا کر کھایا پھر کمرے میں سو گیا۔ تیسرے پہر سو کر اٹھا، غسل کیا، کپڑے تبدیل کئے اور

چائے منگو کر پی اور کمرے میں بیٹھائی وی کے پروگرام دیکھتا رہا۔ جب رات ہو گئی تو تھوڑا بہت ڈنر کیا اور کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ جب رات کے گیارہ بجے تو میں نے انگوٹھی پہنی اور غائب ہو کر کمرے کی کھڑکی میں سے نکل کر شہر کے شمال کی طرف پرواز کر گیا۔

O

چاندنی رات تھی۔ ہر طرف چاندنی کا سنہری غبار سا پھیلا ہوا تھا۔ قدیم مغلیہ مسجد پر ایک نر جلالِ تقدس جھلک رہا تھا۔ میں مسجد کے قریب ہی پرانے باغ میں اتر گیا۔ یہ مغلوں کے زمانے کا باغ تھا جس میں جگہ جگہ سرو کے درخت خاموش کھڑے تھے۔ باغ جہاں ختم ہوتا تھا وہاں ندی کے کنارے سنگ مرمر کی بارہ دری چاندنی رات میں بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ میں بارہ دری میں آکر بیٹھ گیا اور سلطانہ کا انتظار کرنے لگا۔ اب میں روہنی کو اس کے ہندو نام روہنی سے نہیں یاد کروں گا بلکہ اس کو اس کے اسلامی نام سلطانہ سے یاد کروں گا۔ آپ سے گزارش ہے کہ جب میں سلطانہ کا نام لوں تو آپ سمجھ جائیے گا کہ میرا مطلب روہنی ہی سے ہے جو گناہوں کی بخشش کے بعد اب ایک اچھی روح بن چکی ہے۔

کچھ دیر تک میں بارہ دری میں بیٹھا رہا۔ پھر سوچا کہ اُٹھ کر ندی کنارے خوبصورت چاندنی رات کی سیر کرتا ہوں۔ جب سلطانہ بارہ دری میں نمودار ہوگی تو اس کے پاس آجاؤں گا۔ میں بارہ دری سے اتر کر ندی کی طرف چلا ہی تھا کہ مجھے مسجد کی جانب سرو کے درختوں میں ایک سفید انسانی ہیولاد کھائی دیا۔ میں وہیں رُک گیا۔ سفید سایہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھے ایک ایسی خوشبو محسوس ہوئی جو سلطانہ کی روح کی بخشش کے بعد مجھے اس کے سفید لباس میں سے آتی اکثر محسوس ہوا کرتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سلطانہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

میں بھی اُس کی طرف بڑھا۔ وہ سلطانہ ہی تھی۔ اُس کے چہرے پر چاندنی نور بن کر جھلک رہی تھی۔ وہ میرے پاس آکر رُک گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”شیروان!

قید میں تھی۔ جب خدا نے مجھ پر اپنی رحمت نازل فرمائی تو میرے گناہ کا آخری مرحلہ بھی گزر گیا اور میں نتالیا کے آسیب سے آزاد ہو گئی۔ اب اگر نتالیا کا آسیب زندہ بھی ہوتا تو میرے قریب آنے سے پہلے ہی جل کر راکھ ہو جاتا۔ یہی حال پجاری رگھو کی بدروح کا ہے۔ جیسا کہ میں نے شاید پہلے بھی تمہیں بتایا تھا کہ اچھی روح اور بری روح کے درمیان فرق یہ ہوتا ہے کہ اچھی روح روشنی ہے اور بدروح اندھیرا ہے اور روشنی اور اندھیرا کبھی اکٹھے نہیں ہوتے۔“

میں نے کہا۔ ”تو پھر تم پجاری رگھو سے مجھے کیسے بچا سکو گی؟ میں تو ایک عام انسان ہوں۔ رگھو ایک بدروح ہے جس کے پاس جادو کی طاقت ہے۔“

سلطانہ کہنے لگی۔ ”تمہارے پاس ایمان کی طاقت ہے جس کا مقابلہ دنیا کا بڑے سے بڑا اور برے سے بڑا جادو گر بھی نہیں کر سکتا۔ ایمان کی طاقت کے آگے کوئی بدروح نہیں ٹھہر سکتی۔ تم خدا پر بھروسہ رکھو اور پھر تمہاری راہ نمائی کو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم بہت جلد اس بدروح کو بھی اس کے آخری عبرت ناک انجام تک پہنچا دو گے۔ صرف تمہیں تھوڑی سی جرات سے کام لینا ہو گا۔“

میں نے کہا۔ ”یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ میں جرات نہ بھی کروں تو بھی مجھے جرات کرنی ہی پڑے گی۔ اس کے علاوہ اپنے اللہ پر میرا ایمان چٹان کی طرح مضبوط ہے۔ چٹان کسی طوفان میں اپنی جگہ سے گر کر ٹوٹ سکتی ہے لیکن میرا ایمان اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔“

سلطانہ نے خوش ہو کر کہا۔ ”شیروان! تمہاری یہ بات سن کر مجھے روحانی سکون ملا ہے۔ گوشت پوست کے جسم میں ہونے کی وجہ سے تمہارے ساتھ کچھ کمزوریاں، کچھ مجبوریاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ لیکن جو آدمی نیکی کے راستے پر چلتا ہے اللہ کے حکم سے نیکی کی غیبی طاقتیں اس کی مدد کرتی رہتی ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”مجھے کیا کرنا ہو گا؟“

اللہ کی رضا اور تمہاری کوشش سے آخر مجھے نتالیا کے آسیب سے رہائی مل ہی گئی۔“ میں نے کہا۔ ”سلطانہ! نتالیا کا آسیب نتالیا کو ساتھ لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جل کر بھسم ہو چکا ہے۔ اب وہ ہمیں کبھی کوئی گزند نہ پہنچا سکے گی۔“

سلطانہ بولی۔ ”ہاں شیروان! میں جانتی ہوں۔ اللہ نے ہم پر بڑا کرم کیا ہے کہ ہمیں ایک بہت بری شیطانی عورت کے آسیب سے نجات مل گئی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن سلطانہ! ابھی پجاری رگھو کی بدروح ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ شاید اب وہ تمہارا تو کچھ نہ بگاڑ سکے گی لیکن اگر میں اُس کے پھندے میں آ گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔“

سلطانہ نے کہا۔ ”اللہ نے چاہا تو اس بدروح سے بھی تمہارا پیچھا چھوٹ جائے گا اور تم پھر سے ایک سادے نارمل انسان کی طرح زندگی بسر کرنے لگو گے۔“

میں نے کہا۔ ”دُرگا اور پاتالی نے میرا بڑا ساتھ دیا تھا۔ دُرگانے مجھے ایک لفظ بھی یاد کر دیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ اسے یاد کر لو اور یہ لفظ اگر تم رگھو کی بدروح کے سامنے دہراؤ گے تو اُس کا ناش ہو جائے گا اور اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ سلطانہ ہی تمہیں بتائے گی کہ یہ لفظ تمہیں کب اور کہاں بولنا ہے۔“

سلطانہ کہنے لگی۔ ”ہاں۔ اُس نے ٹھیک کہا ہے۔ میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گی۔ چلو بارہ دری میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“

ہم سنگ مرمر کی بارہ دری میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے سلطانہ سے پوچھا۔ ”سلطانہ! میرا دشمن پجاری رگھو ہمارے خلاف جو کوئی نئی سازش تیار کر رہا ہے کیا تم اس سے باخبر ہو؟“

سلطانہ نے کہا۔ ”شیروان! جب سے اللہ تعالیٰ کے حضور میرے گناہوں کی بخشش ہوئی ہے اور میں ایک اچھی روح بن گئی ہوں میں رگھو، دُرگا اور پاتالی کی پہنچ سے ناہز ہو گئی ہوں۔ میرے گناہ کا آخری مرحلہ وہ تھا جب میں نتالیا کے آسیب کی

سلطانہ کہنے لگی۔ ”تم وہی کرو گے جو میں تمہیں کہوں گی۔“

میں بارہ درری میں سلطانہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ اُس نے کہا۔ ”تم یہی پوچھنا چاہتے ہو کہ تمہارے دشمن رگھو نے تمہارے خلاف اب کون سا نیا پھندا تمہیں پھانسنے کے لئے تیار کیا ہے۔ میں تمہیں یہ کہوں گی کہ وہ جتنے پھندے چاہے تیار کر لے لیکن اگر تم اپنی جگہ پر ثابت قدم رہو گے اور تھوڑی سی جرات سے کام لو گے تو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“

”مگر یہ شیطانی بدروح کہاں پر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

سلطانہ نے کہا۔ ”پجاری رگھو کی بدروح ہمارے اُس روہت گڑھ والے پرانے قلعے کے محل میں ہے جہاں اُس نے مجھے قتل کر کے میری روح کو قید کیا تھا اور جہاں سے تم نے میری روح کو اس کی قید سے آزاد کیا تھا اور پھر وہ تمہارا دشمن بن گیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ مجھے ایک بار پھر اسی جگہ پر جانا ہو گا جہاں سے میری مصیبتوں کا آغاز ہوا تھا۔“

سلطانہ نے جواب دیا۔ ”ہاں شیروان! تمہیں وہیں جانا ہو گا۔“

میں نے تشویش کے ساتھ کہا۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ میں پھر کسی پہلے سے بھی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤں۔“

سلطانہ نے کہا۔ ”نہیں شیروان! ایسا نہیں ہو گا۔ تم یوں سمجھ لو کہ جہاں سے تمہاری مصیبتوں کا آغاز ہوا تھا وہیں تمہاری تمام مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔“

”خدا کرے کہ ایسا ہو۔“ میں نے کہا۔

سلطانہ بولی۔ ”یقین رکھو۔ ایسا ہی ہو گا۔“

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ یہاں سے مجھے قلعہ روہت گڑھ کے دیران محل میں جانا ہو گا۔“

سلطانہ نے کہا۔ ”ہاں۔ مگر تم اکیلے نہیں ہو گے۔ ایک خاص حد تک میں

تمہارے ساتھ ہوں گی۔ پھر اس کے بعد بھی میں تمہیں دیکھ رہی ہوں گی اور تمہاری راہ نمائی کر رہی ہوں گی۔“

”ہمیں اس آخری مہم پر کب روانہ ہونا ہو گا؟“

سلطانہ نے کہا۔ ”کل منگل کی رات ہے۔ پجاری رگھو کی بدروح ہر منگل کی رات کو پرانے محل کے بڑے کمرے میں آکر تمہارے اور میرے خلاف خطرناک خفیہ منتروں کا کیرتن کرتی ہے۔ اگرچہ اسے معلوم ہے کہ میں اب اس کی پہنچ سے باہر ہو چکی ہوں لیکن وہ اب بھی مجھے دوبارہ قابو کرنے کے جتن کئے جا رہا ہے۔ البتہ تمہارے بارے میں تو اسے یقین ہے کہ اس بار تم اس کے حملے سے نہیں بچ سکو گے۔ تم کل اسی وقت یہاں آ جانا۔ ہم یہیں سے قلعہ روہت گڑھ والے پرانے محل کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔“

اس کے بعد میں تھوڑی دیر تک سلطانہ کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر کل آنے کا کہہ کر وہاں سے اپنے ہوٹل واپس آ گیا۔

مجھے ایک تشویش سی لگ گئی تھی کیونکہ اس سے پہلے میرا کبھی کسی بدروح سے آنے سامنے کا مقابلہ نہیں ہوا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے ایک بہت ہی خطرناک بدروح کے سامنے جانا پڑ رہا تھا۔ اگرچہ سلطانہ نے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ ہو گی اور میرا دل بھی مضبوط تھا۔ لیکن پھر بھی انسان کمزور ہوتا ہے اور جان اس کو پیاری ہوتی ہے۔ میں سوچتا کہ اگر مجھ سے ذرا سی بھی غفلت ہو گئی یا عین وقت پر سلطانہ میری مدد کو نہ پہنچ سکی یا ڈر گا کا بتایا ہوا طلسمی لفظ کارگر ثابت نہ ہوا تو میں تو مارا جاؤں گا۔

اگلے دن میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں ہی رہا اور خدا سے دعا مانگتا ہا کہ یا خدا! اس آخری مہم میں بھی میری مدد فرماتا۔۔۔۔۔ رات جب ذرا گہری ہو گئی تو میں سلطانہ سے ملنے ندی کنارے والی بارہ درری کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں ہوا میں پرواز کرتے

ہوئے جارہا تھا۔ سلطانہ بارہ دری میں میرے پہنچنے کے فوراً بعد ہی آگئی۔ کہنے لگی۔
”ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے اور اسی وقت قلعہ روہت گڑھ والے محل کی
طرف چل پڑنا چاہئے۔“

سلطانہ کو اب میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ساتھ اڑانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں
اپنے آپ پرواز کر سکتا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں دلی کی چاندنی رات میں فضا میں بلند ہو کر
جھانسی کی طرف پرواز کرنے لگے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ قلعہ روہت گڑھ جھانسی سے
کچھ فاصلے پر روہت گڑھ نامی سٹیشن سے تھوڑی دور جنگل میں واقع ہے ہمیں اپنی
منزل پر پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ جب ہم روہت گڑھ کے قصبے کے اوپر سے گزر
رہے تھے تو سلطانہ کہنے لگی۔ ”شیردان! ہم پرانے محل سے کچھ فاصلے پر ہی ایک جگہ
جنگل میں اتریں گے۔“

۶۴

میں نے کہا۔ ”جیسے تمہاری مرضی۔“

روہت گڑھ قصبے کی ریلوے لائن کے پار تھوڑی دور آگے جا کر جنگل شروع ہو
جاتا ہے۔ چاندنی رات میں ہم جنگل کے اوپر سے گزر رہے تھے اور درختوں کی
چوٹیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ پرواز کرتے کرتے سلطانہ ایک جگہ نیچے اتر
آئی۔ میں بھی اس کے ساتھ نیچے اتر پڑا۔ جہاں وہ اتری تھی وہاں ایک شکستہ کھنڈر کی
چار دیواری باقی رہ گئی تھی۔ اس چار دیواری کے اندر ایک چوترا سا بنا ہوا تھا۔

سلطانہ اس چوترے پر بیٹھ گئی اور مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھالیا۔ کہنے لگی۔ ”تم اپنی
زندگی کی شاید سب سے خطرناک مہم پر جا رہے ہو۔ اگرچہ میں ہر قدم پر تمہارے
ساتھ رہوں گی لیکن میری مدد اور راہ نمائی صرف ایک حد کے اندر ہوگی اس کے
آگے تمہیں اپنی ہمت اور قوت ارادی سے کام لینا ہوگا۔ ایک بات یاد رکھنا تم اگر اس
مہم میں کامیاب ہو گئے تو تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بدروحوں کے عذاب سے نجات
حاصل کر لو گے۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟“

میں نے کہا۔ ”سلطانہ! مجھے تیار ہونا ہی پڑ رہا ہے۔ میرے سامنے دوسرا کوئی
راستہ نہیں۔“

سلطانہ نے کہل۔ ”انشاء اللہ تم کامیاب اور سرخرو ہو کر واپس آؤ گے۔ مجھے تم پر
پورا اعتماد ہے۔ تم محل کے خفیہ راستے سے اندر داخل ہو گے۔ یہ خفیہ راستہ تم نے
دیکھا ہوا ہے اس کے بعد تم محل کی تاریک سیڑھیاں چڑھ کر محل کے بڑے کمرے کی
کی گیلری میں آ جاؤ گے۔ یہ وہی گیلری ہے جہاں سے تم نے رگھو پجاری کے ہاتھوں
میرے قتل ہونے کے پرانے منظر کو ایک بار پھر ابھرتے دیکھا تھا۔ تمہیں یاد ہے نا؟“
میں نے کہا۔ ”ہاں مجھے یاد ہے۔“

سلطانہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم وہاں اسی طرح چھپ کر بیٹھ
جاؤ گے جس طرح تم پہلے دن وہاں چھپ کر بیٹھے تھے۔ تمہارے بازو پر بندھا ہوا
کالے جادوگر کا ہڈی والا تعویذ اپنے طلسمی اثر سے پجاری رگھو کو تمہاری موجودگی کا علم
نہیں ہونے دے گا۔ اس طلسمی تعویذ کی وجہ سے پجاری رگھو تم پر براہ راست حملہ
نہیں کر سکے گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”تو کیا مجھے رگھو کی بدروح پر حملہ کرنا ہوگا؟“

سلطانہ نے کہا۔ ”ہاں۔ تمہیں رگھو کی بدروح پر حملہ کرنا ہوگا۔ لیکن ڈر گانے
تمہیں جو لفظ بتایا ہے وہ حملہ کرنے کے فوراً بعد تمہیں رگھو کی بدروح پر پڑھ کر پھونک
دینا ہوگا اس کے بعد تم خود دیکھ لو گے کہ کیا ہوتا ہے۔“

میں دل میں ڈر رہا تھا۔ ایسا خطرناک کام میں نے زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔ میں
سلطانہ سے کیا پوچھتا، کیا سوال کرتا۔ اب پوچھنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ تو مجھے بھڑکتے
ہوئے آتش فشاں کے دہانے کی طرف بھیجنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور میں بھی مجبور تھا۔
اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے سلطانہ سے پوچھا۔ ”رگھو کی بدروح پر میں کس چیز سے حملہ کروں گا؟“

میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ ایک پستول تھا وہ میں نے راستے میں ہی پھینک دیا تھا۔“

سلطانہ نے کہا۔ ”تمہیں کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم دل میں کلمہ پاک کا ورد کرتے ہوئے جب میں تمہیں کان میں کہوں گی رگھو کی بدروح پر سامنے سے حملہ کرنے کے لئے بڑھو گے۔ اور جب میری طرف سے تمہیں اشارہ ملے گا تو تم دُرگاکا بتایا ہوا لفظ پڑھ کر بدروح پر پھونک دو گے۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

میں بڑی توجہ سے سلطانہ کی ایک بات کو سن رہا تھا اور اسے دل میں بٹھا رہا تھا تاکہ وقت آنے پر مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ جب سلطانہ مجھے اچھی طرح سے سمجھا چکی اور اس کی تسلی بھی ہو گئی تو اُس نے کہا۔ ”اب تم ویران محل کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ میں اسی جگہ بیٹھی تمہیں دیکھ رہی ہوں۔“

میں نے اللہ کا نام لیا اور چپکے سے اٹھ کر روہت گڑھ کے قدیم قلعے کی جانب چل پڑا۔ وہاں سے قلعہ تھوڑے فاصلے پر ہی تھا۔ اس قلعے میں، میں پہلے بھی آچکا تھا۔ مجھے اس کے خفیہ راستے کا بھی پتہ تھا۔ میں خاموشی اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جنگل کے چپ چاپ کھڑے درختوں کے نیچے سے گزر رہا تھا اور دل میں خدا سے اپنی کامیابی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ آخر مجھے دیو قامت پرانے قلعے کی دیوار نظر آگئی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا اس جگہ آگیا جہاں سے ایک خفیہ راستہ قلعے کے اندر ویران محل کو جاتا تھا۔ یہ راستہ ایک غار کی شکل میں تھا جس کا دہانہ جنگلی جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں جھاڑیوں کو ہٹا کر سرنگ میں داخل ہو گیا۔ غار میں داخل ہونے سے پہلے میں نے کلمہ پاک پانچ مرتبہ پڑھ لیا تھا۔

اس غار میں آگے جا کر ایک زینہ اوپر کو جاتا تھا جو محل کے ایک خفیہ کمرے میں نکلتا تھا۔ اس قسم کے خفیہ راستے شاہی محلات میں ضرور رکھے جاتے تھے کہ اگر دشمن کی فوج محل میں داخل ہو جائے تو شاہی خاندان کے افراد محل سے فرار ہو سکیں۔

زینے پر سے ہوتا ہوا میں محل کے خفیہ کمرے میں آگیا۔ یہاں گھپ اندھیرا تھا۔ غائب ہونے کی وجہ سے اندھیرے میں بھی مجھے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ خفیہ کمرے کے تنگ دروازے میں سے نکل کر میں نے ایک اور زینہ طے کیا اور بڑے کمرے کی گیلری میں نکل آیا۔

یہی وہ بڑا کمرہ تھا جہاں پجاری رگھو کی بدروح نے رات کو اپنے کسی خاص عمل یا کیرتن کے لئے آنا تھا۔ مجھے وہ پہلا دن یاد آگیا۔ اسی کمرے میں، میں نے سلطانہ یعنی روہنی کے تین سو سال پہلے ہو چکے قتل کے منظر کو دوبارہ دیکھا تھا اور اسی جگہ سے میری مصیبتوں کا آغاز ہوا تھا۔ میں گیلری میں سنگ مرمر کی جالی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ بڑا کمرہ ویران پڑا تھا۔ درمیان میں جو چبوترہ بنا تھا وہ بھی خالی پڑا تھا۔ سلطانہ نے مجھے کہا تھا کہ تم مجھے دل میں بھی آواز دے کر نہ بلانا۔ موقع دیکھ کر میں خود ہی تمہیں ہدایات دیتی رہوں گی۔

میں خاموش بیٹھا پجاری رگھو کی بدروح کا انتظار کر رہا تھا۔ اندھیرے ویران کمرے میں ایسی خاموشی طاری تھی کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکن سنائی دینے لگی تھی۔ مجھے وہاں بیٹھے آدھ گھنٹہ ہی گزرا ہو گا کہ کمرے میں پھڑپھڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر نیچے دیکھا۔ مجھے ایک سیاہ فام بدروح نظر آئی جو کمرے کی فضا میں ادھر ادھر اڑتے ہوئے جائزہ لے رہی تھی۔ وہ غائب تھی لیکن مجھے نظر آرہی تھی۔ میرے کان میں سلطانہ کی دھیمی سرگوشی کی آواز آئی۔ اُس نے میرے کان میں کہا۔ ”شیروان! سانس روک کر اپنی جگہ ساکت ہو کر بیٹھے رہنا۔ یہ پجاری رگھو کی خاص محافظ بدروح ہے۔ اسے رگھو نے یہ معلوم کرنے کے لئے پہلے بھیجا ہے کہ ویران محل میں جا کر دیکھے کہ کسی دشمن نے کوئی جادو کا عمل تو نہیں کر رکھا۔ بالکل ساکت ہو کر بیٹھے رہو۔ اٹھ کر بھاگو گے تو بدروح کو تم نظر آ جاؤ گے اور پھر تمہاری جان خطرے میں گھر جائے گی۔“

میں نے سانس روک لیا اور جب سانس کی ضرورت محسوس ہوتی تو میں بہت ہی آہستہ آہستہ سانس لینے لگتا۔ میری نگاہیں غیبی بدروح پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بہت بڑے چگادڑ کی طرح کمرے کی فضا میں ادھر ادھر چکر لگا رہی تھی۔ چکر لگاتے ہوئے وہ اوپر گیلری کی طرف بھی آگئی۔

میرے کان میں سلطانہ کی سرگوشی سنائی دی۔ ”شیروان! کسی قسم کی حرکت نہ کرنا۔ یہ تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

میں اور زیادہ ساکت ہو گیا۔ بدروح پھڑپھڑاتی، غوطے لگاتی میرے بالکل قریب سے ہو کر گزر گئی۔ وہ پھر گیلری کی طرف آئی۔ میں اسی طرح پتھر کا بت بن کر بیٹھا رہا۔ بدروح غوطہ لگا کر سیدھی میری طرف آئی۔ میں کچھ گھبرا گیا۔ وہ تیزی سے آئی اور میرے غیبی جسم میں سے گزر کر دوسری طرف نکل گئی۔ میں اپنی جگہ پر لرزسا گیا جیسے تیز ہوا کا جھونکا درخت کی شاخوں میں سے گزر جائے تو شاخیں لرزنے لگتی ہیں۔ سلطانہ نے ٹھیک کہا تھا بدروح کو میرے غیبی وجود کا احساس تک نہ ہوا۔

بدروح نے بڑے کمرے کے مزید دو تین چکر کاٹے اور غائب ہو گئی۔ وہاں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ اتنے میں دو سیاہ پوش بدروحیں نمودار ہوئیں۔ ان کے ہاتھوں میں دو پیالے تھے جن میں سلگتے ہوئے لوبان کا دھواں نکل رہا تھا۔ انہوں نے دونوں پیالے چبوترے پر ایک دوسرے کے متوازی رکھ دیئے اور چبوترے سے اتر کر ایک طرف ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔ اس کے بعد ایک سیاہ فام آدمی نمودار ہوا۔ یہ بھی کوئی بدروح تھی مگر انسانی شکل میں تھی۔ اس کے سر پر بالوں کی لمبی بودی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ اُس نے چبوترے پر وہ کپڑا بچھا دیا۔

یہ کسی جانور کی سیاہ کھال تھی۔ یہ بدروح بھی ایک جانب کھڑی ہو گئی۔ اس کے بعد بالکل اُس روز کی طرح پجاری رگھو کی بدروح داخل ہوئی۔ پجاری رگھو ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دو بدروحوں نے کرسی کندھوں پر اٹھار کھی تھی اور وہ کچھ منتر پڑھتے

ہوئے آرہے تھے۔ چبوترے کے پاس آکر انہوں نے کرسی فرش پر رکھ دی۔ پجاری رگھو کی بدروح کو میں نے صاف پہچان لیا تھا۔ اسی طرح اس کا سر مٹھا ہوا تھا، کانوں میں مندریاں تھیں، جسم سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا تھا، ہاتھ میں ترشول تھا۔ پجاری رگھو نے کرسی سے اتر کر چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ بڑی شیطانی طاقت والی بدروح ہے۔ یہ ضرور مجھے غیبی حالت میں بھی گیلری میں بیٹھا ہوا دیکھ لے گا۔ مگر میں اسے نظر نہیں آیا تھا۔ اس کی نگاہیں گیلری پر سے ہوتی ہوئی واپس چلی گئیں۔ پجاری رگھو نے کھڑائیں پہن رکھی تھیں۔

چبوترے کے پاس آکر اس نے کھڑائیں اتاریں اور چبوترے پر پڑھ کر جانور کی کھال پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ترشول اُس نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ میں اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ پجاری رگھو نے منتروں کا جاپ شروع کر دیا۔ اُس کے منتر میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ یہ بدروحوں کے منتر تھے۔ وہ منتر پڑھتا جاتا تھا اور سلگتے ہوئے لوبان کے پیالوں میں کچھ پھینکتا جاتا تھا۔ وہ دیر تک یہ عمل کرتا رہا۔

پھر ایسا ہوا کہ شاید اس نے فضا میں میری بو محسوس کر لی تھی یا اسے اس کے منتروں کی وجہ سے احساس ہوا تھا، پجاری رگھو منتر پڑھتے پڑھتے رُک گیا۔ اُس نے اونچی آواز میں کہا۔ ”یہاں کوئی زندہ انسان موجود ہے۔“

ایک بدروح جلدی سے سامنے آگئی اور بولی۔ ”مہاراج! میں کونہ کونہ دیکھ گئی تھی یہاں کسی زندہ انسان کی جرات نہیں کہ داخل ہو۔“

پجاری رگھو نے بلند آواز میں کہا۔ ”میرے منتر جھوٹ نہیں بولتے۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ یہاں ایک زندہ انسان موجود ہے مگر وہ غیبی حالت میں ہے۔“

یہ کہہ کر پجاری رگھو اٹھ کھڑا ہوا۔ ترشول اس نے ہاتھ میں پکڑ لیا اور بولا۔ ”میں خود اس بلیچھ کو تلاش کر لوں گا۔“

میرے کان میں سلطانہ کی سرگوشی سنائی دی۔ ”شیروان! اپنی جگہ سے اٹھ کر چھت کے ساتھ لگ جاؤ۔ گھبرانا نہیں۔ رگھو کو تم نظر نہیں آؤ گے۔“

میں اسی وقت گیلری سے بلند ہو کر اوپر چھت کے ساتھ لگ گیا۔ میں نیچے دیکھ رہا تھا۔ پجاری رگھو ایک دم غائب ہو گیا مگر میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ غائب ہونے کے بعد وہ کمرے کی فضا میں ادھر ادھر اڑنے لگا۔ وہ پہلی بدروح کی طرح ایک ایک جگہ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کبھی اڑ کر ایک کونے میں جاتا کبھی وہاں سے غوطہ لگا کر دوسرے کونے میں چلا جاتا اور پھر وہاں سے دوسری طرف نکل جاتا۔ غلام بدروح اور عورتوں کی سیاہ فام بدروہیں ایک طرف کھڑی پجاری رگھو کی بدروح کو کمرے کی فضا میں غوطے لگاتے دیکھ رہی تھیں۔ پجاری رگھو کی بدروح ایک بار اڑتے ہوئے میرے قریب سے ہو کر نکل گئی۔ وہ میرے قریب سے غوطہ لگا کر گزرا تو مجھے گرم ہوا لگی۔ تب مجھے خیال آیا کہ یہ آگ سے بنی ہوئی جہنمی مخلوق ہے۔

اس نے بھی مجھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ واپس چبوترے پر آکر انسانی شکل میں ظاہر ہو گیا اور ترشول کو زور سے چبوترے کے فرش پر مارتے ہوئے بولا۔ ”مجھے میرے دشمن منتروں کا جاپ کرنے سے روک رہے ہیں مگر وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ میں اپنا کیرتن، اپنی تپیا ضرور پوری کروں گا۔“

اور اس نے ایک بار پھر منتر پڑھنے شروع کر دیئے۔ اتنے میں میرے کانوں میں سلطانہ کی سرگوشی سنائی دی۔ ”تم نے دیکھ لیا ہے کہ پجاری رگھو کو بھی تم نظر نہیں آئے۔ اب جس وقت میں کہوں بے خوف ہو کر اُس پر حملہ کر دو۔ خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہے۔ تم کامیاب ہو گے۔“

میں سلطانہ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر اس نے مجھے آواز نکالنے سے سختی سے منع کیا ہوا تھا چنانچہ میں خاموش رہا۔ سلطانہ کی سرگوشی ایک بار پھر سنائی دی۔ ”اب نیچے اتر کر چبوترے پر جا کر پجاری رگھو کے بالکل سامنے جا کر کھڑے ہو جاؤ۔“

میں دل میں خوف محسوس کر رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر میں پجاری رگھو کی بدروح کے بالکل سامنے جا کر کھڑا ہو گیا تو وہ ضرور مجھے دیکھ لے گا مگر اس وقت ایک طرح سے میں سلطانہ کے کنٹرول میں تھا اور وہی مجھے گائیڈ کر رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چھت سے نیچے اترنے لگا۔ پھر چبوترے کے بالکل اوپر آ گیا۔ اس کے بعد چبوترے پر بہاں رگھو پجاری بیٹھا منتروں کا جاپ کر رہا تھا اس کے بالکل سامنے تین قدموں کے فاصلے پر اتر کر کھڑا ہو گیا۔ میں پجاری رگھو کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کے منڈھے ہوئے سر پر پسینے کے قطرے تک دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے لگا کہ میں موت کے سامنے کھڑا ہوں۔

میرا یقین بڑا پختہ تھا مگر پھر بھی میں ایک کمزور انسان تھا کسی وقت شک پڑتا کہ ہو سکتا ہے میرے سارے حربے ناکام ہو جائیں اور یہ بدروہیں مجھے اسی جگہ بھسم کر دیں۔ شاید سلطانہ کو میرے دل کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”شیروان! دل کو مضبوط رکھو۔“

میں نے دل میں کلمہ پاک کا ورد شروع کر دیا۔ میرا کھویا ہوا یقین اور اعتماد واپس آ گیا اور میں اپنی جگہ پر قائم ہو گیا۔ میں دل میں برابر کلمہ پاک پڑھے جارہا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ دنیا کی کوئی شیطانی طاقت مجھے شکست نہیں دے سکتی۔ اب میں بڑی بے تابی سے انتظار کر رہا تھا کہ سلطانہ مجھے رگھو پر حملہ کرنے کا کب اشارہ کرتی ہے۔ پجاری رگھو منتر پڑھتے پڑھتے ایک بار پھر رُک گیا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر اس طرف دیکھا جہاں میں کھڑا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا ہے۔ شاید اس صورتِ حال کو سلطانہ نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اچانک پجاری رگھو نے غضب ناک ہو کر کہا۔ ”تم..... میرے دشمن.....“

عین اُسی وقت میرے کانوں میں سلطانہ کی سرگوشی سنائی دی۔ ”شیروان! مالینی کا شبد پڑھ کر اس پر پھونک دو۔“

میں نے مالینی کا بتایا ہوا لفظ دہرایا اور زور سے پجاری رگھو کی طرف پھوٹک ماری۔ میرا خیال تھا کہ پجاری رگھو ایک دم جل کر راکھ ہو جائے گا مگر یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ کہ مالینی کے بتائے ہوئے شبد نے پجاری رگھو پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ پجاری رگھو نہ صرف یہ کہ مجھے دیکھ چکا تھا بلکہ اُس نے مجھے پہچان بھی لیا تھا۔ اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور اُس نے ڈراؤنی آواز میں بدروحوں کو حکم دیا۔

”اس لیچھ کو پکڑلو۔“

اور یہ کہہ کر پجاری رگھو نے ترشول سنبھال کر کوئی خفیہ منتر پڑھ کر ترشول سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں جلدی سے ایک طرف ہو گیا۔ یہ میں نے بشری کمزوری کے تحت ایسا کیا تھا حالانکہ میں غائب تھا مگر کچھ پتہ نہیں تھا کہ پجاری رگھو کا ترشول میرے غیبی جسم میں سے نکل جانے کی بجائے میرے انسانی جسم کو چھلنی کر دیتا۔ میں واقعی اس وقت گھبرا گیا تھا۔ ہر کلمہ گو مسلمان کی طرح مصیبت کی اس گھڑی میں مجھے سوائے خدا کے اور کسی کا خیال نہ آیا۔ میں نے فوراً اعوذ باللہ پڑھ کر بلند آواز میں کہا۔

”یا اللہ پاک! مجھے شیطان سے اپنی پناہ میں رکھنا۔“

ان الفاظ کا میری زبان سے نکلنا تھا کہ پجاری رگھو کے جسم کو آگ لگ گئی۔ بھڑکتے شعلوں نے اُس کے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ چوترے پر چکر کھانے لگا۔ اُس کے حلق سے بڑی ڈراؤنی آوازیں نکلنے لگیں۔ یہ دیکھ کر اس کی غلام بدروحیں ایک سیکنڈ میں چیختی چلاتی غائب ہو گئیں۔ اب اس دیران محل کے کمرے میں، میں تھا اور پجاری رگھو کی شعلوں میں لپٹی چکر کھاتی ہوئی بدروح تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے پجاری رگھو کا جسم سیاہ ہڈیوں کا پنجر بن گیا۔ ہڈیوں کا پنجر بھی آگ میں جل رہا تھا۔ پھر ہڈیوں کا پنجر بھی بھسم ہو کر راکھ بن گیا۔ اس کے بعد کمرے میں ہیبت ناک سناٹا طاری ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ کمرہ بالکل خالی ہو چکا تھا۔ نہ بدروحیں تھیں، نہ وہ کرسی تھی جس پر بیٹھ کر پجاری رگھو آیا تھا اور نہ چوترے پر سلگتے ہوئے

لوبان والے پیالے ہی تھے۔ سب بلائیں دفع ہو چکی تھیں۔ میرے دل سے اللہ کے خوف کے سوا سارے خوف دُور ہو چکے تھے۔ مجھے سلطانہ کی سرگوشی سنائی دی۔ سلطانہ کی سرگوشی بھی جذبہ ایمانی میں سرشار تھی۔ ”سبحان اللہ! سبحان اللہ! سبحان اللہ!“ اس نے تین بار سبحان اللہ کہا اور بولی۔ ”شیر وان! تم نے اللہ کے پاک کلام کی مدد سے بدی کی ایک شیطانی طاقت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اب تو میں بول سکتا ہوں نا؟“

سلطانہ کی آواز آئی۔ ”کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میں تمہارے پاس واپس آ رہا ہوں۔“

سلطانہ کی سرگوشی سنائی دی۔ ”میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

اور میں اس منحوس محل میں سے نکل کر جنگل کے درختوں کے اوپر سے ہوتا ہوا سلطانہ کے پاس آ گیا۔ وہ کھنڈر کی چار دیواری سے باہر نکل کر میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ”شیر وان! جب مالینی کے شبد نے رگھو پر کوئی اثر نہ کیا تو میں ڈر گئی تھی۔ اب شیطان صفت رگھو کچھ بھی کر سکتا تھا لیکن عین وقت پر اعوذ باللہ پڑھ کر جو تم نے اللہ کو مدد کے لئے آواز دی تو اللہ کے پاک کلام نے تمہیں اپنی پناہ میں لے لیا۔“

میں نے کہا۔ ”سلطانہ! اب تو ساری بدروحوں سے ہمارا اور خاص طور پر میرا

پیچھا چھوٹ چکا ہے نا یا اب بھی کوئی بلا باقی ہے؟“

سلطانہ نے کہا۔ ”نہیں شیر وان! اب ساری بلائیں دفع ہو چکی ہیں۔ خدا نے

تمہاری اور میری غلطیاں اور قصور بخش دیئے ہیں۔“

میں نے شکر الحمد للہ پڑھ کر کہا۔ ”آج میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش

قسمت آدمی سمجھتا ہوں۔“

سلطانہ کہنے لگی۔ ”اب ہمیں واپس چلے جانا چاہئے۔ یہ جگہ ہمارے لئے اچھی

نہیں ہے۔“

اسی وقت ہم روہت گڑھ کے جنگل سے پرواز کر کے دلی کی سمت روانہ ہو گئے۔ رات کا پچھلا پہر شروع ہو گیا تھا جب ہم مغلیہ مسجد کے پیچھے ندی کنارے بارہ دری میں آ گئے۔

میں نے سلطانہ سے کہا۔ ”سلطانہ! اب میں واپس اپنے وطن پاکستان جانا چاہتا ہوں تاکہ وہاں جا کر ایک نئی زندہ شروع کروں۔“

سلطانہ نے کہا۔ ”شیروان! اب مجھے بھی تم سے جدا ہونا ہو گا۔ میں صرف تمہاری خاطر یہاں ٹھہر گئی تھی لیکن میں تمہیں پاکستان پہنچانے کے بعد نیک روحوں کی دنیا میں جاؤں گی کیونکہ تم اکیلے پاکستان نہیں جاسکو گے اس لئے کہ تمہارے پاس پاسپورٹ نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں غائب ہو کر ہوا میں اڑتا ہوا پاکستان چلا جاؤں گا۔ مجھے پاسپورٹ کی بھلا کیا ضرورت ہے؟“

سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بد روحوں کا طلسم ٹوٹ چکا ہے شیروان..... سورج کی پہلی کرن کے ساتھ پاتالی کی انگوٹھی کا اثر بھی ختم ہو جائے گا اور تم اپنے آپ ظاہر ہو جاؤ گے اور پھر نہ غائب ہو سکو گے، نہ ہوا میں اڑ سکو گے۔ اسی طرح کالے جادوگر کی ہڈی جو تم نے اپنے بازو پر باندھ رکھی ہے اس کا طلسم بھی ختم ہو جائے گا۔“

میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”سلطانہ! ان لعنتوں سے بھی میرا پیچھا چھوٹ جائے گا تو میں خدا کا شکر ادا کروں گا۔ میں اب ایک نارمل مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں.....“

سلطانہ نے کہا۔ ”تم نے بڑا نیک فیصلہ کیا ہے۔ لیکن رات ڈھلنے لگی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس سے پہلے کہ تم غیبی حالت سے ظاہر ہو کر انسانی شکل میں واپس آ

جاؤ تمہیں پاکستان پہنچا دوں۔ آؤ میرے ساتھ۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لو۔“

میں نے سلطانہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اُس نے کہا۔ ”اللہ کا نام لے کر آنکھیں بند کر لو۔“

میں نے ایسا ہی کیا۔ ہوا کا تیز جھونکا میرے جسم کو چھو کر گزر گیا۔ پھر جیسے میں ہوا میں سے گزر رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد سلطانہ نے مجھے آنکھیں کھول دینے کو کہا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ آسمان پر چاند ڈھل رہا تھا۔ میں ایک خوبصورت روشوں اور فواروں والے باغ میں چار پیناروں والی ایک مغلیہ عمارت کے پاس کھڑا تھا۔ میرے قریب ہی سلطانہ موجود تھی۔ کہنے لگی۔ ”تم نے اس عمارت کو نہیں پہچانا؟“

میں نے عمارت کو غور سے دیکھا اور خوش ہو کر کہا۔ ”یہ تو مجھے مقبرہ جہانگیر لگتا ہے۔ اس کا مطلب ہے میں اپنے پیارے وطن پاکستان کے پیارے شہر لاہور میں ہوں۔“

سلطانہ مسکرا دی تھی۔ کہنے لگی۔ ”ہاں فیروز! تم اپنے پیارے اور مملکت خداداد پاکستان کے خوبصورت شہر لاہور میں جہانگیر کے مقبرے میں ہو۔“

میں نے تعجب کے ساتھ سلطانہ سے پوچھا۔ ”تم نے پہلی بار مجھے میرے اصلی نام فیروز سے بلایا ہے۔ تم نے پہلے ہمیشہ مجھے شیروان کے نام سے پکارا تھا۔ یہ تبدیلی کیسے ہوئی؟“

سلطانہ نے کہا۔ ”فیروز! شیروان ایک خواب تھا۔ وہ خواب ٹوٹ چکا ہے۔ کچھ دیر کے بعد میں بھی تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاؤں گی۔ مجھے بھی ایک خواب سمجھ کر بھلا دینا اور پاکستان میں ایک سچے پاکستانی اور سچے مسلمان کی حیثیت سے نئی زندگی شروع کرنا۔ میں نے بد روحوں کی حیثیت سے گناہوں کا عذاب بھی دیکھا ہے اور اچھی روح بن کر نیکیوں کا ثواب اور خدا کی رحمت کو بھی نازل ہوتے دیکھا ہے۔ میں تمہیں، تم سے جدا ہوتے ہوئے یہی کہوں گی کہ برائی سے، برے کاموں سے، برے

خیالوں سے بچنا۔ خلق خدا کی خدمت کرنا۔ کوئی تمہارے ساتھ برائی کرے تو اسے معاف کر دینا۔ اللہ اور اُس کے رسول پاک ﷺ کے دکھائے ہوئے راستے پر چلنا۔ کوئی سیدھی راہ سے بھٹکا ہوا تمہارے پاس آجائے تو اسے سیدھی راہ دکھا دینا۔ پانچ وقت نماز پڑھنا۔ نماز دل کے میل کو دھو ڈالتی ہے اور بندے کو اس کے رب کے قریب لے جاتی ہے.....“

سلطانہ کی باتوں نے مجھ پر ایک عجیب رقت کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ میں اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اُس کی آواز سن رہا تھا۔ وہ بھی غائب تھی اور صرف مجھے نظر آرہی تھی۔ میں بھی غائب تھا اور صرف وہی مجھے دیکھ سکتی تھی۔ آسمان پر صبح کا نور پھیلنے لگا اور پھر سورج کی پہلی سنہری کرن مشرقی افق پر بلند ہوئی تو مجھے اپنا جسم نظر آنے لگا۔ میں نے اپنے جسم کو غور سے دیکھا۔ میں واقعی اب غائب نہیں تھا۔

میں نے سلطانہ سے کہا۔ ”سلطانہ! میں غائب نہیں رہا۔“
سلطانہ نے کہا۔ ”بدروحوں کا طلسم سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ٹوٹ گیا ہے فیروز۔ اب تم ایک نارمل انسان ہو۔“

میں نے اپنی انگلی کو دیکھا۔ پاتالی کی انگوٹھی غائب ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے بازو کو ٹٹول کر دیکھا۔ کالے جادوگر کا ہڈی والا تعویذ بھی غائب تھا۔ میں سلطانہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے کہا۔ ”بری بلاؤں اور بدروحوں کے ساتھ اُن کی منحوس نشانیاں بھی غائب ہو گئی ہیں فیروز..... خداوند کریم کا شکر ادا کرو۔ خدا حافظ!“

اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے سلطانہ بھی غائب ہو گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں ایک خواب دیکھ رہا تھا جو ایک دم ختم ہو گیا ہے۔ دور کسی مسجد کے سپیکر سے قرآن پاک کی تلاوت کی آواز سنائی دی۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں قبلہ رو ہو کر سجدے میں گر گیا۔

اس کے بعد میری زندگی بالکل ہی بدل گئی۔ سلطانہ کی نیک روح نے مجھے جو

نصیحتیں کی تھیں میں نے اُن پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ میں پانچوں وقت نماز پڑھتا ہوں۔ اپنے وطن پاکستان سے محبت کرتا ہوں۔ اللہ اور نبی پاک ﷺ کے دکھائے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کوئی برا خیال ذہن میں آجائے تو اسے فوراً اعوذ باللہ پڑھ کر ذہن سے نکال دیتا ہوں۔ کبھی کسی بات پر غصہ نہیں کرتا۔ کوئی میرا دل دکھائے تو میں اسے معاف کر دیتا ہوں۔ اپنی محنت کی کمائی سے بازار سے دال روٹی خرید کر کھا لیتا ہوں اور ہر لمحے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ جن بھیانک واقعات سے میں گزر چکا ہوں انہیں میں نے اپنے ذہن سے بھلا دیا ہے۔ میں غریبی کی زندگی بسر کر رہا ہوں لیکن میرا دل اللہ کے خوف اور خلق خدا کی محبت سے لبریز ہے۔ یہی میری سب سے بڑی دولت ہے۔ یہ وہ دولت ہے جو کم نہیں ہوتی بلکہ جتنی خرچ کرو اتنی بڑھتی جاتی ہے۔ جسے یہ دولت مل جائے اسے اور کیا چاہئے.....“

یہاں اس شخص کی کہانی ختم ہوتی ہے۔ میرے پر زور اصرار کے باوجود اُس شخص نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ مجھے اپنی داستان سنا کر وہ چلا گیا اور اس کے بعد اس سے پھر کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ شاید وہ لاہور چھوڑ کر پاکستان کے کسی دوسرے شہر یا کسی گاؤں میں چلا گیا ہے اور وہاں محنت مزدوری کر کے رزق حلال کی روکھی سوکھی کھا کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے خلق خدا کی خدمت میں مصروف ہو گا۔

(ختم شد)

معروف مصنف انوار علی کی کا پر اسرار ناول

اس جگہ کا وقت
جہاں ایک حسین
لوگوں کی زندگی
سید ہو گیا

مکرم

- سید پور کا جن بہت خوش تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ پر یوں جیسی ایک حسین ترین لڑکی اس کے پاس تھی۔ بڑے فضا مقام تھا، بے غصہ ہوا میں تھیں، چاندنی راتیں تھیں، ریشمیں بدن کی مہک تھی، کیا نہیں تھا، سب کچھ تھا یہاں۔
- بیس سال بعد اس نے اپنی بیٹی کو پہلی اور آخری بار دیکھنے کی خواہش کی ہے تو ہمیں مرنے سے پہلے اس کی آخری خواہش پوری کرنا ہوگی۔
- راشدہ نے جو منظر دیکھا، اسے دیکھ کر کانپ اٹھی۔ ایک کالا بلا نیلم کے پاؤں چاٹ رہا تھا اور وہ کالے پلے کو بڑے کیف نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔
- کیا تم لوگوں نے مجھے پانی کا بلبلہ سمجھ لیا ہے کہ پھونک مارو گے اور میں ہوا میں تحلیل ہو جاؤں گا۔ میں بہت زبردست جن ہوں، میرے راتے سے ہٹ جاؤ، ورنہ وہ تباہی پھیلے گی کہ دنیا دیکھے گی۔

اس ناول کا مرکزی خیال سچا ہے، باقی کہانی کا تانا بانا مصنف کی رات کے وقت گھر میں تھا ہونے کی تخلیق ہے اور تخلیق بھی ایسی کہ اس پر سچ کا گماں ہو۔ صورت میں یہ ناول نہ پڑھیں۔

سفید کاغذ، عمدہ طباعت و کتابت قیمت - 300 روپے

القریش پبلیکیشنز
سکرڈڈ، چوک اردو بازار۔ لاہور
فون: 042-7668958، 042-7652546

www.alquraish.com E.mail: info@alquraish.com